کیفی اعظمی نمبر
معیار

٦
معیار
SADIQUE
کیفی اعظمی نمبر

مدیر: نشاط شاہد
طابع و ناشر: نشاط شاہد
سال اشاعت: ۱۹۹۲ء
قیمت: ایک سو پچاس روپے (۱۵ ڈالر)
طباعت: عزیز پرنٹنگ پریس، دہلی

تقسیم کار

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶-
ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲-
انجمن ترقی اردو (ہند) دین دیال اپادھیائے مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲-
مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶-
شمع نیاز، ۳۱،۷ سمن آباد، لاہور، پاکستان
اقبال حسین لکھویرا، پوسٹ بکس نمبر ۵۳۱، دوبئی (متحدہ عرب امارات)
اردو انٹرنیشنل، ۸۰ ریچمنڈ اسٹریٹ ویسٹ سوٹ، ۲۰۱، ٹورنٹو، اونٹاریو (کناڈا)

معیار پبلی کیشنز
کے، ۲۰-سی شیخ سرائے، فیز ۲، نئی دہلی ۱۷

مشورت :

ڈاکٹر صادق

ترتیب :

شاہد ماہلی

معاون :

ڈاکٹر سرور احمد

سمت

معیار کے فیض نمبر کی شاندار کامیابی ہمارے لیے نہایت خوش آیند اور کسی حد تک حیرت‌نما تجربہ ہے۔ اردو دنیا میں اس کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی، تخلیق کاروں اور نقادوں نے اسے بے حد سراہا، ہند و پاک کے اہم رسائل و اخبارات نے اس پر بہترین تبصرے شایع کیے، ملک اور بیرونی ممالک کے ادب دوست قارئین نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ایک قلیل سے عرصے میں اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا۔ یہی بات دوسرے ایڈیشن کے ساتھ بھی رہی، پاکستان کے ایک اشاعتی ادارے ماورا پبلی کیشنز لاہور نے "معیار" کے فیض نمبر کی زبردست مقبولیت اور بازار میں اس کی مانگ کو دیکھتے ہوئے من و عن اس کا ایک ایڈیشن کتابی شکل میں لاہور سے شایع کیا۔ وہ بھی مختصر سی مدت میں عنقا ہوگیا۔ معیار کے لیے فیض کی نظموں پر تیار کی گئی تصویروں کی نمائشیں منعقد ہوئیں اور انھیں ٹی۔ وی پروگراموں میں پیش کیا گیا۔ کیا یہ ساری باتیں اس کا ثبوت نہیں کہ خلوص نیت، لگن اور ایماندارانہ جذبے کے ساتھ کیا گیا کام رائیگاں نہیں جاتا۔

فیض نمبر کے بعد "معیار" کا کیفی اعظمی نمبر پیش کرتے ہوئے ہمیں از حد مسرت ہو رہی ہے کہ یہ

دراصل ہماری ایک دیرینہ آرزو کی تکمیل اور ایک حسین خواب کی تعبیر سے عبارت ہے۔ ۱۹۸۳ء میں "نیا پاکستانی ادب نمبر" کی ترتیب کے دوران ہم نے پہلی بار کیفی نمبر کے بارے میں سوچا تھا اور پھر کیفی اعظمی نمبر کی اشاعت کا منصوبہ بنانے کے بعد ابتدائی تیاریاں شروع کر دی گئی تھیں کہ اسی اثنا میں ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء کو اچانک فیض احمد فیض اس دنیا سے چل بسے۔ ہر چند کہ فیض کی زندگی ہی میں ہندوپاک کے دو تین رسالوں نے ان پر ضخیم خاص نمبر شایع کر دیے تھے تاہم اردو زبان کے اس مقبول ترین البیلے جیالے عہد ساز محبوب شاعر پر اس کے شایانِ شان ایک خاص نمبر کی اشاعت کی ضرورت پھر محسوس ہو رہی تھی لہٰذا ہم نے اسی بات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے فیض احمد فیض کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کی غرض سے معیاری فیض نمبر نکالنے کا ایک ہنگامی فیصلہ کر کے اس کے مطابق کام کا آغاز کر دیا۔ یہ پروجیکٹ ہندوپاک کے متعدد اہلِ قلم کے تعاون سے دو تین سال کے عرصے میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ یہی چیز کیفی اعظمی نمبر کی اشاعت میں تاخیر کا سبب بن گئی ورنہ یہ نمبر اب سے بہت پہلے شایع ہو چکا ہوتا۔

اردو شعروادب میں کیفی اعظمی کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں کہ اردو شاعری سے ان کا رشتہ نصف صدی کا قصّہ ہے دو چار برس کی بات نہیں۔ اس نصف صدی کے ہنگامہ خیز حالات میں وہ اور ان کی شاعری نہایت صبر آزما مراحل سے گزری ہے کبھی روایت پرستوں نے ان پر انگلیاں اٹھائیں تو کبھی مذہب کے نام نہاد شیدائیوں نے ان پر زبردست حملے کیے کبھی ترقی پسند تحریک کے مخالفوں نے انھیں اپنا ہدف بنایا تو کبھی جدیدیت کے دعویداروں نے ان پر خاک اڑائی تو کبھی قانون کے محافظوں نے ان پر قدغن لگائی اور تو اور خود ترقی پسند ناقدین اور مبصرین نے بھی ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا اس کے باوجود کیفی اعظمی اپنے ضمیر اور فن کے تئیں ایمانداری اور خلوص کا رویّہ اختیار کر کے اپنی زنگار رنگ عظیم تہذیب متعصبانہ سیاست کا شکار ہوتی ہوئی اپنی مظلوم لیکن زندہ و پائندہ زبان اور اس کے شعروادب کی قابلِ قدر روایات اور اپنے عہد کے انسان کی آواز بن گئے۔

کیفی اعظمی کی شاعری ماضی کے انسانوں کے تجربات کو نئے طرز و اسلوب اور تشبیہہ و استعارات میں پیش کرنے کی سعی محض نہیں بلکہ وہ تو ان کے اپنے پر آشوب عہد کے حالات

ماحول اور ذاتی واجتماعی تجربات کا ثمرہ ہے۔ وہ دیکھی ہوئی اور بھوگی ہوئی سچائیوں سے عبارت ہے۔ اس سماج کی پیداوار ہے جس کے اندر شاعر ایک حسّاس اور ذمّے دار رکن کی حیثیت سے زندگی گزار رہا اس کے سارے نشیب و فراز اور جزرو مد سے گزر رہا اور متاثر ہو رہا ہے۔

کیفی اعظمی کی شاعری کا آغاز سفرِ رومانی کی حسین و رنگین وادیوں سے شروع ہوا تھا۔ احتیاط، پشیمانی، ملاقات، مجبوری، تصوّر، اندیشے اور نقش و نگار اور ایسی ہی اُن کی دیگر رومانی نظمیں آج بھی اپنی تازگی، دلکشی، خوابنائی اور تاثر کی بنیاد پر اردو کی بہترین رومانی نظمیں قرار دی جاسکتی ہیں۔ فیض احمد فیض کی طرح (لیکن غالباً اُن سے کچھ پہلے) کیفی اعظمی رومان سے انقلاب کی طرف آئے۔ ان کی اس دور کی نظموں میں مروّجہ سیاسی و سماجی نظام کے خلاف غم و غصّے اور نفرت کا برملا اظہار ملتا ہے۔ ان نظموں پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اکثر ناقدین توازن قائم نہیں رکھ سکے ہیں۔ کیفی اور ان کے ہم عصر ترقی پسند شعرا بقول سجاد ظہیر اگر ایک نظام کے خلاف غصّے اور نفرت کا اظہار کرتے ہیں تو ان پر یہ الزام نہیں لگایا جاسکتا کہ وہ شاعری کے باہر قدم رکھتے ہیں۔ غصّہ، نفرت، محبت، یہی تو وہ جذباتی مادّہ ہے جس سے شاعر اپنے خیال کا مجسّمہ لفظی توازن کی شکل میں تیار کرتا ہے۔

درحقیقت کیفی اعظمی کی شاعری کا ایماندارانہ مطالعہ ملک کے سماجی، سیاسی اور معاشی حالات اور دم بدم بدلتی ہوئی زندگی کے وسیع تر پس منظر کے ساتھ ہی کیا جانا چاہیے کہ کیفی خود بھی اپنی شاعری کو الہام یا فوق الفطرت تسلیم نہیں کرتے۔

معیار کا کیفی اعظمی نمبر پیش کرنے کا جواز ہمارے نزدیک یہی ہے کہ یہ ایک نہایت اہم اور ضروری کام تھا جسے سرانجام دیتے ہوئے ہم فخر و مسرت محسوس کر رہے ہیں۔

ترتیب

سمت	ادارہ	۹
یہ بصری پیکر	شاہد ماہلی	۱۳
خود نوشت	کیفی اعظمی	۲۵
میں اور میری شاعری	کیفی اعظمی	۳۳
کیفی اعظمی، میرے ہم سفر	شوکت کیفی	۴۹
کیفی اعظمی، میرے ابا	شبانہ اعظمی	۸۲
کیفی اعظمی، میرا پڑوسی	محمد ایوب واقف	۸۸
کیفی اعظمی، نئی تہہ داری کا شاعر	پروفیسر محمد حسن	۱۱۳
کیفی اعظمی کی تخلیقی فکر کا سفر	پروفیسر قمر رئیس	۱۲۱
کیفی اعظمی	محمد علی صدیقی	۱۴۰
کیفی اعظمی، ایک تاثر	خلیل الرحمٰن اعظمی	۱۴۸
کیفی اعظمی، ایک تاثر	جوگندر پال	۱۵۱
کیفی اعظمی، معاملاتِ جہاں کا شاعر	ڈاکٹر انور سدید	۱۵۵
کیفی کا شعری سفر	ڈاکٹر شارب ردولوی	۱۶۶
کیفی اعظمی کی شاعری کا بنیادی لحن	ڈاکٹر عتیق اللہ	۱۸۴

کیفی اعظمی	علی سردار جعفری	۱۹۸
کیفی صاحب، دو نیم مسکراہٹ کا نام	عزیز قیسی	۲۰۳
کیفی اعظمی، ایک خواب اور	ساگر سرحدی	۲۱۷
کیفی صاحب	بھیشم ساہنی	۲۲۴
کیفی صاحب، چند جھلکیاں	ڈاکٹر حامد اللہ ندوی	۲۳۰
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ	خلش جعفری	۲۴۳
کیفی اعظمی	سہیل عظیم آبادی	۲۶۱
کیفی اعظمی کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	۲۶۶
آوارہ سجدے کی تخلیقی تشکیل	ڈاکٹر سید حامد حسین	۲۷۶
کیفی اعظمی	ڈاکٹر راج بہادر گوڑ	۲۸۶
کیفی اعظمی، شخصیت اور شاعری	اصغر علی انجینئر	۳۰۳
گھاٹ کے پتھر کو ہے انساں کی تلاش	ڈاکٹر آغا رشید مرزا	۳۱۷
کیفی اعظمی، شخصیت اور فن	ڈاکٹر زرینہ ثانی	۳۲۶
کیفی اعظمی، شکست کا تیسرا زاویہ	ڈاکٹر مظفر حنفی	۳۳۶
نوید صبح ہے قلب عوام کی دھڑکن	ڈاکٹر ش۔ اختر	۳۴۸
کیفی اعظمی کی نظم نگاری	ڈاکٹر فصیح ظفر	۳۵۹
کیفی اعظمی کی شاعری	ڈاکٹر خورشید سلمانی	۳۷۱
آخر شب کا ہم سفر	نامی انصاری	۳۷۷
آفاقی شعور کا شاعر	سہیل احمد خان	۳۸۴
میں کیفی پر مضمون کیوں نہیں لکھنا چاہتا	سید محمد مہدی	۳۹۰

کیفی صاحب، جنھیں میں جانتا ہوں	اختر راہی	۴۰۰
کیفی اعظمی : ایک شاعر، ایک مخلص ایک بھائی	ڈاکٹر عبدالقوی دسنوی	۴۱۱
کیفی اعظمی، میرے دوست، میرے رہنما	عبدالجبار	۴۳۳
کیفی اعظمی کی شاعری میں عورت کا تصور	ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی	۴۴۰
کیفی اعظمی کے ابتدائی تخلیقی آئیڈیل	ڈاکٹر نجابت ادیب	۴۵۵
پیش لفظ	سیّد سجاد ظہیر	۴۶۱
فنی روایت	محمد علی صدیقی	۴۶۵
پیش لفظ	فیض احمد فیض	۴۶۹
پیش لفظ	سردار جعفری	۴۷۱
خانہ جنگی : ایک سیاسی مثنوی	پروفیسر گیان چند جین	۴۷۸
اردو کی پہلی سیاسی مثنوی، خانہ جنگی	ڈاکٹر علی احمد فاطمی	۴۸۹
کیفی اعظمی کی فلمی شاعری	سبودھ لال	۵۰۲
کیفی اعظمی کے ساتھ ایک صبح	محمد نعمان	۵۱۲

شاہد ماہلی

یہ بصری پیکر

"معیار" نے اپنے اوّلین شمارے سے ہی شعر و ادب کے ساتھ فنِ مصوری اور فنِ بت گری پر نہ صرف معیاری مضامین شایع کیے ہیں بلکہ ان فنوں کے اعلیٰ نمونے پیش کرنے کی ایک حسین اور شاندار روایت بھی قایم کی ہے۔ جدید ہندوستانی مصوری، جدید فنِ بت سازی اور پھر جدید پاکستانی مصوری کے بعد معیار ۵ میں 'فیض احمد فیض کی نظموں پر صادق کا عمل' یہ سب اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

ممتاز و معروف شاعر اور نقاد صادق گزشتہ کئی برسوں سے فنِ مصوری کے میدان میں بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ وہ تجربہ پسند ذہن رکھتے ہیں۔ ان کی ادبی تخلیقات کی طرح مصوری میں بھی یہ رجحان ملتا ہے لیکن وہ "تجربہ برائے تجربہ" کے قائل نہیں اس لیے اپنی تصویروں میں ضبط توازن کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ برسوں کے فنی ریاض نے ان کی تصویروں کے خطوط میں وہ دلآویزی اور قوت پیدا کر دی ہے جو عام مصوروں سے علاحدہ ان کی اپنی شناخت قائم کرتی ہے۔ فنِ مصوری کے مبصر ہی نہیں بلکہ وہ لوگ بھی جو صادق کی بنائی ہوئی تصویریں دیکھتے آئے ہیں ایک نظر میں ہی تخلیق کار کو پہچان لیتے ہیں۔ خود صادق بھی کہتے ہیں،

کہ میری نظمیں ہوں یا غزلیں، تنقیدیں ہوں یا تصویریں ان سب کے پس پشت بنیادی تخلیقی قوت تو ایک ہی ہے۔"

فیض احمد فیض کے بعد اب کیفی اعظمی کی نظموں کو صادق نے اپنے موقلم کے ذریعے بصری پیکروں میں پیش کیا ہے۔ واضح رہے کہ یہ کیفی کی نظموں کے ILLUSTRATIONS نہیں ہیں۔ ان کی تشریح یا توضیح بھی نہیں، بلکہ نظم کے قالب میں رواں دواں جذبات اور اس کی روح کو دید کے قابل بنا دینے کا مسرت انگیز فنی تجربہ ہے۔ فیض کی نظموں پر صادق کی بنائی ہوئی تصویروں کی نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے بھیشم ساہنی نے بڑی اچھی بات کہی تھی کہ اب تک میں نے فیض کی شاعری پڑھی اور سنی تھی لیکن آج صادق کی مصوری کے روپ میں اسے دیکھ بھی رہا ہوں" ——— کیفی اعظمی کی نظموں کے یہ بصری پیکر دیکھتے ہوئے اب ہم سب بھی ایسی ہی بات کہہ سکتے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ ایک فن (شاعری) کے بطن سے جنم لینے والے اس دوسرے فن (مصوری) کی تخلیقات قارئینِ معیار کی دلچسپی اور کیفی اعظمی نمبر کی وقعت میں اضافے کا باعث ہوں گی۔

عادت

ابنِ مَرْیَمْ
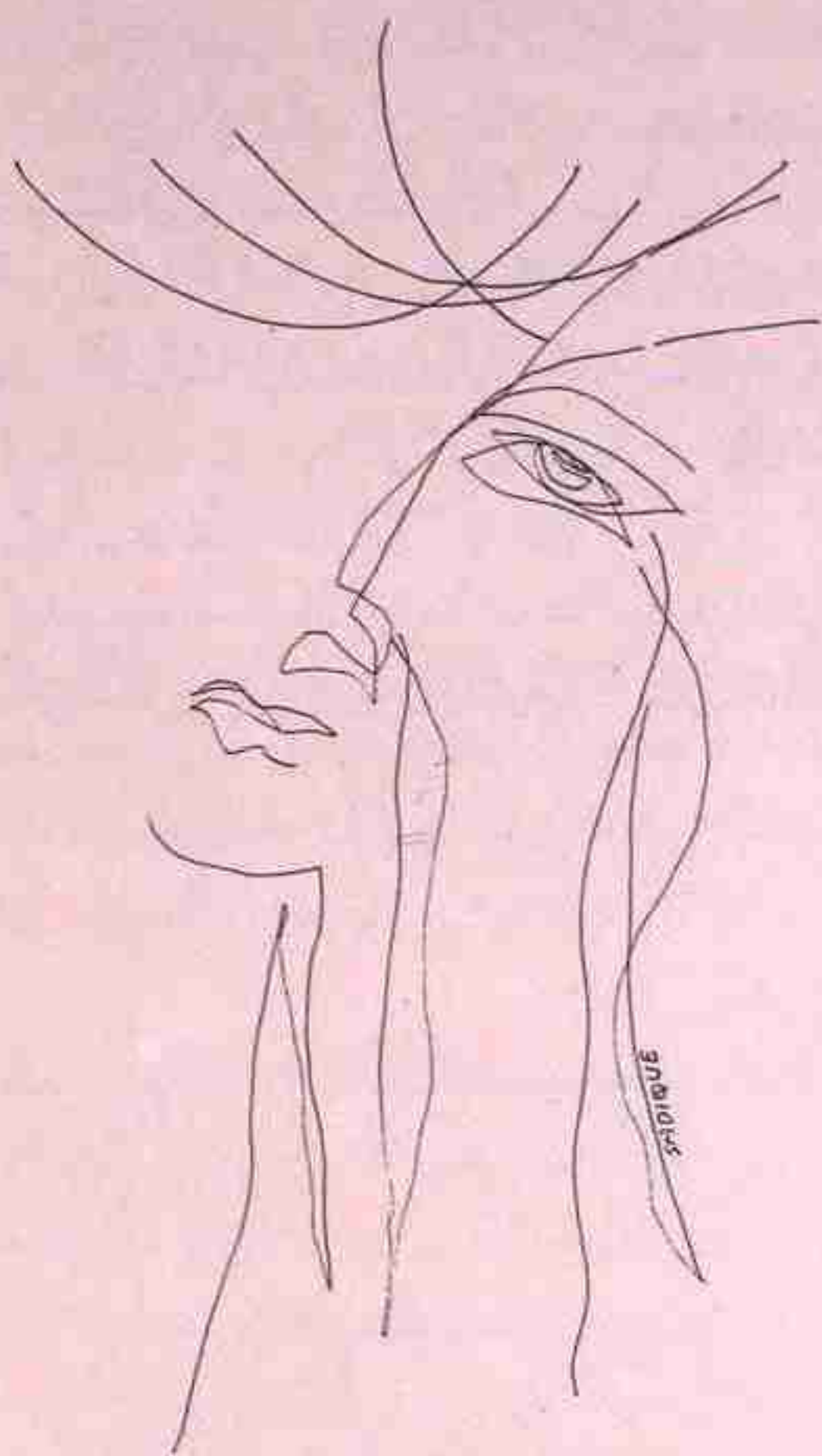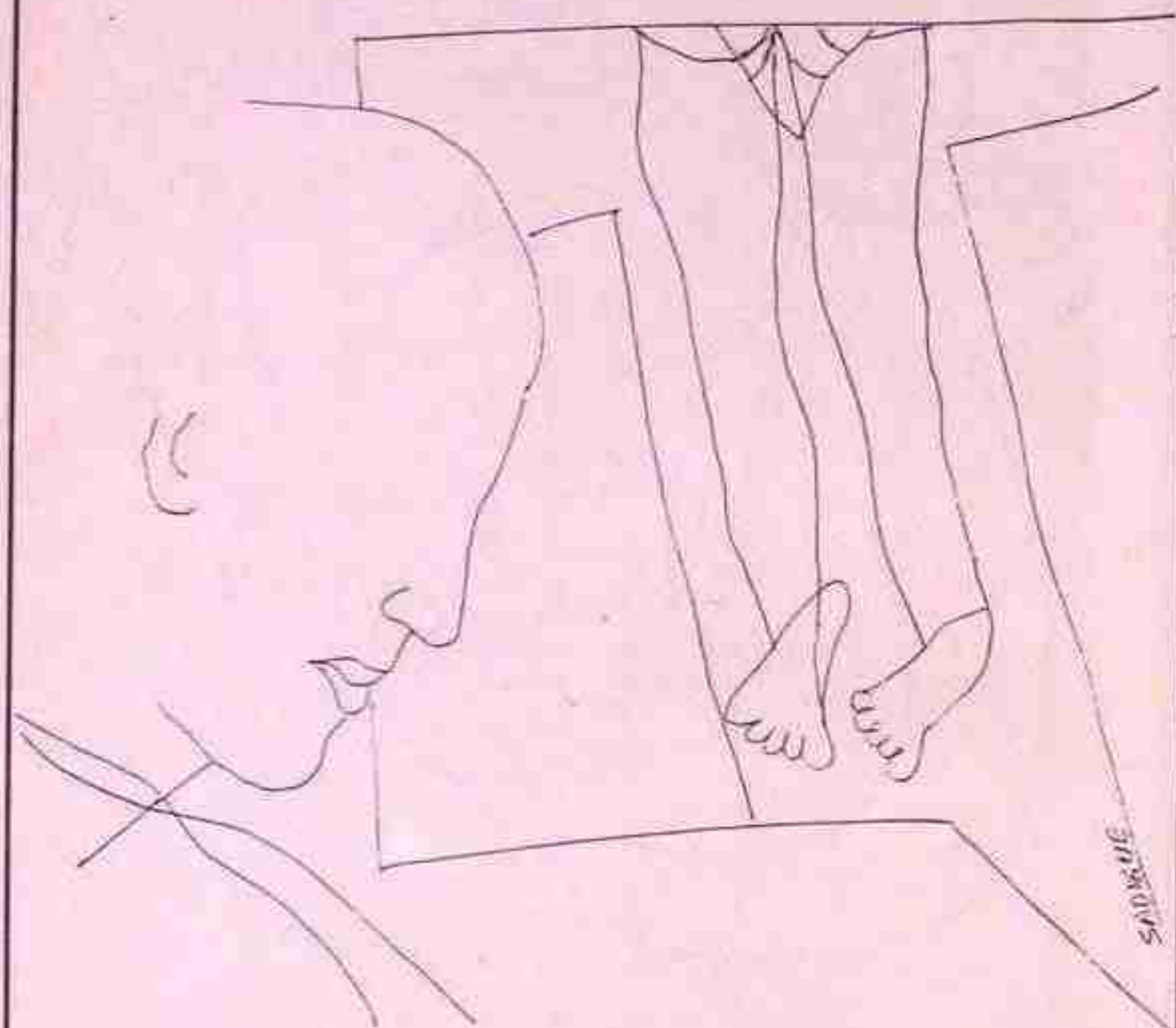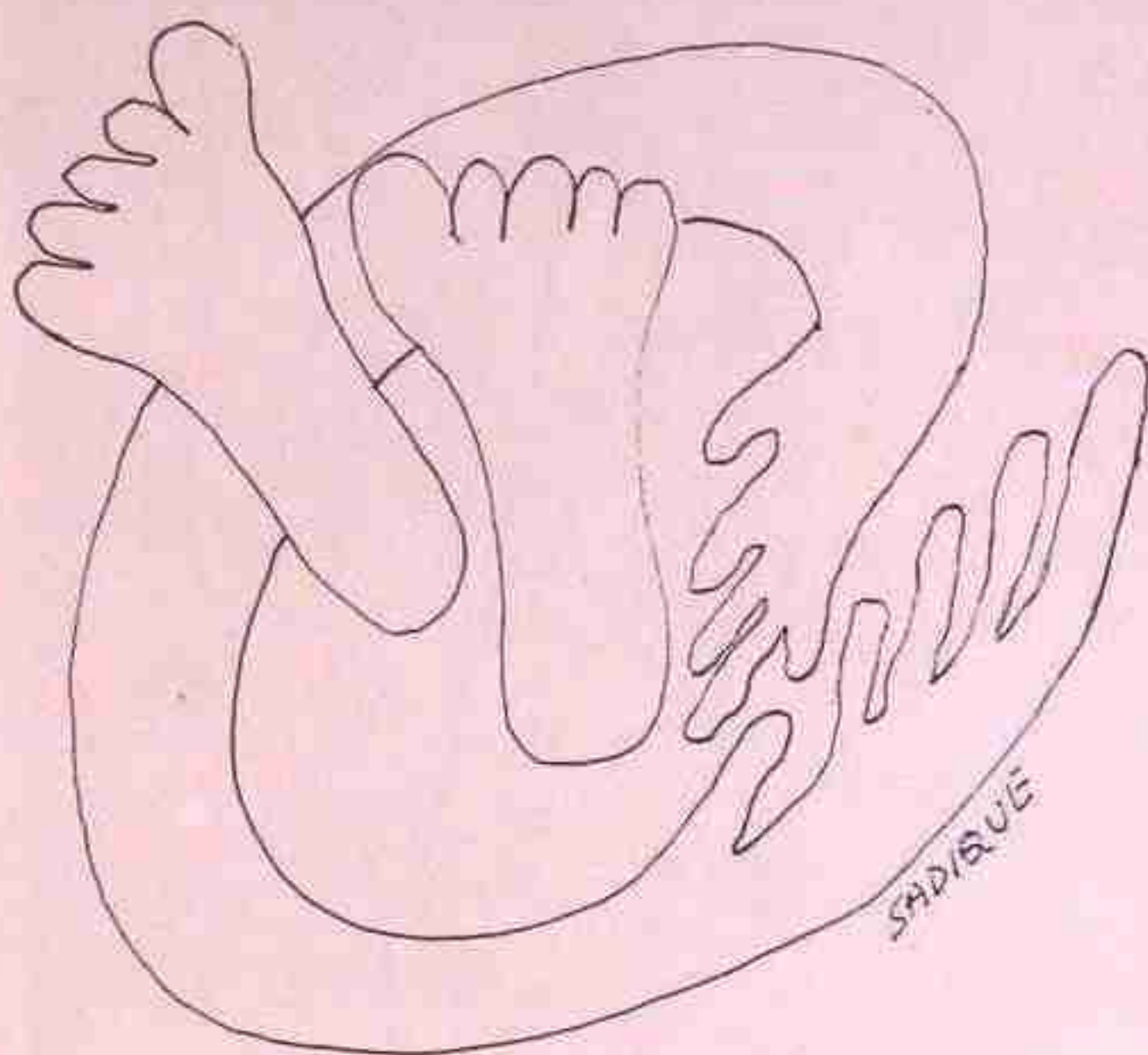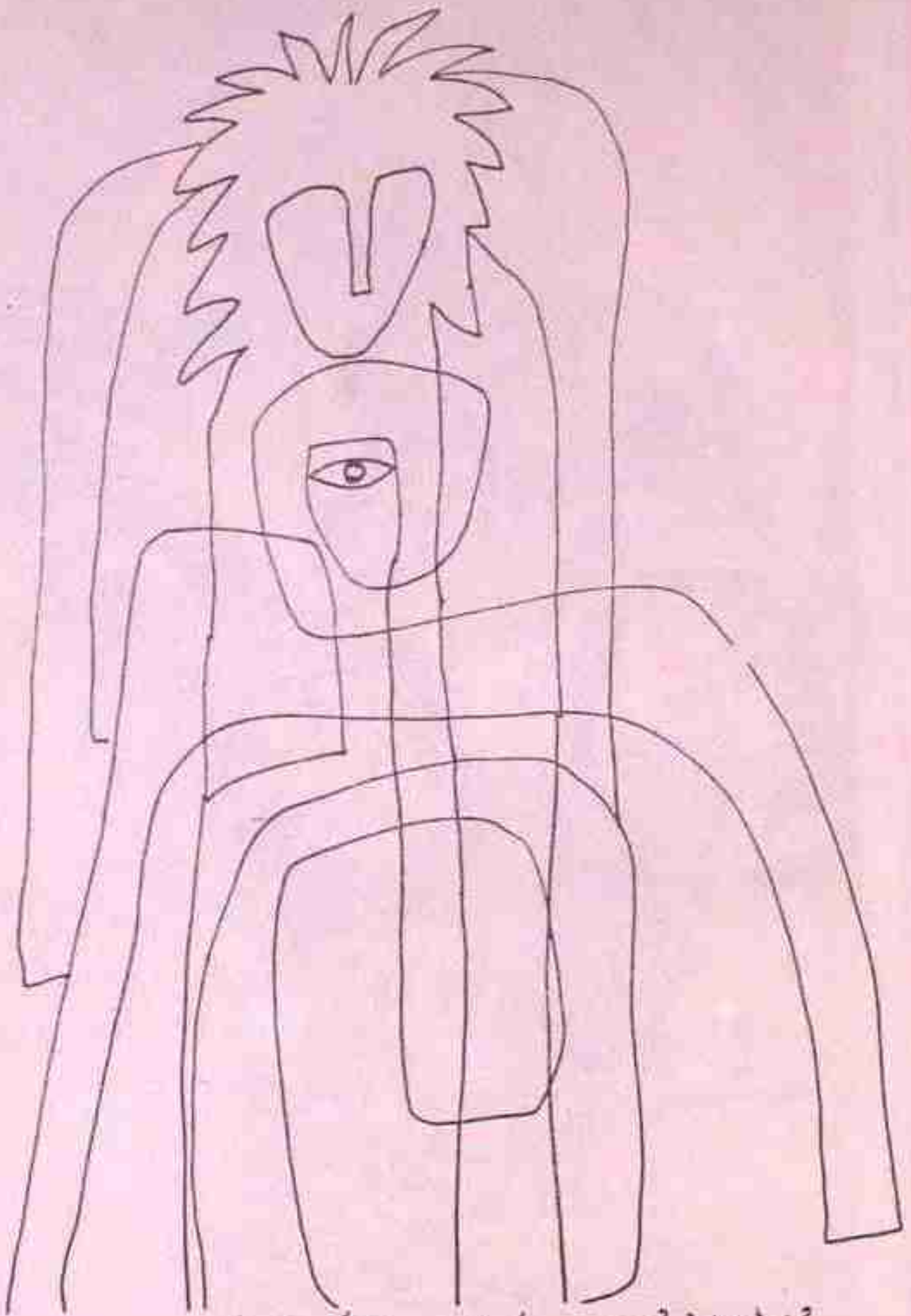
SADIQUE
دائرہ

میرا ماضی میرے کاندھے پر سوار
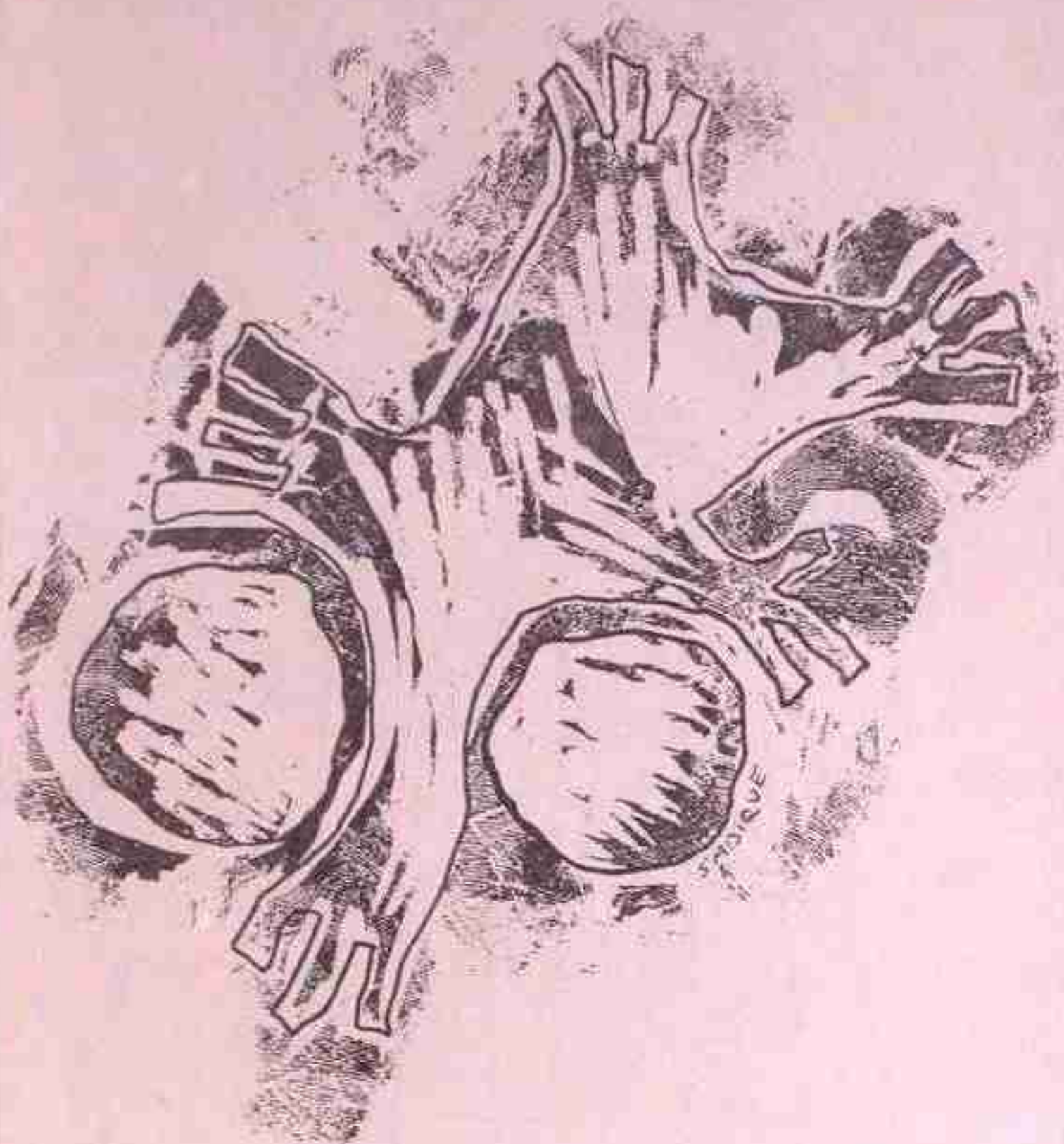
آوارہ سجدے
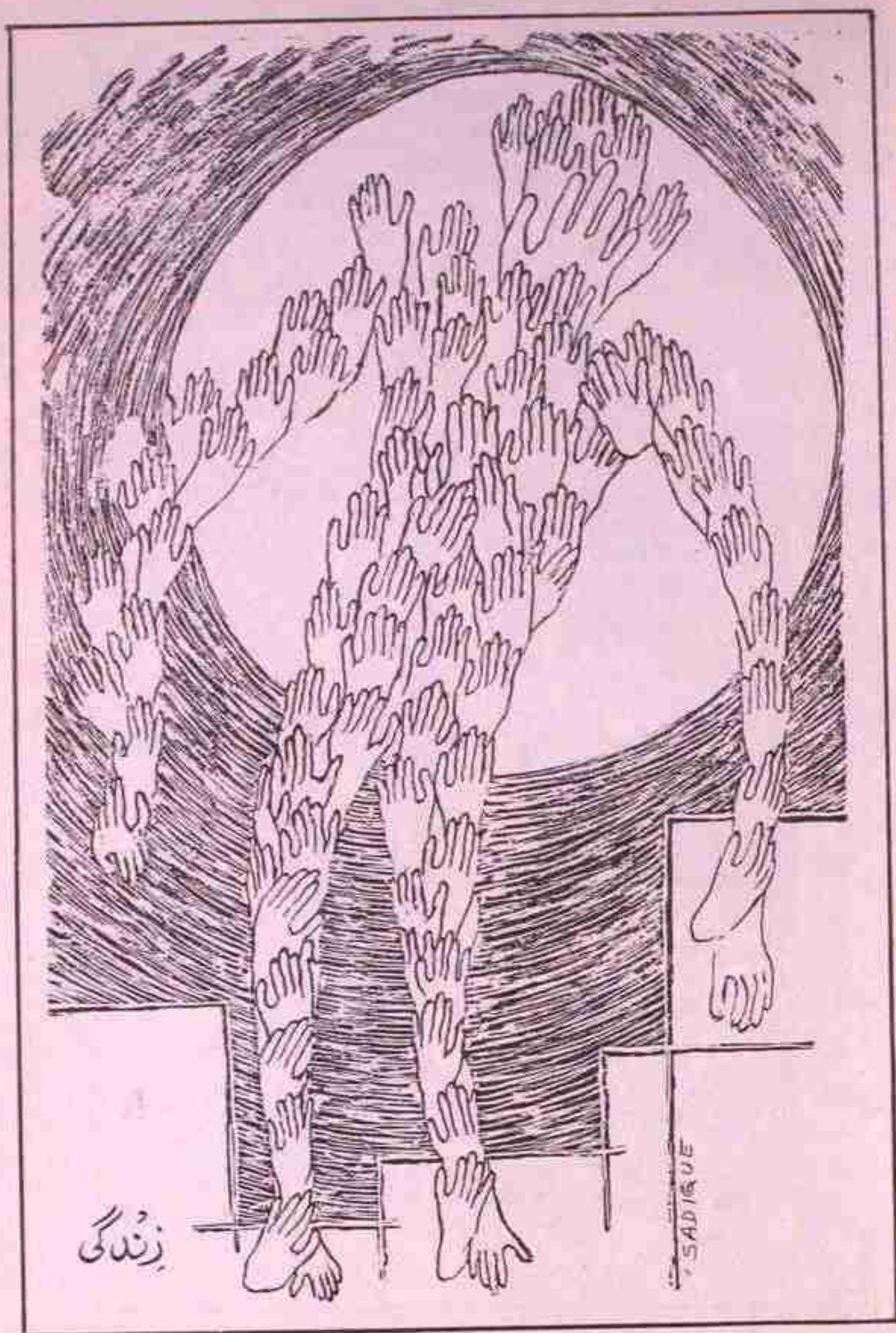
زندگی
SADIQUE
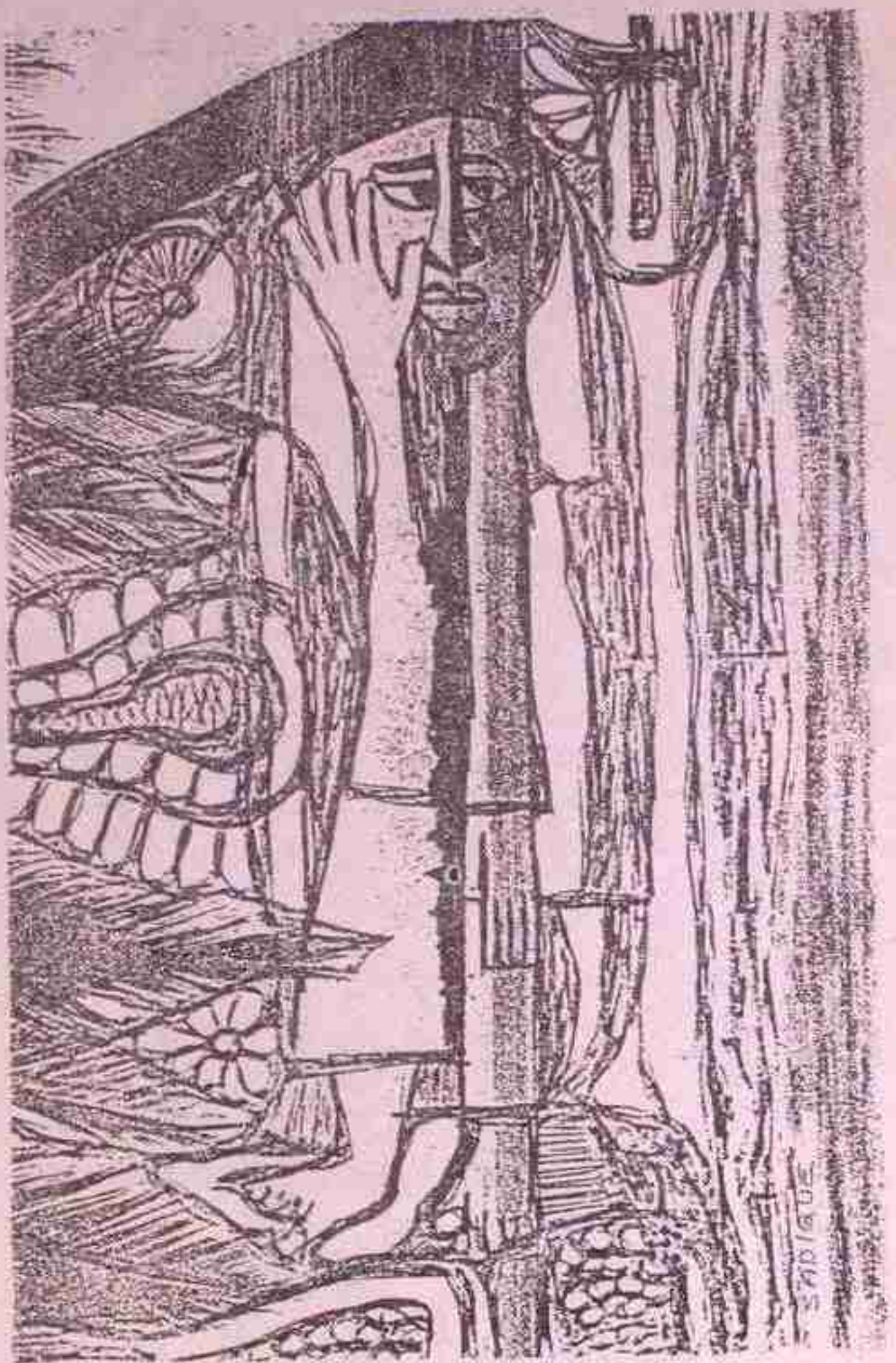
مقتلِ بیروت

بہروپنی
SADEQUAIN

خودنوشت

کیفی

بائیو ڈیٹا

۱۔ تاریخ پیدائش — یاد نہیں

۲۔ تاریخ وفات — معلوم نہیں

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

اپنے بارے میں یقین کے ساتھ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ
میں غلام ہندوستان میں پیدا ہوا آزاد ہندوستان میں
جی رہا ہوں اور سوشلسٹ ہندوستان میں مروں گا

۱۔ پورا نام — سید اطہر حسین رضوی

۲۔ تخلص — کیفی اعظمی

۳۔ والد کا نام — سید فتح حسین مرحوم

۴۔ جائے پیدائش — موضع مجواں ضلع اعظم گڑھ اترپردیش

۵۔ ابتدائی تعلیم — گھر پر ہوئی

۶۔ عربی فارسی اور اردو کی تعلیم اعلیٰ تعلیم لکھنؤ اور الٰہ آباد دونوں جگہ
ہوئی جس کی تفصیل یہ ہے

۷۔ ۱۔ دبیر ماہر (فارسی) لکھنؤ یونیورسٹی
۲۔ دبیر کامل (فارسی) لکھنؤ یونیورسٹی
۳۔ عالم (عربی) لکھنؤ یونیورسٹی

کیفی اور شوکت

والدِ ماجد سید فتح حسین رضوی

والدہ محترمہ کنیز فاطمہ

کیفی اعظمی اپنے بڑے بھائی کے ساتھ

کیفی اعظمی
شبانہ
شوکت
اور
بابا
کے ساتھ
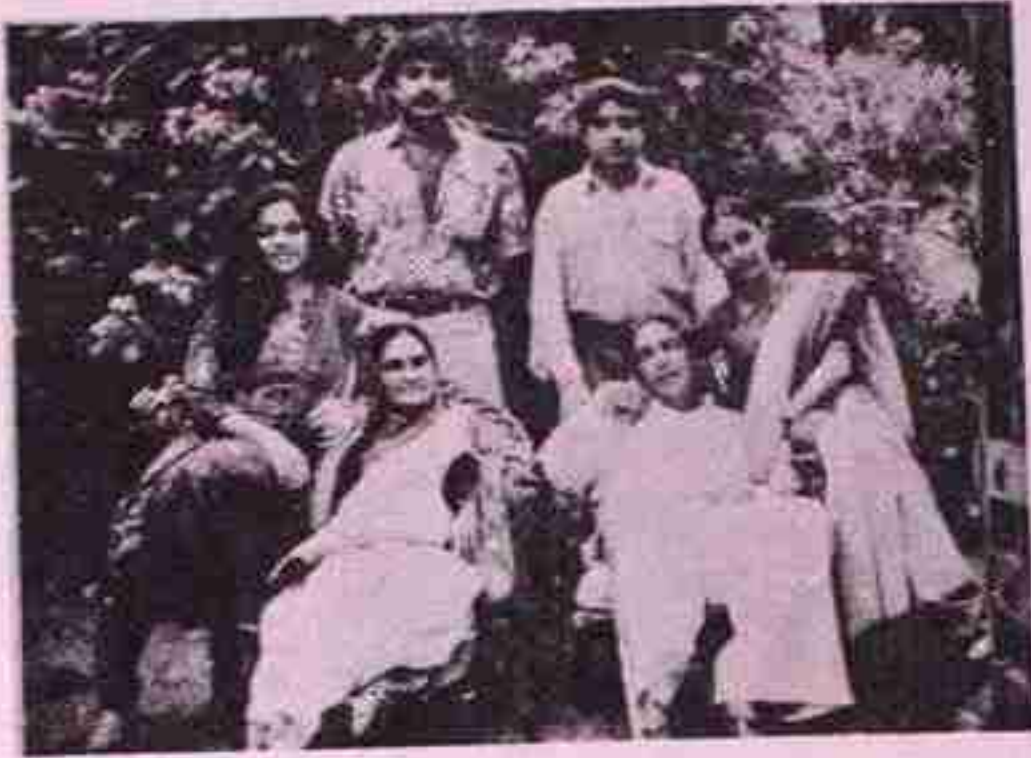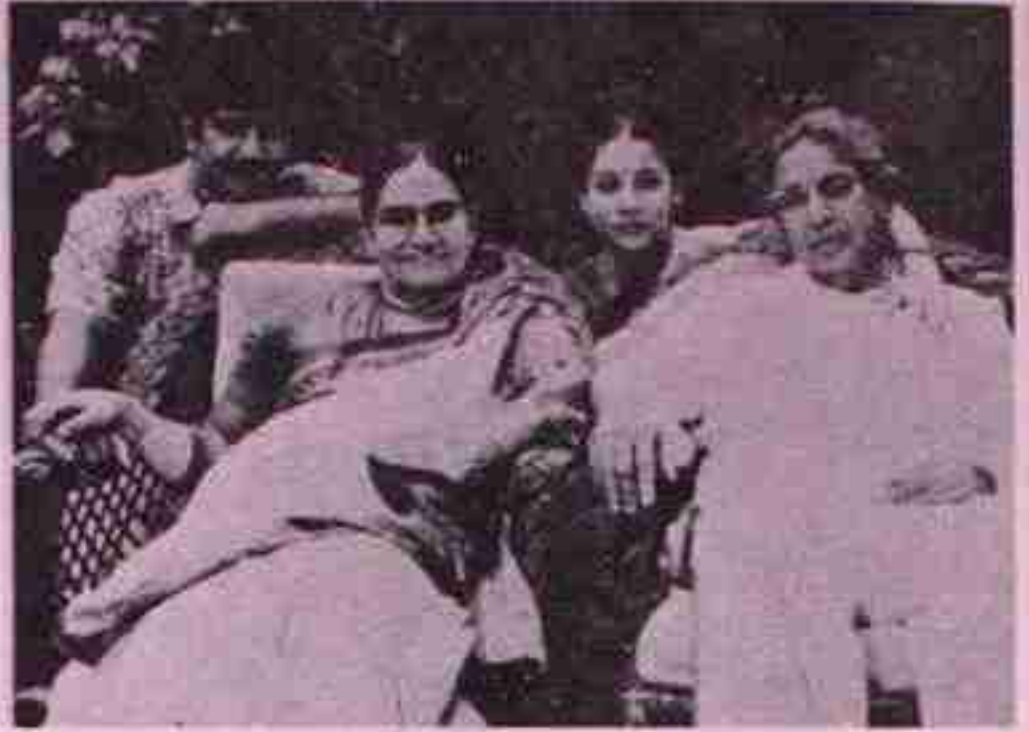
شبانہ ، جاوید
بابا ، تنوی
اور
شوکت کے ساتھ

شبانہ
جاوید
اور
شوکت کے ساتھ

شوکت کے ساتھ

شبانہ کے ساتھ

مشاعرہ میں کلام سناتے ہوئے

سوویت نہرو ایوارڈ لیتے ہوئے

شاہد ماہلی، ڈاکٹر صادق اور مشتاق علی شاہد کے ساتھ ایک گفتگو

کیفی اعظمی اپنے گاؤں اور کھیت میں

عہد سازی

کیفی اعظمی

سرِ سخن

میں اور میری شاعری

میرے

کب پیدا ہوا .... یاد نہیں
کب مروں گا .... معلوم نہیں

اپنے بارے میں یقین کے ساتھ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں محکوم ہندوستان میں پیدا ہوا۔ آزاد ہندوستان میں بوڑھا ہوا اور سوشلسٹ ہندوستان میں مروں گا یہ کسی مجذوب کی بڑ یا دیوانے کا خواب نہیں ہے سوشلزم کے لئے ساری دنیا میں اور خود میرے اپنے ملک میں ایک مدت سے جو عظیم جدوجہد ہو رہی تھی اس سے ہمیشہ جو میرا اور میری شاعری کا تعلق رہا ہے اس یقین نے اسی کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔

میں اُتر پردیش کے ایک مردم خیز ضلع اعظم گڑھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں مجواں میں پیدا ہوا گھر پر کاشتکاری بھی ہوتی تھی چھوٹی موٹی زمینداری بھی تھی۔ میرے والد سید فتح حسین رضوی مرحوم کو قدرت نے ایک ایسی نگاہ عطا کی تھی جو پتھر کے سینے میں تپانِ آرزی کا رقص دیکھ لیا کرتی تھی آج سے ۸۰، ۹۰ برس اُدھر جب میرے سب سے بڑے بھائی پیدا ہوئے تو ابا نے اماں سے کہا ہندوستان میں زمینداری کا کوئی مستقبل نہیں ہے، اگر ہم اس پر تکیہ کئے بیٹھے رہے تو نہ

بچوں کی تعلیم ہو سکے گی نہ تربیت اس لئے میں گاؤں سے نکل کر باہر جاتا ہوں اگر کوئی ڈھنگ کی ملازمت مل گئی تو آپ کو بھی وہیں بلالوں گا اور جہاں تک ممکن ہو گا بچوں کو لکھنؤ میں رکھوں گا تاکہ وہاں ان کی مناسب تعلیم ہو سکے اور زبان بھی نکھر جائے۔ ابا کے اس فیصلے سے خاندان میں کہرام مچ گیا کہ کتنا غلط اقدام ہے اگر اپنا راج پاٹ چھوڑ کے انھوں نے نوکری کر لی تو پورے زمینداروں کی ناک کٹ جائے گی۔ ابا نوکری کا فیصلہ اس لئے کر سکے کہ اس وقت سارے خاندان میں تنہا وہی تعلیم یافتہ تھے، خاندان کی چیخ و پکار پر کان دیے بغیر ابا لکھنؤ چلے گئے خوش قسمتی سے ان کو بہت جلدی اودھ کی ایک مشہور ریاست بلہرہ میں تحصیل داری مل گئی اس کے بعد ابا نے بیوی بچوں کو بھی وہیں بلالیا اور لکھنؤ میں ایک مکان کرایے پر لے کے لڑکوں کو وہاں رکھا، کچھ دنوں کے بعد بڑے بھائی پڑھنے کے لئے علی گڑھ بھیج دیئے گئے ان کے بعد کے دو بھائی لکھنؤ میں رہے ان کی تعلیم وہیں ہوئی، ابتدائی تعلیم سے اعلیٰ تعلیم تک لیکن ابا نے گاؤں سے رشتہ توڑا نہیں اپنے چھوٹے بھائیوں کو روپے بھیجتے رہے۔ کاشتکاری جو پہلے سے ہوتی تھی اس نے اس زمانے میں بہت ترقی کی ابا نے گاؤں میں گھر بنوایا جس کو گاؤں کے عام گھروں کے مقابلے میں حویلی کہہ سکتے ہیں۔ زمیندار ہونے کے باوجود ابا کو اپنی بیٹیوں سے زیادہ پیار تھا لیکن بد قسمتی سے سب سے بڑی باجی کو دق ہو گئی، اس وقت دق نزلے زکام سے زیادہ نہیں، لیکن اُس وقت یہ بیماری کینسر سے کم نہیں سمجھی جاتی تھی۔ ابا نے باجی کا اچھے سے اچھا علاج کرایا اماں ان کو لے کے اس ڈاکٹر کے پاس سے اُس ڈاکٹر کے پاس اس اسپتال سے اُس اسپتال اس شہر سے اُس شہر جاتی رہی لیکن الٹی ہو گئیں کل تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا تین چار سال بیمار رہ کے باجی کا انتقال ہو گیا ان کے بعد تین اور بہنیں یکے بعد دیگرے اسی موذی مرض کا شکار ہوئیں ان کا بھی اسی طرح علاج ہوا میں اس وقت گھر میں سب سے چھوٹا تھا اماں جہاں اپنی کسی بیٹی کو لے کے علاج کے لئے جاتیں مجھے ان کے ساتھ جانا پڑتا اس طرح میں نے اس کچی عمر میں اپنے چاروں طرف بیماریوں اور دکھوں کا ہجوم دیکھا اور میں دھیرے دھیرے غم پسند ہوتا جاتا بد قسمتی سے ان بہنوں کا بھی انتقال ہو گیا چار چار جوان بیٹیوں کی موت سے ابا ہر اعتبار سے بہت کمزور ہو گئے وہ یہ سوچنے اور کہنے لگے کہ ہم نے اپنے سب لڑکوں کو انگریزی پڑھائی ہے،

اس لئے گھر پر یہ ادبار نازل ہوا ہے وہ اماں سے اکثر کہتے کہ جب ہم مریں گے تو کوئی بیٹا فاتحہ بھی نہ پڑھے گا انگریزی اسکولوں میں اُن کو فاتحہ پڑھنا سکھایا ہی نہیں گیا ہے اس لئے والدین نے اپنے طور پر یہ فیصلہ کرلیا کہ مجھے مذہبی تعلیم دلائی جائے اس بات کو نئی نسل کی ایک ترقی پسند افسانہ نگار عائشہ صدیقی نے میرے بارے میں اپنے ایک مضمون میں اس طرح لکھا ہے کہ "کیفی صاحب کو ان کے بزرگوں نے ایک دینی درس گاہ میں اس غرض سے داخل کیا تھا وہاں یہ فاتحہ پڑھنا سیکھ جائیں گے۔ کیفی صاحب اس درس گاہ میں مذہب پر فاتحہ پڑھ کے نکل آئے"۔ اس درس گاہ کی بات یہ ہے کہ والدین نے مجھے مولوی بنانے کے خیال سے میرے لئے انگریزی کی تعلیم کو ممنوع قرار دے دیا۔ چچا مرحوم جو کاشتکاری سنبھالتے تھے وہ مجھے کچھ بھی پڑھانے کے خلاف تھے وہ ابا سے ہمیشہ کہتے کہ آپ نے جن لڑکوں کو صاحب بہادر بنا دیا ہے وہ تو کبھی گاؤں میں اُن کے نہ کھیت کھلیان کے چکر میں پڑیں گے، میں اب کتنے دن جیوں گا اور کتنے دن اتنی بڑی کھیتی کو سنبھالوں گا ایک لڑکے کو تو اس قابل رہنے دیجئے کہ وہ ان چیزوں کو سنبھال سکے۔ لیکن میرا یہ حال تھا کہ بھائی صاحبان جب چھٹیاں گذار کے لکھنؤ جانے لگتے تو میں گھر کے کسی کونے میں رو رو کے اپنا بُرا حال کرلیتا ان حالات میں عمر کا وہ حصّہ جس میں تعلیم شروع ہوجانا چاہئے تھی ضائع ہوگیا، لیکن اچانک قسمت نے یاوری کی۔ فصل کی کٹائی ہو رہی تھی اس کا طریقہ یہ ہے کہ منھ اندھیرے کسان اپنے ہنسیا لے کے آجاتے ہیں اور دوپہر تک بڑے سے بڑا کھیت صاف ہوجاتا ہے اس کا معاوضہ ان کو یہ ملتا ہے کہ وہ جو جیز کاٹتے ہیں اس کی چھوٹی چھوٹی پولیاں بنا کے کھیت میں ایک قطار سے بچھا دیتے ہیں۔ بیس پولیاں زمیندار کی ہوتی ہیں اکیسویں اس کسان کی جو فصل کاٹتا ہے ہمارا سب سے بڑا کھیت جس میں گلے گلے جو آیا تھا وہ کٹ رہا تھا، اتفاق سے چچا کو تحصیل جانا تھا وہ جاتے جاتے مجھے کھیت میں بٹھا گئے اور اچھی طرح سمجھا دیا کہ دھیان رکھنا یہ لوگ بڑے بے ایمان ہوتے ہیں اور حرام خور بھی یہ اکیسویں پولی ہمیشہ بہت بڑی بناتے ہیں ایک ایک پولی میں دو دو تین تین پسیری اناج وہ لے کے چلے جاتے ہیں کسی کو ایسا نہ کرنے دینا خبردار، میں نے ان کو اطمینان دلادیا کہ میں ایک بال کسی کو زیادہ نہ لے جانے دوں گا۔ مطمئن ہو کے چچا تحصیل چلے گئے فصل کٹتی رہی میں نگرانی کرتا رہا گاؤں کی ایک خوبصورت اور جوان لڑکی بھی

فصل کاٹ رہی تھی میں زیادہ تر اسی کے قریب کھڑا رہا دوپہر تک اس کے گورے گورے گالوں سے دھوپ رنگ بن کے ٹپکنے لگی اس کو کچھ اپنے اوپر اعتماد تھا کچھ میری کمزوری بھی وہ سمجھ چکی تھی اس لئے اس نے اپنی پولیاں بہت بڑی بنا رکھی تھی اور جب میں ان کو دیکھنے لگتا تو وہ مسکرانے لگتی ۔ اس نے پولیاں جیسی بنائی تھیں ایسی ہی میں نے اس کو لے جانے دیں، گاؤں کی ایک بوڑھی عورت یہ سب کچھ بڑے غور سے دیکھ رہی تھی اس نے تھوڑا سا اناج چرا رکھا تھا اتنے میں چچا آگئے انھوں نے اس بوڑھیا کو پکڑ لیا اس کو ڈرایا دھمکایا تو اس نے ان سے نمک مرچ لگا کے میری شکایت جڑ دی کہ تو نے ہم سے مٹھی بھر جو چھین لئے تیرے بٹوا نے او کاؤ جون پتریا کی طرح سنگار کر کے کاٹے ای رہی بوجھ کا بوجھ اٹھائے کے او کے سر اپر رکھ دیں، چچا نے میرا کان پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے گھر میں اماں کے پاس لے گئے کہ ان کو بھی وہیں بھیج دیجئے یہ گاؤں میں رہیں گے تو سب کچھ لٹا دیں گے ۔ مجھے مانگی مراد مل گئی، دو چار دن کے بعد اماں نے ماموں کے ساتھ مجھے لکھنؤ بھیج دیا ۔

لکھنؤ میں شیعوں کی سب سے بڑی درس گاہ سلطان المدارس میں میرا نام لکھا دیا گیا اور بورڈنگ میں داخل کر دیا گیا، اس دینی درس گاہ میں پہونچ کے اور بورڈنگ میں رہ کے مجھ پر عرفی کے ایک شعر کی صداقت پوری طرح ظاہر ہوئی ۔

مفتیاں کیں جلوہ بر محراب و ممبر می کنند
چوں بخلوت میروند آں کار دیگر می کنند

میں دیکھتا تھا کہ روز جب انٹرول ہوتا ہے مولانا جو ہمیں پڑھاتے تھے ہمارے درجے کے ایک لڑکے کو جس کے خط و خال دل کش تھے اپنے ساتھ لے کے اپنے کمرے میں چلے جاتے اور اندر سے دروازہ بند ہو جاتا ۔ میں نیا نیا گاؤں سے آیا تھا گاؤں کے لوگوں میں تجسس زیادہ ہوتا ہے میرے دل میں بھی کرید پیدا ہوئی کہ دیکھوں کمرے میں ہوتا کیا ہے ۔ روشندان جو ذرا بلندی پر تھا میں نے اس کے نیچے ایک پیر رکھا اس پر کھڑا ہو کے روشندان سے کمرے میں جھانکنے لگا ۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے مولوی صاحب پلنگ پر دراز ہیں دو تین مولوی صاحبان پلنگ کے قریب کرسیوں پر بیٹھے ہیں لڑکا ہمارے مولوی صاحب کے پلنگ پر بیٹھا ایک چھوٹی سی کتاب پڑھ کے ان کو سنا

رہا ہے تھوڑے وقفے سے مولوی صاحب کہتے لاحول ولا قوۃ اور لڑکے کے گال میں زور سے چٹکی لیتے، باری باری دوسرے مولوی صاحبان بھی یہی حرکت کرتے۔ اس وقت شیعہ مولوی صاحبان اور مولانا عبدالشکور میں بڑے مناظرے ہو رہے تھے میں سمجھا اسی سلسلے کی یہ کوئی کتاب ہوگی ہمارے مولوی صاحب جس کا منھ توڑ جواب لکھیں گے شاید۔

جب کمرہ کھلا اور لڑکا باہر نکلا تو میں نے اس کو پکڑ لیا اور اس سے طرح طرح سے پوچھنا شروع کیا کہ تم کیا پڑھ کے سناتے ہو وہ کچھ گھبرا سا گیا تو مجھے وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کر کے بھاگ کے کمرے میں گیا اور کتاب لا کے مجھے دکھائی یہ مختصر افسانوں کا ایک مختصر سا مجموعہ انگارے تھا جس پر یو پی سرکار نے پابندی لگا رکھی تھی، ترقی پسند ادب سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔

سلطان المدارس جس دن قائم ہوا تھا اسی دن اس کے سارے قاعدے قانون بن گئے تھے اس میں حالات کے مطابق پھر کسی ترمیم و تنسیخ کو حرام سمجھا گیا تھا میں نے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کے طالب علموں کی ایک انجمن بنائی اور انجمن کی طرف سے طالب علموں کے کچھ مطالبے مرتب کر کے سلطان المدارس کے ارباب حل و عقد کے سامنے پیش کئے اس کا جواب ہم کو یہ ملا کہ یہ انجمن ہماری مخالفت میں بنائی گئی ہے ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے اس لئے انجمن کو فوراً توڑ دو ورنہ۔۔۔ انجمن بن چکی تھی۔ اس کو توڑنے کا تو کوئی سوال تھا ہی نہیں ہم نے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو نوٹس دیا کہ اگر فوراً ہماری انجمن کو تسلیم نہ کیا گیا تو ہم اسٹرائیک کر دیں گے اور ہوا یہی کہ ہم کو کچھ ہی دنوں کے بعد اسٹرائیک کرنا پڑی اسٹرائیک میں تمام طالب علم شریک ہوئے اور کچھ دنوں کے بعد دفتر کا عملہ اور کچھ استاد بھی ہمارے ساتھ آگئے اسٹرائیک کی اس وسعت سے ارباب اقتدار بوکھلا گئے انھوں نے نوٹس دیا کہ سلطان المدارس بند کیا جاتا ہے اور بورڈنگ بھی بند کیا جاتا ہے۔ تم لوگ کمرے چھوڑ دو اور اپنے اپنے گاؤں چلے جاؤ جب سلطان المدارس کھلے گا تم لوگ بلا لئے جاؤ گے ہم لوگوں نے اس نوٹس کا کوئی نوٹس نہیں لیا کمروں میں بھی ڈٹے رہے اور اپنے مطالبات پر بھی ڈٹے رہے ایک رات حسین آباد کے کارندے موٹے موٹے ڈنڈے لے کے آئے انھوں نے ہمارا سامان کمروں سے نکال نکال کے باہر پھینک دیا اور ہماری اچھی خاصی پٹائی بھی کی ہم بھی اہنساوادی نہیں تھے ہم نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا اور بورڈنگ پر قبضہ کئے بیٹھے رہے اس رات تک میری شاعری

شروع ہو چکی تھی شاعری کی ابتدا ایک روایتی غزل سے ہوئی تھی لیکن اس اسٹرائیک کے دوران غزل کی مستانگی چھوٹ گئی اور میں احتجاجی شاعری کرنے لگا قریب قریب روز ایک نظم کہہ لیتا لڑکوں کو سناتا اور ان میں جوش پیدا کرتا پٹائی کے بعد دوسرے دن سلطان المدارس کے شمالی پھاٹک پر میٹنگ ہو رہی تھی لڑکے کچھ زمین پر بیٹھے تھے کچھ کھڑے تھے میں ان کے درمیان کھڑا ایک نظم سنا رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ ایک نہایت وجیہ بزرگ تانگے پر بیٹھے ہماری طرف آرہے ہیں میں گھبرایا کہ حضرت آکے ابھی ہم کو سمجھانا شروع کریں گے کہ تم لوگ یہ کیا کر رہے ہو اس سے ہمارا اتنا بڑا تعلیمی ادارہ بدنام ہو رہا ہے وغیرہ وغیرہ گھبراہٹ میں وہ نظم میں اور جوش سے پڑھنے لگا قریب آکے وہ بزرگ تانگے سے اتر پڑے اور میٹنگ میں شامل ہو گئے نظم ختم ہوئی تو انھوں نے مجھ سے نظم مانگی میں نے دے دی ایک سرسری نظر ڈال کے انھوں نے نظم جیب میں رکھ لی اور مجھ سے کہا تم اور تم جن کو چاہو اپنے ساتھ لے لو اور میرے ساتھ میرے گھر چلو میں نے گنواروں کی طرح پوچھ لیا آپ ہیں کون بزرگ انھوں نے فرمایا مجھے علی عباس حسینی کہتے ہیں، علی عباس حسینی اردو والوں میں پریم چند کے بعد دوسرا بڑا نام میں سر جھکا کے ان کے پیچھے ہولیا وہ گولہ گنج میں رہتے تھے گھر پہونچ کے حسینی صاحب نے نوکر کو چائے بنانے کا حکم دیا اور اپنے صاحبزادے سے کہا جاؤ دیکھو احتشام صاحب یونیورسٹی سے آگئے ہیں آگئے ہوں تو بلا لاؤ احتشام صاحب قریب ہی بارود خانے میں رہتے تھے احتشام صاحب آئے تو ان کے ساتھ اعظم حسین صاحب بھی آگئے جو روزنامہ سرفراز کے اڈیٹر تھے حسینی صاحب نے نہایت زوردار لفظوں میں ہماری وکالت کی اور مجھ سے اصرار کیا کہ میں اپنی وہی نظم سناؤں میں نے نظم سنائی نظم اعظم صاحب نے لے لی کہ وہ اس کو سرفراز میں شائع کریں گے اور ہماری حمایت میں اداریہ بھی لکھیں گے احتشام صاحب مجھے آل انڈیا اسٹوڈنس فیڈریشن کے دفتر لے گئے وہاں انھوں نے مجھے علی سردار جعفری صاحب سے ملایا یہ اسٹوڈنس فیڈریشن کے جنرل سکریٹری تھے یا صدر، اعظم صاحب نے ہماری تائید میں زبردست اداریہ لکھا، جعفری صاحب ہماری میٹنگوں میں آنے لگے اب ہمارے ایجی ٹیشن میں توانائی پیدا ہو گئی حسین آباد وقف کے متولیوں نے ہماری مانگیں مان لیں اور تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد ہماری اسٹرائیک ختم ہوئی لیکن میں اور میرے چند اور ساتھی سلطان المدارس سے نکال دیئے گئے مولوی بننے کا خیال تو میں ترک کر ہی چکا تھا لیکن تعلیم جاری رکھی اور پرائیویٹ امتحانات دے کے

اردو، فارسی اور عربی کی چند اسناد حاصل کیں جن کی تفصیل یہ ہے:

۱ - دبیر ماہر (فارسی) ۲ - دبیر کامل (فارسی) ۳ - عالم (عربی)	لکھنؤ یونیورسٹی
۴ - اعلیٰ قابل (اردو) ۵ - منشی (فارسی) ۶ - منشی کامل (فارسی)	الہ آباد یونیورسٹی

سوچا یہ تھا کہ یہ امتحانات پاس کر کے کسی کالج میں براہِ راست ایف۔ اے میں داخلہ لے لوں گا اور انگریزی پڑھوں گا لیکن جب تک سیاست اور شاعری دونوں کا جنون بہت ترقی کر چکا تھا آگے تعلیم حاصل کرنے کے لئے جس نظم وضبط کی ضرورت تھی میرا لاابالی پن اس کو جھیل نہیں سکا اور تعلیم ادھوری رہ گئی۔

شاعری تو ایک طرح سے مجھے ورثے میں ملی تھی میرے والد باقاعدہ شاعر تو نہیں تھے لیکن ان کا شاعری کا ذوق بہت بلند تھا گھر میں اردو، فارسی کے دیوان بڑی تعداد میں تھے۔ میں نے یہ کتابیں اس عمر میں پڑھیں جب ان کا بہت کم حصہ سمجھ میں آتا تھا مجھ سے بڑے تینوں بھائی باقاعدہ شاعر تھے یعنی صاحب بیاض بھی تھے اور صاحب تخلص بھی سب سے بڑے بھائی سید ظفر حسین مرحوم کا تخلص مجروحؔ تھا۔ ان سے چھوٹے بھائی سید یوسف حسین کا تخلص بیتابؔ تھا۔ ان سے چھوٹے بھائی سید بشیر حسین کا تخلص وفاؔ تھا۔

بھائی صاحبان جب چھٹیوں میں علی گڑھ اور لکھنؤ سے گھر آتے تھے تو گھر پر اکثر شعری محفلیں منعقد ہوتی تھیں جن میں بھائی صاحبان کے علاوہ قرب وجوار کے شعراء شریک ہوتے بھائی صاحبان جب ابا کو اپنا تازہ کلام سناتے اور ابا سے داد پاتے تو مجھے بہت رشک ہوتا اور میں بڑی حسرت سے اپنے سے سوال کرتا کیا میں بھی کبھی شعر کہہ سکوں گا لیکن میں جب بھائیوں کے شعر سننے کے لئے کھڑا ہو جاتا یا چپ چاپ کہیں بیٹھ جاتا تو فوراً کسی بزرگ کی ڈانٹ پڑتی

کہ تم یہاں کیوں بیٹھے ہو تمہاری سمجھ میں کیا آئے گا گھر میں جاؤ اور پان بنوا کے لاؤ میں زمین پر پاؤں پٹکتا تقریباً روتا ہوا گھر میں باجی کے پاس جاتا کہ دیکھئے میرے ساتھ یہ ہوا میں ایک دن ان سب سے بڑا شاعر بن کے دکھا دوں گا باجی مسکرا کے کہتیں کیوں نہیں تم ضرور کبھی بڑے شاعر بنو گے ابھی تو یہ پان لے جاؤ اور باہر دے آؤ اسی عمر میں ایک واقعہ یہ ہے کہ ابا بہرائچ میں تھے۔ قزلباش اسٹیٹ کے مختارِ عام یا پتہ نہیں کیا وہاں ایک مشاعرہ منعقد ہوا اس وقت زیادہ تر مشاعرے طرحی ہوا کرتے تھے اسی طرح کا ایک مشاعرہ تھا بھائی صاحبان لکھنؤ سے آئے تھے۔

بہرائچ، گونڈہ، نانپارہ اور قریب دور کے بہت سے شعرا مدعو تھے مشاعرے کے صدر مانی جائسی صاحب تھے ان کے شعر سننے کا ایک خاص طریقہ تھا کہ وہ شعر سننے کے لئے اپنی جگہ پر اکڑوں بیٹھ جاتے اور اپنا سر اپنے دونوں گھٹنوں سے دبا لیتے اور جھوم جھوم کے شعر سنتے اور داد دیتے۔ اس وقت شعرا حسب مراتب بٹھائے جاتے ایک چھوٹی سی چوکی پر قیمتی قالین بچھا ہوتا اور گاؤ تکیہ لگا ہوتا صدر اسی چوکی پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھتا جس شاعر کی باری آتی وہ اسی چوکی پر آ کے ایک طرف نہایت ادب سے دو زانو ہو کے بیٹھتا، مجھے موقع ملا تو میں بھی اسی طرح ادب سے چوکی پر ایک کونے میں دو زانو بیٹھ کے اپنی غزل جو طرح میں تھی سنانے لگا طرح تھی مہرباں ہوتا رازداں ہوتا وغیرہ میں نے ایک شعر پڑھا ؂

وہ سب کی سن رہے ہیں سب کو دادِ شوق دیتے ہیں
کہیں ایسے میں میرا قصۂ غم بھی بیاں ہوتا

مانی صاحب کو نہ جانے شعر اتنا کیوں پسند آیا کہ انھوں نے خوش ہو کے بیٹھ ٹھونکنے کے لئے پیٹھ پر ایک ہاتھ مارا تو میں چوکی سے زمیں پر آ رہا مانی صاحب کا منھ گھٹنوں میں چھپا ہوا تھا اس لئے انھوں نے دیکھا نہیں کہ کیا ہوا جھوم جھوم کے داد دیتے اور شعر مکرر مکرر مجھ سے پڑھواتے رہے اور میں زمین پر پڑا پڑا شعر دوہراتا رہا، یہ پہلا مشاعرہ تھا جس میں شاعر کی حیثیت سے میں شریک ہوا۔ اس مشاعرے میں مجھے جتنی داد ملی اس کی یاد سے اب تک کوفت ہوتی ہے۔ بزرگوں نے اس طرح میرا دل بڑھایا کہ واہ میاں واہ ماشاء اللہ آپ کا حافظہ بہت اچھا ہے کسی نے کہا زندہ رہو میاں کس اعتماد سے غزل سنائی ہے ہر آدمی یہ سمجھ رہا اور کسی نہ کسی طرح ظاہر

کرر ہا تھا کہ مجھے میرے کسی بھائی نے غزل لکھ کے دے دی ہے جو میں نے اپنے نام سے پڑھی ہے خیر ان بزرگوں کی ان خوش فہمیوں کی میں نے زیادہ پروا نہیں کی لیکن جب ابا نے بھی کوئی اس طرح کی بات کی تو میرا دل ٹوٹ گیا اور میں رونے لگا میرے بڑے بھائی شبیر حسین وفا جو ابا بیٹوں میں جن کو سب سے زیادہ چاہتے تھے انھوں نے ابا سے کہا انھوں نے جو غزل پڑھی ہے وہ انھیں کی ہے شک دور کرنے کے لئے کیوں نہ ان کا امتحان لے لیا جائے اس وقت ابا کے منشی حضرت شوق بہرائچی تھے جو مزاحیہ شاعر تھے انھوں نے اس تجویز کی تائید کی مجھ سے پوچھا گیا امتحان دینے کے لئے تیار ہو میں خوشی سے اس کے لئے تیار ہو گیا شوق صاحب نے مصرعہ دیا "اتنا ہنسو کہ آنکھ سے آنسو نکل پڑے"، بھائی صاحب نے کہا ان کے لئے یہ زمین بنجر بات ہو گی کوئی ایسی شگفتہ سی طرح تجویز کیجئے لیکن میرا اس وقت کا ایگو آج جسے اکثر تلاش کرتا ہوں میں نے کہا اگر میں غزل کہوں گا تو اسی زمین میں ورنہ امتحان نہیں دوں گا طے پایا کہ اسی طرح میں طبع آزمائی کروں میں اسی جگہ لوگوں سے ذرا الگ ہو کے دیوار کی طرف منھ کر کے بیٹھ گیا اور تھوڑی دیر میں تین چار شعر ہو گئے آج ان شعروں کو دیکھتا ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ان میں میرا کیا ہے پوری غزل میں وہی باتیں جو اساتذہ کہہ چکے تھے اس زمانے کا زیادہ کلام ضائع ہو گیا لیکن وہ پہلی غزل اس لئے زندہ رہ گئی کہ نہ جانے کہاں سے وہ بیگم اختر تک پہونچ گئی اس میں انھوں نے اپنی آواز کے پنکھ لگا دیئے اور وہ سارے ہندوستان، پاکستان میں مشہور ہو گئی لیجئے وہ غزل آپ بھی سن لیجئے یہ میری زندگی کی پہلی غزل ہے جو میں نے ۱۱ برس کی عمر میں کہی تھی۔

غزل

اتنا تو زندگی میں کسی کی خلل پڑے
ہنسنے سے ہو سکون نہ رونے سے کل پڑے

جس طرح ہنس رہا ہوں میں پی پی کے گرم اشک
یوں دوسرا ہنسے تو کلیجہ نکل پڑے

اک تم کہ تم کو فکرِ نشیب و فراز ہے
اک ہم کہ چل پڑے تو بہر حال چل پڑے

ساقی سبھی کو ہے غم تشنہ لبی مگر
مے ہے اسی کی نام پہ جس کے ابل پڑے
مدت کے بعد اس نے جو کی لطف کی نگاہ
میں خوش تو ہو گیا مگر آنسو نکل پڑے

اب اس غزل کو آپ پسند کریں یا نہ کریں خود میں بھی اب ایسی غزل نہیں کہہ سکتا لیکن اس کی یہ افادیت ضرور ہے کہ اس نے لوگوں کا شک دور کر دیا اور سب نے یہ مان لیا کہ میں نے جو کچھ اپنے نام سے مشاعرے میں سنایا تھا وہ میرا ہی کہا ہوا تھا مانگے کا اجالا نہیں تھا، بہرائچ میں یہ غزل کہنے اور مشاعرے میں سنانے کے بعد جب لکھنؤ آیا تو سب نے یہ سمجھایا کہ اگر سنجیدگی سے شاعری کرنا چاہتے ہو تو کسی استاد کا دامن پکڑ لو کوئی بے استاد شاعر نہیں ہو سکتا ممکن ہے گونڈے بہرائچ میں ہو جائے لیکن یہ لکھنؤ ہے اس زمانے میں وہاں دو استادوں کا سکہ چل رہا تھا حضرت آرزو لکھنوی اور مولانا صفی میں آرزو صاحب کے مقابلے میں صفی صاحب کو زیادہ پسند کرتا تھا ہمت کر کے ان کے دولت خانے پر پہونچ گیا وہ مولوی گنج میں رہتے تھے، میں نے اطلاع بھجوائی صفی صاحب کا بڑا پن ملاحظہ فرمائیے کہ انھوں نے بلا لیا وہ ایک کھری چارپائی پر لنگی باندھے اور بنیائن پہنے بیٹھے تھے میں پہونچا تو سر اٹھا کے میری طرف دیکھا اور آنے کی وجہ پوچھی میں نے عرض کیا میں آپ سے اصلاح لینا چاہتا ہوں انھوں نے ایک بار پھر مجھے غور سے دیکھا اور پوچھا کچھ کہا ہے میں نے یہی غزل سنائی مولانا صفی نے ہر ایک شعر پر سر ہلایا اور ہر شعر مکرر پڑھوایا اور داد دی ظاہر ہے کہ میرے لئے یہ بہت تھا پھر انھوں نے پوچھا تمھاری عمر کیا ہے میں نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کے اپنا قد اونچا کر کے کہا ۱۱ برس یہ سن کے وہ مسکرائے، انھوں نے کہا میری شاعری کی عمر اس وقت ۶۵ برس کی ہے اگر تمھارے کلام میں زبان اور بیان کی کوئی خامی ہو تو میں اسے ضرور ٹھیک کر سکتا ہوں لیکن ایسا کرنے میں تمھاری فکر کی گرمی بھی چلی جائے گی ۱۱ برس کے سینے میں جو حدت ہوتی ہے وہ ۶۵ برس کے سینے میں نہیں ہو سکتی تم ایک خاص عقیدت سے میرے پاس اصلاح کے لئے آئے ہو لیکن اصلاح کے بعد جب جاؤ گے تو کڑھتے ہوئے جاؤ گے کہ میری غزل خراب کر دی۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اگر واہ واہ سے گمراہ نہ ہو تو لکھتے رہو

اور پڑھتے رہو شعر کی خامیاں خشک پتوں کی طرح گرتی جائیں گی اور خوبیاں نئی کونپلوں کی طرح پھوٹتی رہیں گی اسی مشورے کی روشنی میں میں نے اپنا ادبی سفر شروع کیا جو ابھی تک جاری ہے اب تک میری نظموں اور غزلوں کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

۱ ۔ جھنکار

۲ ۔ آخرِ شب

۳ ۔ آوارہ سجدے

۴ ۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ (دوسرا اجلاس)

آوارہ سجدے کی پذیرائی مختلف حلقوں میں مختلف ڈھنگ سے ہوئی، دلّی میں کوئی انوؔر دہلوی صاحب ہیں انھوں نے اور شاہی امام نے آوارہ سجدے کے خلاف جہاد چھیڑ دیا کتاب ضبط کرنے اور مجھے جیل میں ڈالنے کا مطالبہ شروع ہو گیا رہبر دکھن اور سیاست جدید کانپور نے بھی اپنی سخن فہمی کا بے شرمی کے ساتھ مظاہرہ کیا اتر پردیش اردو اکاڈمی نے اس کو اس سال کی سب سے بہتر کتاب گردانا اور اپنا پہلا اوارڈ دیا اسی کتاب پر مجھے سویت لینڈ نہرو ایوارڈ بھی ملا، اوارہ سجدے پر مجھے ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ بھی ملا جو میرے لئے ایک بڑا اعزاز ہے، بہار اتر اردو اکادمی نے بھی ایک خصوصی ایوارڈ دیا میری مجموعی ادبی خدمات پر مجھے لوٹس ایوارڈ بھی ملا یہ ایوارڈ افرو ایشن رائٹرز کمیٹی کی بین الاقوامی جیوری دیتی ہے، میں نے اب تک یہ احتیاط کی تھی کہ جو نظم کسی ایک کتاب میں آجائے وہ دوسرے مجموعے میں شامل نہ کی جائے اس سے یہ نقصان ہوا کہ بعض اہم نظمیں اہلِ نظر تک نہیں پہونچ سکیں اس لئے سرمایہ میں جھنکار، آخرِ شب اور آوارہ سجدے کی زیادہ تر نظمیں جمع کر دی گئی ہیں لیکن یہ کلیات نہیں ہے اب بھی میری بہت سی نظمیں اور غزلیں ادھر اُدھر بکھری ہوئی مل جائیں گی ان کو تلاش کر کے اس مجموعے میں شامل کر دیتا تو اس کی ضخامت ضرور بڑھ جاتی لیکن شاید قدر و قیمت میں کوئی اضافہ نہ ہوتا۔

اس مجموعے کی اشاعت پر مجھے جن احباب کا شکریہ ادا کرنا ہے ان میں

۱۔ ایک ہمالیاتی شخصیت مقبول فدا حسین کی ہے جنھوں نے اس مجموعے کا سرورق بنایا اور میرا چہرہ بھی جس کو دیکھ کے پہلی مرتبہ مجھ کو میرے خط و خال اچھے لگے۔

۲۔ ڈاکٹر صادق نے اس مجموعے کی تزئین میں بہت حصہ لیا میں ان کا شکرگذار ہوں۔ ڈاکٹر صادق سے جب جب ملا ہوں میں نے زیر لب یہ مصرع دہرایا ہے۔ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری ان کی مشہور کتاب ترقی پسند افسانہ پڑھ کے ترقی پسندی پر میرا عقیدہ اور مضبوط ہو گیا۔

۳۔ اس کتاب کی تزئین میں سلیمہ ہاشمی کا بھی حصہ ہے ان کا شکریہ تو نہیں ادا کرتا ہوں ہاں ڈھیروں پیار بھیجتا ہوں۔

۴۔ جیسی یہ کتاب ہے ایسی کتاب کے لئے احباب بہت دنوں سے تقاضا کر رہے تھے لیکن تین چار مجموعوں کی نظموں اور غزلوں کو نقل کرنے کے لئے کسی فرہاد کی ضرورت تھی، جو بے ستوں کاٹ کے جوئے شیر لا سکے یہ فرہاد مجھے اپنے ہی گاؤں کے پڑوس یعنی سرائے میر میں مل گیا یہ ہیں نوجوان ہوشیار شاعر رشید انصاری سلمہٗ جن کی داڑھی دیکھ کے میں ہمیشہ اس الجھن میں پڑ جاتا ہوں کہ وہ اصلی ہے یا ڈگ ہے بہت سی دعاؤں کے ساتھ ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

کتاب کا نام

۵۔ میں نے اور میری بیوی نے اپنی ملی جلی کوشش سے صرف دو بچے پیدا کئے، بچے پیدا کر لئے لیکن نام رکھنے کی صلاحیت مجھ میں تھی نہ میری بیوی میں۔ بیٹی تقریباً ۱۱ برس کی ہو گئی تھی تب تک ہم میاں بیوی اس کو صرف مُنّی کہتے رہے۔ ایک دن سردار جعفری صاحب نے ہم دونوں کو ڈانٹا کہ یہ منّی منّی کیا کرتے رہتے ہو کوئی ڈھنگ کا نام رکھو شوکت نے جعفری صاحب سے کہا آپ ہی کوئی نام تجویز کیجئے۔ جعفری صاحب نے بہت سے نام تجویز کئے ان میں سے ہم سب نے شبانہ پسند کیا اور اس طرح منّی شبانہ بن گئی۔ اس کے بعد ہم میاں بیوی بیٹے کے نام کے لیے پریشان ہوئے اُس کی آپا اس کو بابا کہتی تھی ہم بھی یہی کہتے تھے۔ ایک دن میرے ایک نوجوان دوست مسعود صدیقی جو عربی کے پروفیسر تھے اور اس وقت سعودیہ میں عربی پڑھا رہے ہیں انھوں نے بابا کو احمر اعظمی بنا دیا، ہم نے اس کے بعد پھر کوئی بچہ پیدا ہی نہیں کیا کہ پھر نام رکھنا

پڑے گا۔ اتنی ہی پریشانی اس کتاب کے نام کی بھی چونکہ مجھے اپنی صلاحیتوں کا تجربہ تھا اس لئے میں نے ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے دوستوں ادیبوں سے فرمائش کر رکھی تھی کہ میری نئی کتاب کے لئے کوئی نام تجویز کر دیجئے۔ میری یہ مشکل میرے نوجوان دوست اور ساتھی حسن کمال نے آسان کر دی اور کہا کہ اس مجموعے کا نام سرمایہ ہونا چاہئے۔ میں حسن کمال کا شکر گذار ہوں۔

۱۔ آخر میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں جس کا شکریہ سب سے پہلے ادا کرنا چاہئے تھا یہ حوصلہ مند نوجوان ہیں برادرم شاہد ماہلی جو خود ایک خوش فکر شاعر بھی ہیں اور خوش مذاق ناشر بھی اور میرے ہم وطن بھی، میں ان کا شکریہ سب کے بعد ادا کر رہا ہوں اس کی تلافی ایسے ہو سکتی ہے کہ آپ ان صفحات کو یہاں سے پڑھنا شروع کیجئے۔

پس سخن

میں نے شاعری کیوں شروع کی شاعر کیسے بنا (اگر آپ مجھے شاعر سمجھتے ہیں) اس کی تحقیق کے لئے کسی محقق کی ضرورت نہیں۔ میں نے جس گھر میں جنم لیا اس میں شاعری رچی بسی ہوئی تھی لیکن سیاست سے دلچسپی کیسے پیدا ہوئی اس کو سمجھنا اور سمجھانا میرے لئے بھی مشکل ہے میں جس گاؤں میں پیدا ہوا اور ابتدائی زندگی جہاں گذری وہاں باہر کی ہوا بھی مشکل سے آتی تھی۔ شہروں میں کیا ہو رہا ہے، کانگریس کیا کر رہی ہے مسلم لیگ کیا کر رہی ہے اس کا ذکر بھی وہاں نہیں آتا تھا، بزرگوں سے میں نے سنا ہے کہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے نیل کی کاشت شروع کروائی تو ہمارے گاؤں میں بھی نیل کے بیج آئے اور کارندوں کی زبانی پیغام بھی آیا کہ جو گیہوں بونا چھوڑ دو نیل کی کھیتی شروع کرو تو کمپنی بہادر تم کو مالا مال کر دے گی میرے دادا مرحوم نے جب یہ سنا تو انھوں نے رازدارانہ طور پر گاؤں والوں کو سمجھایا کہ دیکھو کمپنی ہمارے کاریگروں کے انگوٹھے کاٹ کر ہماری صنعت اور تجارت کو ٹھکانے لگا چکی ہے اب کھیتی باڑی کو بھی تباہ کرنا چاہتی ہے اس لئے چپکے چپکے ان بیجوں کو بونے سے پہلے بھون ڈالو بھنے ہوئے بیج اُگ نہیں سکتے اور جب وہ اُگیں گے نہیں تو کمپنی یہ سمجھے گی کہ اس گاؤں کی زمین نیل کی کھیتی کے لئے مناسب نہیں اور ہم کو اس مصیبت سے نجات مل جائے گی دادا مرحوم نے خود یہی کیا اور ان کے مشورے

پر کچھ اور لوگوں نے ایسا ہی کیا جب نیل کے بیج اُگے نہیں تو کمپنی یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئی کہ اس گاؤں کی زمین اچھی نہیں ہے لیکن کچھ دنوں میں یہ بات سب کو معلوم ہو گئی کہ کسانوں نے نیل کے بیج میر عطا حسین کے کہنے پر بھون ڈالے تھے دادا مرحوم پر مقدمہ چلا جائداد ضبط ہوئی لیکن اس کے بعد کمپنی نے ہمارے گاؤں کے لوگوں کو نیل بونے پر مجبور نہیں کیا دادا مرحوم نے کمپنی کے خلاف نفرت کا جو بیج نیل کے کھیتوں میں بویا تھا وہ ایک دن میرے سینے میں پھوٹا اور پھولا پھلا۔ میری عمر کوئی ۹-۱۰ برس کی ہو گی جب میں نے سنا کہ ہماری تحصیل میں ایک گورا کلکٹر آرہا ہے جس نے اعظم گڑھ کے زمینداروں کو بہت ستایا ہے جو بندوبست ہو جائے بہت نفرت کرتا ہے میں نے اپنی ہی عمر کے لڑکوں کو جمع کیا بہنوں کو کالے دوپٹے چرا کے پھاڑے اور کالے جھنڈے بنائے اور چوری چوری تحصیل پہونچ گئے کہ جب وہ بندر آئے گا تو ہم اس کو کالے جھنڈے دکھائیں گے کلکٹر بہت دیر میں آیا تھانے دار جو ابا کے پاس اکثر آتا تھا اس نے ہم کو دیکھ لیا اور مجھے پکڑ کے ابا کے پاس لایا ابا کسی غیر کے سامنے ہم کو کبھی نہ ڈانٹتے تھے نہ مارتے تھے لیکن انھوں نے ہم کو سمجھایا بہت کہ اب ایسا نہ کرنا انھیں دنوں کی بات ہے کہ ہم جنگل میں گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے میں نے دیکھا کہ ایک ببول کے درخت میں کہیں ایک چٹکی روئی اُڑ کے آئی اور کانٹوں میں پھنس گئی ہے میں نے انگلیوں کو کانٹوں سے بچاتے ہوئے وہ روئی نکال لی اب میں اور میرے ساتھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہے اور سوچ رہے تھے کہ ببول میں روئی کہاں سے آگئی کچھ دور پر آم کے ایک سایہ دار درخت کے نیچے ہمارے گاؤں کا ایک بزرگ آدمی زمین پر کمبل بچھائے لیٹا سو رہا تھا، میں روئی لئے اس کے پاس پہونچا اور روئی دکھا کے اس سے پوچھا کہ چاچا ببول کے پیڑ میں روئی کہاں سے آگئی وہ اٹھ بیٹھا اور اُس نے ہم کو سمجھایا کہ بابو جب سے مہاتما گاندھی نے چرخہ کاتنا شروع کیا ہے بھگوان بھی ہر جگہ روئی پیدا کرنے لگا ہے میں سر کھجانے اور سوچنے لگا کہ ان کو کیسے معلوم ہوا کہ گاندھی جی چرخہ کاتتے ہیں، اس وقت کا ہندوستان ایسا ہی تھا لیکن میرے گھر پر سیاست کا سایہ نہیں پڑا ایک بات جس پر مجھے فخر ہے اور جو قابلِ ذکر بھی ہے کہ میرے گھر پر کبھی فرقہ پرستی کا بھوت نہیں منڈلایا بھائی صاحبان جب چھٹیوں میں آتے تو اُن کے ساتھ کانگریس اور مسلم لیگ کی خبریں بھی آتیں، کبھی کھانے پر بات چھائے پر گاندھی جی اور ان کی بکری

کی بات چھڑتی یا یہ کہانی کہ جواہر لال نہرو کے کپڑے پیرس سے دھل کے آتے ہیں، مجھے ان باتوں میں دلچسپی تو بہت تھی لیکن کوئی روشنی نہیں ملتی تھی جب لکھنؤ آیا وہاں سوراج کا اندولن بہت زوروں پر چل رہا تھا، میں پربھات پھیریوں میں شامل ہو گیا منہ اندھیرے کسی پربھات پھیری میں میں شامل ہوتا اور نظمیں پڑھتا اس مجموعے میں جھنکار کی جو نظمیں ہیں مثلاً "اٹھو دیکھو وہ آندھی آرہی ہے" یہ ایک پربھات پھیری کے لئے میں نے کہی اور اسی میں پڑھی تھی، شہر میں ستیہ گرہ بھی ہو رہی تھی بدیشی کپڑے دوکان سے نکال نکال کے جلائے جا رہے تھے۔ امین آباد میں کپڑوں کی ایک بہت بڑی دوکان تھی اس میں سے بدیشی کپڑوں کے تھان نکال کے سڑک پر جلائے جا رہے تھے میں بھی اس دلچسپ کام میں شریک ہو گیا تھوڑی دیر میں پولیس آگئی اور ہم سب پکڑے گئے میں بھی جب ایک حولدار نے میرا بازو پکڑ کے مجھے اپنی لاری میں بٹھایا تو میں نے دیکھا کہ میرے محلے کا ایک لڑکا کچھ دور سائیکل روکے کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا ہے میں نے پکار کے اس سے کہا میرے گھر میں بتا دینا کہ میں جیل جا رہا ہوں اس وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں گاندھی جی اور جواہر لال کی صف میں شامل ہو گیا نشہ اس وقت اُترا — جب عالم باغ پہونچ کے لاری رکی اور پولیس نے مجھے اور میری عمر کے کچھ اور لڑکوں کو اتار کے ہلکی سی ہماری کیننگ کی اور چھوڑ دیا بس اب گھر بھاگ جاؤ، میرا دل ٹوٹ گیا میں سیدھا امین آباد کانگریس کے دفتر میں پہونچا اور میں نے پولیس کی شکایت کی کہ مجھے پولیس جیل نہیں لے گئی اب میں اپنے گھر جا کے کیا بتاؤں گا ایک بزرگ لیڈر نے مجھے بہت تسلی دی کہ ابھی تم بہت کم سن ہو لیکن جیل جانے کا اتنا شوق ہے تو کام کرتے رہو کسی دن جیل چلے ہی جاؤ گے میں آنسو بھرے ہوئے گھر لوٹ آیا اور سوچنے لگا کہ ایسا کام کرنا چاہئے کہ ضرور ہی جیل جاؤں۔
ہمارے گروپ میں ایک بنگالی نوجوان بھی تھا اس نے ہم کو بم بنانے کا نسخہ دیا، ہم نے بم بنایا اور طے کیا کہ وزیر گنج تھانے پر ہم بم پھینکیں گے جس کے انسپکٹر نے ہم کو چھوڑ دیا خیریت یہ ہوئی کہ جب بم تیار ہو گیا تو مجھے یہ فکر ہوئی کہ تھانے پر پھینکنے سے پہلے یہ معلوم کر لینا چاہئے کہ بم بنا بھی ہے یا نہیں ہم لوگ گومتی کے کنارے شمشان گھاٹ کی طرف گئے اور وہاں سناٹے میں ہم نے بم کی آزمائش کی تو معلوم ہوا کہ وہ انار بن گیا (آتش بازی والا) میں نے اپنے بنگالی دوست کو

خوب گالیاں دیں مار پیٹ بھی ہوئی اور اس کو اپنے گروپ سے نکال دیا۔
بہت دنوں تک اسی طرح بھٹکتا رہا۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اس وقت ایک ایسا رومانک حادثہ ہوا کہ میں لکھنؤ چھوڑ کے کانپور چلا گیا وہاں مزدور سبھا کے کارکنوں کا ساتھ ہوا وہ چوری چوری مجھے کمیونسٹ پارٹی کا لٹریچر دینے لگے اب مجھے وہ راستہ مل گیا جس پر میں نے زندگی کا اتنا لمبا سفر طے کیا ہے اور باوجود مفلوج ہو جانے کے اب تک اسی راستے پر چل رہا ہوں ایک دن اسی راستے پر گروں گا اور سفر ختم ہو جائے گا منزل پر یا منزل کے قریب۔

کیفی اعظمی

۷ نومبر ۱۹۸۹

(زیر طبع مجموعۂ کلام 'سرمایہ' سے)

شوکت کیفی

کیفی اعظمی: میرے ہم سفر

اعظم گڈھ یوپی کے ایک چھوٹے سے گاؤں مجواں میں زمیندار مسلم شیعہ گھرانے میں پیدا ہونے والے لڑکے کا نام اطہر حسین رضوی رکھا گیا، باپ کا نام فتح حسین اور ماں کا نام کنیز فاطمہ تھا۔

اطہر حسین بچپن ہی سے انتہائی حساس طبیعت واقع ہوا تھا ان کی باجی کا کہنا تھا کہ اطہر نے بچپن سے ہی عید میں نئے کپڑے اس لئے نہیں پہنے کہ کسان بچوں کے پاس نئے کپڑے نہیں ہوتے تھے۔

ہمیشہ اپنے چھوٹے بھائی بہن کی شرارتوں کا خمیازہ بھگتا، شرارت چھوٹا بھائی کرتا اور الزام اطہر پر آجاتا اور وہ بے چارہ بغیر قصور کئے ابا سے پٹتا اور منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلتا کہ ابا میرا قصور نہیں بچھن کا ہے۔

کوئی مہمان گھر میں آجاتا اور جب اس کے جانے کا وقت آتا تو یہی بچہ گھر کے ایک کونے میں چپ چاپ کھڑا روتا رہتا اور قمیص کے دامن سے اپنے آنسو پوچھتا رہتا۔

چھ سات سال کی عمر میں ایک بار اکّہ پر گاؤں جاتے ہوئے اس کا BALENCE OUT ہوگیا (توازن بگڑ گیا) اور وہ اکّہ کے ساتھ لٹکتا ہوا ایک میل چلا گیا۔ لیکن اس کے منہ سے ایک چیخ بھی نہ نکلی۔ جب پیچھے سے آتے ہوئے ایک شخص نے دیکھا تب وہ چلایا اور اکّہ رکا اور اس بچے کی جان بچی پیٹ اور ٹانگیں بالکل چھل چکی تھیں۔

اطہر کی ماں کا یہ حکم تھا کہ جب اطہر کھانا کھانے بیٹھیں تو ضرور کوئی نہ کوئی بہن اس کے پاس رہے تاکہ وہ بھوکے نہ اٹھ جائیں۔

بڑی بہن واجدہ کا یہ بھائی بہت چہیتا تھا، چھ سال کی عمر ہی سے بڑی باجی رات کو سوتے وقت اپنے پاس لٹا لیتیں اور میر انیس کے مرثیے سنایا کرتیں۔

گھر میں شعر و شاعری کا ماحول رہتا ابا اچھی غزل یا نظم کہنے والے بیٹے کو کوئی نہ کوئی بڑھیا سا انعام دیا کرتے تھے ان شعر کہنے والے بھائیوں میں اطہر شامل نہیں تھے، ان کا کام تھا اندر سے چاء اور پان لاکر مہمانوں کو پیش کرنا اور بھاگ بھاگ کر ان کی خاطر مدارات کرنا۔

اس وقت اطہر کی عمر گیارہ سال کی تھی مردانے سے زنان خانے اور زنانخانے سے مردانے میں دوڑتا ہوا یہ بچہ آہستہ آہستہ شعر بھی کہتا جاتا۔

ایک دن جب مشاعرہ شروع ہوا تو اس نے اپنے بڑے بھائی کے کان میں چپکے سے کہا کہ میں بھی اپنی ایک غزل پڑھنا چاہتا ہوں بھائی ذرا متعجب ہوئے پھر ابا سے اجازت دلوادی جب اس بچے نے اپنی غزل سنائی تو محفل سے اسے داد ملی (جس میں ابا بھی شامل تھے) "واہ واہ بڑی ہمت کی اتنے لوگوں میں غزل پڑھ دینا بھی بڑی ہمت کا کام ہے"

پھر ابا نے شبیر بھیا کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا (جس کا مطلب تھا کیا تم نے کہہ کر دی ہے)

حساس بچہ سمجھ گیا اور اپنے آنسو چھپانے کے لئے بھاگ کر زنانخانے میں آگیا جہاں تخت پر بیٹھی واجدہ باجی پان لگا رہی تھیں۔

گھر میں اس کا صرف ایک ہی دوست تھا اور وہ تھیں واجدہ باجی، واجدہ باجی کے آگے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، روتے روتے اس نے کہا "دیکھئے باجی میں ایک دن ہندستان کا مشہور شاعر ہوں گا، اور اس سے مجھے کوئی طاقت نہیں روک سکتی، اس وقت تو ابا سمجھے ہیں کہ میری غزل شبیر بھیا نے کہہ کر دی ہے۔"

واجدہ باجی کو اپنے ننھے بھائی پر پیار آگیا اور گلے لگا کر بولیں "بائیں مرد ہو کر روتے

ہو ، چلو آنسو پونچھو اگر تم چاہو گے تو ضرور بڑے آدمی بنو گے ، اب جاؤ یہ پان باہر دے آؤ۔"
اور پھر ایک دن وہ بھی آیا کہ ایک مصرعہ طرح دیا گیا جس میں غزل کہنی تھی۔
تمام بھائی بغلیں جھانکنے لگے اور اس لڑکے نے دو تین گھنٹوں میں یہ غزل کہہ ڈالی۔
غزل کا مصرعہ طرح تھا۔ "اتنا ہنسو کہ آنکھ سے آنسو نکل پڑے" اطہر کیفی نے یہ غزل کہی۔

اتنا تو زندگی میں کسی کی خلل پڑے
ہنسنے سے ہو سکون نہ رونے سے کل پڑے
جس طرح ہنس رہا ہوں میں پی پی کے اشک غم
یوں دوسرا ہنسے تو کلیجہ نکل پڑے
مدت کے بعد اس نے جو کی لطف کی نگاہ
جی خوش تو ہو گیا مگر آنسو نکل پڑے

اس غزل نے پورا مشاعرہ لوٹ لیا۔ ابا دنگ رہ گئے فوراً ایک بار کرپن، ایک سرج کی شیروانی کے ساتھ ایک عدد تخلص بھی دیا "کیفی" جو بعد میں کیفی اعظمی بنا۔
اور پھر ابا نے عربی فارسی کی تعلیم کے لئے لکھنؤ بھیج دیا مولویوں کی صحبت کیفی نہیں جھیل سکے۔ دینی تعلیم سے ان کا جی اکھڑ گیا اور بمشکل تمام اپنی تعلیم ختم کی۔
بچپن سے ہی حساس طبیعت ہونے کی وجہ سے لوگوں کی مصیبتوں، پریشانیوں، بھوک، افلاس سے بہت متاثر ہوتے تھے۔

اس وقت روس میں انقلاب آچکا تھا اور ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی اس کی تائید کر رہی تھی، کیفی کمیونسٹ پارٹی کا اخبار "قومی جنگ" بہت شوق سے پڑھا کرتے تھے جو مزدوروں اور کسانوں کی حمایت کرتا تھا۔

کیفی چپکے چپکے روس کی حمایت میں نظمیں لکھ کر "قومی جنگ" کو بھیجنے لگے لیکن نظم پر نہ تو نام ہوتا تھا اور نہ ہی پتہ، اس کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری تھے پی سی، جوشی، سجاد ظہیر اور سردار جعفری پارٹی کے اہم لیڈروں میں سے تھے۔ یہ لوگ نظمیں دیکھتے اور حیران ہو جاتے کہ "یا اللہ اتنی خوبصورت نظمیں لکھنے والا شخص آخر

اپنا نام اور پتہ کیوں نہیں لکھتا کون ہے وہ" پھر سوچتے کہ شاید سرکاری ملازم ہے نام لکھتے ہوئے گھبراتا ہے۔

اور پھر لکھنؤ میں کیفی کی کھوج شروع ہوئی اور آخر ایک دن ایک مشاعرے میں سردار جعفری نے کیفی کو ڈھونڈ ہی لیا۔ سجاد ظہیر نے کیفی سے بمبئی چلنے کی فرمائش کی اور کیفی فوراً تیار ہو گئے، گھر میں ایک کھلبلی مچ گئی "دہریوں کے ساتھ رہو گے نہ ان کا کوئی مذہب نہ ایمان تباہ ہو جاؤ گے" لیکن یہ ضدی بچہ اپنی بات پر اڑا رہا اور سردار بھائی اور بنے بھائی کے ساتھ بمبئی آگیا۔ یہاں پی۔سی۔جوشی اور پارٹی نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور یہ پارٹی کے ہول ٹائم ممبر ہو گئے یہ ۱۹۴۳ء کی بات ہے۔

یہاں سے کیفی مشہور ہونا شروع ہوئے۔ پارٹی نے کیفی کی نظموں کا پہلا مجموعہ "جھنکار" چھاپا جو ہاتھوں ہاتھ بک گیا، پھر ہندو مسلم فسادات پر چھوٹا سا کتابچہ "خانہ جنگی" چھپا۔ اب یہ ہندوستان کے تمام شہروں میں مشاعروں میں مدعو کئے جاتے اور خوب داد پاتے۔ اس زمانے میں ان کی انقلابی نظم "عورت" بہت مشہور ہوئی۔ یہ ناممکن تھا کہ کیفی کسی مشاعرے میں شرکت کریں اور "عورت" نظم سنائے بغیر آجائیں۔ بہت دن بعد جب ایک چھوٹی سی محفل میں وائی۔بی۔چوہان نے یہ نظم سنی تو کہا تھا "کیفی کو صدیوں زندہ رکھنے کے لئے صرف یہ ایک نظم ہی کافی ہے۔

عورت

قلبِ ماحول میں لرزاں شررِ جنگ ہیں آج
حوصلے وقت کے اور زیست کے یکرنگ ہیں آج
آبگینوں میں تپاں ولولۂ سنگ ہیں آج
حسن اور عشق ہم آواز و ہم آہنگ ہیں آج

جس میں جلتا ہوں اسی آگ میں جلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

زندگی جہد میں ہے صبر کے قابو میں نہیں
نبضِ ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں
اڑنے کھلنے میں ہے نکہت خمِ گیسو میں نہیں
جنت اک اور ہے جو مرد کے پہلو میں نہیں
اس کی آزاد روش پر بھی مچلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

قدر اب تک تری تاریخ نے جانی ہی نہیں
تجھ میں شعلے بھی ہیں بس اشک فشانی ہی نہیں
تو حقیقت بھی ہے دلچسپ کہانی ہی نہیں
تیری ہستی بھی ہے اک چیز جوانی ہی نہیں
اپنی تاریخ کا عنوان بدلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

گوشے گوشے میں سلگتی ہے چتا تیرے لئے
فرض کا بھیس بدلتی ہے قضا تیرے لئے
قہر ہے تیری ہر اک نرم ادا تیرے لئے
رت بدل ڈال اگر پھولنا پھلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

توڑ کے رسم کے بت بند قدامت سے نکل
ضعفِ عشرت سے نکل وہمِ نزاکت سے نکل
نفس کے کھینچے ہوئے حلقۂ عظمت سے نکل
قید بن جائے محبت تو محبت سے نکل
راہ کا خار ہی کیا گل بھی کچلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

توڑ یہ عزم شکن سلسلۂ پند بھی توڑ
تیری خاطر ہے جو زنجیر وہ سوگند بھی توڑ
توڑ پیمانۂ مردانِ خردمند بھی توڑ
بن کے طوفان چھلکنا ہے ابلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

تو فلاطون و ارسطو ہے تو زہرہ پرویں
تیرے قبضے میں ہے گردوں تری ٹھوکر میں زمیں
ہاں اٹھا جلد اٹھا پائے مقدر سے جبیں
میں بھی رکنے کا نہیں وقت بھی رکنے کا نہیں
لڑکھڑائے گی کہاں تک کہ سنبھلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

اور پھر یہ ہینڈسم جوشیلا نوجوان شہر شہر گھومتا ہوا مشاعرے کے سلسلے میں حیدر آباد پہنچا، یہ ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔

اس زمانے میں اختر حسن حیدر آباد کے ڈیلی نیوز پیپر "پیام" کے اڈیٹر تھے جو خود بھی ترقی پسند خیالات کے حامی اور اچھے شاعر بھی تھے ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کی بے حد خاطر کرتے کیفی سردار جعفری سلطانہ آپا اور مجروح سلطان پوری ان ہی کے مہمان ہوئے۔

حیدر آباد میں خاص طور پر WEMENS - COLLEGE (زنانہ کالج) میں کیفی کی تصویریں لڑکیوں میں پچیس تیس روپیوں میں بکا کرتی تھیں، کیفی لڑکیوں کے بہت محبوب شاعر تھے۔

مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے ہی ہال کھچا کھچ بھر گیا تھا سامنے صوفے پر ایک دبلی پتلی سی لڑکی اپنے بڑے بھائی خورشید علی خان اور بہنوئی اختر حسین کے ساتھ سحر زدہ سی بیٹھی اس نوجوان کی گرجدار آواز سن کر حیران ہو رہی تھی۔

اس زمانے میں نظام سرکار کا راج تھا، کسی کی ہمت نہیں تھی کہ نظام کو اعلیٰ حضرت کے علاوہ کسی اور خطاب سے مخاطب کر سکے اور یہ نوجوان گرج گرج کر نظام کے خلاف "تاج" نظم سنا رہا تھا۔

"یہ وہ کشکولِ گدائی ہے جو بھرتا ہی نہیں"

(جھنکار میں بھی چھپی ہے)

نظم ختم ہوئی تو بھائی جان نے اپنی چھوٹی بہن کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا "اتنی سی عمر میں یہ ہمت"

مشاعرہ ختم ہوا کیفی کو لڑکیوں نے گھیر لیا آٹوگراف کے لئے مجھے اچھی طرح یاد ہے کیفی کی اس وقت کی پوزیشن کسی ہیرو سے کم نہیں تھی اور جب یہ دبلی پتلی لڑکی اپنی آٹوگراف بک لے کر ان کے پاس پہنچی تو کیفی نے شرارت سے ایک بہت ہی مہمل شعر اس پر لکھ دیا۔ اس لڑکی خود داری کو بہت ٹھیس پہنچی اور جب گھر پہنچی تو سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس لڑکی نے شکایت کی "آپ نے ہماری آٹوگراف بک پر اتنا برا شعر کیوں لکھا"۔

کیفی مسکرائے اور اسی لہجے میں بولے "آپ نے سب سے پہلے ہم سے آٹوگراف کیوں نہیں لیا"۔ (کیونکہ اس لڑکی نے سردار جعفری اور مجروح سے پہلے لیا تھا) دونوں کھکھلا کر ہنس پڑے، آنکھوں نے آنکھوں سے کچھ کہا۔ کیفی کی اس نظم کی طرح ۔

شرارہ

دو نگاہوں کا اچانک وہ تصادم مت پوچھ
ٹھیس لگتے ہی اڑا عشق شرارہ بن کر
اڑ کے پہلے انھیں چھینپی ہوئی نظروں میں رکا
نرم، معصوم، حسیں، مست اشارہ بن کر
پھر نگہ سے عرق آلود جبیں پر جھلکا
پھنکڑی پھول گہر لعل ستارہ بن کر

وصل کے ساتھ سے اتر آیا گُلِ عارض میں
رنگ رس شہد نہیں اس سے بھی پیارا بن کر
گُلِ عارض سے سمٹ آیا لبِ رنگیں میں
راگ ہے لہر نہیں برق کا دھارا بن کر
لبِ گل رنگ سے پھر رینگ گیا باہوں میں
لس کے باہوں کی گدازی میں چلا دل کی طرف
چاہ، التفات، کرم، پیار، ملارا بن کر
دل میں ڈوبا تھا کہ بس پھوٹ پڑا رگ رگ سے
جانِ دل، جانِ نظر، جانِ نظارا بن کر
پیکرِ حسن سے پھر اڑ کے چلا میری طرف
ایک بدمست جوانی کا اتارا بن کر
رہزنِ ہوش مگر ہوش کا پیغام لئے
دشمنِ ضبط مگر ضبط کا یارا بن کر
درد ہی درد مگر وجہ سکوں وجہ طرب
سوز ہی سوز مگر جان سے پیارا بن کر
آتے ہی چھا گیا کھوئی ہوئی ہستی پہ مری
میری کھوئی ہوئی ہستی کا سہارا بن کر
اب شرارہ دہی اس کے لب و رخسار میں ہے
اور کیفی مرے تپتے ہوئے اشعار میں ہے

(جھنکار میں یہ چھپی ہے)

اور ان دو نگاہوں کے تصادم نے گھر والوں میں ایک ہنگامہ خیز تصادم پیدا کر دیا۔ مخالفت جھگڑے رونا دھونا ماں کہتیں "ہول ٹائمر ہے بیالیس روپے تنخواہ پاتا ہے بیوی کو کہاں سے کھلائے گا" بڑی بہن کہتیں "ایک پیر جیل میں ایک پیر باہر، بیوی

کو کہاں رکھے گا"

اور آخر کار یہی محبت کی فتح ہوئی لڑکی کے ابا جو بہت ہی معقول ذہن کے آدمی تھے یہ کہہ کر بمبئی سے آئے "زندگی اس کو گذارنی ہے ہم کو نہیں" گھر والوں کو یہ بھی نہیں چلنے دیا۔ کیفی کے مرجھائے ہوئے دل میں جان پڑ گئی، سجاد ظہیر اور رضیہ آپا نے مجبور کر کے اپنے گھر بلالیا اور تمام ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی موجودگی میں اس لڑکی کا نکاح کیفی سے پڑھوادیا۔

نکاح میں ایک مشکل یہ تھی کہ لڑکا شیعہ تھا اور لڑکی سنی نکاح کے لئے بھی دو قاضیوں کی ضرورت تھی جن کا بلانا مشکل تھا جب قاضی نے پوچھا لڑکے کا مذہب، بنے بھائی مسکرا کر بولے "حنفی المذہب" بس نکاح ہو گیا چاروں طرف سے مبارک مبارک کی آوازیں آنے لگیں اور نہایت دلچسپ مشاعرہ شروع ہو گیا جوش، مجاز سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، اسکندر علی وجد سب نے اپنی اپنی خوبصورت نظمیں اور غزلیں سنائیں اور شادی کی محفل کامیاب ہوئی اس زمانے میں کیفی کی نظموں کا نیا مجموعہ "آخر شب" چھپ رہا تھا۔ سردار جعفری نے شادی کے تحفہ کے طور پر ایک کاپی بہت خوبصورت جلد میں جلدی سے چھپوا کر لڑکی کو پیش کیا۔ اندر سردار جعفری نے لکھا تھا "موتی کے لئے" میرا گھر بلو نام

زندگی جہد میں ہے صبر کے قابو میں نہیں
نبض ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں
اڑنے کھلنے میں ہے نکہت خم گیسو میں نہیں
جنت اک اور ہے جو مرد کے پہلو میں نہیں

اس کی آزاد روش پر بھی مچلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

کیفی

اور دوسرے صفحہ پر لکھا تھا

"شس کے نام"

"میں تنہا اپنے فن کو آخرِ شب تک لا چکا ہوں تم آ جاؤ تو سحر ہو جائے"

کیفی

چنانچہ سحر ہو گئی اور "شس" شوکت بن کر ان کی زندگی میں آ گئی شادی کے بعد ہم اندھیری کمیون کے ایک کمرے میں آ گئے، کمیون کی دنیا میرے لئے ایک بالکل نئی دنیا تھی پیپل اور کٹھل کے بڑے بڑے پیڑوں سے گھری ہوئی یہ جگہ بہت خوبصورت تھی اور اس سے خوبصورت تھے وہاں کے لوگ، روشن دماغ، انسان دوست، کچلے ہوئے پریشان حال بھوکے انسانوں کے لئے ایک نئی دنیا بنانے کی دھن میں جدوجہد کرتے ہوئے لوگ ہندوستان کے مختلف شہروں سے آئے ہوئے لوگ لیکن لگتا تھا کہ ایک ہی خاندان کے فرد ہیں۔ سب ہی کامریڈ کامریڈ پکارے جاتے تھے، اس وقت کامریڈ کا مطلب تھا "مکمل آدمی"

صبح کمیون کے کچن میں چائے کا بڑا سا پتیلا چڑھا رہتا اور یہ کامریڈ جلدی جلدی اپنے المونیم یا تام چینی کے مگوں میں چائے لے کر اخبار سنبھال لیتے۔ پھر جلدی جلدی نہا دھو کر صبح دس بجے ہی دوپہر کا کھانا کھا کر جس میں ایک دال ایک سبزی چاول اور روٹی ہوتی المونیم کے برتنوں میں کھا پی کر اور اپنے برتن دھو کر رکھ دیتے اور پارٹی کے مختلف FRONTS پر نکل جاتے۔

میں نے جاتے ہی کچن کی ذمہ داری سنبھال لی اور کھانے کے مینو میں جہاں تک گنجائش ہوتی تبدیلی کرتی رہتی مثلاً کبھی کوفتے بنوا لئے کبھی میٹھے چاول کبھی لوکا بھرتہ کبھی بگھارے بیگن وغیرہ۔ بس پھر کیا تھا سارے کامریڈ میرے نام کے نعرے لگاتے "کامریڈ موتی زندہ باد" "کامریڈ موتی کی جے ہو" اور پھر خاموش ہو کر کھانا کھاتے۔ ان کو خاموش دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی۔

کیفی کی پارٹی ویج صرف پینتالیس روپے تھی جس میں تیس روپے کھانے کے کٹ جاتے باقی رہے پندرہ تو ان میں سگرٹ اور ریلوے پاس کا خرچ میرے لئے کوئی پیسہ نہیں بچتا تھا پارٹی ویج مجھے نہیں مل سکتی تھی، مجھے پالنے کیلئے کیفی نے ایک ڈیلی نیوز پیپر میں پانچ روپئے روز پر ایک مزاحیہ نظم لکھنی شروع کی کبھی کبھی تو مجھے ان پر رحم آنے لگتا

آنکھ کھلتے ہی انھیں یہ گھبراہٹ ہوتی کہ نظم لکھنی ہے۔ اور فوراً کاپی پنسل لے کر بیٹھ جاتے۔

ایک دن پی سی جوشی میرے کمرے میں آ گئے میں گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی پیار سے کہا "بیٹھو بیٹھو" اور خود ایک اسٹول کھینچ کر بیٹھ گئے پوچھا "آج کل کیا کرتی ہو" میں نے کہا کچھ نہیں" پھر مسکرا کر بولے "تمھیں پتہ ہے کہ ایک اچھی بیوی بننے کیلئے کتنی باتوں کی ضرورت ہوتی ہے" میں نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا "ایک اچھی بیوی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے شوہر کا ہاتھ بٹائے نوکری کرے اپنے بچوں کی دیکھ بھال کرے اور پھر شوہر کے ساتھ پارٹی کا کام بھی کرے" کافی دیر تک میرے بارے میں پوچھتے رہے اور جب وہ اٹھ کر گئے تو میں نے اپنے اندر ایک عجیب و غریب طاقت محسوس کی اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں ایک اچھی بیوی بنوں گی، کام کروں گی پارٹی کا اور پیسے کمانے کا بھی۔

اس زمانے میں کیفی نے مجھے ایک کتاب لا کر دی "انسان کا ارتقا" اسے پڑھ کر جو بہت سے جالے میرے ذہن میں لگے رہ گئے تھے وہ سب چھٹ گئے پھر میں نے اپنا ارادہ کیفی پر ظاہر کر دیا کیفی چاہتے تھے کہ میں ان کے ساتھ مزدوروں میں کام کروں، لیکن میں نے "انڈین پیوپلز تھیٹر" کا اسٹیج اپنے لئے چن لیا اور آج تک اس میں کام کرتی ہوں۔ آج کل تو کیفی اپٹا کے پریزیڈنٹ ہیں۔

میں کمانے کیلئے ریڈیو ڈرامے میں بھی حصہ لینے لگی کبھی فلم کی ڈبنگ مل جاتی۔ پارٹی نے کیفی کی دقت کو محسوس کیا اور "اپنا ادب" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے دو سو روپئے ماہوار و ہیج مقرر ہوئی۔

ہم دونوں مل کر پارٹی کی میٹنگوں میں شریک ہوتے جہاں کبھی سردار جعفری تقریر کرتے کبھی سجاد ظہیر اور کبھی کیفی، کیفی کا روز کا آنا جانا اور اٹھنا بیٹھنا مدنپورے کے مزدور علاقے میں تھا۔ وہیں کے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر انہوں نے نظم "مکان" لکھی تھی۔

مکان

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
تم بھی اٹھو، تم بھی اٹھو، میں بھی اٹھوں
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی
(آوارہ سجدے)

ان دنوں ہماری سب سے بڑی تفریح تھی چاندنی رات میں اندھیری اسٹیشن سے کھلی چھت کی وکٹوریہ میں بیٹھکر کیمون آنا اس پر ایک روپیہ خرچ ہوتا اس لئے یہ موقع صرف مہینے میں ایک ہی بار نصیب ہوتا تھا۔

اور کبھی جلوسوں میں شریک ہوکر کئی کئی میل پیدل چلتے "لال باوٹا زندہ باد، انقلاب زندہ باد، کمیونسٹ پارٹی زندہ باد، کسان مزدور کی جے ہو" کے نعرے لگاتے،

۱۹۴۸ء کے ایک جلوس میں مجھے یاد ہے گولی بھی چلی تھی اور ہمارے "اپٹا" کا ایک ممبر مارا گیا تھا دینا پاٹھک، بلراج ساہنی کو پولیس نے بری طرح پیٹا تھا اور گھسیٹتے ہوئے جیل لے گئی تھی میرا دل پتے کی طرح دھڑک رہا تھا اور میں بھاگ کر پریل کے ایک مزدور کے گھر میں گھس گئی تھی، جہاں ایک مزدور عورت نے مجھکو پانی پلایا تھا اور اس کے شوہر نے مجھے گھر لاکر چھوڑا تھا

اور جب ۱۹۴۹ء میں بی ٹی رندلیوے کا زمانہ آیا تو پارٹی انتہا پسندی کا شکار ہوگئی بہت سارے کامریڈ جیلوں میں ٹھونس دئے گئے جو بچ گئے وہ آہستہ آہستہ پارٹی سے الگ ہونے لگے اور پھر ۱۹۶۲ء کے چینی حملے کے بعد روس اور چین منظریاتی جنگ میں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے دو ٹکڑے ہو گئے، اس تقسیم سے کیفی کو بے انتہا تکلیف پہنچی زبان سے تو کچھ نہ کہا لیکن یہ نظم "آوارہ سجدے" اسی زمانے میں کہی۔

آوارہ سجدے

اک یہی سوزِ نہاں کل مرا سرمایہ ہے
دوستو میں کسے یہ سوزِ نہاں نذر کروں
کوئی قاتل سرِ مقتل نظر آتا ہی نہیں
کس کو دل نذر کروں اور کسے جاں نذر کروں

تم بھی محبوب مرے تم بھی ہو دلدار مرے
آشنا مجھ سے مگر تم بھی نہیں، تم بھی نہیں
ختم ہے تم پہ مسیحا نفسی چارہ گری
محرمِ دردِ جگر تم بھی نہیں، تم بھی نہیں

اپنی لاش آپ اٹھانا کوئی آسان نہیں
دست و بازو مرے ناکارہ ہوئے جاتے ہیں
جن سے ہر دور میں چمکی تھی تمہاری دہلیز
آج سجدے وہی آوارہ ہوئے جاتے ہیں

دور منزل تھی مگر ایسی بھی کچھ دور نہ تھی
لئے پھرتی رہی رستے ہی میں وحشت مجھکو
ایک زخم ایسا نہ کھایا کہ بہار آجاتی
دار تک لے کے گیا شوقِ شہادت مجھکو

راہ میں ٹوٹ گئے پاؤں تو معلوم ہوا
جز مرے اور مرا راہنما کوئی نہیں
ایک کے بعد خدا ایک چلا آتا ہے
کہہ دیا عقل نے تنگ آکے خدا کوئی نہیں

(آوارہ سجدے ۱۹۶۲ء)

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود سوشلزم سے کیفی کا یقین نہیں اٹھا ہے الٹے

جو بھی بن پڑتا ہے کرتے ہیں ابھی تک پارٹی کا کارڈ ان کے پاس ہے۔

۱۹۴۹ء میں میں اپنے بچے کی پیدائش کے سلسلے میں لکھنو چلی گئی کیفی بھی میرے ساتھ تھے وہاں واجدہ باجی نے مجھے سب سے زیادہ پیار دیا۔

میرے سنی ہوتے کے باوجود کیفی کے ابا اماں مجھے بے حد پیار سے ملے اسپتال کا خرچ اچھن بھیا (کیفی کے بڑے بھائی) نے اٹھایا وہیں کبھی اماں سے کبھی واجدہ باجی سے کیفی کے بچپن کے قصے سنے کیفی کے گاؤں مجواں میں بھی چار مہینے گذارے،

اتنے دن گاؤں میں رہنے کے بعد گاؤں سے میرا جی بھر گیا میں گاؤں میں رہنے کی بالکل عادی نہیں ہوئی، میرا بچپن حیدرآباد شہر میں گذرا البتہ کیفی اپنے گاؤں میں بہت خوش تھے وہیں سے تلنگانہ موومنٹ پر "تلنگانہ" نظم لکھ کر پارٹی کو بھیجی، کئی نظمیں انہوں نے اپنے گاؤں میں بیٹھ کر لکھیں، گرمی سخت پڑتی تھی ہمارے اندر کے کمرے میں چھت پر لگا ہوا ایک پنکھا ہوتا تھا کپڑے کا میں اور بچہ سوتے رہتے اور یہ اپنی میز کے قریب اپنے پیر سے پنکھے کی ڈوری باندھ لیتے اور اسے کھینچتے رہتے اور ہاتھ سے نظمیں لکھتے رہتے سوچتے رہتے کسی نے گاؤں کے لڑکوں سے یہ بات کہہ دی اب کیا تھا لڑکے ہاتھ سے پنکھا کھینچنے کی نقل اتارتے اور کیفی کو چھیڑتے (گاؤں میں بیوی کا کام کرنے کو بہت معیوب سمجھا جاتا تھا)

پھر میں کیفی کے پیچھے پڑ گئی کہ یہاں سے چلو "پیسہ ہمارے پاس ایک نہیں چلیں تو کیسے"، کیفی کہتے۔ پھر ہم کیفی کی چھوٹی بہن شبیری سے دو سو روپئے لیکر بمبئی آگئے:

یہاں نقشہ ہی بدل گیا تھا ہمارا پیارا اندھیری والا کمیون ٹوٹ چکا تھا سجاد ظہیر پاکستان بھیج دئے گئے تھے رضیہ آپا لکھنو شفٹ کر گئی تھیں سلطانہ آپا نے بھائی (سجاد ظہیر) کے گھر چلی گئی تھیں سلطانہ آپا نوکری بھی کرتیں اور پارٹی کا کام بھی کرتیں اور اب ان کا گھر کمیون بن گیا تھا۔ بہت سے لوگ تھے میں اپنے بچے کو لیکر حیدرآباد چلی گئی۔

کیفی اس زمانے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کی تیاریوں میں مصروف تھے پارٹی پر پابندی کی وجہ سے کانفرنس بمبئی میں نہیں ہو سکتی تھی اس لئے کیفی نے سوچا کہ کانفرنس بھیونڈی میں کی جائے جو بمبئی سے تیس میل دور ہے اور زیادہ تر ہینڈلوم پر کپڑا بننے والے مزدوروں کی بستی ہے ۔

کیفی رات دن کام کر رہے تھے ہمارے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا میں اتنی خود دار ہوں کہ کبھی اپنے ماں باپ سے بھی ایک پیسہ نہیں مانگا۔ پھر انہیں دنوں میرا بچہ بیمار ہو گیا۔ میں اس کا ہومیو پیتھک علاج کراتی رہی جس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا اور بچہ تیرہ دن کی بیماری کے بعد چل بسا۔ ٹائیفائیڈ نمونیہ ہو گیا تھا۔ میری دنیا میں اندھیرا چھا گیا کیفی کو تار دیا گیا۔ کیفی فوراً آ گئے اور مجھے اپنے ساتھ بمبئی لے گئے ۔

بمبئی میں میں سلطانہ آپا کے گھر میں رہنے لگی کیفی اور مہندر ناتھ کی انتھک کوششوں سے کانفرنس کامیاب ہوئی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کا نیا مینی فیسٹو وجود میں آیا ۔

کانفرنس کی مصروفیت میں تھوڑے دن تو گذر گئے لیکن بچے کی یاد میرے دل سے نہیں جاتی تھی ہر وقت روتی رہتی اس کا ایک چھوٹا سا کرتا اپنے پاس رکھتی اسے آنکھوں پر رکھ لیتی ۔ بس اسٹاپ پر اگر کسی عورت کی گود میں ایک سال کا بچہ دیکھ لیتی تو اپنا بچہ یاد آ جاتا اور پیروں میں اتنی سکت نہ رہتی کہ کھڑی رہ سکوں ۔

مجھے سب سے زیادہ سہارا مہدی (کیفی کے بہت پیارے دوست) نے دیا بہت سمجھاتے رہتے اور پھر میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے غم کی وجہ سے بورنگ ہوتی جا رہی ہوں ۔ انسان میں اپنے غم کو برداشت کرنے کی طاقت ہونی چاہیے تب ہی وہ کچھ کر سکتا ہے ۔ لوگ بھی کسی کے غم کو زیادہ دن تک نہیں جھیل سکتے ۔

پھر میں نے اپنے آنسو پوچھ ڈالے اور ہنسنے کی عادت ڈال لی اور پھر سے اپنا کام شروع کر دیا ۔

اب کیفی انڈر گراؤنڈ جا چکے تھے مجھے یاد ہے کہ جب کوئی کامریڈ چھپتے

چھپلے تے مجھے ان سے ملانے لے جاتا تو خوشی سے میرا دل دھڑکنے لگتا۔ کبھی کبھی مہینوں بعد ملنا ہوتا ایک ماہ بعد اندھیری کے کسی گھر میں جب میں ان سے ملنے گئی تو میں نے انہیں پہچانا ہی نہیں۔ انہوں نے مونچھیں رکھ لی تھیں میں نے دیکھتے ہی کہا "تو یہ ہے کیا شکل بنا لی ہے بالکل پولس کانسٹیبل لگتے ہو"۔ کیفی ہنس کر کہنے لگے "اسی لئے تو جیل جانے سے بچا ہوا ہوں"

پھر جب شبانہ ہونے والی ہوئی تو پارٹی نے سخت مخالفت کی کہ کیفی انڈر گراونڈ ہیں اور شوکت کی کوئی آمدنی نہیں ہے، اس لئے بچہ نہیں ہونا چاہیئے اور ابارشن ضروری ہے، لیکن میں نہیں مانی میں نے صاف انکار کر دیا۔ میرا ایک بچہ مر چکا تھا اور مجھے دوسرے بچے کی سخت ضرورت تھی میں پھر اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی جہاں میری ماں نے مجھے بہت پیار سے رکھا اور وہیں شبانہ پیدا ہوئی۔

کیفی کو یہ فکر تھی کہ پہلا بچہ تو غربت کی نذر ہو گیا اب اس بچی کے لئے انہیں پیسہ کمانا چاہئے۔ چنانچہ انہوں نے فلموں میں گانے لکھنے شروع کر دئے شاہد لطیف نے کیفی کی حالت دیکھتے ہوئے انہیں اپنی فلم "بزدل" کے لئے دو گانے دئے "روتے روتے گذر گئی رات رے" "کاہے اب رے بلم" دونوں گانوں کا معاوضہ ایک ہزار روپئے دیا۔

اس زمانے میں عصمت آپا اور شاہد بھائی ہم دونوں کو بہت چاہتے تھے بلکہ جب شبانہ ہونے والی تھی میں بہت بیمار ہو گئی تھی خون کی کمی کمزوری تو عصمت آپا نے مجھے اپنے گھر میں رکھا اور میرا علاج کرایا۔

کیفی کی کوششوں سے ڈھنکر روڈ کی ایک بلڈنگ میں ہمیں ایک کمرہ مل گیا اور میں دو مہینے کی شبانہ کو لے کر اس کمرے میں آگئی، کمرہ بہت ہی گندہ اور باتھ روم کامن تھا، بجلی بھی نہیں تھی، میں نے فیصلہ کر لیا کہ نوکری کروں گی اور زہرہ آپا سے (جو اس زمانے میں پرتھوی تھیٹر میں بھی کام کرتی تھیں اور اپٹا کے ڈراموں میں بھی بہت اچھی آرٹسٹ اور بہت رحم دل عورت ہیں) اپنا ارادہ ظاہر کیا وہ فوراً

مجھے پرتھوی تھیٹر لے گئیں جہاں پرتھوی راج جی مجھ سے بہت پیار سے ملے اور فوراً نوکری دیدی سو روپے میری تنخواہ مقرر ہوئی پھر محبت سے کہنے لگے "ہمارا تھیٹر غریب ہے ہم پیسے زیادہ نہیں دے سکتے لیکن یہاں آپ کو پیار کی کمی نہیں ملے گی"

چنانچہ ایسا ہی ہوا میں اپنی دو مہینے کی بچی کو کمر پہ لاد کر تھیٹر لے جاتی اس کے گیلے کپڑے میک اپ روم میں سوکھنے کے لئے ڈالتی اور پاپا جی (سب لوگ انہیں پیار سے پاپا جی کہتے) ذرا بھی اعتراض نہیں کرتے تھے بالکل ایک باپ کی سی شفقت ان کی شخصیت میں بسی ہوئی تھی۔

اسی طرح دن گذرتے گئے۔ تین سال کی عمر تک تو میں شبانہ کو اپنے ساتھ پرتھوی تھیٹر کے ٹور پر لے جاتی رہی لیکن جب وہ تین سال کی ہوئی تو اس پڑھائی کا مسئلہ سامنے آیا۔

کیفی چاہتے تھے کہ وہ اپنی بچی کو بڑے انگلش اسکول میں داخل کریں میں مخالفت کرتی تھی کہ بڑے اسکول کی فیس ہم کہاں سے دے سکیں گے لیکن کیفی نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شبانہ کو بڑے اسکول ہی میں پڑھائیں گے چاہے انہیں کتنی ہی محنت کرنی پڑے پیسہ کمانے کے لئے۔

اسی زمانے میں سلطانہ آپا ADULT EDUCATION کی انسپکٹرس تھیں اسکولوں میں ان کا آنا جانا رہتا تھا ایک دن جب وہ کوئن میری ہائی اسکول گئیں تو انھوں نے شبانہ کو اپنی بچی کہہ کر نام لکھوا دیا" ورنہ اچھے اسکولوں میں جگہ ملنی بھی مشکل تھی اور اس اسکول میں تو بغیر انگریزی پڑھے ماں باپ کے بچوں کو ہرگز نہیں لیتے۔

وہاں یہ بچی اپنی ذہانت اور ملنسار طبیعت کی بدولت ٹیچرس کی بہت چہیتی ہوگئی اور ہر سال فرسٹ آنے لگی اس کی اچھی رپوٹ دیکھکر میری آنکھوں میں سلطانہ آپا کے لئے تشکر کے آنسو چھلکنے لگے۔

پھر آہستہ آہستہ کیفی کو فلموں میں کام بھی ملنے لگا اور وہ بچی کی فیس اور گھر کا بوجھ اٹھانے کے قابل ہو گئے مگر پارٹی کا کام انہوں نے پھر بھی

نہیں چھوڑا،

گرو دت کی فلم "کاغذ کے پھول" موہن سہگل کی فلم "اپنا ہاتھ جگن ناتھ" ایک کے بعد ایک سب کے گانے لکھے کاغذ کے پھول کے گانے بہت مقبول ہوئے۔ اور رمیش سہگل کی فلم شعلہ و شبنم کا گانا

جانے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں یہ آنکھیں مجھ میں

راکھ کے ڈھیر میں شعلہ ہے نہ چنگاری ہے

پھر بہت جلد ہم سے ریڈ فلیگ ہال چھین لیا گیا ہر کشن داس ہاسپٹل کو اس جگہ کی ضرورت تھی پارٹی کے لوگ کیس ہار گئے اور پھر ہم لوگ کیفی کی کوششوں سے جوہو کے اس کاٹیج میں آ گئے جس کا کرایہ دو سو بیس روپئے ہے اور ابھی تک یہیں رہ رہے ہیں۔

پھر کیفی کو ایک روز چیتن صاحب ملنے آ گئے اپنی فلم "حقیقت" میں ان کو گانے لکھنے کی آفر کی۔

"حقیقت" بہت ہٹ ہوئی اور کیفی مستقل طور پر چیتن صاحب کے ساتھ گانے لکھنے لگے۔ کیفی کے فلمی دنیا میں "دو کارنامے" ہیں ایک تو چیتن صاحب کی فلم "ہیر رانجھا" جو پوری منظوم فلم ہے اور دوسرا "گرم ہوا" جسے سیتھو نے ڈائرکٹ کیا ہے۔ گرم ہوا کی کہانی، ڈائیلاگ اور اسکرین پلے کیفی کے ہی لکھے ہوئے ہیں اور انھیں فلم فیر کے تین ایوارڈ اکٹھے ملے کہانی، ڈائیلاگ اور اسکرین پلے کہانی کے لئے نیشنل ایوارڈ بھی ملا۔

کیفی کی اب تک چار کتابیں چھپ چکی ہیں، "جھنکار" "آخرِ شب" "آوارہ سجدے" اور فلمی گیتوں کا مجموعہ "میری آواز سنو" "آوارہ سجدے" ان کا نیا انتخاب ہے "آخرِ شب" کے بعد انہوں نے بہت ساری نظمیں لکھیں لیکن اسے اس مجموعہ میں شریک کرنے کے قابل نہیں سمجھا اس مجموعے کو بہت سارے انعامات مل چکے ہیں، نہرو ایوارڈ ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ، یو پی اردو اکیڈمی ایوارڈ،

آوارہ سجدے کی تمام شاعری، آخرِ شب کی شاعری سے کہیں زیادہ پختہ، کہیں زیادہ آگے ہے بلکہ میں سمجھتی ہوں کہ تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ اگر میں ن۔م راشد صاحب کی آخری سطریں جو انہوں نے فیض صاحب کے مجموعہ کلام نقشِ فریادی کے مقدمہ میں لکھیں ہیں کیفی کی شاعری کے لیے بھی دہرادوں تو شاید غلط نہ ہوگا۔

"فیض کسی مرکزی نظریے کا شاعر نہیں صرف احساسات کا شاعر ہے اور اپنے شدید احساسات کو وہ اپنے حسین الفاظ کے ساتھ اس طرح پیوست کرتا ہے کہ وہ ایک ہی پیرہن کے تار پود معلوم ہونے لگتے ہیں۔"

فرق صرف اتنا ہے کہ کیفی ایک مرکزی نظریے کے بھی شاعر ہیں ترقی پسند شاعر ترقی پسند انسان بھی سچے آدمی جو دل میں وہی زبان پر اور وہی عمل میں بھی اور اسی سچے اور ترقی پسند آدمی کے ساتھ میں نے زندگی کا طویل راستہ طے کرلیا ہے انتیس ۲۹ سال ایک صدی کے چوتھائی حصّے سے بھی زیادہ۔

شادی سے پہلے ایک بار میں نے کیفی کے سامنے ایک پیپر پر لکھ دیا تھا کہ "اگر زندگی کے اس طویل سفر میں تم میرے ہمسفر ہو جاؤ تو یہ زندگی اس طرح گذر جائے جیسے پھولوں پر سے نسیم سحر کا لطیف جھونکا"

اور میں آپکو یقین دلاتی ہوں کہ زندگی کے انتہائی اتار چڑھاؤ کے باوجود ایک کمرے کی زندگی کے باوجود کبھی کھانا ہے اور کبھی نہیں کے باوجود میں نے کبھی اپنے ماں باپ کو شکایت کا ایک لفظ بھی نہیں لکھا میں نے کبھی اپنے آپکو دکھی نہیں محسوس کیا۔ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو ایک انتہائی خوش قسمت عورت سمجھا اور آج بھی سمجھتی ہوں شاید میرے ہی لئے کیفی موت کی دہلیز کو چھوکر واپس آگئے۔

۹ فروری ۱۹۷۳ء کو فالج کا اس قدر زبردست حملہ ہوا کہ زندہ رہنے کی

کوئی آس نہیں رہ گئی تھی، بارہ گھنٹے برین ہیمرج میں رہ کر کوئی واپس نہیں لوٹ سکتا اور کیفی لوٹ آئے میرے لئے میرے بچوں کے لئے میں ان کی انتہائی شکر گذار ہوں اور ساتھ ہی خدا کی بھی جس نے مجھ پر رحم کیا۔ اور میں سلطانہ آپا سردار بھائی کا احسان بھی کبھی نہیں بھول سکتی جنہوں نے میرا اتنا ساتھ دیا بریچ کینڈی ہاسپٹل میں داخل کرنے کا سہرا صرف ان کے سر ہے ورنہ وہاں داخلے کا میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی اور جب تک کیفی ہاسپٹل میں رہے ان دونوں نے مجھے اپنے گھر میں رکھا اور سردار بھائی کی بہنوں کی بھی میں انتہائی شکر گذار ہوں ربو باجی اور ستارہ کی کہ ان لوگوں نے بھی میری دلجوئی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

کیفی نے بھی موت سے ہار نہیں مانی مستقل اس سے لڑتے رہے۔ اسپتال کا ایک واقعہ مجھے یاد آرہا ہے۔ ایک دن سلطانہ آپا کے گھر سے سوا چار بجے ہاسپٹل پہنچی جہاں کیفی بے ہوش پڑے ہوئے تھے ان کے کمرے کے دروازے پر DON'T DISTURB کا بورڈ لگا ہوا تھا بیوی بھی چار بجے سے پہلے ان کے کمرے میں داخل نہیں ہوسکتی تھی، کیا دیکھتی ہوں کہ ایک طالب علم کیفی کے سرہانے بیٹھا اپنا دکھڑا سنا رہا ہے اور کیفی نیم بے ہوشی میں اپنے سر کے درد کے باوجود بڑے غور سے سن رہے ہیں میں یہ دیکھتے ہی جھلا گئی "حد ہوگئی ڈاکٹر نے آپ کو بات کرنے سے بھی منع کیا ہے اور آپ اس سے باتیں کر رہے ہیں" پھر میں نے لڑکے کو مخاطب کر کے کہا "میاں تم ذرا باہر آؤ" وہ کسمسانے لگا "میں۔ میں کیفی صاحب کو اپنے حالات سنانا چاہتا ہوں" میں نے پیار سے کہا "ذرا آپ باہر آجائیے مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے" لڑکا اٹھ کر باہر آنے لگا تو کیفی نے اپنی نحیف لڑکھڑاتی آواز میں کہا "موتی یہ اسٹوڈنٹ ہے اسے کچھ مت کہنا ہوسکے تو اس کی جو ضرورت ہے اسے پوری کردینا" میں اچھا اچھا کہہ کر باہر نکل گئی پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ احمد آباد کا رہنے

والا ہے سوتیلی ماں کے ظلم سے گھبرا کر بھاگ آیا ہے۔ اور یہاں کام چاہتا ہے اور کیفی سے کام مانگنے آیا ہے۔"

ہاسپٹل میں جہاں کیفی کے چاہنے والوں کی ایک بھیڑ لگی ہوتی تھی جس میں اپنے پیارے دوستوں کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے وزیرِ صحت ڈاکٹر رفیق ذکریا گورنر علی یاور جنگ اور ان کی بیگم صاحبہ وغیرہ ہوتے تھے تو ایک طرف وہیں نیچے مالیوں کی قطار بیٹھی ہوئی تھی ملنے کی اجازت تو اتنے لوگوں کو نہیں مل سکتی تھی صرف صاحب کی طبیعت پوچھنے جو ہوسے آتے اور جاتے ہوئے کہتے "ہمارے دیوتا جیسے صاحب کو بھگوان اچھا کردے۔"

ہاسپٹل میں پانچویں دن کیفی نے ایک نظم کہی "دھماکا" کیفی اپنی لڑکھڑاتی زبان میں کہتے جاتے اور شمع زیدی لکھتی جاتیں۔ اور میں دنگ رہ جاتی کتنی ہمت ہے کیفی میں کتنی جان ہے اور میں دل ہی دل میں ان کے زندہ رہنے کی دعائیں مانگنے لگتی۔

وہیں اسپتال میں انہوں نے دوسری نظم کہی "زندگی" آدھی نظم بریچ کینڈی ہاسپٹل میں کہی اور آدھی روس کے ہاسپٹل میں جہاں وہ علاج کے لئے ۱۹۷۲ء میں گئے تھے۔

زندگی

آج اندھیرا مری نس نس میں اتر جائے گا
آنکھیں بجھ جائیں گی بجھ جائیں گے احساس و شعور
اور یہ صدیوں سے جلتا سا سلگتا سا وجود
اس سے پہلے کہ میری بیٹی کے وہ پھول سے ہاتھ
گرم رخسار کو ٹھنڈک بخشیں
اس سے پہلے کہ میرے بیٹے کا مضبوط بدن
تنِ مفلوج میں شکتی بھر دے
اس سے پہلے کہ مری بیوی کے ہونٹ

میرے ہونٹوں کی تپش پی جائیں
راکھ ہو جائے گا جلتے جلتے
اور پھر راکھ بکھر جائے گی

زندگی کہنے کو بے مایہ سہی
غم کا سرمایہ سہی
میں نے اس کے لئے کیا کیا نہ کیا
کبھی آسانی سے اک سانس بھی میراج کو اپنا نہ دیا

آج سے پہلے بہت پہلے
اسی آنگن میں
دھوپ بھرے دامن میں
میں کھڑا تھا مرے تلووں سے دھواں اٹھتا تھا
ایک بے نام سا بے رنگ سا خوف
مجھے احساس یہ چھایا تھا کہ جل جاؤں گا
میں پگھل جاؤں گا
اور پگھل کر مرا کمزور سا میں
قطرہ قطرہ مرے ماتھے سے ٹپک جائے گا

ملبوہا تھا مگر اشکوں کے بغیر
چیختا تھا مگر آواز نہ تھی
موت لہراتی تھی سو شکلوں میں
میں نے ہر شکل کو گھبرا کے خدا مان لیا

کاٹ کے رکھ دیئے صندل کے پُراسرار درخت
اور پتھر سے نکالا شعلہ
اور روشن کیا اپنے سے بڑا ایک الاؤ
جانور ذبح کئے اتنے کہ خوں کی لہریں
پاؤں سے اٹھ کے کمر تک آتیں
اور کمر سے مرے سر تک آتیں

سوم رس میں نے پیا
رات دن رقص کیا
ناچتے ناچتے تلوے مرے خوں دینے لگے
میرے اعضا کی تھکن
بن گئی کانپتے ہونٹوں پہ بھجن
ہڈیاں میری چٹخنے لگیں ایندھن کی طرح
منتر ہونٹوں سے ٹپکنے لگے روغن کی طرح

اگنی ماتا مری اگنی ماتا
سوکھی لکڑی کے یہ بھاری کندے
جو تری بھینٹ کو لے آیا ہوں
ان کو سویکار کر اور ایسے دھدھک
کہ مچلے شعلے
کھینچ لیں جوش میں سورج کی سنہری زلفیں
آگ میں آگ ملے
جو امر کر دے مجھے

ایسا کوئی راگ ملے

اگنی ماں سے بھی نہ جینے کی سند جب پائی
زندگی کے نئے امکان نے لی انگڑائی
دفعتاً دور سے کانوں میں یہ آواز آئی
بدھم شرنم گاچھامی
دھمم شرنم گاچھامی
سنگھم شرنم گاچھامی
چار ابرو کا صفایا کر کے
بے سلے وستر سے ڈھانپا یہ بدن
پونچھ کے پتنی کے ماتھے سے دمکتی بندیا
سوتے بچوں کو بنا پیار کئے
چل پڑا ہاتھ میں کشکول لئے
چاہتا تھا کہ کہیں بھکشا میں جیون مل جائے
جو کبھی بند نہ ہو، دل کو وہ دھڑکن مل جائے
مجھکو بھکشا میں مگر زہر ملا
ہونٹ تھرانے لگے جیسے کرے کوئی گلہ
جھک کے سولی سے اسی وقت کسی نے یہ کہا
تیرے اک گال پہ جس پل کوئی تھپڑ مارے
دوسرا گال بھی آگے کردے
یہی جینے کا طریقہ بھی ہے انداز بھی ہے
تیری آواز بھی ہے، یہ مری آواز بھی ہے

میں اٹھا جسکو اہنسا کا سبق سکھلانے
مجھ کو لٹکا دیا سولی پہ اسی دنیا نے
آرہا تھا میں کسی کوچوں سے ٹھوکر کھا کر
ایک آواز نے روکا مجھکو
کسی مینار سے نیچے آکر
اللہ اکبر، اللہ اکبر
ہوا دل کو یہ گماں
کہ یہ پُرجوش اذاں
موت سے دیگی اماں
پھر تو میں پہنچا جہاں
میں نے دہرائی کچھ ایسے یہ اذاں
گونج اٹھا سارا جہاں
اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر
اسی آواز میں اک اور بھی گونجا اعلان
کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَان

اک طرف جھک گیا خورشیدِ جہاں تاب کا سر
ہوا فالج کا اثر
پھٹ گئی نس کوئی
شریانوں میں خون جم سا گیا
ہوا مجروح دماغ
ایسا لگتا تھا کہ بجھ جائے گا صدیوں سے جو جلتا ہے چراغ
پھر سمندر جو بڑی دیر سے طوفان میں تھا

ایسا تڑپا کہ مرے کمرے کے اندر آیا
آتے آتے وہ مرے واسطے امرت لایا
اور کہا شیو نے یہ بھجوایا ہے
آج شیو علم ہے، امرت ہے عمل
اب وہ آساں ہے جو دشوار تھا کل
رات جو موت کا پیغام لئے آئی تھی
بیوی بچوں نے مرے، اس کو کھڑکی سے پرے پھینک دیا
اور جو وہ زہر کا اک جام لئے آئی تھی
اس نے وہ خود ہی پیا
صبح اتری جو سمندر میں نہانے کیلئے
رات کی لاش ملی پانی میں

ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے کہ ایک دن ہمارے گھر میں چوری ہوگئی تمام بیڈ کور، چادریں، کمبل چوری ہو گئے، مجھے معلوم تھا کہ چور کون ہے۔ ایک چور مالی ہمارے گھر کسی کے توسط سے آگیا تھا۔ جب ہمارے گھر میں مستقل چوریاں ہونے لگیں اور مجھے پتہ چلا کہ یہ سارا کام اسی مالی کا ہے تو میں نے اسے نکال باہر کیا اور ایک دن جب ہم لوگ گھر سے باہر گئے ہوئے تھے اور گھر کھلا ہوا تھا تو موقع دیکھ کر وہ مالی پھر آیا اور گھر کے تمام کمبل چادریں اور بیڈ کور اٹھالے گیا۔ جب میں نے کیفی سے کہا کہ تم خدا کے لئے پولس میں اطلاع کرو کہ اس طرح چوری ہوئی ہے اور چور صرف وہی مالی ہے تو کہنے "دیکھو شوکت بارش ہونے والی ہے اس غریب کو بھی تو چادروں اور کمبل کی ضرورت ہوگی اس کے بچے کہاں سوئیں گے تم تو اور خرید سکتی ہو لیکن وہ نہیں" میں نے اپنا سر پیٹ لیا اب کیا جواب دیتی۔
ایک بار یہ لان میں بیٹھے لکھ رہے تھے، پھولوں پودوں سے انھیں بہت

پیار ہے اس کے لئے حد سے زیادہ محنت کرتے ہیں دور دور سے پھولوں کے بیج منگواتے ہیں اس زمانے میں پھولوں کا موسم آنے والا تھا وہ گملوں میں پھولوں کے بیج لگا رہے تھے اتنے میں محلہ کی ایک مرغی اپنے دس بارہ چھوٹے چھوٹے بچوں سمیت آگئی اور بچوں سے گملوں کا بیج کرید کرید کر کھانے لگی بچے بھی ماں کا ساتھ دینے لگے کیفی کو ایک دم غصہ آگیا اور انھیں بھگانے کے لئے ایک چھوٹا سا پتھر اٹھا کر ان کی طرف پھینکا وہ پتھر مرغی کے ایک بچے کو لگ گیا اور وہ وہیں تڑپ تڑپ کر دم توڑ گیا۔ بس پھر کیفی سے نہ رہا گیا جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے مرغی کے بچے کو پانی پلایا کسی طرح زندہ رکھنے کی کوشش کی مگر جب وہ نہ بچ سکا تو ایک دم قلم بند کر کے رکھدیا اور دو روز تک کام ہی نہ کر سکے۔

مجھ سے کہنے لگے "میں نے بہت زیادتی کی انھیں آواز سے بھی بھگا سکتا تھا، پتھر پھینکنے کیا ضرورت تھی، اب مجھ سے کام ہی نہیں ہو رہا ہے جب بیٹھتا ہوں وہ مرغی کا بچہ نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہے" میں نے ہنس کر بالکل بچوں کے سے انداز میں سمجھایا بھئی یہ تو اتفاق سے ہوا اور پھر مرغی تم کھاتے بھی تو ہو اگر اب نہیں مرتا تو تھوڑا بڑا ہو کر کاٹ دیا جاتا تم اس کے بارے میں مت سوچو وغیرہ وغیرہ۔

کیفی کی عزت میری نگاہوں میں ان کی بیماری کے بعد کئی گنا بڑھ گئی اور وہ ہے ان کا WILL POWER ایک ہاتھ کے مفلوج ہونے کے باوجود انہوں نے بیماری سے ہار نہیں مانی ہر مشاعرے میں جاتے ہیں ہر میٹنگ میں شریک ہوتے ہیں ایک مرتبہ بہار کے ایک شہر گیا میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس تھی ان لوگوں نے کانفرنس انتہائی گرمی کے مہینے میں رکھدی کیفی نے فیصلہ کر لیا کہ میں جاؤں گا۔ میں بے حد ڈر گئی اچھے اچھے رائٹرس گیا کی گرمی سے ڈر کر پیچھے ہٹ گئے تھے لیکن کیفی کی ضد ان کو گیا لے گئی وہاں سے وہ پٹنہ

پیس کانفرنس میں بھی گئے وہاں تو ہم دونوں مرتے مرتے بچے اسٹیشن پر ایک لاکھ کسان واپس جارہے تھے اس میں، میں اور کیفی پھنس گئے اگر اس وقت ایک کسان اپنا ڈنڈا اٹھا کر ہماری مدد نہ کرتا تو لوگ ہم دونوں کو کچل کر آگے بڑھ جاتے۔

ایسے مشاعروں کے دعوت نامے قبول کر لیتے ہیں جن کا نام بھی کسی نے نہ سنا ہوگا۔

اپنے گاؤں سے بے حد پیار کرتے ہیں تمام زمین تو ماں باپ کے پاکستان جاتے ہی لوگوں نے ہڑپ کر لی جو تھوڑی بچی وہ کچھ لوگوں نے محبت کی وجہ سے واپس کر دی۔ کیفی ملیح آباد ٹرک پر بیٹھ کر گئے اور آم کے تین سو پودے لاکر اپنے سامنے اس زمین میں لگوا لئے اب چاہتے ہیں کہ پھولپور اسٹیشن سے مجواں تک سڑک بھی بن جائے اور جب بھی کیفی کی کوششوں سے حکومت نے سڑک بنوانی چاہی گاؤں والوں نے اڑنگے لگانے شروع کر دیے پھر خود گاؤں گئے ایک ایک کو سمجھایا کہ "بھیا اس میں آپ ہی لوگوں کا فائدہ ہے سڑک بن جانے دو" پھر مجھ سے کہتے "بے چارے کسان بھی تو زمین کے سہارے پر زندہ رہتے ہیں ان کی اتنی زمین چلی جائے گی تو وہ کھیتی کس طرح کریں گے"۔

ایک بار ۱۹۷۰ء میں گاؤں کی اسی محبت میں پیر کا فریکچر بھی بہت بری طرح ہوا۔ ہوا یوں کہ کیلے کے تین سو پودے اپنے باغ میں لگوانے کیلئے بھساول سے خرید کر لکھنؤ پہنچے لکھنؤ میں ہمیشہ ہوٹل گلمرگ میں ٹھہرا کرتے ہیں۔

دوسرے روز ۹ بجے کی ٹرین سے مجواں جانے والے تھے گاؤں کی سڑک بنوانے کے سلسلے میں چیف منسٹر اتر پردیش رام نریش یادو سے صبح سات بجے ملنے گئے واپسی میں اسی کے بارے میں سوچتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے کہ پیر پھسل گیا اور گر پڑے بائیں پیر کے جوڑ کی ہڈی تین ٹکڑے ہو گئی اٹھ نہیں سکے لوگوں نے پکڑ کر بڑی مشکل سے اٹھایا اور کرسی پر بٹھا دیا ظاہر ہے تکلیف کتنی ہوئی ہوگی لیکن ظاہر نہیں کیا اور ہنستے رہے شعر سناتے رہے

لیکن جب تکلیف ناقابلِ برداشت ہوگئی تو چہرے پر پسینہ آنے لگا اور چپ ہوگئے۔
بشن کپور (بلٹز کے یوپی کے نامہ نگار) پہلے ہی پاگلوں کی طرح بھاگ کر میڈیکل کالج پہنچ
چکے تھے وہاں سے ڈاکٹر گوئل کو آپریشن تھیٹر سے پکڑ کر لائے کیفی فوراً میڈیکل کالج
پہنچائے گئے ایکسرے ہوا معلوم ہوا کہ ران میں تین جگہ سے ہڈی ٹوٹ گئی ہے مجھے
فون کیا گیا میں گھبرا کر بائی ائر دہلی پہنچی اور وہاں سے مہدی کو لے کر لکھنؤ پہنچی دیکھتی
کیا ہوں کہ پیٹ بری طرح پھول گیا ہے ناک اور منہ سے نلکیاں لگی ہوئی ہیں میں
رونے لگی۔

ڈاکٹر نے بتایا کہ پیٹ میں ہیمرج ہوگیا ہے۔ آنتوں نے کام کرنا بند
کر دیا ہے اگر پیٹ اسی طرح رہا تو ایک گھنٹے کے بعد آپریشن کرنا ہوگا میری آواز
سن کر ہوش میں آ گئے شاید میرے پہنچنے سے طاقت ملی ہوگی آنتوں اہستہ آہستہ
کام کرنا شروع کر دیا۔

تین چار روز کے بعد ڈاکٹر گوئل نے تھوڑی سی دیر بے ہوش کر کے
بالکل ماہرِ فن کی طرح بغیر آپریشن کے ہڈی جوڑ دی اور پیر کو ٹریکشن میں رکھ دیا۔
ساڑھے چار مہینے کیفی کا بایاں پیر بندھا رہا نہ کروٹ لے سکتے اور نہ بیٹھ سکتے۔
ساڑھے چار مہینے تک ایک آدمی چت لیٹا رہا بڑی ہمت کی بات تھی میں وہیں
ہاسپٹل میں رہ گئی تھی کیونکہ مہدی نے کہا تھا کہ لکھنؤ کے میڈیکل کالج کے ڈاکٹر
بمبئی سے بہتر ہیں اور یہی ہوا میں نے وہاں چار مہینے رہ کر دیکھا کہ ڈاکٹر گوئل تو
خیر انتہائی ذہین اور فرشتہ صفت انسان ہیں لیکن ان کا پورا اسٹاف ڈاکٹر نرسیں
فیوز وتھیو رسٹ غیر معمولی لوگ ہیں کیفی کے اچھا ہونے میں ان سب کا ہاتھ ہے لیکن
کیفی بھی عجیب وغریب انسان ہیں اسی ٹریکشن کی حالت میں جب لکھنؤ میں شیعہ سنی فساد
ہوا اور نرسیں آکر بتاتی تھیں کہ آج اتنے شیعہ لڑکے مارے گئے اور آج اتنے سنی
تو اسی حالت میں لیٹے لیٹے انہوں نے ایک نظم کہی "لکھنؤ تو نہیں"

لکھنؤ تو نہیں

عزا میں بہتے تھے آنسو یہاں لہو تو نہیں
یہ کوئی اور جگہ ہے یہ لکھنؤ تو نہیں

یہاں تو چلتی ہیں چھریاں زباں سے پہلے
یہ میر انیس کی آتش کی گفتگو تو نہیں

چمک رہا ہے جو دامن یہ دونوں فرقوں کے
بغور دیکھو یہ اسلام کا لہو تو نہیں

تم اس کا رکھ لو کوئی اور نام موزوں سا
کیا ہے خون سے جو تم نے وہ وضو تو نہیں

سمجھ کے مال مرا جسکو تم نے لوٹا ہے
پڑوسیو وہ تمہاری ہی آبرو تو نہیں

یہ نظم فوراً "قومی آواز" میں چھپی کیفی کی اس ساڑھے چار مہینے کی تکلیف میں میں نے ایک دن بھی ان کو غصہ کرتے یا چڑھتے نہیں دیکھا البتہ جب صبح ہوتی تھی تو سب سے پہلا جملہ کیفی کی زبان سے نکلتا "موتی آج ایک دن اور پورا ہوا خدا کا شکر ہے" اور کبھی کہتے "میں ساگر (میرے بھانجے ارشاد احسن کا دو سالہ بچہ جسکو کیفی بے انتہا چاہتے ہیں) کا ہاتھی کبھی نہیں بن سکوں گا"

لیکن خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ عرصہ بھی گذر گیا اور کیفی کی قوت ارادی ڈاکٹروں کی محنت اور لگن نے انہیں پھر سے چلنے پھرنے کے قابل بنا دیا۔

INDIAN PEOPLES. THEATER یعنی اپٹا کے پریزیڈنٹ ہیں ہر میٹنگ میں شریک ہوتے ہیں لوگوں کو پکڑ پکڑ کر ممبر بناتے ہر ڈراموں کے ترجمے کرواتے ہیں خود ڈرامے لکھتے ہیں "آخری شمع" ڈرامہ کیفی کا لکھا ہے جو فرحت اللہ بیگ کے "دلی کے آخری یادگار مشاعرے" سے اخذ کیا گیا ہے۔ آج کل "زہر عشق" کو منظوم

ڈرامے کی شکل میں لکھ رہے ہیں جو بہت ہی دلچسپ ہے۔ شاعری کرتے ہیں فلموں کے گانے لکھتے ہیں غرض کہ کوئی ایسا کام نہیں جو وہ نہ کرتے ہوں، برسوں بعد ترقی پسند مصنفین کی میٹنگیں پھر سے شروع کرائی ہیں ابھی تک تو یہ میٹنگیں ہمارے گھر پر ہی ہوتی ہیں۔ میٹنگوں کے لئے کسی جگہ کی تلاش میں ہیں ۱۹۴۷ء میں یہ میٹنگس سجاد ظہیر کے گھر پر ہوا کرتی تھیں۔ کوئی پرچہ بھی نکالنا چاہتے ہیں۔

ایک ڈاکٹر نے مجھ سے کہا کہ فالج کے بعد ہم نے کسی مریض کو کام کرتے نہیں دیکھا۔ کیفی کو ۱۹۷۴ء میں پدم شری کا خطاب بھی ملا اپنے انتخاب "آوارہ سجدے" کیلئے تین ایوارڈ لئے۔ جس کے بارے میں میں پہلے لکھ چکی ہوں اور بدقسمتی دیکھئے کہ ہمارے ملک کے لوگوں نے اس کتاب کے چھپنے پر پابندی لگادی۔ بعض لوگوں کو ضد ہے کہ اس میں سے "بہر تسمیہ بابا" نظم نکال دی جائے اور اور کیفی کو ضد ہے کہ وہ اس نظم کے بغیر ہرگز کوئی کتاب نہیں چھاپیں گے غرض کہ ایک اچھی کتاب جو ان کا انتخاب ہے لوگ اسے پڑھنے سے محروم رہ گئے مجھے کبھی کبھی بہت دکھ ہوتا ہے۔

بے حد حساس ہیں اگر کچھ خریدنا بھی ہوتا ہے تو کوشش کرتے ہیں کہ کوئی گانا مل جائے اور پیسے مل جائیں تو وہ کام کریں۔

کبھی کبھی شبانہ چڑھ کر کہتی ہے "ابا اگر یہی پیسے بابا (میرا بیٹا جو شبانہ سے چھوٹا ہے) کماتا تو آپ ہرگز اتنا پرہیز نہ کرتے" تو ہنس کر جواب دیتے ہیں "نہیں بیٹے انسان کو اس وقت تک اپنا بوجھ خود اٹھانا چاہئے جب تک اس کی طاقت ساتھ دے"

ان کی پلیٹ میں کھانا ڈالنے سے لیکر کپڑوں کا خریدنا سلوانا یہ ہمیشہ سے میرا کام رہا ہے اور آج تک ہے۔ ایک بار کیفی نے شکایت کی کہ پاجامہ تھوڑا چھوٹا ہوتا ہے۔ پہننے میں پھنستا ہے۔ میں نے درزی سے شکایت کی تو وہ ہنس کر بولا "اگر ہم آپ کے سیٹھ کو دیکھے گا تو صحیح ناپ لے گا سیٹھ کو تو ہم نے دیکھا بھی نہیں تو

کپڑا کیسے برابر ہوگا" یہ تو حالت ہے پھر ایک دن پکڑ کر درزی کے پاس لے گئی۔

بیماری کے بعد کچھ زیادہ چپ سے ہو گئے ہیں کبھی کبھی ڈپریشن بھی آجاتا ہے۔ لکڑی پکڑ کر چلنے سے انتہائی نفرت کرتے ہیں لیکن مجبوری ہے لکڑی پکڑنی ہی پڑتی ہے چلتے ہوئے اگر کسی نے ذراسی بھی مدد کرنی چاہی تو بری طرح چڑھ جاتے ہیں کسی کی مدد قبول کرنا بالکل پسند نہیں کرتے۔

کبھی کبھی بہت دکھ بھرے لہجے میں کہتے ہیں "کیا میں اپنا دوسرا ہاتھ کبھی بھی استعمال نہیں کر سکوں گا" میں بچوں کی طرح سمجھانے لگتی ہوں "ایک رات جب آپ سو کر اٹھیں گے تو حیران رہ جائیں گے کیونکہ آپ کا دوسرا ہاتھ بھی کام کرنے لگے گا اور فیوزو تھریپی سے جان مت چھڑاؤ اسے روز کرتے رہو خدا میں بڑی طاقت ہے وہ کوئی بھی معجزہ کر سکتا ہے اور جب تک میرا بایاں ہاتھ آپ کا ہی تو ہے"

کتابیں خریدنا ماؤنٹ بلانٹ فونٹن پن تحفے میں قبول کرنا اور پھول پودے لگوانا ان کی دلچسپ ہابی ہے اپنے مالی کو بہت پیار کرتے ہیں اور وہ بھی ان کو بہت چاہتا ہے۔

مرغوب غذا گوشت ہے اچھا پکا ہوا گوشت بہت شوق سے کھاتے ہیں میں نے ایک بڑا فلیٹ سمندر کے کنارے خرید لیا ہے بہت خوبصورت اور پُرفضا جگہ ہے لیکن کیفی ہرگز وہاں رہنے پر تیار نہیں ہوتے کہتے ہیں میں کسان ہوں مجھے زمین سے پیار ہے یہ پھول اور پودے تو مجھے زندہ رکھتے ہیں۔

صبح کی چاء ہم اپنے چھوٹے سے لان میں بیٹھکر پیتے ہیں وہ اخبار پڑھتے رہتے ہیں اور میں گذرے ہوئے دن کا حساب نوکر سے لیتی رہتی ہوں اسی ماحول سے متاثر ہو کر کیفی نے ایک پیاری سی نظم کہی ہے "ایک لمحہ"

ایک لمحہ

زندگی نام ہے کچھ لمحوں کا
اور ان میں بھی وہی اک لمحہ

جس میں دو بولتی آنکھیں
چاے کی پیالی سے جب اٹھیں
تو دل میں ڈوبیں
ڈوب کر دل سے کہیں
آج تم کچھ نہ کہو
آج میں کچھ نہ کہوں
بس یونہی بیٹھے رہیں
ہاتھ میں ہاتھ لئے
غم کی سوغات لئے
گرمیٔ جذبات لئے
کون جانے کہ اسی لمحے میں
دور پربت پہ کہیں برف پگھلنے ہی لگے

شبانہ اعظمی

کیفیؔ اعظمی میرے ابّا

مجھ پر اکثر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ میں اپنے ابا سے جنون کی حد تک متاثر ہوں۔ میں اپنے دوستوں کو ان کی اپنی ذاتی خوبیوں اور ان کی اپنی انفرادی شخصیت کی بنا پر دیکھنے کی بجائے اُن کا موازنہ اپنے ابا سے کرتی ہوں۔

اس قسم کی باتیں سن کر جو میرا ردّعمل ہوتا ہے اس کا انحصار میری ذاتی ذہنی کیفیت کے مطابق ہوتا ہے۔ کبھی تو یہ سب سن کر میں اسے ہنسی میں ٹال دیتی ہوں کبھی دل ہی دل میں خوش ہوتی ہوں اور کبھی کبھی بے حد غصّہ بھی آتا ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ میں نے اس پہلو پر کبھی سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا۔

لیکن آج جب میں ابا کے بارے میں یہ مضمون لکھنے بیٹھی ہوں تو واقعی سوچ رہی ہوں کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میں عام بچّوں کے مقابلے میں اپنے ابا سے بہت زیادہ پیار کرتی ہوں۔ کیا میں ابا کو اپنے بھائی بابا سے زیادہ تو نہیں چاہتی ہوں ؟۔ یہ سب کچھ بچکانا سا لگتا ہے۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ ابا میری نظروں میں ایک بہت ہی خاص آدمی ہیں۔ اور میرے لئے وہ سب سے زیادہ چہیتے انسان ہیں۔

یہ بات میں نے اپنے بچپن میں ہی محسوس کرلی تھی کہ میرے ابا دوسرے "ڈیڈیوں" سے بالکل الگ قسم کے انسان ہیں۔ وہ اُن کی طرح صبح اُٹھ کر "دفتر" نہیں جاتے اور نہ ہی دوسرے بچوں کے معززؔ "باپاؤں" کی طرح قمیض اور پتلون ہی پہنتے ہیں اور نہ ہی ان کی طرح انگریزی بولتے ہیں۔ اپنی کلاس کے دوسرے بچوں کی طرح میں اپنے ابا کو ڈیڈی کہہ کر مخاطب نہیں کرتی اور یہ لفظ "ابا" کانوں میں کچھ عجیب سا کافی کھُردرا، کھُردرا سا لگتا تھا۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے میں اپنی چوتھی اور پانچویں کلاس کی سہیلیوں میں اپنے آپ کو دل ہی دل میں کچھ "ذات باہر" محسوس کرتی تھی۔ میں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ بہت جلد ہی سیکھ لیا کہ اپنی ہم جماعت لڑکیوں سے بات چیت کرتے وقت "ابا" کا ذکر کرنا ہی گول کر دوں۔ اگر کوئی پوچھتا کہ "ابا" کیا کرتے ہیں۔ تو میرا گول مول جواب ہوتا تھا "بزنس"۔ یہ تو میں تصور بھی نہیں کرسکتی تھی کہ میں اس بات کا اعتراف کروں کہ میرے ابا "شاعر" ہیں۔ یعنی دوسرے لفظوں میں کہوں کہ وہ ایک بے کار قسم کے انسان ہیں اور کوئی کام وام نہیں کرتے۔ لیکن پھر ایک دن ایک معجزہ ہوا۔

میری ایک ہم جماعت لڑکی نے کہا کہ اُس کے "ڈیڈی" نے میرے ڈیڈی کا نام اخبار میں پڑھا ہے۔ اخبار والوں نے میرے ڈیڈی کی ایک نظم کی بہت تعریف کی ہے۔ اس انکشاف نے مجھے فوراً اپنے ابا کا قائل کر دیا۔ اور میں نے فوراً اپنے "ابا" کو "ابا" تسلیم کرلیا..... وہ بھی کُرتے پاجامے کے ساتھ۔ واقعی میرے ابا دوسروں سے بالکل مختلف اور خاص الخاص انسان ہیں "ہے کوئی اور بچہ میری کلاس میں جس کے ڈیڈی کا نام اخبار میں چھپا ہو.....؟"

پھر بھی اُن کی شاعری کیا ہے۔ وہ کیا لکھتے ہیں اس کی سوجھ بوجھ مجھ میں بہت دیر سے آئی۔ جب میں نے KEATS اور WORDSWORTH کی نظمیں اسکول میں پڑھیں تب میری سمجھ میں آنے لگا کہ شاعری کیا ہوتی ہے اور شاعر کسے کہتے ہیں۔ میرے ابا بھی "شاعر" ہیں، یہ جان کر مجھے اچھا لگنے لگا اور میں گھر کی اُن محفلوں میں زیادہ دلچسپی لینے لگی جس میں فراقؔ گورکھپوری اور جوشؔ ملیح آبادی جیسے ممتاز شاعر شرکت کرتے تھے۔ میں ہمہ تن گوش اُن کے وہ شعر سنتی جو میری سمجھ میں قطعاً نہیں آتے تھے۔ لیکن اُن کے لفظوں کی ترتیب اور خوبصورتی اور موسیقیت کانوں میں رس سا گھول دیتی تھی۔

یہ سارا ماحول میرے لئے بے حد پُرکشش تھا۔ ادبی گفتگو کی روانی۔ گلاسوں کی کھنک اور سگریٹ کا مرغولے کھاتا ہوا دُھواں۔ پورے کمرے میں پھیل جاتا تھا۔ میں نے مشاعروں میں بھی جانا شروع کر دیا۔ ساحر لدھیانوی بے حد ہر دل عزیز تھے اور سردار جعفری کا لوگوں کے دلوں میں بے حد احترام تھا۔ لیکن کیفی اعظمی کا اپنا ایک ہی جادو تھا۔ وہ مشاعرے کے آخری چند شعراء میں ہوتے۔ اور اپنی گہری اور پاٹ دار آواز اور ادائیگی کے حسن اور قوت سے لوگوں کا دل جیت لیتے تھے۔ انھیں مشاعروں میں میں نے کیفی کی نظم "ابن مریم" سنی جو میری پسندیدہ نظم بن گئی... اور پھر اور نظمیں "عادت"۔ "دائرہ" وغیرہ۔ ایک باپ کی حیثیت سے ابا کا اثر شاید مجھ پر وہی ہوگا جو کسی بھی باپ کا اپنی اولاد پر ہوتا ہے۔ لیکن اُن کی شاعری نے ہر بار مجھے ایک نئے سرے سے مرعوب کیا ہے۔

مجھے قطعاً اس بات کا دعویٰ نہیں ہے کہ میں ابا کی شاعری کو پوری طرح سمجھتی ہوں لیکن اُن کی شاعری کے جن پہلوؤں نے مجھے خاص طور سے متاثر کیا ہے۔ وہ ہے ان کی زبان کی قوت نظر کی گہرائی اور وسعت اور ان کے استعاروں کی فکر انگیزی۔ اُن کی شاعری میں کیفی کے ذاتی غم اور مسرتیں ان کی ذاتی وارداتیں نہیں رہتیں۔ بلکہ تمام انسانوں کے دُکھ اور درد اُن میں سمٹ آتے ہیں۔ اور اس طرح غم جاناں غم دوراں میں بدل جاتا ہے۔ اُن کی جدّوجہد عوامی جدّوجہد کا سیل رواں بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں جھونپڑپٹی کے لوگوں میں کام کر رہی ہوتی ہوں یا عورتوں پر ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھاتی ہوں یا پھر فرقہ پرستی کے خلاف جدّوجہد میں حصّہ لیتی ہوں تو ابا کی کوئی نہ کوئی نظم اس وقت میری رہنمائی کرتی ہے اور مجھے قوت بخشتی ہے۔ "مکان" "عورت" اور "بہروپنی" وہ نظمیں ہیں جو میری جدّوجہد کے ہر موڑ پر ہمیشہ میرا سرمایۂ قوت بنتی ہے۔

مجھے اپنی کم عمری کے وہ دن بھی اچھی طرح یاد ہیں جب میں اپنی اس حماقت پر فخر کرتی تھی کہ میں اخبار نہیں پڑھتی۔ گھر میں ہونے والی سیاسی بحثوں سے بے حد بور ہو جاتی تھی اور جب مدن پورہ اور دوسرے مزدور علاقوں سے محنت کش لوگ ابا سے ملنے آتے تھے۔ تو میں جان بچا کر بھاگ جایا کرتی تھی۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ میرے اس سطحی اور تنگ چڑھے پن کے رویے

سے ابّا دل برداشتہ کیوں نہیں ہوئے۔ آخر میں اُن کی بیٹی تھی اور وہ مجھے بچپن میں اپنے ساتھ مدن پورہ میں ہونے والے بہت سے مزدوروں کے جلسے میں لے جا چکے تھے۔ وہ مزدوروں میں خود بھی کام کرتے تھے۔ یقیناً ان کی یہ خواہش ہوگی کہ میں مزدوروں اور اُن کے مسائل میں دلچسپی لوں۔ اور ایک طرف میں تھی کہ ان لوگوں سے کترا رہی تھی۔ دراصل کانوینٹ کی تعلیم نے مجھ میں ایک طرح کی بے رُخی اور بے اعتنائی پیدا کر دی تھی جو مجھے ایسی تمام باتوں سے دور لے گئی تھی۔ لیکن ابّا نے ایک بار بھی میرے اس رویّے پر غصّے کا اظہار نہیں کیا۔ اور نہ ہی کبھی انھوں نے اپنے خیالات مجھ پر لادنے کی کوشش کی (سچ تو یہ ہے کہ وہ کسی معمولی سے معمولی مسئلے پر بھی بن مانگے کبھی اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتے۔ اُن کی رائے چاہیئے تو مانگنی پڑے گی۔ اس معاملے میں اُن کا رویّہ مجھ سے اور ممّی سے بالکل الگ ہے۔ کیوں کہ ہم دونوں پوری دنیا کو مانگے بن مانگے اپنی زرّیں رائے دینے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔)

آج سوچتی ہوں تو لگتا ہے کہ شاید وہ جانتے تھے کہ اُگتا ہوا پودا لاکھ سوچے کہ وہ اپنی جڑوں سے دور ہو رہا ہے لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے۔ خاک کہیں بھی اُڑتی پھرے پہنچتی وہیں ہے جہاں کا خمیر ہوتا ہے۔ سو وقت کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ میں صبح کی بھولی شام سے تھوڑے پہلے ہی گھر آ گئی۔ اور اس گھر سے میرا مطلب اپنے ابّا کی سیاسی اور سماجی سوچ سے ہے۔

آج کل جب میں کبھی کبھی اس بات سے مایوس ہو جاتی ہوں کہ حالات کو جس تیزی سے بدلنا چاہیئے بدل نہیں رہے۔ جھونپڑپٹی والوں کی جدّوجہد کو مفاد پرست عناصر کامیاب ہونے سے روکے ہوئے ہیں۔ غریب عورتوں کے مسائل آج بھی وہی ہیں۔ فرقہ پرستی کا عفریت آج بھی شہروں کی سڑکوں پر ناچ رہا ہے۔ ایسے بھی لمحے آتے ہیں جب اُمید کمزور ہو جاتی ہے۔ ایسے لمحوں میں میری ماں مجھے کیفی صاحب کی ان کوششوں کی یاد دلاتی ہیں جو وہ اپنی اس صحت کے باوجود اپنے گاؤں کی خاطر کر رہے ہیں۔ گذشتہ دس برسوں میں اُن کی انتھک کوششوں کی وجہ سے اب اس چھوٹے سے گاؤں میں سڑک ہے۔ بجلی ہے۔ ایک چھوٹا سا چھ بستروں والا اسپتال ہے۔ ایک اسکول ہے۔ پوسٹ آفس ہے۔ اور یہ سب حاصل کرنا ایک چھوٹے سے گاؤں کے لئے آسان نہیں تھا۔ ایک ایک قدم پر انھیں مخالفتوں اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ (سرکار اور سرکاری

افسروں سے کوئی کام کروالینا اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا کہ جوئے شیر لانا) اگر اُن کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ہمت ہار بیٹھتا۔ لیکن ابا میں لوگوں کو منظم کرنے اور اُن کی رہنمائی کرنے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ جب ۱۹۷۲ء میں اُن پر فالج کا حملہ ہوا تو ہم میں سے کوئی بھی یہ سوچ نہیں سکتا تھا کہ ابا اپنی جدّ و جہد جاری رکھ سکیں گے۔ لیکن ڈاکٹروں نے ہمیں وارننگ دی کہ ہم ابا کو کسی کام سے نہ روکیں کیونکہ وہ اپنی قوت ارادی اور زندگی سے بے پناہ محبت کے بل بوتے پر ہی اپنی بیماری پر قابو پا سکتے ہیں۔ وہ آج مفلوج ہونے کے باوجود مفلوج نہیں ہیں۔ میں کیفی صاحب کی قوت ارادی ان کے عمل اور ان کے ناقابلِ تسخیر جذبے کو سلام کرتی ہوں۔

سردار جعفری جو ہمارے خاندان کے گہرے دوست ہیں اور ابا کو اپنا چھوٹا بھائی مانتے ہیں مذاق میں کہا کرتے ہیں "کیفی نے فالج کے ساتھ اتنی زیادتی کی ہے کہ وہ اب ڈر کر کسی دوسرے شاعر پر نازل نہیں ہو سکتی۔"

ابا ان دنوں بمبئی میں نہیں رہتے۔ بمبئی میں وہ خود کو اکیلا محسوس کرتے ہیں۔ اگر انھیں دس دن بھی بمبئی میں رہنا پڑ جائے تو اُکھڑے اُکھڑے سے لگنے لگتے ہیں۔ میری اور میرے بھائی بابا کی خواہش ہے کہ وہ ہمیشہ کی طرح اب بھی ہمارے ساتھ رہیں۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ اُن کا دل مجواں میں لگا رہتا ہے۔ جب وہ ہمارے پاس نہیں ہوتے تو میں ان کی کمی محسوس کرتی ہوں ابا اگر بمبئی میں ہوتے ہیں اور میں کہیں باہر ملک سے واپس آتی ہوں تو وہ مجھے ہوائی اڈے پر لینے ضرور آتے ہیں۔ چاہے کوئی بھی وقت ہو۔ ہوائی اڈے کے گرین چینل سے نکلتے وقت اُن کا چہرہ تلاش کرنے میں مجھے کوئی زیادہ وقت نہیں لگتا۔ اور اُن کو دیکھ کر میرا دل کھل اُٹھتا ہے۔

میں اور ابا بہت کھل کر بات نہیں کرتے۔ یوں تو میں امّی سے زیادہ قریب ہوں لیکن جب میرا ذہن صاف نہیں ہوتا اور مجھے کوئی اہم فیصلہ کرنا ہوتا ہے تو پھر میں ابا ہی سے پوچھتی ہوں انھیں سے رائے لیتی ہوں۔ زندگی میں بڑے سے بڑے سنگین مرحلے پر ابا ہی میری رہنمائی کرتے ہیں معاملہ کتنا ہی گمبھیر کیوں نہ ہو۔ ابا بڑی مدبّری سے کام لیتے ہیں۔ وہ جذبات کو ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔ معاملے کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر وہ اپنی رائے دیتے ہیں۔ جب فرقہ وارانہ یکجہتی کے سلسلے میں میں دہلی سے میرٹھ تک پد یاترا (پیدل چلنے) میں شامل ہونے کی تیاری

کر رہی تھی تو میں بے حد گھبرائی ہوئی تھی۔ مجھے وارننگ دے دی گئی تھی کہ حالات پُر تشدد ہو سکتے ہیں اور کسی فلمی ایکٹریس کے لئے ان حالات میں میرٹھ جیسے کسی بھی شہر میں اس طرح جانا خطرے سے خالی نہیں۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ جب میں سب کو خدا حافظ کہہ رہی تھی تو جاوید اور میرے بھائی بابا۔ بھابھی تنوی اور میری ماں یہی ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ میرے لئے پریشان نہیں ہیں۔ مگر میں دیکھ سکتی تھی۔ کہ وہ سب اندر سے میرے لئے فکر مند ہیں۔ اور اسی بات نے ایک لمحے کو مجھے بھی خائف سا کر دیا۔ میں آگے بڑھی اور میں نے ابا کو پیٹھ کی طرف سے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ میں نے اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کو بہنے سے روکے رکھا۔ ابا نے مجھے کھینچ کر اپنے سامنے کر لیا اور میری آنکھوں میں بڑی حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میری بہادر بیٹی ڈر رہی ہے؟ جاؤ تمھیں کچھ نہیں ہوگا۔" ان کی آنکھوں میں کہیں میرے لئے خوف کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ اُن کی بے خوف آنکھیں دیکھ کر یکایک مجھے اپنے اندر ایک بے پناہ قوت کا احساس ہوا۔ مجھے ایسا لگا جیسے اُن کی آنکھوں سے ایک طاقت تیرتی ہوئی مجھ تک آ گئی ہے اور میری پوری ذات میں پھیل گئی ہے۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دہلی سے میرٹھ کی وہ پدیاترا بے حد کامیاب رہی۔ راستے میں ہر گاؤں ہر بستی کے لوگوں نے ہمارے جلوس کا خیر مقدم کیا۔ ہم نے ان سے باتیں کیں اور کئی جگہ میں نے مجمع کو فرقہ واریت کے خلاف ابا کی نظم "بہروپنی" بھی سنائی۔ اور ہر بار نظم سناتے ہوئے مجھے ایسا لگا کہ صرف آواز میری ہے ورنہ ابا ہی ان لوگوں کو خطاب کر رہے ہیں۔

جب بھی میں نے ابا کی رہنمائی پر بھروسہ کیا مجھے کامیابی ملی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب تک میرے سر پر ابا کا ہاتھ ہے اور جب تک اُن کے شعور کا سرمایہ میرے پاس ہے۔ زندگی کے دشوار سے دشوار موڑ پر بھی مجھے کبھی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

محمد ایوب واقف

میرا پڑوسی

"زیرِ نظر مضمون میں کیفی اعظمی صاحب کے بارے میں جتنی بھی باتیں قلم بند کی گئی ہیں ان میں حقائق سے اغماض روا رکھ کر کسی طرح کی افسانہ طرازی نہیں کی گئی ہے اکثر ملاقاتوں میں کیفی صاحب نے ان باتوں کی نشاندھی کی ہے پھر ہم دونوں بہ ہم دیگر بہت قریب ہیں اعظم گڈھ کے ایک ہی مقام سے وابستہ ہیں بچپن سے میرے کان ان کے نام سے آشنا ہیں۔ کیفی صاحب کے بارے میں ان کے بزرگوں کے بارے میں اپنے علاقے کے لوگوں سے میں سنتا آرہا ہوں۔ ان سنی باتوں کو بھی میں نے من وعن صفحۂ قرطاس پر نہیں اتارا ہے بلکہ کیفی صاحب سے دو بدو بات کر کے سچائی کی تہہ تک پہونچ کر ہی ان باتوں کو ضبطِ تحریر میں لانے کی جرأت کی ہے اس لئے اب ان باتوں کے بارے میں میں کسی دُبدھے کا شکار نہیں ہوں۔"

اعظم گڈھ کی تحصیل پھولپور میں میزواں (مجواں) (MEZWAN)

ماہل (MAHUL) اور پورہ نورم بیسہ POORAH NOORAM BAISA

تین قریبی مقامات ہیں۔ میزداں کیفی صاحب کا وطن ہے۔ ماہل سید احتشام حسین مرحوم کا اور پورہ نورم بیسہ میرا۔ یہ تینوں مقامات ایک مثلث کے تین زاویوں کی نمائندگی کرتے ہیں کاغذ پر اگر اس مثلث کو بنایا جائے تو کچھ اس طرح ہوگا۔
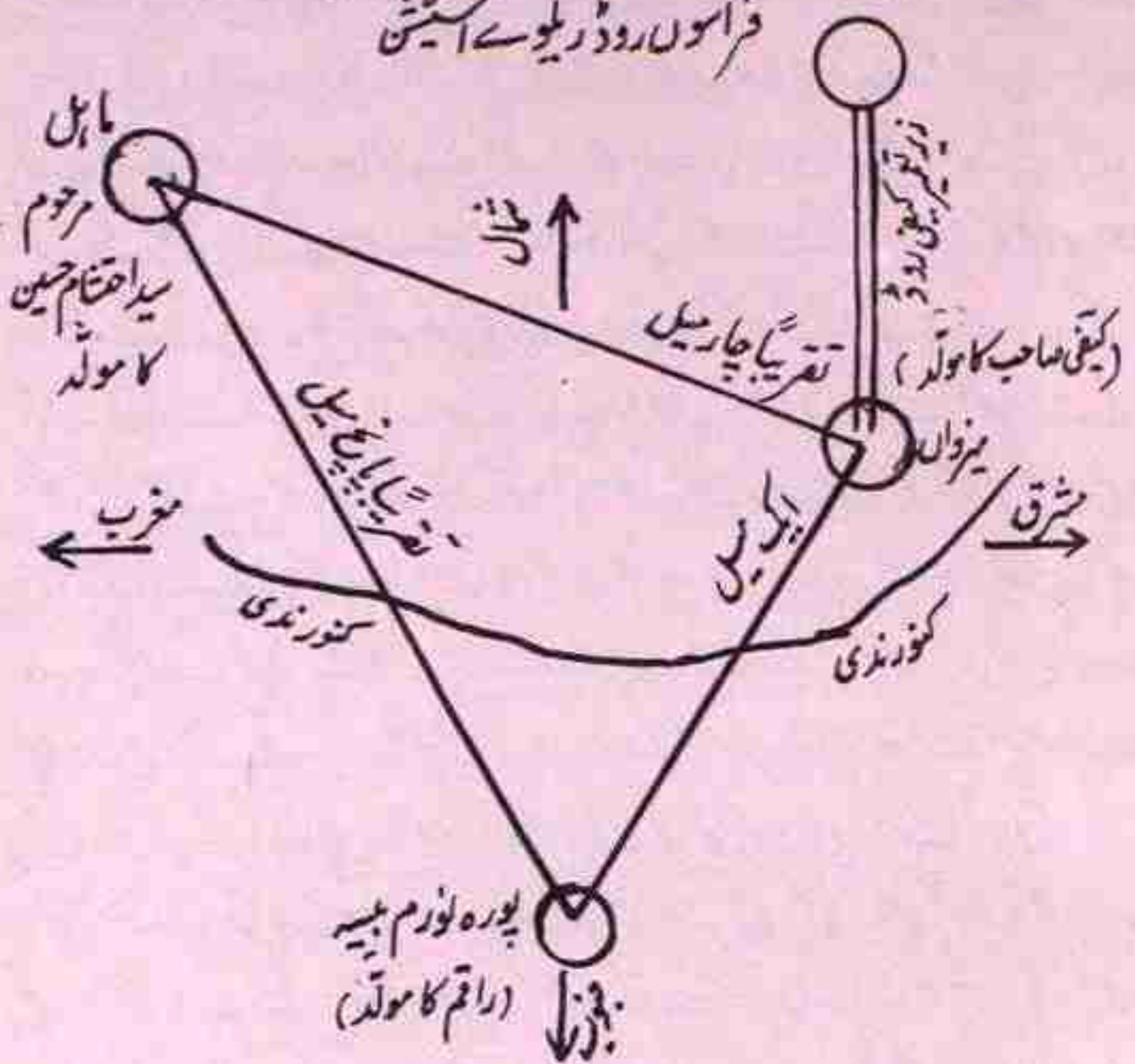
میزواں اور پورہ نورم بیسہ کے درمیان کا فاصلہ ایک میل سے زیادہ نہیں ہے۔ ان دو مقامات کو مشہور کنور ندی ملاتی ہے یا یوں سمجھ لیجئے یہ دو گاؤں کنور ندی کے دو ساحلوں پر آباد ہیں۔ کیفی صاحب کا گاؤں شمال مشرقی ساحل پر آباد ہے اور میرا جنوب مغربی ساحل پر۔ احتشام حسین مرحوم جس قصبے میں پیدا ہوئے وہ شمال مغربی سرے پر آباد ہے کیفی صاحب اور مرحوم سید احتشام حسین ہمارے دیار کی دو شیعہ بستیوں سے تعلق رکھتے ہیں میرا تعلق وہاں کے شیخوں کی ایک چھوٹی سی بستی سے ہے۔ ہمارے صوبے میں شیعہ حضرات کی بستیاں جہاں جہاں آباد تھیں ایک زمانہ میں وہاں بڑی تابناک فضا

INVIRONMENT تھی۔ آزادی کے بعد وہ بستیاں تباہیوں اور بربادیوں کے منھ کا لقمہ بن گئیں۔ گویا اپنے جلیل القدر، اور سرتا قدم شمع رسالت سے منور اسلاف کا مرثیہ لکھنے اور پڑھنے والوں کا مرثیہ اب یہ بخت سیاہ بستیاں پڑھ رہی ہیں دراصل ہوا یہ کہ یوپی میں مسلمانوں کا یہ فرقہ حد درجہ فارغ البال اور آسودہ حال تھا اس فرقے کے بیشتر افراد بڑے بڑے تعلقوں اور علاقوں کے مالک تھے ان کے پاس باغ بغیچے اور زمینیں تھیں مگر یہ لوگ کھیتی باڑی کے کاموں سے مطلقاً ناواقف تھے۔ ان کے سارے کام اندرون خانہ سے لے کر بیرون خانہ تک ان کا رندے اور نوکر چاکر کیا کرتے تھے۔ ان کے آباد کئے ہوئے کسانوں اور اسامیوں سے انھیں ہزاروں روپئے محصولات کی شکل میں ملتے تھے۔ چونکہ ان گھرانوں کے افراد کو زراعت کے پیشے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی اس لئے ان کا سارا ذوق و رجحان تعلیم اور علم و ہنر کی طرف تھا۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے تو پتہ چلے گا کہ اس طبقے کے لوگ یوپی کے شہروں میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ اور لکھنؤ چونکہ اس صوبے کا صدر مقام تھا جسے مغلیہ سلطنت کے زوال ہی کے دوران میں آصف الدولہ نے خوشحالیوں اور آسائشوں کا مرکز دلنواز بنا دیا تھا لہٰذا دور دور سے شیعہ حضرات کھنچ کھنچ کر اس گہوارۂ علم و ادب میں داخل ہونے لگے۔ اس شہر ہزار داستان سے شیعہ حضرات کا قلبی لگاؤ اس کے فرماں رواؤں کی شیعیت کا مرہون منت تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤ شیعوں کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ اور یہ مرکز آج بھی اپنی تمام تر بربادیوں اور ہلاکتوں کے باوجود قائم ہے

موضع میزواں جسے کیفی صاحب کا مولد و مسکن ہونے کا فخر حاصل ہے یہ بھی جیسا کہ میں نے عرض کیا شیعوں ہی کی ایک چھوٹی سی دور افتادہ بستی تھی۔ اس بستی کے شیعہ حضرات اگرچہ دیگر مقامات کے شیعوں کی طرح امیرانہ کروفر کے مالک تو نہ تھے لیکن مالی اعتبار سے خود کفیل تھے۔ کیفی صاحب کے والد سید فتح حسین ایک ایسے ہی گھرانے کی نمائندگی کرتے تھے جسے نانِ شبینہ کی خاطر بھٹکنے اور اس کے لئے ذہنی اذیتوں کا رونا رونے کا قدرت نے موقع

نہیں دیا تھا۔ لیکن آزادی کے بعد دوسری شیعہ بستیوں کی طرح اس بستی کا بھی شیرازہ بکھر گیا کیا پتہ تھا کہ جس آزادی کے حصول کے لئے وہ تن من دھن کی بازی لگا رہے ہیں جب آزادی ملے گی تو خانماں بربادی سب سے پہلے انھیں کے حصے میں آئے گی مگر ہوا وہی۔ مکانات مکینوں سے خالی ہو گئے، کچھ آزاد ہندوستان میں رہ کر ہی قسمت آزمائی کے لئے کمر بستہ ہوئے کچھ ڈر اور خوف سے تاب نہ لا کر نئی مملکت پاکستان ہجرت کر گئے۔

دشمن کو بھی اللہ چھڑائے نہ وطن سے
جانے وہی بلبل جو بچھڑ جائے چمن سے

چنانچہ آپ دیکھیں گے تو پتہ چلے گا کہ خود کیفی صاحب کے پانچ بھائیوں میں اکیلے کیفی اعظمی ہیں جو ہندوستان میں رہ گئے ان کے دوسرے بھائی پاکستان کے شہر کراچی میں آباد ہو گئے۔ کیفی صاحب کی پانچ بہنوں میں چار تو خیر آزادی سے پہلے ہی اللہ کو پیاری ہو گئیں بڑی بہن جو ماشاء اللہ ابھی حیات ہیں اور بھرے پرے گھر کی مالکہ ہیں کراچی ہی میں ہیں۔ غرضیکہ کیفی صاحب کے خاندان کے بیشتر افراد پاکستان ہی میں ہیں کیا پتہ کہ کیفی صاحب اگر ترقی پسندوں کے حلقہ بگوش نہ ہوئے ہوتے تو وہ بھی ہندوستان میں رہتے یا وہ بھی اسی دیار کے آب و گل کو اپنی زندگی بناتے جس دیار میں ان کے دوسرے بھائی ہیں۔

کیفی صاحب کا پورا نام سید اطہر حسین کیفی اعظمی ہے۔ لیکن اب انھیں سید اطہر حسین کیفی کوئی نہیں کہتا اب وہ صرف کیفی اعظمی ہیں اور اسی نام سے اپنوں اور پرایوں میں مشہور ہیں اب تو اپنے ماں باپ کا عطا کردہ نام زبان پر لانے میں انھیں کچھ تکلف سا ہوتا ہے۔ ایک بار یوں ہی باتوں باتوں میں میں ان سے کچھ پوچھ بیٹھا کہ کیفی صاحب آپ کا پورا نام کیا ہے؟ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ پورا نام بتانے میں انھیں کچھ پس و پیش ہوا۔ میں نے ان سے کہا حضرت ایک بار جوش ملیح آبادی سے کسی نے ان کا نام پوچھا تو وہ اپنا نام ہی بھول گئے تھے۔ کہیں آپ کے ساتھ بھی

ایسا ہی تو نہیں ہوا ہے۔ کہنے لگے نہیں بھائی عرصے کے بعد جب سے میرا اصل نام پوچھا گیا ہے تو دل کے نہاں خانے میں پرانی یادوں کے نقوش ابھر آئے اور میں ایک لمحہ کے لئے گونگا ہو گیا۔ ہاں تو میں آپ سے بتا رہا تھا کہ کیفی صاحب کا پورا نام سید اطہر حسین کیفی ہے ان کے والد کا نام سید فتح حسین تھا سید فتح حسین مرحوم کو اللہ نے دس اولادیں عطا کیں پانچ لڑکیاں اور پانچ لڑکے۔ پانچ لڑکوں میں کیفی صاحب سب سے چھوٹے ہیں لیکن مقبولیت اور ہر دلعزیزی میں وہ سب سے آگے ہیں کیفی صاحب کے والد سید فتح حسین صاحب مرحوم صوبہ اودھ کی ایک اسٹیٹ بلہرا میں تحصیلداری کے عہدے پر فائز تھے اسی زمانے میں انہوں نے لکھنؤ میں ایک مکان خرید لیا تھا اور اپنے سب بچوں کو وہیں بلالیا۔ میزواں تعلیمی و تہذیبی اعتبار سے بہت پسماندہ اور دور افتادہ مقام تھا وہاں بچوں کو رکھنے مطلب ان کے مستقبل کو مسمار کرنا تھا۔ اس لئے دور اندیش اور سلیم العقل باپ نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے وہاں کے صدر مقام لکھنؤ کو ترجیح دی۔ یہ وہ دور تھا جب انگریزی پڑھنا اور پڑھانا دونوں قابلِ مذمت شغل گردانا جاتا تھا۔ سر سید احمد خاں مرحوم و مغفور کی تمام تر مساعی کے باوجود انگریزی کی تعلیم ابھی تک ہندوستانی مسلمانوں کے گھروں میں بے دینی کی دلیل سمجھی جاتی تھی لیکن فتح حسین صاحب نے ایسے ناسازگار ماحول میں رہ کر بھی لڑکوں کو انگریزی تعلیم کیلئے لکھنؤ اور علی گڑھ کی جامعات میں داخلہ دلایا۔ خدا کی کرنی کہ اسی ایام میں ان کی چار لڑکیوں کی یکے بعد دیگرے موتیں واقع ہو گئیں۔ فتح حسین صاحب مذہب پرست تو تھے ہی انھیں وہم ہو گیا کہ انہوں نے لڑکوں کو انگریزی پڑھوانا شروع کیا مذہب گھر سے جاتا رہا خدا کو ناراضگی ہوئی اور ان کی بیٹیاں موت کا شکار ہو گئیں۔ فتح حسین صاحب کو بیٹیوں کے مقابلے میں بیٹوں سے زیادہ لگاؤ تھا اور جب یہ جانکاہ حادثہ پیش آیا تو دل ٹوٹ گیا۔ لہذا خدا کی ناراضگی کو رحمت و مرافقت میں بدلنے کیلئے آج کے کیفی اور اس زمانے کے اطہر حسین کو انہوں نے مولوی بنانے اور علوم اسلامیہ سے

ان کے سینے کو بھر دینے کی غرض سے لکھنؤ کے شیعوں کے مشہور مدرسہ سلطان المدارس میں داخل کرایا۔ سلطان المدارس میں ان کا داخلہ اس وقت ہوا جب پورے ملک میں آزادی کا صور پھونکا جا چکا تھا۔ ہر دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات ہلکورے لینے لگے تھے۔ گاؤں گاؤں قصبہ قصبہ اور شہر شہر انگریزوں اور انگریزوں کی حکومت کے خلاف نعرے بازیاں، ایجی ٹیشن اور اسٹرائیک ہو رہی تھی، تعلیمی اداروں میں اس کے اثرات کچھ زیادہ ہی تھے، سلطان المدارس میں آئے ہوئے کیفی اعظمی کو ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ انہوں نے چند طلباء پر مشتمل ایک یونین بنا لی اور آزادی کی لہر کو تیز کرنے کے لئے ایجی ٹیشن شروع کر دیا، مدرسے کے ارباب حل و عقد کو کیفی صاحب اور ان کے دوستوں کی یہ حرکتیں ناپسندیدہ لگیں، یونین کو تسلیم کرنے کی بجائے انہوں نے اُسے غیر قانونی قرار دیا۔ یونین کے طلبا پر مدرسہ والوں کے اس رویّے کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ الٹے انہوں نے اپنی سرگرمیوں کو اور تیز کر دیا۔ اور مسلسل اسٹرائیک چھیڑ دی۔ اور مدرسے کے ارباب حل و عقد نے اسٹرائیک میں ملوث طلباء کے نام نوٹس جاری کر دیئے۔ اور ان سے کہہ دیا گیا کہ ہوسٹل کے کمرے جلد از جلد خالی کر دیئے جائیں۔ طلباء نے ہوسٹل کے کمروں کو خالی کرنے سے انکار کر دیا۔ لاٹھی چارج ہوا۔ کیفی صاحب اور ان کے چند ساتھی زخمی ہوئے۔ زخمی ہونے کے بعد ان کے حوصلے پست نہیں ہوئے بلکہ اور بلند ہوئے اسٹرائیک کے دوران کیفی صاحب کا خاص کام یہ ہوتا تھا کہ وہ ایجی ٹیشنی نظمیں لکھتے اور طلباء کے جلسوں میں جو عام طور سے مدرسے کے صدر دروازے پر منعقد کئے جاتے جوش و خروش کے ساتھ پڑھتے۔

ایک بار سلطان المدارس کے صدر دروازے پر دوران اسٹرائیک یونین کا ایک جلسہ ہو رہا تھا کیفی صاحب لہک لہک کر اپنی احتجاجی نظمیں سنا رہے تھے سامنے سے تانگے پر ایک وجیہہ قسم کے شیروانی پوش صاحب آتے ہوئے نظر آئے۔ تانگا جب قریب آیا تو طلباء کی نگاہیں ان شیروانی پوش صاحب کی طرف

مرکوز ہوگئیں کیفی صاحب کے قدم ڈگمگانے لگے گمان یہ گذرا کہ یہ صاحب جو تانگے پر بیٹھے ہیں کوئی سرکاری آدمی ہیں رنگے ہاتھوں پکڑے گئے چالان ہو جائے گی۔ پھر وہ صاحب تانگے سے اتر کر کیفی صاحب کے پاس آئے کہنے لگے میں اس لئے رک گیا کہ آپ ایک اچھی نظم اچھے ڈھنگ سے سنا رہے تھے۔ میری خواہش ہے کہ میں آپ سے کچھ اور نظمیں سنوں اب آپ کو یہ جاننے کا شدید اشتیاق ہوگا کہ وہ صاحب کون تھے تو لیجئے ان نام سن ہی لیجئے وہ تھے اردو کے مشہور افسانہ نگار مرحوم علی عباس حسینی۔ علی عباس حسینی مرحوم، کیفی صاحب کو اپنے ساتھ اپنے گھر (بارود خانے) لے گئے انہوں نے مرحوم سید احتشام حسین اور اعظم حسین ایڈیٹر سرفراز (لکھنؤ) کو بھی بلوایا اس دن کیفی صاحب سے خوب نظمیں سنی گئیں علی عباس حسینی مرحوم ہی کے ایما پر اعظم حسین[1] نے دوسرے دن سرفراز کا اداریہ کیفی صاحب اور ان کی یونین کے مطالبات کی موافقت میں زوردار طریقے سے لکھا۔ سارے لکھنؤ میں اس کا چرچا رہا۔ دراصل یہیں سے کیفی اعظمی کی شہرت میں چار چاند لگنا شروع ہوا۔ پھر علی سردار جعفری بھی جوان دنوں لکھنؤ میں تھے اور آل انڈیا اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے جنرل سکریٹری بھی تھے کیفی صاحب کی درخواست پر سلطان المدارس آئے مدرسے کے ارباب حل و عقد سے گفت و شنید کی نتیجے کے طور پر کچھ مطالبات منظور ہوئے لیکن اسٹرائیک جاری رہی۔ کیفی صاحب کے بقول اتنی طویل اسٹرائیک شاید ہی کسی تعلیمی ادارے میں چلی ہو گی۔

بارود خانے میں علی عباس حسینی کے مکان پر کیفی صاحب اور سید احتشام حسین کے مابین یہ پہلی ملاقات تھی اور اس پہلی ملاقات نے ہی کیفی اعظمی صاحب کے مستقبل کے پلان کا تعین کر دیا۔ پھر ایسا ہوا کہ کیفی صاحب مرحوم احتشام حسین کی فرمائش پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے اس دم سے آج تک کیفی صاحب

---

[1] اردو کے مشہور شاعر شمیم کرہانی کے بڑے بھائی۔

ترقی پسند ادیب اور شاعر ہیں، ہندوستان میں آزادی کے بعد فکر و خیال کے بڑے بڑے طوفان لپٹے اور اٹھکر بیٹھے لیکن کیفی صاحب اپنی ڈگر پر خلوص اور دیانتداری کے ساتھ گامزن ہیں۔ وقت کی کسی ہوا نے ترقی پسند تحریک سے ان کے لگاؤ کو ختم نہیں کیا اس طرح کیفی صاحب جو مولوی بننے کیلئے سلطان المدارس میں داخل ہوئے تھے مولوی تو خیر نہ بن سکے البتہ کارل مارکس کے تیر کے گھائل ہو گئے اور اس طرح گھائل ہوئے کہ آج تک اس کا زخم باقی ہے۔

کیفی اعظمی کی تاریخ پیدائش نہ تو کیفی صاحب کو معلوم ہے اور نہ ان کے خاندان کے دوسرے افراد کو۔ وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں دیہی علاقوں میں پیدائش کی تاریخیں بایدوشاید ہی رکھی جاتی تھیں آج بھی تعلیم کے قدر دانی کے دور میں ہماری طرف گاؤں میں کون تاریخیں سنبھالتا ہے، کسی گھر میں کوئی پڑھا لکھا کسی میدان کا بڑا یا چھوٹا تیر انداز پیدا ہوا تو وہ خود اپنی تاریخ پیدائش کی تحقیق کر لیتا ہے یا پھر گاؤں کے بڑے بوڑھے اپنی یادداشت کے برتے پر کچھ قیاس آرائی کر دیتے ہیں کیفی صاحب کی عمر کے بارے میں بھی ان کے خاندان کے آس پاس کے کسی بڑے بوڑھے نے کوئی قیاس آرائی کر دی ہوگی اس قیاس آرائی کی بنیاد پر کیفی صاحب نے مجھے بتایا کہ جب انہوں نے پہلی غزل کہی تو اس وقت ان کی عمر کچھ گیارہ سال کی ہوگی واللہ اعلم بالصواب

کیفی صاحب کا شاعرانہ ذوق قدرت کا عطیہ ہے۔ ان کی جولانی طبع کو رنگ و روغن ان کے گھر کے شاعرانہ ماحول نے عطا کیا۔ ان کے بھائیوں میں سب کے سب شاعر تھے ان کے بڑے بھائی سید ظفر حسین کا تخلص مجروح تھا ان کے چھوٹے بھائی یوسف حسین کا تخلص بیتاب تھا۔ تیسرے نمبر کے بھائی شبیر حسین کا تخلص وفا تھا۔ تمام بھائیوں میں بقول کیفی صاحب یوسف حسین بیتاب اچھا کہتے تھے۔ لیکن کیفی صاحب اپنے بھائی شبیر حسین وفا سے کچھ زیادہ ہی متاثر تھے ان کی آواز میں بڑی شیرینی اور دلکشی پوشیدہ تھی۔ قصیدہ خوانی کی محفلوں میں جب وہ اپنی مترنم آواز میں پڑھنا شروع کرتے تھے تو محفل کا ہر فرد جھوم اٹھتا تھا۔ بھائیوں کی شعر گوئی کے

ساتھ ساتھ اساتذہ کے وہ تمام دواوین جو کیفی صاحب کے گھر میں موجود تھے بڑے کارآمد ثابت ہوئے کیفی صاحب نے مجھے بتایا کہ اگرچہ ان کے گھر میں بہت سے اساتذہ کے دواوین تھے لیکن میر انیس کا دیوان تو ہم سبھی بھائیوں کے لئے کحل الجواہر کا درجہ رکھتا تھا۔ کیفی صاحب نے دیوانِ میر انیس سے پورا پورا استفادہ کیا چنانچہ آپ ان کی شاعری کا مطالعہ کریں تو ان کی ابتدائی شاعری پر کلامِ انیس کا بڑا گہرا اثر دیکھ پڑے گا۔ ان کی بعد کی شاعری میں بھی کہیں کہیں انیس کا اثر ضرور مل جاتا ہے۔ اس لئے کہ انیس کی شاعری کا رعب ان کے تحت الشعور میں قائم ہے، انیس کے کلام سے اپنے لگاؤ کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا کہ

> "جب میں چھوٹا تھا تو میری بہن جو سب سے بڑی تھیں روزانہ مجھے انیس کے مرثیے سناتیں اور پھر میری عادت بن گئی کہ جب تک میں انیس کے دیوان سے دو چار بند اپنی بہن سے سن نہ لیتا تب تک رات بھر مجھے نیند نہیں آتی۔ میر انیس کا کلام سنتے سنتے مجھے ان کے دیوان کا کافی حصہ ازبر ہوگیا تھا اور چونکہ حافظہ قوی تھا اس لئے ازبر کرنے میں کسی طرح کی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ اور مجھے انیس اور کچھ دوسرے شعراء کے اشعار اتنی کثیر تعداد میں ازبر ہوگئے کہ ہمارے یہاں جو آئے دن بیت بازی ہوتی اسے میں ان اشعار کی مدد سے جیت لیا کرتا تھا۔"

میں یہ بتا رہا تھا کہ کیفی اعظمی صاحب کو شعر گوئی کی طرف مائل کرنے کے لئے ان بھائیوں کے شاعرانہ جوش و خروش نے بڑا کام کیا لیکن اس ضمن میں کیفی صاحب کے والد سید فتح حسین کا رول بھی کچھ کم اہم نہیں تھا: فتح حسین صاحب اگرچہ شاعر نہیں تھے لیکن شاعری سے ان کی دلدادگی ایک طرفہ چیز تھی، وہ آئے دن اپنے گھر پر محفل قصیدہ خوانی منعقد کرتے تھے دور و نزدیک کے شعراء کو مدعو کرتے تھے کیفی صاحب باوجود اپنی کم سنی کے ان محفلوں میں حاضر رہتے اور تمام شاعروں کی تخلیقات کو غور اور انہماک سے سنتے دراصل انھیں محفلوں نے انھیں شعر گوئی کی طرف مائل کیا اور وہ خود شعر کہنے لگے، چنانچہ

ان کے گھر پر ایسی ہی ایک قصیدہ خوانی کی محفل سجی تھی بہت سارے شعراء مدعو تھے اس موقع پر کیفی صاحب نے بھی کچھ اشعار کہہ لئے ان اشعار کو انہوں نے اپنے بھائی شبیر حسین وفا کو دکھایا وفا صاحب نے کیفی صاحب کے اشعار کو دیکھا تو بھڑک اٹھے بڑی تعریف کی۔ انہوں نے کیفی صاحب سے تاکیداً کہا کہ آج جو محفلِ قصیدہ خوانی منعقد ہونے والی ہے اس میں یہ اشعار پڑھے جائیں، کیفی صاحب سنجیدہ بزرگوں کے سامنے اپنی تخلیق پیش کرنے میں انھیں کچھ شرم سی محسوس ہوئی لیکن چونکہ وہ شبیر حسین[۱] صاحب سے بہت ڈرتے تھے اس لئے وہ انکار کرنے سے رہے اگر انکار کرتے تو وفا صاحب کی لال پیلی آنکھوں کا سامنا کرنا پڑتا اس لئے چپ چاپ ان سے حامی بھر لی۔ شام کو جب محفل قصیدہ خوانی منعقد ہوئی تو شاعروں کی فہرست میں کیفی صاحب کا نام بھی درج کیا گیا اور جب ان کی باری آئی تو انہوں نے بڑے اعتماد کے ساتھ اپنا کلام سنایا خوب واہ وا ہوئی محفل میں جتنے لوگ تھے سب نے کیفی صاحب کو داد دی۔ جب وہ کلام سنا چکے تو بعضوں نے کہا واہ میاں پڑھا تو خوب لیکن جو پڑھا ہے اسے کہا بھی ہے؟ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ کلام کیفی صاحب کا اپنا نہیں ہے بلکہ کسی اور کا ہے کیفی صاحب کے بار بار یہ کہنے پر کہ یہ کلام ان کا ہی ہے کسی نے تسلیم نہیں کیا، خود ان کے والد بھی یہی سمجھ رہے تھے کہ کیفی نے کہیں سے چوری کی ہے لوگوں کے ایسے سلوک پر کیفی صاحب حد درجہ غمگین ہوئے وہ اس رات خوب روئے ان کی آنکھوں سے اتنے آنسو گرے کہ آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

کیفی صاحب کے ساتھ مذکورہ بالا واقعہ اس وقت پیش آیا جب وہ اپنے والد کے ساتھ بہرائچ میں جہاں وہ تحصیلداری کے عہدے پر مامور تھے قیام پذیر ہوئے تھے ان دنوں کیفی صاحب کے والد کے ایک محرر تھے جو خود بھی بڑے اچھے اور پرگو شاعر تھے شوق بہرائچی کے نام سے جانے جاتے تھے ان کے سامنے تجویز رکھی گئی کہ اگر کیفی واقعی اپنے کو شاعر کہتے ہیں اور لوگوں سے شاعر کہلوانا بھی چاہتے ہیں تو ان کا امتحان

---

[۱] کیفی صاحب کے بھائی شبیر حسین وفا بہت تند مزاج تھے چھوٹی چھوٹی باتوں پر کبیدہ خاطر ہو جاتے تھے

لے لیا جائے کیفی صاحب امتحان دینے کے لئے ہنسی خوشی راضی ہو گئے شوق بہرائچی کے ذمہ یہ کام عائد کیا گیا کہ وہ کسی استاد شاعر کا کوئی مصرع منتخب کر کے کیفی کو دیں، شوق بہرائچی نے آرزو لکھنوی کی ایک غزل کی زمین منتخب کی جس کا ایک شعر اس طرح ہے۔

اپنی خوشی کے ساتھ مرا غم نباہ دو
اتنا ہنسو کہ آنکھ سے آنسو نکل پڑے

ایک ایسے شاعر کے لئے جس نے ابھی ابھی شعر گوئی کے میدان میں قدم رکھا ہے آرزو لکھنوی کی مندرجہ بالا زمین واقعی سنگلاخ تھی لیکن کیفی اعظمی نے ہمت نہیں ہاری متعینہ وقت کے اندر ہی انہوں نے غزل کہہ لی۔ میری درخواست پر اپنی وہ غزل انہوں نے پوری کی پوری مجھے سنائی۔ پوری غزل سوز و گداز کا مرقع ہے کہیں بھی اسلوب بیان میں جھول یا گنجلک نہیں ہے اس کا داخلی تاثر بھی دلوں کو چھو لیتا ہے غزل کے کچھ اشعار قارئین کی نذر کرتا ہوں تاکہ وہ بھی ایک اچھی غزل کا لطف اٹھا سکیں۔ اور اس امر کا اندازہ کریں کہ اپنی کم عمری کے باوجود اس وقت کیفی صاحب نے آرزو لکھنوی جیسے قادر الکلام شاعر کی سخت اور سنگلاخ زمین میں کیسے کیسے اچھے اشعار نکالے ہیں تو لیجئے غزل کے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

اتنا تو زندگی میں کسی کی خلل پڑے
ہنستے ہوئے سکون نہ رونے سے کل پڑے
جس طرح ہنس رہا ہوں میں پی پی کے اشک غم
یوں دوسرا ہنسے تو کلیجہ نکل پڑے
اک تم کہ تم کو فکر نشیب و فراز ہے
اک ہم کہ چل پڑے تو بہر حال چل پڑے
مدت کے بعد اس نے جو کی لطف کی نگاہ
جی خوش تو ہو گیا مگر آنسو نکل پڑے

غزل کہنے کے بعد کیفی اعظمی صاحب نے اسے اپنے ممتحن شوق بہرائچی کو دکھائی شوق بہرائچی نے غزل دیکھی تو ان کے تعجب اور تاثر کی انتہا نہ رہی انہوں نے وارفتگی کے عالم میں کیفی صاحب کو جی بھر کے داد دی پھر وہ غزل کیفی صاحب کے ابا کے سامنے پیش ہوئی والد نے جب اپنے کم سن لڑکے کو اتنی عمدہ غزل کا خالق پایا تو سرورد انبساط سے ان کی آنکھیں روشن ہوگیئں انہوں نے اپنے لائق اور فطری شاعر بیٹے کی پیشانی چومی اور شاباشی دی اس وقت کیفی صاحب کے شناساؤں میں جس نے بھی غزل سنی احسنت اور آفریں کی صدا بلند کی کیفی صاحب کی یہی غزل آگے چل کر بہت مشہور ہوئی کیونکہ وقت کی مشہور مغنیہ بیگم اختر نے اسے منفرد آواز میں گا کر امر کر دیا۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ لکھنؤ میں سلطان المدارس کی اسٹرائیک کے زمانے میں ان کی ملاقات مشہور افسانہ نگار علی عباس حسینی سے ہوئی تھی اور علی عباس حسینی کے توسط سے وہ مشہور زمانہ نقاد مرحوم سید احتشام حسین سے ملے احتشام حسین مرحوم اس وقت تک اپنی ادبی تحریروں کے ذریعے لکھنؤ اور بیرون لکھنؤ میں خاصے مشہور ہو چکے تھے اور ان کے تعلقات بیشتر ائمۂ قلم سے قائم ہو چکے تھے۔ ایسے ہی ایک ادیب و دانشور مرحوم سجاد ظہیر بھی تھے جنھیں ان کے احباب بنے بھائی کہکر پکارتے تھے یہ وہی دانا و توانا شخص تھے جنہوں نے اردو کی سب سے بڑی اور فعّال تحریک "ترقی پسند تحریک" کی قیادت کی۔ ان کی قیادت و رہنمائی میں اردو کی ترقی پسند تحریک خوب پھلی پھولی سجاد ظہیر مرحوم بھی ان دنوں لکھنؤ میں تھے۔ سید احتشام حسین کی معیت میں کیفی صاحب ان سے ملے۔ سجاد ظہیر مرحوم جوہر شناس تو تھے ہی انہوں نے کیفی سے مل کر پہلی ہی فرصت میں بھانپ لیا کہ ان سے (کیفی صاحب) اردو کی ترقی پسند تحریک کو حسب خواہش طلب نفع پہنچ سکتا ہے لہذا سجاد ظہیر مرحوم انھیں ۱۹۴۳ء میں بمبئی لائے اور کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے شائع ہونے والے رسالے "قومی جنگ" کی مجلس

ادارت میں شامل کر لیا۔ سجاد ظہیر مرحوم جن امیدوں اور خواہشوں کے ساتھ کیفی صاحب کو بمبئی لائے تھے ان امیدوں اور خواہشوں کو کیفی صاحب نے بطریق احسن پورا کیا کیفی صاحب کی ذات ترقی پسند ادب اور ترقی پسند تحریک کے لئے بڑی بابرکت ثابت ہوئی اس کا اعتراف تحریک کے بانی اور اس کے رہنما مرحوم سجاد ظہیر نے بار ہا کیا۔

ایک شام جب میں کیفی صاحب کی رہائش گاہ واقع جانکی کٹیر جوہو میں ان سے ملنے گیا تو ان سے ادبی اور غیر ادبی قسم کے مختلف معاملات و مسائل پر گفتگو ہوئی میں نے اردو کی ترقی پسند تحریک کے عروج و زوال کے بارے میں اور اس سے وابستہ ادبا و شعراء پر عائد کئے گئے الزامات کے بارے میں جب ان سے پوچھا اور ان موضوعات پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کو کہا تو انہوں نے جملہ باتوں پر روشنی ڈالی میں نے اپنی ڈائری میں ان باتوں کو درج کر لیا آج ضرورت کے پیش نظر ان باتوں کو جوں کا توں پیش کرتا ہوں تاکہ قاری بھی ان کے افکار و خیالات سے حسب ضرورت مستفید ہوں۔ انہوں نے کہا :

"واقف صاحب ترقی پسند تحریک وقت ایک انتہائی ضروری تحریک تھی جو کام اس نے اپنے ذمے عاید کیا تھا وہ بھی اتنا ہی ضروری تھا۔ ہماری تحریک کے خلاف کچھ لوگ شروع ہی سے سینہ سپر ہو گئے تھے جیسا کہ سب تحریکوں کے ساتھ اکثر ہوتا آیا ہے خود سر سید کی تحریک بھی الزامات کی زد میں آئی۔ جن حضرات نے ہماری تحریک کی مخالفت کی انھیں بیک وقت ہم سے کئی شکایتیں تھیں پہلی شکایت یہ رہی تھی کہ اردو کی ترقی پسند تحریک نے اردو کے قدیم شعری سرمائے سے اجتناب برتا اور اسے قابلِ گردن زدنی قرار دیا اور یہ کہ یہ تحریک اس پورے سرمائے کو یک لخت تلف کر دینے کے حق میں ہے۔ واقف صاحب میں عرض کر دینا چاہتا

ہوں کہ ہم لوگ جو اردو کی ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے ہیں
اردو کی قدیم شاعری اور اس کے پورے سرمائے کو اپنا شاندار
ورثہ سمجھتے ہیں اسے ختم کر کے یا اسے نظر انداز کر کے ہم اردو ادب
کا کوئی بھی قصر تعمیر نہیں کر سکتے اور اگر کریں گے تو وہ خام بنیادوں پر
قائم ہوگا۔ ہم پر دوسرا الزام یہ ہے کہ ہم لوگ جنسی بے راہروی
کا شکار ہیں یہ الزام بھی سراسر غلط ہے۔ ہم سبھی ترقی پسند مصنفین
ازدواجی زندگی میں کامل یقین رکھتے ہیں اس کے بغیر ہماری زندگیاں
ادھوری رہتی ہیں آپ بمبئی میں رہتے ہیں ترقی پسند تحریک سے
وابستہ بہت سے شاعر بھی یہیں ہیں آپ سے ان کے تعلقات
بھی ہیں آپ سردار جعفری کو دیکھ لیں جاں نثار اختر کو دیکھ لیں۔
مجروح سلطان پوری کو دیکھ لیں یہ سب کے سب ترقی پسند ہیں
لیکن سب ازدواجی زندگی کے مالک ہیں سب کے بیوی بچے ہیں آپ
میرا ہی امتحان لے لیں میری بیوی ہے۔ میرے بچے ہیں انھیں
میں اپنی زندگی سمجھتا ہوں اور واقف صاحب ہم نے کسی عقیدے
پر بھی کبھی چوٹ نہیں کسی ہیں جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہوئے پائے
گئے ہیں ہر عقیدہ بہتر ہے ان سے کام لینے کا سلیقہ ہونا چاہئے
تو واقف صاحب ترقی پسند تحریک پر جو بھی الزامات ہیں جن کی نشان
دہی آپ نے اپنے سوالوں میں کی ہے سب کے سب لغو اور بے بنیاد
ہیں اور ناسمجھی کی بنیاد پر وجود میں آئے ہیں۔ میں نے تو یہ بھی دیکھا
ہے کہ وہ لوگ جو ہم سے سخت مخالفت کرتے تھے ایک زمانہ وہ بھی آیا
کہ وہ ہمارے معترف و مداح ہوئے انہوں نے بہت سی باتوں پر ہم
سے اتفاق کیا یہ الگ بات ہے کہ ان کا اعتراف و اتفاق پوشیدہ
طور پر ہوا ہے"

جب کیفی صاحب تمام ترقی پسندوں کی جانب سے میرے سوالوں کا جواب دے رہے تھے اور انھیں بے قصور ثابت کر رہے تھے تو اچانک میرے ذہن میں جوش ملیح آبادی ایک سوالیہ نشان بن کر ابھرے، میں نے کیفی صاحب سے سوال کیا کہ آپ نے جوش ملیح آبادی کی تصنیف "یادوں کی برات" تو ضرور پڑھی ہوگی وہ بھی تو ترقی پسند تھے ایسے میں اور ایک زمانے میں تو ان کا اعتبار ترقی پسندوں میں نیشن سمجھا جاتا تھا کیفی صاحب میرے اس استفسار پر ذرا اور سنجیدہ ہوتے انہوں نے اپنی پیشانی پر بل دیتے ہوئے کہا:

"واثق صاحب جوش ملیح آبادی کا معاملہ ذرا الگ ہے جوش نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی وہ سر تا سر جاگیردارانہ ماحول تھا اس ماحول میں وہ سب کچھ ہوتا ہے جس کا ذکر جوش نے اپنی کتاب "یادوں کی برات" میں کیا ہے مگر میں یہ کہتا ہوں کہ جوش کا اعمالنامہ ان کے ساتھ ہے میں یہ بھی نہیں کہتا کہ اس تحریک سے وابستہ سبھی ادیب و شاعر فرشتہ ہیں ان سے غلطیاں سرزد نہیں ہوئی ہیں ایسا کہنا تو لوگوں کی آنکھ میں دھول جھونکنا ہوگا ہمیں جوش یا اس قبیل کے دوسرے لوگوں کے اعمالنامے سے کیا لینا دینا ہے ہم ان کی شاعری سے متاثر ہیں پہلے بھی تھے اب بھی ہیں۔"

اس مضمون میں اگر میں کیفی اعظمی کی شاعری سے بحث کرنے لگوں تو ظاہر ہے مضمون ضرورت سے زیادہ طویل ہو جائے گا اس لئے ان کی شاعری کے محاسن و معائب کے بارے میں تفصیل میں جانے سے سر دست میں گریز کروں گا لیکن کچھ باتیں جو ان کے فن سے متعلق کہنا ضروری ہیں ان کا بیان کئے بغیر چارہ بھی نہیں۔

کیفی اعظمی کی پوری شاعری کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ ان کی شاعری ایک جدت پسند اور بیدار مغز فنکار کی شاعری ہے وہ بنیادی طور پر غزل کے نہیں بلکہ نظم کے شاعر ہیں وہ جس نوع کے عنوانات

پر اظہار خیال کرتے ہیں اس کے لئے نظم کی ہی تنگنائے موزوں و مناسب ہے اور اسی کے ذریعے ہی وہ اپنے خیالات کو اطمینان بخش آہنگ سے عوام الناس تک پہنچا سکتے ہیں۔ غزل اپنی تمام تر ہر دلعزیزی اور بے پناہ خوبیوں کا مرقع ہونے کے باوجود مسلسل و مربوط خیالات کی توضیح و اشاعت کے لئے ناکافی ہے غالباً اسی لئے کیفی صاحب نے اپنی بات کو عوام تک پہنچانے کے لئے نظم کا آلہ اپنایا ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ انہوں نے غزلیں کہی ہی نہیں ہیں۔ انہوں نے نظمیں کہنے کے ساتھ ساتھ غزل کے گیسو بھی سنوارے ہیں لیکن نظم گوئی کی طرف ان کا جھکاؤ زیادہ ہے، اس کا خاص سبب یہی ہے کہ جس موضوع پر وہ اپنے قاری کو مفصل و مکمل آہنگ سے کچھ سمجھانے کا ارادہ رکھتے ہیں اس موضوع پر نظم گوئی کے ذریعہ ہی اپنے خیالات و محسوسات کا اظہار کر کے وہ مطمئن و مسرور ہوتے ہیں غزل میں اشاروں اور کنایوں ہی میں کوئی بات کہی جا سکتی ہے تفصیل و وضاحت کا بار نہ وہ برداشت کر سکتی ہے اور نہ تفصیل و وضاحت میں اس کا داخلی تاثر برقرار رہ سکتا ہے اس لئے کہ غزل کا حسن اس کا نکھار و سلیقہ اس کی اشاریت اور کنائیت ہی میں پوشیدہ ہے ویسے وقتاً فوقتاً منہ کا مزہ بدلنے کے لئے کیفی صاحب نے غزلیں کہی ہیں اور ان کی وہ غزلیں ان کے دو مجموعوں "آخرِ شب"[*] اور "آوارہ سجدے" میں شامل ہیں ان کی غزلوں کی مجموعی تعداد پچاس سے زیادہ نہیں ہے، ان غزلوں میں ہمیں چند ایسی غزلیں ضرور مل سکتی ہیں جو اپنے داخلی تاثر حسن اور وقار کے معیار پر پوری اترتی ہیں مثال کے طور پر ان کی کچھ غزلوں کے اشعار ملاحظہ فرمائیے

تمہیں نے دل کو دل سمجھا نہیں ہے
کوئی ارماں نہ ہو ایسا نہیں ہے

---

[*] میرے اس خیال سے مجروح سلطان پوری صاحب کو اتفاق نہیں ہوگا لیکن حقیقت یہی ہے۔

مرے سینے میں اپنا درد بھر دو
اکیلے بوجھ یہ اٹھتا نہیں ہے
ترے آنچل میں ہیں کتنے ستارے
کوئی میرا ہے ان میں یا نہیں ہے
مری باہوں سے آگے جا رہی ہو
مگر آگے کوئی دنیا نہیں ہے

—— ⁘ ——

برس پڑی تھی جو رخ سے نقاب اٹھانے میں
وہ چاندنی ہے ابھی تک غریب خانے میں
بس اک جھجک ہے یہی حالِ دل سنانے میں
کہ تیرا ذکر بھی آئے گا اس فسانے میں
یہ کہہ کے ٹوٹ گیا شاخِ گل سے آخری پھول
اب اور دیر ہے کتنی بہار آنے میں

—— ⁘ ——

کیا جانے کس کی پیاس بجھانے کدھر گئیں
اس سر پہ جھوم کے جو گھٹائیں گزر گئیں
پیمانہ ٹوٹنے کا کوئی غم نہیں مجھے
غم ہے تو یہ کہ چاندنی راتیں بکھر گئیں
اب جس طرف سے چاہے اتر جائے قافلہ
ویرانیاں تو سب مرے دل میں اتر گئیں
پایا بھی ان کو کھو بھی دیا چپ بھی ہو گئے
اک مختصر سی رات میں صدیاں گذر گئیں

—— ⁘ ——

ایسے لمحے بھی عشق میں آئے
حسن سے ہم نے ناز اٹھوائے
حاصلِ زندگی ہے ایک وہ رات
چاند بانہوں میں جب اتر آئے
جھوم جھوم اٹھی اسپتال کی شام
وہ عیادت کو اس طرح آئے
یوں دعا میں لرز رہے تھے ہونٹ
جیسے کوئی شراب چھلکائے

ہاتھ آ کر لگا گیا کوئی
میرا چھپر اٹھا گیا کوئی
لگ گیا اک مشین میں میں بھی
شہر میں لے کے آ گیا کوئی
ایسی تنہائی ہے کہ چہرہ بھی
بیچ کر اپنا کھا گیا کوئی
اب وہ ارمان ہے نہ وہ سپنے
سب کبوترا اڑا گیا کوئی
وہ گئے جب سے ایسا لگتا ہے
چھوٹا موٹا خدا گیا کوئی
میرا بچپن بھی ساتھ لے آیا
گاؤں سے جب بھی آ گیا کوئی

اس امر کی نشاندہی ہم پہلے کر چکے ہیں کہ کیفی صاحب غزل کے نہیں نظم کے شاعر ہیں اور اپنی نظم گوئی کے ذریعے انہوں نے اردو کے شعری سرمائے کو وقیع کیا ہے ان

کی نظموں میں زبان کی صفائی و شستگی، خیالات کی طرفگی طرز بیان کی ممدگی خاصے کی چیزیں ہیں، انہوں نے سستی، ملکی اور سطحی قسم کی شاعری بہت کم کی ہے ان کی وہ نظمیں جو اشتراکیت کے پروپیگنڈے کے لئے کہی گئی ہیں اور جن کی تعداد بھی کافی ہے ان کو چھوڑ کر باقی ماندہ نظموں کو اگر فن کے اعلیٰ معیار پر جانچا جائے تو بلاشبہ کئی کامیاب نظمیں ملیں گی ایسی نظموں کا شمار ہم صرف ترقی پسند شاعروں کی ہی اچھی نظموں میں نہیں بلکہ اردو کی پوری شاعری میں بلند معیار کی حامل قرار دے سکتے ہیں مثال کے طور پر کیفی صاحب کی ابتدائی نظموں میں "حقیقتیں" اور "عورت" کو لے لیں یہ دونوں نظمیں دو الگ الگ عنوانات پر کہی گئی ہیں "حقیقتیں" ہمارے ملک کی سماجی، معاشی و معاشرتی تفریق اور اس کے زیر اثر پیدا ہونے والی بے اطمینانی روح پاش عُسرت، نواب اور مسئلہ نوازی اور ان سماجی ناسوروں کے ہاتھوں دم توڑتی ہوئی انسانی زندگی کی درد انگیز ترجمان ہے۔ اس نظم کی زبان میں ایک قسم کی جادو اثری کار فرما ہے اور یہ جادو اثری شاعر کے ان ناگفتہ بہ حالات کی خالق ہے جس کا شکار ایک زمانے میں خود رہ چکا ہے نظم کا خالق جب تک خود ان حالات کا شکار نہ ہو جن حالات کو وہ اپنی نظم کے سانچے میں ڈھال رہا ہے تب تک نظم میں سوز و گداز پیدا نہیں ہو سکتا۔ میر کے کلام میں بے پناہ درد کا احساس اسی لئے ہوتا ہے کہ وہ خود ان حالات کا شکار رہا جن کا اظہار اس نے اپنی شاعری میں کیا ہے۔
کیفی اعظمی صاحب کی نظم "حقیقتیں" میں جو بلا کا اثر اور سوز پنہاں ہے تو محض اسی لئے کہ وہ جبر مشیت کی اذیت ناک چکی میں پسے ہیں۔ افلاس و مجبوری کے ہاتھوں پامال ہوئے ہیں مصائب کی روح پاش گھڑیوں میں دن رات گذارتے میں اور پھر جب اس آپ بیتی کو نظم کے آبگینے میں ڈھالنے بیٹھے تو اسے لاکھوں پامال انسانوں کا دکھڑا بنا دیا اب اس پس منظر کے ساتھ نظم کے یہ بند ملاحظہ فرمائیے ؂

آج ہر دن سے زیادہ ہے ہلاکت کا اثر
درد ہر رگ میں ہے دہری ہوئی جاتی ہے کمر

یہ گرانی یہ مرا خرچ یہ کچھ سکّۂ زر
قرض خواہوں کی بھی یورش ابھی ہوگی گھر پر
اور گھر میں عسرت کے سوا کچھ بھی نہیں

اُف یہ سکّے یہ شب و روز کی محنت کا مآل
جن کا پانا بھی بوال اور نہ پانا بھی بوال
جن کا مٹھی میں ذرا دیر ٹھہرنا بھی محال
کھینچ لیتا ہے جنہیں سود ستانوں کا جلال
حق مرا ان پہ زیارت کے سوا کچھ بھی نہیں

راس آتا ہے جنہیں مشغلۂ جور و جفا
خونِ مفلس سے کیا کرتے ہیں جو کسبِ حنا
جن کی آنکھوں میں شرارت ہے طبیعت میں دغا
ان کی دنیا میں سبھی کچھ ہے مصیبت کے سوا
میری دنیا میں مصیبت کے سوا کچھ بھی نہیں

نظم کا آخری بند اس لحاظ سے کافی اہم ہے کہ اس میں شاعر نے اپنا مدعا علی الاعلان ظاہر کر دیا ہے ملاحظہ فرمایئے ـــ

گلشنِ جور کی سم ریز و خزاں پاش بہار
دوزخِ زر کے مچلتے ہوئے جاں سوز شرار
نفع خوروں کی نگاہوں کی یہ لچکتی تلوار
بڑھتے جاتے ہیں شب و روز یہ سارے آثار
کہ علاج ان کا بغاوت کے سوا کچھ بھی نہیں

نظم کے آغاز سے لیکر اس کے آخری بند کے اس مصرعے تک کہ "علاج اسکا بغاوت کے سوا کچھ بھی نہیں" فکر و خیال کا ایک مربوط و مسلسل سلسلہ ہے اس پوری نظم میں نہ کہیں تصنع کی آمیزش ہے نہ بیان کا پھوہڑپن سماج کے ایک ایک ناسور کو دردناک ڈھنگ سے شاعر نے

ہمارے ذہن پر منطبق کیا ہے اور آخیر میں اس کا علاج بغاوت اور صرف بغاوت قرار دیا ہے بغاوت کی یہ لوچونکہ اتنے سلیقے سے تیز کی گئی ہے اس لئے قاری کا ذہن اسے بہت آسانی سے تسلیم کر لیتا ہے شاعر کی عظیم ترین کامیابی اسی مقام پر حاصل ہوتی ہے جب وہ اپنے محسوسات کو سلیقہ مندی کے ساتھ بیان کرکے اپنے قاری کو اپنا ہمنوا بنا لیتا ہے ایسی نظمیں زندہ قوموں کے لئے برہنہ تلوار کا روپ دھار سکتی ہیں لیکن افسوس کہ ہمارا ہندوستانی سماج شاعر کے ان گراں قدر خیالات سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا سکا وہ ناسور جو عرصۂ دراز سے ہماری زندگیوں کو کھائے جا رہے ہیں جوں کے توں پڑے ہوئے ہیں ۔

"حقیقتیں" کی طرح "عورت" بھی اگرچہ کیفی صاحب کی شروع کی نظموں میں شامل ہے لیکن خیالات کی بلندی اور بیان کی عمدگی سے دو آتشہ ہو گئی ہے عورت عموماً پوری دنیا میں اور خصوصاً ہمارے ہندوستانی سماج میں ہمیشہ سے مظلومیت و محکومیت کا شکار رہی ہے اس کے حقوق کا استحصال ہر دور میں ہوتا رہا ہے اور اپنی محکومیت و مظلومیت کی سخت گیری سے وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو رہی ہے کہ قدرت نے شاید اسے تخلیق ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ گھر کی چہار دیواری میں مقید رہے ۔ اور سماج کے تمام معاملات و مسائل سے قطع تعلق کرکے صرف مردوں کی شہوانی خواہشات کی تکمیل کرتی رہی ۔ عورت ذات کے ساتھ ہمارا یہ سلوک انتہائی بدبختانہ ہے عورت ہماری ہی طرح بہر حال خدا کی حسین و جمیل مخلوق ہے اس کے پاس بھی ہماری ہی طرح دل و دماغ، ہاتھ پاؤں اور خواہشات ہیں جن کی مدد سے وہ ہر اس کام کو انجام دے سکتی ہے جس کی امید ہم صرف مردوں سے کرتے ہیں یہ ایک تلخ حقیقت ہے علامہ اقبال جیسے شاعر نے جو اسلام کی صحیح روح (REAL SPRIT) سے آشنا بھی ہے اور اس کے عاشق بھی یہ کہکر عورت کے وقار کو بلند کیا کہ ؏

"وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ"

اس حقیقت کا اعتراف کیفی اعظمی صاحب نے بھی دل سے کیا ہے وہ جس پاکیزہ سماجی اصلاح و تعمیر کے راستے پر گامزن ہیں اس راستے میں وہ عورت کو اپنا برابر شریک

معین و مددگار بنانا چاہتے ہیں اور عورت کے دل میں خود کے بارے میں جو احساس طاری ہے اور جس احساس نے صدیوں سے اسے خود فراموش بنا رکھا ہے کیفی صاحب عورت کے دل و دماغ سے اس نفسیاتی خوف و ہراس کو نکال کر اس کے اندر خود نگری کا احساس پیدا کرنا چاہتے ہیں اس حسین نظم کے چند بند دیکھتے چلئے کیفی صاحب کہتے ہیں۔

اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے
قلب ماحول میں لرزاں شرر جنگ ہے آج
حوصلے وقت کے اور زیست کے یک رنگ ہیں آج
حسن اور عشق ہم آواز و ہم آہنگ ہیں آج
جس میں جلتا ہوں اسی آگ میں جلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

قدر اب تک تری تاریخ نے جانی ہی نہیں
تجھ میں شعلے بھی ہیں بس اشک فشانی ہی نہیں
تو حقیقت بھی ہے دلچسپ کہانی ہی نہیں
تیری ہستی بھی ہے اک چیز جوانی ہی نہیں
اپنی تاریخ کا عنوان بدلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

تو فلاطون و ارسطو ہے تو زہرہ پروین
تیرے قبضے میں ہے گردوں تری ٹھوکر میں زمیں
ہاں اٹھا جلد اٹھا پائے مقدر سے جبیں
میں بھی رکنے کا نہیں وقت بھی رکنے کا نہیں
لڑکھڑائے گی کہاں تک کہ سنبھلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

رومانی نظموں میں کیفی اعظمی صاحب کی مشہور نظم اندیشے بھی ایک شاہکار

کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ نظم جس فضا میں کہی گئی ہے وہ سرتاسر عشق و محبت کی فضا ہے اس میں کسی طرح کے میکانکی عمل (MECHANICOL PROCEN) کا دخل نہیں ہے یہاں نہ عاشق کو معشوق کی بے مہریوں کا شکوہ ہے اور نہ معشوق کو عاشق کی دغا بازیوں کا گلہ، اس میں دو پاک دلوں کے آپسی لگاؤ کے بعد الگاؤ کا جو ہر حال زمانے کی ناسازگاری کا عطا کردہ ہے درد و کرب میں ڈوبا ہوا خوبصورت اظہار ہے اس لازوال تخلیق کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

روح بے چین ہے اک دل کی اذیت کیا ہے
دل ہی شعلہ ہے تو یہ سوز محبت کیا ہے
وہ مجھے بھول گئی اس کی شکایت کیا ہے
رنج تو یہ ہے کہ رو رو کے بھلایا ہوگا

مندرجہ بالا بند کی تخلیق کے ساتھ ہی شاعر کا دل پوری طرح عشق اور سوز عشق کی کیفیت سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے اب وہ جو کچھ سوچتا اور محسوس کرتا ہے اس کے اظہار پر پوری طرح قابو پالیتا ہے عمدہ تشبیہیں حسین الفاظ اس کے نوکِ قلم پر آکر آگے کے بندوں کو خوبصورت سے خوبصورت تر کرتے جاتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر اس کے قلم سے لکھے ہوئے اشعار قاری کے ذہن پر تیر و نشتر کا کام کرنے لگتے ہیں دیکھئے۔

جھک گئی ہوگی جواں سال امنگوں کی جبیں
دب گئی ہوگی پلک ڈوب گیا ہوگا یقیں
چھا گیا ہوگا دھواں گھوم گئی ہوگی زمیں
اپنے پہلے ہی گھروندے کو جو ڈھایا ہوگا

نظم اسی کامیاب اسلوب کے سہارے ہوتے ہوئے آگے بڑھتی ہے شاعر کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا جاتا ہے اور اپنے اس پورے سفر میں وہ اپنے قاری کو ایک لمحے کیلئے مایوس نہیں کرتا بلکہ احساس کی جس آگ میں وہ خود جل رہا ہے اپنے قاری کو بھی جلنے کیلئے مجبور کرتا ہے دیکھئے یہ بند۔

دل نے ایسے بھی کچھ افسانے سنائے ہوں گے
اشک آنکھوں نے پئے اور نہ بہائے ہوں گے
بند کمرے میں جو خط میرے جلائے ہوں گے
ایک اک حرف جبیں پر ابھر آیا ہوگا

ان نظموں کے علاوہ کیفی صاحب کی دوسری بہت سی نظمیں مطالعہ کے قابل ہیں ایسی نظموں میں "زندگی" اور "دائرہ" وغیرہ تو ایسی نظمیں ہیں جو قاری کو بلا کا ذہنی حظ دے سکتی ہیں شرط یہ ہے کہ قاری طبیعت کی جزرسی سے کنارہ کش ہو کر ان نظموں کا مطالعہ کرے اور اپنے دل ودماغ کو اس فضا سے ہم آہنگ کرے جس فضا میں ڈوب کر شاعر نے ان نظموں کی تخلیق کی ہے ۔

آخر میں اور تفصیل میں جانے سے گریز کرتے ہوئے میں صرف اتنا کہوں گا کہ کیفی صاحب کی شاعرانہ شخصیت بڑی سجل اور پرکشش ہے ۔ انہوں نے شاعری کے ذریعہ ہزاروں مردہ دلوں میں زندگی کی روح پھونکی ہے رباب زندگی کے تار کو مرتعش کیا ہے ۔ انہوں نے میدان شاعری میں کسی جست وخیز کے سہارے اپنا مقام نہیں بنایا ہے بلکہ اس جولانگاہ میں انہوں نے محنت شقت اور عرق ریزی کا ثبوت دیا ہے زندگی میں انھیں مسلسل صلابتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے لیکن ان کی زندگی کی ان صلابتوں نے انھیں قنوطیت پسند اور کبیدہ خاطر نہیں ہونے دیا وہ مصائب میں رہ کر بھی عظیم قدروں کا علم بلند کرتے رہے ہیں ان کی انسانیت اس وقت بھی قابلِ رشک تھی جب عسرت اور تنگ دستی ان کے آگے آگے چلتی تھی اور ان کی وہ انسانیت آج بھی ہمیں لبھاتی ہے جب کہ منعم دو جہاں نے انھیں وارستگی سے نوازا ہے ۔

محمد حسن

کیفی اعظمی: نئی تہہ داری کے شاعر

کیفی اعظمی کی شاعری تین مختلف ادوار سے گزری ان ادوار کی پہچان آسان ہے لیکن انہیں کوئی نام دینا مشکل ہے ان کا پہلا مجموعہ جھنکار چھپا اور اس سے قبل نیا ادب اور قومی جنگ میں مختلف نظمیں شائع ہوئیں تو ایسا لگا کہ انیس اور جوش کے رنگ و آہنگ کا پروردہ شاعر نظم کرنے کی قدرت کو جذبے کی شدت اور وضاحت و صراحت کے ساتھ ہنگامی موضوعات پر اظہار خیال کے لئے صرف کر رہا ہے زمانہ بھی رومانیت کا تھا، اختر شیرانی۔ احسان دانش اور جوش کا چرچا تھا اور ان کے بیانیہ رنگ اور محاکاتی قوت کا ایسا سکّہ چلتا تھا کہ بیان واقعہ یا منظر نگاری کو اور اس کے ساتھ ساتھ شدید جذباتی لب و لہجہ میں مضمون کی تکرار اور نت نئے الفاظ کے ساتھ شاعری کرنے کو ہی فن جانتے تھے خطابیہ لہجے کا رواج ایسا تھا کہ ترقی پسندی کے چلن سے پہلے بھی اختر شیرانی اور روشن صدیقی جیسے رومانی شاعر بھی عشقیہ نظمیں محبوب براہِ راست خطاب ہی کی شکل میں لکھ رہے تھے۔ یہ جذباتیت اگر شاعری کا طرۂ امتیاز بنی تو یہ ترقی پسندی کا جرم نہ تھا اگر خطابیہ لہجہ عام تھا تو اس کا رشتہ حالی اور شبلی سے جا ملتا ہے۔ کیفی نے اسے براہ راست انداز دیا۔

اس دور کی شاعری پر گفتگو کرتے وقت چند بنیادی مباحث سامنے آتے ہیں کیا براہِ راست لہجہ اچھی شاعری کی راہ میں مزاحم ہوتا ہے؟ یا خطابیہ یا بیانیہ شاعری اچھی شاعری ہو ہی نہیں سکتی؟ اگر ہو سکتی ہے تو اس کے حدود اور امکانات کیا ہیں؟ یا اچھی شاعری محض خطابیہ یا بیانیہ ہی ہوتی ہے اور اس کا صرف ایک ہی اسلوب براہِ راست اسلوب ہی ہے؟

ظاہر ہے کہ شاعری کا کوئی ایک اسلوب یا محض ایک آہنگ متعین نہیں کیا جا سکتا مگر آج کے دور میں خطیبانہ یا بیانیہ شاعری اور راست اسلوب پر نکتہ چینی کرنے والوں کو یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اس انداز و اسلوب میں بھی اچھی ہی نہیں بڑی شاعری ہوتی ہے اور نہ تو نعرہ نہ خطیبانہ اور بیانیہ انداز شاعری کا نقیض ہے نہ راست اسلوب البتہ بات شاعر کے سلیقہ کی ہے اس کی خطابت میں دل کی لگی کتنی ہے اور دل لگی کتنی اس کے مخاطب میں اس کی اپنی ذات کی آواز کس حد تک ہے اور کتنی محض گھن گرج ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیفی کے دور اول کی شاعری میں یہ سلیقہ کتنا ہے؟ اس سوال پر بحث کرنے سے قبل یہ وضاحت ضروری ہے کہ کیفی کی جھنکار کے دور کی شاعری محض سیاسی نظموں تک محدود نہیں ہے بلکہ فطرت (شام) اور عشقیہ مضامین (تین انضلائے محبت) اور سیاسی ہنگامی موضوعات کی نظموں کی تعداد برابر برابر ہی ہے۔

اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے رومانی شاعروں کے ہاں رومان اور سیاست ذات اور ہنگامی موضوعات کی یہ تقسیم برابر قائم رہی ہے اختر شیرانی نے جو عشقیہ مضامین ہی کے شاعر سمجھے جاتے ہیں "اٹھو ساقی اٹھو تلوار اٹھا" جیسی نظمیں بھی لکھی ہے۔

ترقی پسند تحریک رومانویت کی اسی موڑ پر سامنے آئی اس کا سب سے بڑا مسئلہ درد مند اور رومانوی مزاج کو سماجی آہنگ اور عصری شعور کی وسعت دینے کا تھا چنانچہ رومان و عصری وابستگی کا یہ خط فیض، مجاز، مخدوم، سبھی کے ہاں سے گذرتا ہے بعض نے ان دونوں کو الگ الگ کر رکھا (خود فیض نے بھی "دو عشق" نظم تک ان کی دوئی برقرار رکھی) بعض نے دونوں کو سمونے کی کوشش کی (مجاز کا مصرعہ "آہنگ نو میں پاس ناموس نگاران جہاں ہے تو اٹھو") بعض نے ہنگامی یا سماجی موضوعات میں تغزل کی رومانی کھنک پیدا کی (مخدوم کی نظم انقلاب ـ گزر بھی جا کہ ترا انتظار ہے کب سے) سوال ان اسالیب کے اچھے یا برے ہونے کا نہیں بلکہ رومانویت کی توسیع کی اس مہم کا ہے جو اس وقت شاعری کو درپیش تھی۔

یہ توسیع دو سطحوں پر ہو سکتی تھی ایک معروضی یا غیر ذاتی سطح کے واقعات اور حالات کو شاعری کا موضوع بنانے میں دوسرے فکر و احساس کو وسعت دے کر اسے جزو شعر

بنانے میں پہلی صورت میں کیفی کے ابتدائی دور میں اور دوسری صورت ان کی شاعری کے
تیسرے دور میں نمایاں ہے اور ان دونوں ادوار کے یہاں کشاکش بھی ہے اور آویزش اور
ارتقاء کی داستان بھی۔

کیفی نے جھنکار کے دور میں جوش۔ احسان دانش اور خود سردار جعفری کے بھی اثرات قبول
وہ بیانیہ شاعری کو SIFICATION تک لے گئے جس سے گمان ہوتا ہے کہ شاعری پوری
تخلیق نہیں اسلوب بیان ہے جس کے سانچے میں ہر بیان اور ہر خیال ڈھالا جا سکتا ہے جہاں
قوت ہی کی پرواز قائم نہیں رہی ہے وہاں فن تخلیق کے بجائے صنعت ہی بن گیا ہے۔

کیفی کو ان نظموں پر داد بھی ملی ہے بیداد بھی۔ حالات کی رفتار تیز تھی اور شاعری کو نظم
گوئی کی قوت بھرپور تھی نتیجہ یہ ہوا کہ واقعات جو اس زمانے میں ہر حساس انسان کا شانہ رگڑتے
ہوئے گزر رہے تھے کیفیت میں ڈھلنے سے پہلے ہی نظم بن کر کیفی کے قلم سے ٹپک پڑتے تھے
ان میں بیانیہ انداز ہے خطیبانہ رنگ ہے جذبے کی شدت تو ہے گتی نہیں ہے صراحت اور
وضاحت ہے کہیں کہیں منظوم مقالے کا رنگ تسلیم۔ ایسے دور بھی آتے ہیں جب لمحاتی ادب
ضرورت بن جاتا ہے دوسری جنگ عظیم کے دوران .. فاشزم سر پر تلوار کی طرح لٹک رہا تھا ایسے
لمحاتی ادب کا وجود میں آنا لازمی تھا اس دور نے ایلیا اہرن برگ کو بھی پیدا کیا بریخت کے لمحاتی
موضوعات کے ڈراموں کو بھی جنم دیا اور کیفی کی شاعری کو بھی۔

لیکن اس کے باوجود یہ بات رکھنے کی ہے کہ اس دور کی قدرِ ناپختہ شاعری نے بھی سماجی
شعور اور طبقاتی شعور کو بیدار کرنے کا اہم فریضہ ادا کیا ہے شاعری محض کیفیت سے زندہ نہیں رہ
سکتی جب تک اس کیفیت کا رشتہ وسیع تر نگاہوں تک نہیں لے جاتیں ان میں
PARAPHRASION، زیادہ ہے جذبے کا ارتقاء نہیں پھیلاؤ ہے جو تکرار مضامین اور
صراحتِ بیان میں ظاہر ہوا ہے۔ کیفی کی نظریں صرف گرد و پیش پر جمی ہوئی ہیں اور اس گرد و پیش سے
ابھر کر جو نقش نگار انسان کی شخصیت اور اس کے اندرون پر مرکوز ہوتے ہیں ان تک وہ نہیں پہنچے
پھر یہ بھی ہے کہ کیفی رومانیت اور تغزل سے آزاد ہو کر عصری مسائل کو سانچے میں
ڈھالنے کی کوشش کر رہے تھے یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی ایک معنی میں یہ آج بھی جاری ہے

اسی لئے ان کو اس دور کی نظموں کو قبولِ عام اس دور میں تو ملا مگر بعد کو وہ کیفی کی پہچان نہ بن سکیں۔ اس تجربے نے جسے اکثر کیفی کے خلاف استعمال کیا گیا ہے شبلی نے ظفر علی خان تک کی روایت کو آگے ضرور بڑھایا گو ان کا سارا سیلاپن کیفی نہ پا سکے البتہ واقعات اور تصورات کا نیا رخ اردو شاعری میں ضرور ابھرا۔

کیفی اگر اس نہج پر زندگی بھر شاعری کرتے رہتے تو شاید اس میں بھی ایک نیا رنگ پیدا کرتے مگر جلد ہی اس اسلوب کی حد بندیاں ان کی نظر کے سامنے بے نقاب ہونے لگیں یہ محض فنکارانہ مجبوری نہیں تھی بلکہ حالات کی تبدیلی کا عکس تھی۔

اردو شاعری میں شاید کیفی سے زیادہ کوئی دوسرا شاعر صورتِ حال کی اس تبدیلی سے اتنا متاثر نہیں ہوا۔ سردار جعفری نے انقلابی شاعری کی گھن گرج کو آزاد نظم میں جو زور و شور اور گھن گرج سے ڈھالا تھا لیکن کیفی نے اس سدس کو زبان اور پابند نظم کی چاشنی میں سمو لیا لیکن جب انقلابی تحریکیں ٹھنڈی پڑیں تلنگانہ کا انقلاب ٹھٹکنے لگا اور پوری دنیا میں اشتراکی تحریک کے افتراق نے نئی صورتِ حال کو جنم دیا تو ایک مدت تک کیفی پر خاموشی طاری رہی۔ اب شاید اس AGITATIONAL لہجے کی شاعری کی ضرورت نہیں تھی اور وہ ممکن بھی نہ تھی جو کیفی کی پہچان بن چکی تھی۔

یہ موڑ صرف کیفی ہی کے سامنے نہ تھا پوری ترقی پسند شاعری کے سامنے تھا سردار نے اس کا حل "ایک خواب اور" کی شاعری میں تلاش کیا جو طبقاتی حد بندیوں سے روحانی علامتیت کوئی معنویت دے کر تلاش کیا جاں نثار نے اپنا لہجہ بدلا پرویز شاہدی نے اپنے اسلوب کو نئے ڈھنگ سے تراشا اور نکھارا کیفی نے اس کا حل اپنے طور پر تلاش کیا۔

مگر اس تلاش سے قبل یہ صراحت ضروری ہے کہ کیفی کی AGITATIONAL نظموں کے دور کے بعد جن دو نظموں نے انہیں ادبی احترام عطا کیا وہ "آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے" اور "ایک بوسہ" تھیں اردو کے ادبی حلقوں کو پہلی بار اس کا اندازہ ہوا کہ ایک ایسا شاعر ابھرا ہے جو اپنی نجی کیفیت کو محض جذبے کی شدت کے بل پر ہی نہیں دردمندی اور کیفیت آفرینی کے نہج پر بیان کر سکتا ہے اور اس بیان سے دل جیت سکتا ہے۔

یہ کیفی کی شاعری کا دوسرا دور تھا یہاں شاعر کا محور اس کی محض اپنی ذات نہیں مگر ذات اور گرد و پیش کے واقعات کا باہمی رشتہ ہے پہلے کی نظموں کی طرح کچھ کرنے کی للکار نہیں ہے خطابت کا رنگ غالب نہیں بلکہ ایک سنبھلا ہوا انداز ہے جو چاروں طرف پھیلی ہوئی آگاہی کے ٹکڑوں کو چنتا ہے اور انہیں اپنی ذات کا حصہ بنا کر دیکھتا ہے اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ پہلے دور میں کیفی کی شاعری خارجی واقعات کے درمیان ٹکراؤ سے عبارت ہے دوسرے دور میں خارج اور ذات کی باہمی آویزش ہے اور اس آویزش میں محض بیان نہیں تجربہ اور کیفیت اصل شعر بنتے ہیں. اب کیفی گرد و پیش کے حوالے سے خود اپنی دریافت میں سرگرداں ہیں اور انکے آڑے ترچھے زاویے بنتے ہیں۔

اس دور میں کیفی کی شاعری کا لہجہ، امیجری اور لفظیات سبھی کچھ بدلے ہیں اور اس کاوش میں انہوں نے خود اپنی لفظیات اور اپنی امیجری ڈھالنے کی کوشش بھی کی۔

زمانہ نازک تھا اور شعری لہجوں میں تبدیلی کی یہ فصل خاصی اندیشہ ناک تھی ایک طرف شاعر کے عظمت پرست قنوطی ہو جانے کے خطرے تھے دوسری طرف عصر حاضر سے بیگانگی کے اندیشے کل کے جذباتی عقیدے تیزی سے دھندلا رہے تھے ملک میں اب عوامی تحریکوں کی وہ دھوم دھام نہ تھی جو انقلاب کا خواب دکھا سکے جس تحریک سے کیفی کا رشتہ تھا وہ بھی انتشار کا شکار تھی کل کے انقلابی آج کے قصیدہ خواں بن چکے تھے. کیفی نے اس موڑ پر ہنگامی واقعات کو انسانی تاریخ کے وسیع تر پس منظر میں دیکھنے اور اسے ایک ذاتی واردات کی طرح شعر کی زبان دینے کی کوشش کی۔

اس کشمکش کا اظہار کیفی کی نظم عادت سے ہوتا ہے جہاں فرد اپنی ذات کے اندھے کنوئیں میں اسیر روشنی زندگی چلا رہا ہے اس نظم تک پہونچتے پہونچتے کیفی کا کلام پڑھنے والا ایک بالکل نئی فضا سے دوچار ہوتا ہے یہاں تخاطب نہیں براہ راست للکار بھی نہیں ایک ذاتی آویزش ہے جو ہر فرد کے سامنے آتی ہے وہ اپنے باطن سے نکلے یا نہ نکلے اور نکلے تو باہر کی دنیا سے کن شرائط اور کس سطح پر معاملہ کرے ایک ایسے دور میں جب بنے بنائے عقیدے باطل ہو رہے تھے اور نعرے اور فارمولے ناپید یا بے آبرو تھے کیفی کے سامنے

مسئلہ ذات اور زمان و مکان کے لئے رشتے تلاش کرنے کا تھا اور یہ رشتے انہوں نے اس بصیرت کی روشنی میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو انہیں مادی جدلیت کے نظام فکر سے ملی۔

ایک مدت تک ترقی پسندی کا مفہوم ہنگامی موضوعات اور راست خطیبانہ اسلوب سمجھے جاتے رہے لیکن ترقی پسندی اگر اتنی میکانکی ہے تو اسے ترقی سے کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا اصل پرکھ تو زندگی کی اس بصیرت اور احساس کے اس نہج کی ہوگی جو کسی فن پارے میں ظاہر ہوتا ہے خواہ وہ ویت نام کی جنگ پر لکھا گیا ہو! سوال بقول گولڈمان کا ہوتا ہے جو ادب پارے میں آرٹ بن کر جھلکتا ہے پہلے دور میں کیفی کی نظموں میں ہنگامی موضوعات اور عمل کی للکار کو اولیت حاصل ہے تیسرے دور کی نظموں میں زندگی کے اس جذباتی رویے کو اولیت ملی ہے جو مختلف رنگوں میں اور مختلف مسایل کے دوران ابھرتا ہے۔

اس دور کی شاعری میں جو آگاہی ملتی ہے اس کے بارے میں دو باتیں آفاقیت اور تاریخیت اہم ہیں (انوکھی بات یہ ہے کہ یہ دونوں خصوصیات قصیدہ گوئی کے دور میں ابھریں) آفاقیت سے میری مراد ہے ہنگامی واقعات کے بجائے عالم گیر سطح پر پیش آنے والے انسانی مسائل سے ہے یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ کیفی نے ویت نام کو ابن مریم کے وسیع تر سیاق و سباق میں پیش کیا ہے۔

جاؤ وہ ویت نام کے جنگل
اس کے مصلوب شہر، زخمی گاؤں
جن کو انجیل پڑھنے والوں نے
روند ڈالا ہے پھونک ڈالا ہے
جانے کب سے پکارتے ہیں ہمیں

اسی آفاقیت کی پرچھائیاں ان کی ایسی نظموں میں ہیں جو انسانی وجود کے مرکزی مسایل پر لکھی گئی ہیں اور یہ مسایل محض دور کی آواز یا خارج کے وقوع نہیں آپ بیتی کا درجہ رکھتے ہیں مثلاً زندگی جس میں موت کی طرف انسان کے رویے کا ذکر ہے ان مسایل کی طرف کیفی نے ایک سچے مارکسی کا رویہ اپنایا ہے جو موت کو حقیقت سمجھ کر اسے سائنٹفک

طور پر دیکھتا ہے نہ اس سے گریز کرتا ہے نہ اس کے خوف کو اپنے اوپر غیر ضروری طور پر طاری کرتا ہے۔

تاریخیت سے میری مراد ہے انسانی زندگی کا وسیع تر تاریخ کا احساس اور ادراک کیفی نے اپنی کئی نظموں کی ابتدا اور ذاتی احساس یا کسی نجی واقعے سے کی ہے مگر اسے تاریخ کے آئینے میں دیکھا ہے "ابن مریم" اور زندگی دونوں میں اس انسان کی بپتا ہے جو صدیوں سے طرح طرح کے مظالم اور استحصال کا شکار رہا ہے اور موت کے خوف سے مختلف قسم کے توہمات میں پناہ لیتا رہا ہے گویا ہر لمحہ اور ہر تجربہ، ہر احساس اور ہر جذبہ صدیوں کی پرتیں کھولتا ہوا اور رقم نہاقرن کی سرحدیں پار کرتا ہوا ایک انسانی سرگذشت کا جز بن جاتا ہے اور انسانی رزم نامے کا حصّہ بن کر سامنے آتا ہے۔

مختلف زمانوں پر پھیلے ہوئے انسانوں کے لئے مرکزی معنویت رکھنے والے احساسات کیفیات اور تصورات کو شعری اظہار بخشنے کے لئے کیفی کو نئی امیجری ہی نہیں نیا علامتی پیرایہ ایجاد کرنا پڑا اس علامتیت کا انداز ابہام اور چیستاں کا نہیں ہاں ایک تہ بکرنی کا ضرور ہے جس کا حل خود اسی میں چھپا ہوا ہے۔ علامتیں نئی تہ داری اور جامعیت کے ساتھ شعر میں جادو جگاتی ہیں۔

حضرت عیسٰی کا مجسمہ ــــ کے چوراہے پر استادہ ہے۔ اس مجسمے کے نیچے دنیا کا کاروبار جاری ہے چور بازاری کے دھندے چوری ڈاکہ زنی استحصال روحوں کا سودا ضمیر کا بیوپار اور ایک بے سہارا بے گھر بے آسرا شخص حیرت سے حضرت عیسٰی کے مجسمے کو تکتا رہتا ہے جو مسیحا بھی کہے جاتے تھے اور جو انسانوں کو دکھ درد سے نجات دلانے کے لئے پھانسی پر چڑھے تھے اور یہ بے آسرا شخص اس امید سے انہیں تکتا ہے کہ وہ ویت نام کے جنگلوں یا خیر و شر کی دوسری رزم گاہوں کی طرف جائیں گے اور اس طرح مجسمے کا خالی کیا ہوا چبوترہ اسے رات کو سونے کے لئے میسر آجائے گا۔

اس تہ در تہ علامت نگاری کی معنویت فنی انبساط کا ایک ذخیرہ ہے جو مختلف تمثالوں سے مل کر بنا ہے۔ اس مرقع سازی کو کیفی نے معنویت بخشی ہے اور علامتیت اور معنویت کا

جرأتِ فکر کے ساتھ یہ حسین امتزاج اس دور میں جس طرح اپنایا ہے اس کی مثالیں قدیم ترقی پسند شعراء میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ اس زمانے میں انقلابی ہی نہیں جمہوری تحریکوں پر بھی سخت وقت آئے۔ اشتراکی اکائی ٹوٹے بقول کیفی بجد ے گو آمادہ ہو گئے (گو ذاتی طور پر میں کسی اشتراکی سماج کو بھی سجدہ کرنے کا مخالف ہوں۔ مارکسیت اگر کچھ سکھاتی ہے تو سر بلندی کہ اپنی بصیرت اور حکیمانہ نظر پر بھروسہ اور اس کا صحیح استعمال ہی سکھاتی ہے) اس وقت بہت سے ایسے شاعر تھے جو سماجی وابستگی اور اجتماعی شعور ہی سے انکار کر بیٹھے یا تو اپنی ذات میں اسیر ہو گئے یا کلاسیکی شاعری یا محض انسان دوستی کی طرف واپس چلے گئے۔ ملک میں جمہوریت برسرِ دار ہوئے ایمرجنسی نافذ ہوئی اور اچھے بھلے فن کار قصیدہ خواں ہو گئے کیفی نے اس دور میں بھی اپنے دور اور اپنے معاشرے سے رشتہ توڑ کر اپنی کلاہ کی کجی میں کمی آنے دی۔ چنانچہ ایمرجنسی کے دوران تیرے شہر میں ردیف کی ان کی غزل نظم "سناٹا" اور اخبارات کی آزادیٔ اظہار پہ پابندی لگنے پر ان کی نظم "آئینہ" اس دور کی یادگار ہیں۔ فرق البتہ یہ ہے کہ اب ان کے پیرایۂ اظہار میں علامتیت ہی نہیں جامعیت اور تہہ داری بھی آگئی ہے۔ اب بقول اقبال "برہنہ حرف نہ گفتن" کے زیادہ قائل ہو گئے ہیں۔ ایک ایسے دور میں بھی جب اندھیروں کا تسلط مستحکم لگنے لگے کیفی یقین و اعتماد کا ننھا سا دیا جلانے سے نہیں چوکتے۔

ایک کروٹ اور بدلے گا ابھی ہندوستان

اور اس کا جواز وہ سب دیے فراہم کرتے ہیں جو شاعر اپنے وطن کی سالگرہ کے موقع پر جلاتا رہا ہے۔

ایک دو بھی نہیں چھبیس دیے
ایک ایک کر کے جلائے میں نے
بجھ گئے سارے دیے
ہاں مگر ایک دیا نام ہے جس کا امید
جھلملاتا ہی چلا جاتا ہے

یہی کس بل اور جرأتِ فکر نئی علامتیت اور تہہ داری کے ساتھ مل کر کیفی کے شعری

آہنگ کی تشکیل کرتی ہے۔

کیفیؔ کی شاعری کا ذکر ان کی غزل کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ کیفی نے غزلیں کم کہی ہیں وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں لیکن ان کی غزلوں میں بھی یہی علامتی انداز سماجی وابستگی کی بنیادوں پر ابھر کر اور نکھر کر سامنے آیا ہے جو لوگ اس تحریک کے نشیب و فراز سے واقف ہیں جس سے کیفیؔ اور ان کی شاعری گہرے طور پر وابستہ رہی ہے انہیں غزل کے ان اشعار میں نئی معنویت کا احساس ہو گا جو اردو غزل کا نیا شعری لہجہ بھی ہے۔

خار و خس تو ہٹیں راستہ تو چلے
میں اگر تھک گیا قافلہ تو چلے

بیلچے لاؤ کھودو زمیں کی تہیں
میں کہاں دفن ہوں کچھ پتہ تو چلے

آج کیفیؔ کی شاعری ایک ایسے احساس فردگی شاعری ہے جو حکیمانہ شعور کو پورے طور پر اپنا کر مایوسیوں کے اندھیروں میں بھی زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی ہمت اور جرأت رکھتا ہے اور اپنی شخصیت اور شاعری کو انسان کے اس عظیم مجاہدے کا حصہ جانتا ہے جو ازل سے جاری ہے اور رہتی دنیا تک جاری رہے گی اور جس کے نتیجے کے طور پر تہذیب و تمدن کی ساری برکتیں، زبان اور شعر کی ساری لطافتیں اور علم و عمل کے سارے تاج محل اسے انسانیت کو حاصل ہوئے ہیں۔ کیفیؔ اس مجاہدے کے سپاہی بھی ہیں اور مغنی بھی۔

قمر رئیس

کیفی اعظمی کی تخلیقی فکر کا سفر

گورکی نے اپنے ایک دلچسپ مضمون "میں نے لکھنا کیسے سیکھا" میں اپنے تجربات اور مشاہدات کو تعمیمی شکل دے کر بڑی خیال انگیز باتیں لکھی ہیں۔ وہ لکھتا ہے "یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ زمانہ قدیم سے ہر جگہ پر انسانوں کی روح کو مقید کرنے کے لئے ایک جال بنا جاتا رہا ہے لیکن دوسری طرف ہمیشہ اور ہر مقام پر یہ بھی ہوتا رہا ہے کہ کچھ لوگوں نے انسان کو ضعیف الاعتقادی توہم پرستی اور تعصبات سے نجات دلانے کے کام کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا جہاں لوگ چھوٹی چھوٹی مسرتوں اور نفسانی خواہشوں کے پیچھے بھاگتے رہے ہیں وہاں ایسے باغی بھی ہوتے ہیں جو اپنے گرد و پیش کی پستیوں اور زندگی کے عامیانہ پن کے خلاف احتجاج کی سرکش آواز بلند کرتے ہیں اور یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ آخری تجزیہ میں وہ باغی جنھوں نے انسانوں کو آگے کا راستہ دکھایا اور اس راستے پر چلنے کی ترغیب دی ان کو ان لوگوں پر فوقیت اور فتح مندی حاصل ہوئی جو طبقاتی سماج کی پست اور عامیانہ صورت حال سے مفاہمت کے مبلغ تھے۔

خود گورکی جس کے ذہن پر یہ انقلابی دانش طلوع ہوئی اپنے سماج کے ان باغیوں میں

سے ایک تھا جن کی فتح مندی کی بشارت اس نے دی ہے۔گورکی نے اسکول یا دانش گاہ میں کسب علم نہیں کیا۔روس کے طبقاتی سماج کے نہایت گھناؤنے ماحول میں اس نے بچپن سے ایک عام مزدور کی زندگی بسر کی۔اس نے بھی زمینداروں، سرمایہ داروں اور انسانی تہذیب واخلاق کے محافظوں کے ہاتھوں انسان کے جسم وروح کی اسیری اور استحصال کے وحشیانہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھے اور وہ خود بھی ان صعوبتوں سے گذرا اس طرح قدم بہ قدم وہ اس انقلابی حقیقت کی طرف بڑھتا رہا جس نے انسانی سماج کی تاریخ کے اسرار اس پر کھول دیئے اور مستقبل کے ایک ایسے سماج پر اس کا یقین محکم کیا جو ہر طرح کی غلامی اور استحصال سے پاک ہو۔"

کیفی اعظمی کی زندگی اور شاعری پر جب میں نظر ڈالتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے شعور کی تعمیر وتربیت بھی جبر وبے داد کے کم وبیش ایسے ہی ماحول میں ہوئی۔وہ بھی اپنے گرد وپیش کے انسانوں کے دکھ درد اور محرومیوں میں شریک رہے۔ان کے دل میں ان گھناؤنے حالات کے خلاف نفرت کی بجلیاں کوندنے لگیں جنھوں نے انسانوں کو شریفوں اور کمینوں، حاکموں اور غلاموں میں تقسیم کر رکھا تھا اور جس میں اخلاق اور مذہب کے اجارہ دار بدترین اخلاقی جرائم سے دریغ نہ کرتے تھے وہ بھی ان ہی نتائج تک پہنچے جن تک گورکی پہنچا تھا اور انھوں نے بھی باغیوں کے ہراول دستے میں اپنی زندگی مجاہدانہ شان سے گذار دی۔

ہر باغی نوجوان کی طرح کیفی بھی رومانی مزاج لے کے پیدا ہوئے تھے لیکن یہ رومانیت وہ نہیں تھی جو زندگی کے معروضی حقائق سے منھ موڑ کر ذات کے خول میں قید کر دیتی ہے اور فن کار وجود کے اسرار یا پھر مرگ وحیات کے مسائل پر سوچ وچار کرنے میں عمر عزیز برباد کرتے ہیں۔یہ ایسی فعال اور متحرک رومانیت ہے جو بقول گورکی زندہ رہنے کی انسان کی خواہش کو استحکام بخشتی اور اسے ماحول کی پستیوں سے اونچا اٹھاتی ہے۔

کیفی اعظمی نے گذشتہ چالیس سال میں جو شاعری کی ہے وہ اسی متحرک رومانیت اور باغی احساس وفکر کی شاعری ہے۔

ضلع اعظم گڈھ کے مجواں گاؤں کے ایک نہایت قدامت پسند چھوٹے زمیندار گھرانے

میں پیدا ہونے والا اطہر حسین کس طرح انیس بیس سال کی عمر میں کیفی اعظمی بن گیا اس کی پوری روداد تو شاید اب کیفی اعظمی بھی بیان نہ کر سکیں اس لئے کہ بچپن کی بے شمار واردات جو حساس ذہنوں پر نتیجہ خیز اثرات ڈالتی ہیں اکثر لاشعور کے نہاں خانوں میں اتر جاتی ہیں۔ شوکت کیفی صاحبہ نے اپنے مضمون، کیفی اعظمی میرے ہم سفر، میں ان کے بچپن کے کچھ واقعات بیان کئے ہیں ان سے اور بعض دوسرے شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بچپن سے ہی غیر معمولی طور پر حساس اور دردمند دل رکھتے تھے۔ ایک ایسا دل جو دکھی، غم دیدہ، غریب اور ٹھکرائے ہوئے انسانوں کے لئے محبت کے بے کراں جذبات سے معمور تھا۔ جو طبقاتی اونچ نیچ کی مصنوعی دیواروں سے انسانوں کی آزادی کا خواہاں تھا۔ اطہر حسین بچپن ہی سے عید کے دن نئے کپڑے پہننے سے اس لئے انکار کر دیتا تھا کہ اس کے ہجوی گاؤں کے غریب کسان بچوں کے پاس پہننے کو نئے کپڑے نہیں ہوتے تھے۔ گاؤں کے غریب کسانوں، مزدوروں، کمہاروں اور تیلیوں کے بچے ہی وہ بچے تھے جن کے ساتھ گلیوں، کھیتوں باغوں، تالابوں، میلوں اور نوٹنکیوں میں اطہر حسین نے اپنے بچپن اور لڑکپن کے حسین ترین لمحے گذارے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی زندگی اور دکھ سکھ سے اسے ایک احساس یگانگت پیدا ہو گیا تھا۔ ان کے چچا زمیندار تھے اور عام زمینداروں کی طرح رعب داب سے رہتے تھے۔ انھیں یہ واقعہ آج بھی یاد ہے کہ گاؤں کے ایک کمہار کا لڑکا بمبئی سے کمائی کر کے گاؤں واپس آیا۔ چچا کے لئے وہ ایک جاپانی بیٹری اور کچھ دوسرا سامان لایا۔ جب وہ سامان نذر کرنے کے لئے ان کے پاس پہنچا تو انھوں نے سامان لے کر رکھ لیا لیکن چونکہ وہ انگریزی بال کٹوا کر آیا تھا اس لئے اس پر بے بھاؤ کی گالیاں اور لاتیں پڑیں۔

ربیع کی فصل کٹ رہی تھی۔ چچا نے اطہر حسین کو نگراں بنا کر کھیت پر بھیج دیا۔ مزدور ۲۲ پولیاں کاٹتے تھے تو ایک پولی ان کی مزدوری ہو جاتی تھی۔ یہ آخری پولی وہ بہت کسی ہوئی اور موٹی بناتے تھے۔ چچا کے حکم کے مطابق انھوں نے مزدوروں کی وہ پولیاں کھلا کر دیکھیں لیکن ان میں سڈول اور شاداب جسم کی ایک کسان لڑکی بھی تھی۔ اطہر حسین نے اس کی پولی نہیں کھلوائی مزدوروں نے جل کر یہ بات چچا کو بتادی، اس کے نتیجے میں انھیں گاؤں سے رخصت کر دیا گیا۔

گھر میں سخت قدامت پسندانہ اور گھٹا گھٹا ماحول تھا۔ اطہر حسین کی کئی جوان بہنیں

دق کے موذی مرض کا شکار ہو کر مر چکی تھیں۔ اطہر حسین اکثر اپنے والد صاحب کے ساتھ بیمار بہنوں کو دیکھنے سینی ٹوریم جاتے تھے۔ ان حالات اور حادثوں نے ان کے حساس دل کو دکھی اور بوجھل بنا دیا تھا۔

پندرہ سولہ برس کی عمر میں وہ لکھنؤ کے سلطان المدارس میں داخل کر دیئے گئے گاؤں کی محفلوں میں شعر گوئی کا چسکا پڑ چکا تھا۔ لکھنؤ کی آب و ہوا بھی اس شوق کو راس آئی اب غزلوں کے ساتھ نظمیں بھی کہنے لگے۔ سلطان المدارس میں دقیانوسی خیالات اور فیوڈل قدروں کا تسلّط تھا۔ اطہر حسین اس ماحول سے بیزار تھے۔

"انگارے" شائع ہو چکی تھی۔ اور چونکہ حکومت نے اسے غیر قانونی قرار دیا تھا اس لئے شہر میں اس کے چرچے تھے۔ مدرسے کے مولوی جمع ہو کر ایک طالب علم سے "انگارے" کے افسانے سنتے تھے۔ بعض کہانیوں کے فحش حصّے بار بار سنتے اور لاحول پڑھتے تھے۔ اطہر حسین نے بھی "انگارے" اسی زمانے میں پڑھی۔ اس سے نفرت کے ان جذبات نے جو ظلم و تشدد، قدامت پرستی اور تنگ نظری کے خلاف ان کے دل میں پیدا ہو رہے تھے۔ ایک واضح شکل اختیار کی۔ اس سے انھیں اظہار و عمل کی جرأت اور حوصلہ بھی ملا۔

وہ "عالم" کے امتحانات کی تیاری کر رہے تھے۔ مدرسے کے ایک مولوی نے نہج البلاغہ پڑھانے کے لئے انھیں سحری کے وقت گھر بلایا۔ وہ مولوی غالباً علّت المشائخ کا شکار تھا۔ اطہر حسین پر اس نے جبر کرنا چاہا۔ وہ نکل بھاگے اور سلطان المدارس کے طلباء اور اساتذہ کو انھوں نے یہ واقعہ بتا دیا۔ سارے طلباء نے متحد ہو کر اس مولوی کو ہٹانے کے لئے ہڑتال کر دی جو چھ مہینے جاری رہی۔ اطہر حسین نے جو شاید اب کیفی اعظمی ہو گئے تھے اس دور میں بڑی جوشیلی نظمیں لکھیں۔ ان کے باغیانہ جذبات کے اظہار کا یہ پہلا محاذ تھا۔ طرح طرح کے دباؤ اور ترغیبات کے باوجود ان کے قدم نہیں ڈگمگائے۔

اس زمانے میں ایک عشق بلاخیز نے بھی انھیں اپنی آسیبی گرفت میں لے لیا۔ کشمیری خاندان کی ایک لڑکی کو وہ ایم۔ اے کی تیاری کے لئے اردو پڑھاتے تھے اس طوفانی عشق کی آگ میں دونوں ہی جل بجھے۔ شرط یہ رکھی گئی کہ کیفی چھ ماہ کے لئے لکھنؤ سے چلے جائیں اگر اس کے

بعد بھی دونوں کا عشق قائم رہا تو شادی کر دی جائے گی۔ لیکن یہ دراصل ایک چال تھی۔

کیفی کانپور آ گئے۔ کانپور جو شمالی ہندوستان میں مزدوروں کی تحریک کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ جہاں ۱۹۲۵ء میں پہلی کمیونسٹ کانفرنس ہوئی تھی جس کی مجلس استقبالیہ کے صدر مولانا حسرت موہانی تھے۔ کانپور میں سلطان نیازی، سید محمد مہدی، مونس رضا اور سنت سنگھ یوسف جیسے مارکسی نوجوانوں سے ان کی ملاقات ہوئی۔ یہیں انھوں نے مارکسی لٹریچر پڑھا۔ سہارنپور سے نکلنے والا انقلابی پرچہ "چنگاری" وہ پہلے ہی پڑھتے تھے۔ اب بمبئی سے نکلنے والا کمیونسٹ پارٹی کا اخبار "قومی جنگ" بھی پڑھنے لگے۔ فکر و عمل کا ایک وسیع میدان اب ان کے سامنے تھا۔

دوسری جنگ عظیم شروع ہونے پر ملک کے کمیونسٹ رہنما اور ترقی پسند دانشور گرفتار کر لئے گئے تھے۔ لیکن جب نازیوں نے اپنی ساری قوت جمع کر کے سوویت روس پر حملہ کیا (اور جو اس وقت نازیوں کے خلاف برطانیہ کا حلیف تھا)، تو ہندوستانی کے اشتراکی رہنماؤں اور ادیبوں کو بھی رہائی اور تنظیم کی آزادی نصیب ہوئی۔ نازیوں کے جارحانہ حملے کے خلاف سوویت عوام کی یہ جنگ تیسری دنیا کے کروڑوں انسانوں کے لئے آزادی کی جنگ تھی اگر چار سال کی مدافعانہ جنگ میں دو کروڑ سوویت جوان اپنی جانیں قربان کر کے ہٹلر کی فوجوں کو شکست نہ دیتے تو کون کہہ سکتا ہے کہ آج ساری دنیا میں فاشسٹوں یا سامراجیوں کا راج نہ ہوتا۔ اس لئے نازیوں کے اس حملے کے خلاف ہندوستان کے مزدوروں اور کسانوں، دانشوروں اور نوجوانوں کی سینکڑوں تنظیموں نے صدائے احتجاج بلند کی اور سوویت عوام کی جانبازانہ مدافعت کو انسانی جرأت و جواں مردی اور ایثار و قربانی کا زندہ معجزہ قرار دیا۔

کیفی کا پہلا مجموعہ "جھنکار" ۱۹۴۱ء میں اور دوسرا مجموعہ "آخر شب" آزادی سے کچھ قبل ۴۷ء کے اوائل میں شائع ہوا۔ ان مجموعوں میں نازیوں کے خلاف سوویت عوام کی اس جنگ اور ان کی فتح یابی کے لئے ہندوستان کے اور ساری دنیا کے محنت کش عوام کے حوصلہ خیز جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے، سرخ جنت، روسی عورت کا نعرہ۔ اسٹالن کا فرمان جگاؤ اعتراف

روسی عوام اور جنگ۔ یلغار اور دوسری نظمیں۔ بے شک ان میں سے بیشتر نظمیں نہ صرف یہ کہ ہنگامی اور سطحی ہیں بلکہ خطیبانہ جوش سے معمور ہیں۔ لیکن ان نظموں نے ہندوستان کے لاکھوں عوام کے دلوں میں نازی درندوں کے خلاف نفرت کے جذبات بیدار کئے ہیں۔ انھیں دنیا کے محنت کش عوام کی بیداری اور آزادی کی عہد آفریں تحریکوں سے جوڑا ہے۔ انسانی تاریخ کے ایک ایسے موڑ پر جب انسانیت مرگ و زیست کی کشمکش سے دوچار تھی اگر کیفی اعظمی، سردار جعفری، مخدوم اور دنیا کے دوسرے بے شمار عوام دوست ادیب و شاعر اپنے ضمیر کی آواز پر فاشسٹ جارحیت کے خلاف آواز بلند نہ کرتے تو آنے والی نسلیں انھیں بجا طور پر بے ضمیر کہتیں۔ حق و باطل، بربریت اور انسانیت کی اس جنگ میں کیفی بھی ایک سپاہی تھے اور قلم سے جہاد کر رہے تھے۔ ان نظموں کے احتجاجی آہنگ میں اس جنگ کے ٹینکوں اور توپوں کی گڑگڑاہٹ اور اس کے شعلوں کی گرمی اور لپک محسوس ہوتی ہے۔ اس جنگ کے بارے میں ہندوستان کے اور ساری دنیا کے بورژوا حلقوں کا جو رد عمل تھا اس نے کیفی کے سیاسی اور طبقاتی شعور کو زیادہ تیکھا اور توانا بنا دیا اور ان کی انقلابی فکر کو نئی گہرائیوں سے آشنا کیا۔

جھنکار اور آخر شب کی نظمیں کیفی نے لگ بھگ اکیس سے اٹھائیس سال تک کی عمر میں لکھی تھیں جب گاؤں کے روز و شب کی یادیں اور عشق بلاخیز کی گھاتیں پرچھائیوں کی طرح ان کا پیچھا کر رہی تھیں۔ عشق میں ناکامی انھیں شکست و مایوسی اور کلبیت کے ایسے اندھیرے غاروں میں لے جا سکتی تھی جہاں سے وہ کبھی واپس نہ آتے لیکن دکھی انسانوں کی محبت اور محنت کش عوام کی جنگ آزادی سے احساس یگانگت IDENTIFICATON نے انھیں غموں سے کام لینے کا ہنر سکھا دیا اور ان کی معصومیت کو حزنیت کی زہرناکی سے پاک کر کے ایک انقلابی صورت دی۔

بے شک جادۂ آزادی کے اس جانباز سپاہی کو ایک موہوم نسوانی آواز روکتی ہے بلاتی ہے۔ بار بار اس کے دامن دل سے لپٹتی ہے۔ اسے ایک کشمکش سے بھی دوچار کرتی ہے لیکن اس کے قدم رکتے نہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے گرم لہو اور حسین تر خوابوں کی ترنگ میں، دشت عمل کے ساحل پر پہنچ جاتا ہے اور کسی حسین پیکر کی وہ آواز شکست کھا کر ڈوب جاتی ہے۔

نظم آواز کی شکست کا پہلا بند دیکھیے۔

یہ تاریک جادہ یہ پُر ہول جنگل — جلائی ہے غول بیاباں نے مشعل
درختوں کے نیچے ہے وحشت کا ڈیرہ — ہواؤں میں حل ہو رہا ہے اندھیرا
اندھیرے میں احساس یہ بھی نہیں ہے — زمیں پر فلک یا فلک پر زمیں ہے
بھیانک خموشی کے اللہ رے تیور — کہ بجتے ہیں کان آپ اپنی صدا پر

یہ حسین پیکر گاؤں کی زندگی اس کی اندھیری راتوں پر ہول ویرانیوں، جنگلوں اور آوارہ ہواؤں سے کیفی کی گہری وابستگی کا مظہر ہے۔ جھنکار کی بعض دوسری نظموں کے عنوانات ہیں۔ بانسری کا لہرا، برسات کی ایک رات، آندھی، شام، کہرے کا کھیت، دوشیزہ مالن، پیتل کے کنگن، سویرے سویرے۔ ان نظموں میں کیفی کے معصوم دل کی مدھر دھڑکنیں ہی نہیں۔ گاؤں کے ماحول اور موسموں کی آہٹ بھی سنائی دیتی ہے۔ اس مجموعہ کی نظموں میں کہیں انیس کے لہجے کی سادگی اور شیرینی ہے اور کہیں جوش کی بلند آہنگی اور رومانی وفور لیکن ان کے بطن سے جو تصویریں ابھرتی ہیں وہ احساس کی صداقت اور کیفیت سے معمور ہیں۔

فضا جھومتی ہے گھٹا جھومتی ہے — درختوں کی ضو برق کو چومتی ہے
تھرکتے ہوئے ابر کا جذب توبہ — کہ دامن اٹھائے زمیں گھومتی ہے

برسات

مچلتی جھومتی ہلچل مچاتی — تڑپتی شور کرتی دل ہلاتی
گرجتی چیختی فتنے اٹھاتی — قیامت کو جگا کر لا رہی ہے
اٹھو دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے

"آندھی"

مست گھٹا منڈلائی ہوئی ہے — باغ پہ مستی چھائی ہوئی ہے
جھوم رہی ہیں آم کی شاخیں — نیند سی جیسے آئی ہوئی ہے
رینگتے ہیں خاموش ترانے — موجِ ہوا بل کھائی ہوئی ہے

"شام"

فطرت کے کھلے آغوش میں پلنے والے گاؤں کی سیدھی سادی زندگی سے، گاؤں کے غریب اور دکھی عوام سے اور ان کے مسائل سے کیفی کی یہ وابستگی آج بھی برقرار ہے۔ آج بھی جب وہ چلنے پھرنے سے ایک حد تک معذور ہیں اپنے گاؤں کے مکان کی مرمت کرواتے جاتے ہیں۔ گاؤں کی سڑک پختہ بنوانے اور وہاں مدرسہ کھلوانے کے لئے وزیروں اور افسروں کے دروازے بھی کھٹکھٹاتے ہیں۔ گاؤں کے کسانوں اور مزدوروں کے درمیان بیٹھ کر ان میں گھل مل کر ایک روحانی سکون حاصل کرتے ہیں، یہی وہ جذبہ تھا جس نے برسوں انھیں مدن پورہ (بمبئی) کی تنگ گلیوں گندی بستیوں اور وہاں کے غریب مزدوروں میں کام کرنے پر مجبور کیا۔ انھیں اپنے حقوق کے لئے لڑنے اور جد وجہد کرنے پر اکسایا اور منظم کیا۔ اور آج بھی وہ ذہنی اور جذباتی طور پر ان سے الگ نہیں ہیں۔

کیفی ترقی پسند شعرا کے اس حلقہ سے تعلق رکھتے ہیں جو زندگی کے ہر دور میں محنت کش عوام اور ان کی تحریکوں سے جڑے رہے جو انصاف اور آزادی کے لئے محکوم اور مظلوم انسانوں کی جد وجہد" ان کے عزائم" ان کی قوت اور ان کی آخری فتح پر ایمان اور عقیدہ رکھتے ہیں کیفی کی بیشتر نظموں کے مخاطب یہی محنت کش عوام ہیں۔ ان نظموں میں سیدھا سادہ طرز اظہار اور جوشیلا رزمیہ لب ولہجہ ہے وہ جد وجہد کرنے والے مزدوروں اور کامگاروں کے جذباتی آہنگ سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔ ان نظموں میں کوئی پیچیدہ امیجری یا چونکا دینے والے تجربات نہیں ہیں لیکن ان میں سماجی اور سیاسی تناؤ کی جو فضا ہے وہ اس عہد کی بنیادی آویزشوں اور تضادات کی ترجمانی ضرور کرتی ہے۔

۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۶ء تک کا یہ زمانہ ہندوستان میں سیاسی ہلچل ہی نہیں انقلابی تحریکوں اور ہنگاموں کا زمانہ بھی تھا۔ اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ بورژوا وطن پرستوں نے بھی شاید پہلی بار برطانوی سامراج کے خلاف ایک منظم اور متشدد جارحانہ رویہ اختیار کیا تھا۔ قومی رہنماؤں کی بے دریغ گرفتاری سے ملک میں برطانوی حاکموں کے خلاف نفرت کی آگ سی دہک اٹھی تھی۔ پھر جنگ کے خاتمہ پر کروڑوں انسان جس اقتصادی بحران سے دوچار ہوئے جس گرانی بے زری بے روزگاری اور ہلاکت آفریں قحط کا سامنا ہوا۔ اس نے کسانوں اور مزدوروں

کو دحشت زدہ کر دیا۔ ۴۶ء کے صرف ابتدائی تین مہینوں میں چھ لاکھ مزدوروں نے چار سو سے زائد ہڑتالیں کیں، تلنگانہ کوچین اور کیرالا میں کسان اٹھ کھڑے ہوئے۔ فروری ۴۶ء میں ہزاروں ہندوستانی جہازیوں نے برطانوی سامراج کے خلاف کھلی بغاوت کر دی۔ یہ باغیانہ سرگرمیاں کمیونسٹ پارٹی کانگریس، مسلم لیگ تینوں کی متحدہ قیادت میں جاری تھیں۔ ان کا نتیجہ تھا کہ برطانوی حکومت نے سپر ڈال دی اور دستور ساز اسمبلی اور قومی حکومت کے قیام کی منظوری دے دی۔

کیفی کی اس عہد کی نظموں میں اس پر آشوب لیکن حوصلہ خیز قومی صورت حال کے زندہ اور تابناک نقوش ملتے ہیں۔ برطانوی حکومت کے اقتدار اعلیٰ کے تحت ریاستوں میں جب کانگریس نے قومی حکومتیں بنائیں تو انھوں نے پہلا حملہ کسان سبھاؤں اور ان مزدوروں کی تنظیموں پر کیا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کیفی اعظمی نے کہا تھا۔

سبھاؤں کو توڑنے کچلنے کی ہوگی یہ ساز باز کب تک
اڑیں گے پھر بھی فضا میں لے کر تمھیں ہوائی جہاز کب تک
کبھی تو آخر زمین کے ساکنوں کا بھی سامنا کروگے

اٹھی ہے کھیتوں سے سرخ آندھی ملوں میں بجلی چمک رہی ہے
تمھارا منھ مادر وطن آج کتنی حسرت سے تک رہی ہے
جو کہہ چکے ہو وہ کر دکھاؤ سہارے کب تک دیا کروگے

غضب کا بھونچال ہے پرانے محل سے باہر نکل بھی آؤ
بھڑک چلی آتش بغاوت اسے نہ گھبرا کے اب بجھاؤ
کہیں لپک کر تمھارا دامن پکڑ لیں شعلے تو کیا کروگے

آج کے قومی حکمرانوں اور قومی صورت حال کے تعلق سے بھی یہ نظم کتنی معنویت رکھتی ہے؛

یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

آزادی سے کچھ قبل بین الاقوامی صورت حال بھی تیزی سے بدل رہی تھی۔ جنوب مشرقی ایشیا میں برطانیہ، فرانس اور ڈچ سامراجی جاپانیوں کو ہٹا کر پھر سے اپنا نو آبادیاتی اقتدار قائم کرنا چاہتے تھے اور امریکی سامراج ان کی مدد کر رہا تھا۔ ادھر یورپ میں نئی انقلابی حکومتیں قائم ہو رہی تھیں اور چین میں انقلابیوں کے قدم تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ دوسری جنگ نے ثابت کر دیا کہ اشتراکی نظام اور اشتراکی اقتدار جدید ترین اسلحہ سے مسلح دنیا کی عظیم ترین طاقتوں سے لوہا لینے اور انھیں شکست دینے کی قوت رکھتا ہے۔

ہمارے جادے، ہماری منزل ہمارے دریا ہمارے ساحل
ہماری دنیا بسی ہوئی ہے جدھر نگاہیں اٹھا رہے ہیں
ہمارے مل اور کارخانے، ہماری کھیتی، ہماری کانیں
ہماری قوت کا پوچھنا کیا ہم آج دنیا پہ چھا رہے ہیں
ہم آگے بڑھتے ہی جا رہے ہیں

کیفی کا یہ پر اعتماد رجائی لب و لہجہ۔ ان کا یہ یقین کہ مغرب ہو یا مشرق۔ محنت کش عوام ساری دنیا میں اپنے اقتدار کا پرچم نصب کرتے آگے بڑھ رہے ہیں ایک غیر متزلزل عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کچھ لوگ اس وقت اسے صرف ایک کھوکھلی نعرہ بازی سمجھتے تھے لیکن آج صرف چوتھائی صدی بعد دنیا کی ایک تہائی آبادی ایک غیر طبقاتی اشتراکی نظام میں سانس لے رہی ہے اور ہندوستان کی تین ریاستوں میں بائیں بازو کی (کمیونسٹ) حکومتیں قائم ہیں۔

یقین کی یہ دولت کیفی کو مزدوروں، کسانوں کی زندگی اور ان کی تحریکوں میں براہِ راست شامل ہونے سے ہاتھ آئی تھی وہ دیکھ رہے تھے کہ کھیت ہوں یا کھلیان گر گھے ہوں یا کارخانے تخلیقی محنت کے ہر میدان میں عورت مرد کی ہم دوش ہے۔ اس کے ساتھ پسینہ بہاتی ہے۔ یہ اسی شعورِ حیات کا نتیجہ ہے کہ عورت کے بارے میں ان کا رویہ ان کے بہت سے معاصرین سے (جو متوسط طبقے کی میزانِ اقدار سے انحراف نہیں کر سکے) مختلف رہا۔ وہ عورت کو حسن اور زیبائی کا پیکر ضرور سمجھتے ہیں لیکن رزمگاہِ حیات میں۔ انقلابی جدوجہد میں وہ اسے مرد کے شانہ بہ شانہ دیکھنا چاہتے

ہیں مجاز نے تو صرف آنچل سے پرچم بنا لینے کی آرزو کی تھی اور ساحر (باوجود اس کے کہ انھوں نے مرد کے ہاتھوں عورت کی محکومی اور پامالی کے خلاف احتجاج کی موثر آواز بلند کی) صرف یہ کہہ کر چپ ہو جاتے ہیں۔

تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر دو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر دو

لیکن کیفی کی آواز عزم ویقین کی ایک نئی آواز ہے۔ اور یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ انھوں نے عورت اور محبوبہ کا ایک نیا تصور اردو شاعری کو دیا۔ ان کی مشہور نظم "عورت" کے یہ بند دیکھیے۔

اُٹھ مری جان میرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

قلب ماحول میں لرزاں شرر جنگ ہیں آج
حوصلے وقت کے اور زیست کے یک رنگ ہیں آج
آبگینوں میں تپاں ولولہ سنگ ہیں آج
جس میں جلتا ہوں اسی آگ میں جلنا ہے تجھے
اُٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

زندگی جہد میں ہے صبر کے قابو میں نہیں
نبض ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں
جنت اک اور ہے جو مرد کے پہلو میں نہیں
اس کی آزاد روش پر بھی مچلنا ہے تجھے
اُٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

توڑ کر رسم کا بُت بندِ قدامت سے نکل
ضعف عشرت سے نکل وہم نزاکت سے نکل
نفس کے کھینچے ہوئے حلقۂ عظمت سے نکل
یہ بھی اک قید ہی ہے قید محبت سے نکل
راہ کا خار ہی کیا گل بھی کچلنا ہے تجھے
اُٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

مردوں کی حاکمیت کے سماج میں عورت کو عیش و نشاط کا وسیلہ بنانے کے لئے نہ صرف رسموں اور واہموں کی زنجیروں میں جکڑا گیا ہے بلکہ اسے خالی "احساس نزاکت احساس عظمت اور احساس محبت کا قیدی بھی بنایا گیا۔ کیفی کے حقیقت پسندانہ شعور نے اس رواجی تصور یا MYTH کو بڑے مؤثر ڈھنگ سے توڑ دیا ہے۔ اپنی ایک دوسری نظم "اخغائے محبت" میں کیفی نے محبت کی آزادی کو ایک مثبت اور آزاد انسانی قدر کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

ذکر آچکا ہے کہ کیفی کی شاعری محض آرزومندی یا خیال آرائی نہیں ہے۔ وہ ان کی زندگی کی سچائیوں اور انقلابی جدوجہد ہی کا ایک روپ ہے۔ جب حیدر آباد کے ایک ذی حیثیت اور بڑے گھرانے کی ایک لڑکی (شوکت) سے انھوں نے عشق کیا تو اسے سب کچھ بتا دیا اور جتا دیا کہ پارٹی کمیون کی ایک نیم تاریک کوٹھری میں اور پینتالیس روپے مہینہ کی آمدنی میں اسے ان کے ساتھ گذر بسر کرنا ہوگی اور ایسا ہی ہوا۔ اپنے نصب العین کے لئے دونوں نے کیسی قربانیاں دیں؟ اپنی جوانی اور صحت کے بہترین ایام (جو کبھی واپس نہیں ملیں گے) کس طرح انھوں نے مزدوروں اور ناداروں کے ساتھ ان کی لڑائی میں شریک ہو کر گذارے اس کا اندازہ کیفی کی شاعری سے نہیں ہو سکتا۔ اس میں محنت کش عوام کے دکھ درد، بھوک افلاس محرومیوں اور ان کی بے مثل قربانیوں کا ذکر تو بار بار آتا ہے لیکن ان کی زندگی اور مقدر سے پیمانِ وفا باندھ کر کیفی اور شوکت کن آزمائشوں سے گذرے؟ اس کا حوالہ کہیں نہیں ملتا۔

اپنے تیسرے مجموعہ "آوارہ سجدے" کے تعلق سے کیفی نے لکھا ہے "جھنکار" سے آوارہ سجدے تک میری شاعری نے جو فاصلہ طے کیا ہے اس میں وہ مسلسل بدلتی اور نئی ہوتی رہی ہے۔ آج وہ جس موڑ پر ہے اس کا نیا پن بہت واضح ہے۔ یہ رومانیت سے حقیقت پسندی کی طرف کوچ کا موڑ ہے۔

آخر شب اور آوارہ سجدے کی اشاعت میں کم و بیش تیئیس سال کا وقفہ ہے اس میں ابتدائی چند نظموں کو چھوڑ کر باقی تمام نظمیں اور غزلیں ۶۲ء سے ۷۴ء تک کی تخلیق ہیں اس مدت میں دنیا کتنے ہنگاموں اور تہلکوں سے گذری۔

تیسری دنیا میں کتنے ملک آزاد ہوئے اور کتنے ہی ملک اشتراکی سماج کی تعمیر کے راستہ

پر چل پڑے۔ عالمی کمیونسٹ تحریک میں کتنے اختلافات رونما ہوئے۔ باہمی آویزش کی صورتیں بھی پیدا ہوئیں۔ ہندوستان میں بھی ایک پارٹی کئی پارٹیوں میں بٹ گئی۔ ہمسایہ ملکوں سے تین جنگیں ہوئیں ملک میں زراعتی اور صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ طبقاتی آویزش بھی بڑھی۔ کسانوں اور مزدوروں کی تحریکوں میں بھی استحکام کے آثار پیدا ہوئے۔ لیکن اسی کے ساتھ ملک میں بورژوا، فرقہ پرست اور رجعت پسند طاقتوں کا اثر بھی بڑا۔ سامراج کے ہاتھ زیادہ دراز اور ناخن تیز تر ہو گئے۔

الغرض تیس سال میں ایک نئی دنیا نے جنم لے لیا۔ آج محنت کش عوام کی صفیں زیادہ خود آگاہ، باشعور اور منظم ہیں۔ وہ اپنے حریفوں اور استحصال کرنے والوں کی شاطرانہ چالوں کو سمجھتی ہیں۔ اس لئے آج انھیں جھنجھوڑنے کی ضرورت نہیں۔ آج کے سیاسی تجربات اور سانحات بھی روزمرّہ زندگی کے انسانی تجربات میں گھل مل کر زیادہ پیچیدہ اور کثیر الجہت ہو گئے ہیں۔ آج کی انفرادیت پسندانہ داخلی اور وجودی شاعری میں بھی سیاسی اور سماجی تناؤ TENSIONS چپکے سے کسی آسیب کی طرح در آتے ہیں۔ دوسری طرف سیاسی اور سماجی تجربات شاعر کے داخلی وجود کے حوالے سے اپنی معنویت کا اثبات اور ترسیل کی تسکین کا سامان بہم کرتے ہیں۔ اس قلب ماہیت نے شعری اظہار کے جس نئے اسلوب کو فروغ دیا وہ صرف نئی پود کے باشعور تخلیق کاروں کا دور نہیں اس کے نشانات ۶۰ء کے بعد مخدوم، سردار جعفری، جاں نثار اختر اور کیفی اعظمی جیسے ترقی پسند شعراء کے کلام میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ نیا اشاراتی اسلوب عصر حاضر کے جمالیاتی تقاضوں اور نئے قارئین کی حیثیت سے بھی مطابقت رکھتا ہے۔

کیفی اعظمی کا یہ خیال بڑی حد تک درست ہے کہ ان کی شاعری کا یہ نیا پن، رومانیت سے حقیقت پسندی کی طرف گریز ہے۔ تاہم یہ بھی صحیح ہے کہ نہ وہ پہلے نرے رومان پرست تھے اور نہ اب سر تا سر حقیقت پسند ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ پہلے وہ زندگی کی جن حقیقتوں کو جذباتی سطح پر محسوس اور بیان کرتے تھے اب ان کا ادراک ان کے وجود میں زیادہ ہمہ گیر اور ان کا اظہار فنی سطح پر زیادہ معنوی تہوں کا حامل ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ مادی حالات کی تبدیلی نے تخلیقی تناظرات بھی بدلے ہیں۔ لیکن ان نظموں کے پیچھے شخص اور شاعر تو وہی ہے جس نے اپنی آواز میں اپنے عہد

کے دبے کچلے انسانوں کی محرومیوں کا سارا کرب بھر لیا تھا۔ جس نے زندگی اور کائنات کے مظاہر کو ان کی نگاہ سے دیکھنا اپنی فطرت بنالیا تھا۔ جیسے مارکسی نظریات نے تاریخ اور انسانی سماج کی تفہیم وتعبیر کا ایک معروضی اور سائنسی اسلوب دیا تھا اور بغیر کسی ارادی کوشش کے تجربات برجستگی کے ساتھ اپنے تجربات کو عوام کی عام فہم زبان ان کے محاورہ اور لب ولہجہ میں ادا کرنے کی قدرت رکھتا تھا۔ یقیناً یہ شخص اور شاعر وہی ہے۔ اس لئے وہ اپنی ان نگارشات میں بھی پہچانا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی شناخت سے عصرِ حاضر کے ان کروڑوں انسانوں کی شناخت ہوتی ہے۔ جو تعمیر وترقی کے ہزار دعووں کے باوجود آج بھی فٹ پاتھ پر اور جھگیوں میں حیوانوں سے بدتر زندگی گذارنے پر مجبور ہیں۔

یہ بند دیکھیئے:

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
سب اٹھو میں بھی اٹھوں تم بھی اٹھو تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی

یہ زمیں تب بھی نگل لینے پہ آمادہ تھی
پاؤں جب ٹوٹتی شاخوں سے اتارے ہم نے
ان مکانوں کو خبر ہے نہ مکینوں کو خبر
ان دنوں کی جو گپھاؤں میں گذارے ہم نے

ہاتھ ڈھلتے گئے سانچے میں تو تھکتے کیسے
نقش کے بعد نئے نقش نکھارے ہم نے
کی یہ دیوار بلند اور بلند اور بلند
بام و در اور ذرا اور سنوارے ہم نے

آندھیاں توڑ لیا کرتی ہیں شمعوں کی لویں
جڑ دیئے اس لئے بجلی کے ستارے ہم نے

بن گیا قصر تو پہرے پہ کوئی بیٹھ گیا
سو رہے خاک پہ ہم شورشِ تعمیر لئے

اپنی نس نس میں لئے محنتِ پیہم کی تھکن
بند آنکھوں میں اسی قصر کی تصویر لئے
دن پگھلتا ہے اسی طرح سروں پر اب تک
رات آنکھوں میں کھٹکتی ہے سیہ تیر لئے

نظم کا آخری بند وہی ہے جو پہلا ہے اس تکرار نے اور نظم کی علامتی فضا نے معنویت کا جو ڈرامائی لہجہ DRAMATICATION OF MEANING EQUATION پیدا کر دیا ہے اس کی خوبی سے قطع نظر یہاں جمع متکلم "ہم" قاری کی تخیل میں ان کروڑوں انسانوں اور صدہا پیڑھیوں کے زندہ نقوش بیدار کر دیتا ہے جو یگوں سے اس دھرتی کو اپنے صناع ہاتھوں سے دلہن کی طرح سجاتے رہے ہیں لیکن آج بھی وہ فٹ پاتھ پر بڑے بے رحم موسموں اور بے درد حاکموں کی استبداد سہہ رہے ہیں۔

کیفی کی بعض نظموں کا آغاز واحد متکلم سے ہوتا ہے لیکن جیسے جیسے نظم آگے بڑھتی ہے غیر شعوری طور پر "میں" "ہم" سے بدل جاتا ہے۔

"ابن مریم" کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

تم خدا ہو۔
خدا کے بیٹے ہو۔
جو بھی ہو مجھ کو اچھے لگتے ہو۔
مجھ کو سچے لگتے ہو۔

اس کے بعد شاعر کا تخیل اس کرہ ارض پر بنی نوع انسان کی تقسیم اس کا استحصال اور ان دونوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے وحشیانہ جرائم کا احاطہ کرتا ہے۔

اس ستارے میں جس میں صدیوں کے

جھوٹ اور کذب کا اندھیرا ہے
اس ستارے میں جس کو ہر رخ سے
رینگتی سرحدوں نے گھیرا ہے
اس ستارے میں جس کی آبادی
امن بوتی ہے جنگ کاٹتی ہے
رات بیتی ہے نور مکھڑوں کا
صبح سینوں کا خون چاٹتی ہے
تم نہ ہوتے تو جانے کیا ہوتا

اب یہ بند دیکھئے جس میں "میں" تحلیل ہو کر ساری دکھی انسانیت کے روپ میں طلوع ہوتا ہے۔

تم نہ ہوتے تو اس ستارے میں
دیوتا، راکشش، غلام، امام
پارسا، رند، راہبر، رہزن
برہمن، شیخ، پادری، بھکشو
سبھی ہوتے مگر، ہمارے لئے
کون چڑھتا خوشی سے سولی پر

ایسا لگتا ہے کہ کیفی کی شاعری کی بنیادی تعدیل EQUATION یہی "میں"="ہم" ہے۔ باقی ساری علامتیں۔ امیج اور استعارے اسی کے تابع اور اس کی پراسرار قوتوں اور رشتوں کے شارح ہیں یہ میں اور ہم کی تعدیل صوفیا یا بعض جدید شعراء کی طرح کسی تجریدی واہمہ تخلیقی جلوہ یا وجودی کرشمہ کی علامت نہیں یہ ہماری اسی دنیا کی تخلیق اس کے ارتقاء اور اس کی ساری رونق کے پیچھے متحرک اور روبہ کار سب سے بڑی قوت ہے۔ یہ انسان ہے جو بجر و بحر کا فاتح اور دنیا کے روز افزوں حسن کا خالق ہے جس نے اپنے عمل کی قوت اور اپنی تخلیقی جودت سے ہر عہد میں دنیا کو حسین تر بنایا اور زندگی کو امن اور آشتی کے

فردوس بنانے کے خواب دیکھے۔ وہ ارتقائے حیات کے ہر دور میں زندہ رہا ہے اور زندہ رہے گا۔ اس لیئے کہ زندگی کو انسان کے لئے راحت افزا بنانے کے اپنے خوابوں کو اس نے مادی تعمیرات میں مجسم کر دیا ہے۔ اس کی قوت عمل کا یہ تخلیقی اظہار ہی اس کی بقا کا ضامن ہے۔ اس کی قوت اور صلابت کے جذب و ادراک نے شاعر کو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو مروڑنے کی جرأت بخشی ۱۹۷۳ء میں فالج کے شدید حملہ کی یادگار کیفی کی شاہکار نظم "زندگی" ہے۔ اس نظم کی فکر انگیز علامتوں کے تفصیلی تجزیہ کا یہ موقع نہیں ہے۔ شاعر نے اس میں موت پر فتح پانے کی انسان کی ازلی خواہش کو متضاد تاریخی قوتوں کے تناظر میں دیکھا ہے۔

آج سے پہلے، بہت پہلے۔
اسی آنگن میں۔

دھوپ بھرے دامن میں
میں کھڑا تھا مرے تلوؤں سے دھواں اُٹھتا تھا
ایک بے نام سا بے رنگ سا خوف
کچے احساس پہ چھایا تھا کہ جل جاؤں گا
میں پگھل جاؤں گا
اور پگھل کر مرا کمزور سا "میں"
قطرہ قطرہ مرے ماتھے سے ٹپک جائے گا

اس انفرادی وجود "میں" کے ٹوٹ کر بکھر جانے کے خوف کا مداوا ایک طرف انسان نے روحانی اور ماورائی طاقتوں میں تلاش کیا جس نے دنیا کے مذاہب کو اور نتیجتاً یوگ، سنیاس بھگتی اور درویشی کو جنم دیا۔ دوسری طرف اس نے بنی نوع انسان کو دباؤں، دکھوں اور محرومیوں کے عذاب سے نجات دلانے کے نئے علم و عمل کا سہارا لیا۔ وہ ہر دور میں شیو کی طرح زندگی کے زہر کو منتھ کر پیتا رہا۔ شاعر کے نزدیک "میں" کو "ہم" سے آہنگ کر کے اس کی نجات کی عملی تدابیر کا راستہ ہی انسان بقا کا راستہ ہے۔ اس خیال کو کیفی نے جن حسین تمثیلوں

اور علامتوں کے تار و پود میں سمویا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔

یہ صحیح ہے کہ عہد جدید کے بعض دوسرے ممتاز شعراء کی طرح کیفی کی انفرادیت کا نقش زیادہ روشن اور گہرا نہیں ہے۔ شاید اس لیے کہ انھوں نے کسی بھی دور میں اپنے عہد اور اپنے عوام کی آواز سے اپنی آواز کو الگ پہچاننے اور پانے کی کوشش نہیں کی۔ انسان کے اجتماعی دکھ درد اور اس کی جدوجہد کے مقابلہ میں اپنی ذاتی محرومیوں اور محشرِ وجود کو کبھی فوقیت نہیں دی نہ ہی اظہار و بیان کی کسی طور پسندی MANNERISM کے مصنوعی سہاروں سے اپنی انفرادیت کا سکہ جمانے کی سعی کی۔ تاہم "آوارہ سجدے" کی نظموں میں جو ایک نئی علامتی فضا، تیکھا طنزیہ لب و لہجہ اور نظم کی تعمیر کا جو منفرد سلیقہ ہے وہ انھیں اپنے معاصرین میں ممتاز کرنے کے لئے کافی ہے۔ انیس اور جوش کے اثر سے وہ پہلے ہی آزاد ہو چکے تھے بعض دوسرے ترقی پسند شعراء کی طرح انھوں نے اقبال سے فیض اٹھانے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ ان کے شاعری کا طنزیہ احتجاجی لہجہ (جو ان کی انفرادیت کو نمایاں کرتا ہے) علیحدہ تفصیلی مطالعہ کا طالب کرتا ہے۔ کھلونے۔ دائرہ، پیر تسمہ پا، مذہبی عادت، بہرہ اور دوسری نظموں میں عہد حاضر کے دہشت آفریں TENSIONS کو کیفی نے جس شدت احساس اور فنی مہارت سے پیش کیا ہے وہ جدید شاعری میں کمال فن کا اعلا نمونہ ہے۔

انفرادیت کے تعلق سے یہ سوال اکثر ذہن میں آتا ہے کہ کیا اچھی اور بڑی شاعری کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک رچی ہوئی روشن انفرادیت کی حامل ہو؟ اگر ایسا ہے تو دنیا کے لوک گیتوں اور عوامی شاعری کا ایک بڑا سرمایہ تیسرے درجہ کی تخلیقات میں شمار ہوگا لیکن ایسا نہیں ہے۔ دنیا کی زبانوں کے بے شمار لوک گیت شاعری کا اعلا ترین معیار پیش کرتے ہیں اس لئے کہ انفرادیت فی نفسہٖ کوئی فنی قدر نہیں ہے۔ پریم چند کے معاصرین میں سجاد حیدر یلدرم۔ نیاز فتحپوری۔ یہاں تک کہ راشد الخیری کی تصانیف بھی پریم چند کے مقابلہ میں زیادہ فنی انفرادیت کی حامل ہیں۔ ان کی ہر تخلیق کے آئینہ میں مصنف کا چہرہ پہچانا جاتا ہے۔ تو کیا اس وصف کی بنا پر یہ نتیجہ نکالا جائے کہ وہ پریم چند کے مقابلہ میں زیادہ بڑے تخلیق کار

ہیں ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے اور جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں وہ کسی مغالطہ کا شکار ہیں جس فن کار کی تخلیقی فکر کا سرچشمہ زندگی کی بنیادی حقیقتیں ہوں گی جو اپنی دردمندی کے ہاتھوں اپنے عہد کے کروڑوں انسانوں کے دکھ درد سے جڑا ہو گا اسے اپنے داخلی اور شخصی تجربات میں بھی اپنے عہد کے سوز و ساز کی لرزشیں محسوس ہوں گی اور اس لئے فطری طور پر اس کی تخلیقات میں انفرادیت کا نقش مدھم ہو گا جو محض فن کار کی ذات کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے۔ لیکن دوسری طرف اس کا فن فکر کی وسعت تجربہ کی گہرائی، تخیل کی توانائی اور اظہار و بیان کی ایسی سحرکار سادگی سے منور ہو گا جو صرف زندگی کی گہرائیوں میں اترنے اور اس کے زہر کو پینے سے حاصل ہوتی ہے۔
کیفی کا فن ہمیشہ کی طرح آج بھی اسی راستہ پر گامزن ہے۔

محمّد علی صدّیقی

کیفی اعظمی ۔ شاعری اور آدرش

کیفی اعظمی اس دور کے ایک اہم شاعر ہیں۔ فکر و نظر کی وہ بلندیاں جو شاعری جیسے لطف اور نازک فن کے ساتھ وابستہ ہونی چاہئیں صرف داخلیت اور بطونِ ذات کے ساتھ وابستہ نہیں ہوتیں بلکہ شاعر کے ارد گرد کی دنیا میں جو کچھ بھی وقوع پذیر ہو رہا ہے وہ زندگی کو خوبصورت سے خوب صورت تر دیکھنے کی کوشش ہی سے عبارت ہوتا ہے اور صرف وہی شعرا اس بڑے مقصد کے ساتھ انصاف کر پائے ہیں جو زندگی اور آدرشوں کے ساتھ پیوستہ ہوتے ہیں۔

کیفی اعظمی کی شاعری بین الاقوامی سطح پر جنگ عظیم دوم میں نازی ازم اور فاشزم کے مہیب خطرات سے نبرد آزمائی اور قومی سطح پر آزادی کی جدو جہد سے شروع ہوئی۔ آزادی کے حصول کے بعد وہ آزادی کے "شکستِ خواب" کے تلخ احساسات سے دوچار ہوئے اور انھوں نے انتہائی چابک دستی اور ذمہ داری کے ساتھ شاعری کو وظیفۂ حیات میں تبدیل کر دیا۔

بعض نقادوں نے کیفی اعظمی کی شاعری پر محض اس وجہ سے توجہ نہ دی کہ وہ فاشزم اور

آزادی جیسے اہم موضوعات سے متعلق نظموں کو بطونِ ذات سے باہر کی دنیا سمجھتے تھے۔ روایتی شاعری اور مزاجیت و لاشعور کے موضوعات کے رسیا بعض جدید شاعروں نے خارج اور باطن کے بارے میں جن شدائد کو اپنی کائنات گردانا وہ اس سادہ سی حقیقت سے پہلوتہی کر بیٹھے کہ خارجی مظاہر اور لاشعوری کیفیات کے قطبین کے مابین کش مکش میں "حال" کو فراموش نہ کرنا چاہیے۔ حال کے بغیر نہ ماضی، ماضی رہتا ہے اور نہ مستقبل، مستقبل۔ جب سارتر نے ہُسرل (HUSSERL) کی پیروی میں یہ رائے قائم کی ہے کہ تمام شعور کسی نہ کسی شے سے وابستہ ہوتا ہے جس طرح آئینہ دید شے رکھتا ہے جس کا عکس اُس میں پڑتا ہے تو اُس نے ایک اہم بات کہی تھی کہ شعوری عمل اشیاء سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتا۔ سارتر نے اپنی تصنیف "وجود و عدم" میں ایک کلیدی نکتہ بیان کیا ہے اور وہ یہ کہ "عدم وجود کے خارج میں نہیں ہے بلکہ اُس کے اپنے اندرون میں مخفی ہے۔ اس کے بطون میں موجود ہے جیسے ایک کیڑا پھول کے اندر کنڈلی مارے بیٹھے ہوتا ہے۔" سارتر نے کہا تھا کہ انسان ماضی اور مستقبل کے حوالہ ہی سے زندگی میں معنیٰ پیدا کرتا ہے۔ سارتر نے اپنی اس اہم ترین کتاب میں جو بنیادی بات کہی ہے وہ یہ ہے کہ "انسان وہ وجود ہے جس کے ساتھ عدم اس دنیا میں آیا ہے۔" اور یہ صرف اُس وقت ممکن ہے جب عدم سے کامل آزادی کی جانب بڑھا جائے۔

سارتر کے نظریہ کی کھردراہٹ دیکھنی ہو تو اُس کے ڈرامہ "مکھیاں" (FLIES) کا مطالعہ کیجیے۔ اس ڈرامہ کا لب لباب یہ ہے کہ ظلم و جبر کی معدومی زندگی ہے اور خیر ہے لیکن ہمارے منطقہ میں سارتر کے شارحین نے فلسفۂ موجود ہے کی اس طرح تشریحات کی ہیں کہ سارتر کے یہاں ظلم و جبر کے خلاف جنگ کو کارِ خیر سمجھنے کا رویّہ شعوری طور پر اس طرح دھندلا دیا گیا کہ معاً یوں لگا کہ جیسے زندگی کے بارے میں باخبر ہونا یا شعوری ہونا اور زندگی کو ہم عصری سیاق میں معنیٰ دینے کی کوشش لایعنی کارروائی شمار ہو۔ اگر ہم سارتر کے ڈرامہ "مکھیاں" (FLIES) اور "وجود و عدم" (BEING TO NOTHINGNESS) کو ضروری پیغام کے ساتھ مطالعہ کر سکیں تو یہ قباحت پیدا نہ ہو سکے گی کہ ترقی پسند شاعری کو شعور اور ہم عصری شعور سے عبارت قرار دے کر غیرِ ادب کے خانہ میں رکھنا پڑے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہماری شعری روایت میں جعفر زٹلی، نظیر اکبر آبادی اور چند اہم شہر آشوب

کے شاعروں کو چھوڑ کر اٹھارویں صدی میں ہونے والی فارسی شاعری اور ادب سے انصاف نہیں کیا جاسکا اور اس طرح ہم اپنے معاشرہ کی بدلتی ہوئی سائیکی (PSYCHE) کا اندازہ نہ لگا سکے۔ اردو غزل کے توسط سے جس تخیل اور فکر تک رسائی حاصل ہو سکی وہ ایک تھکے ہارے عاشق کی شاعری تھی جس کی سماجی، معاشی اور سیاسی دُنیا رُو بہ زوال تھی۔ اندرونی بغاوتیں اور بیرونی حکمرانوں کی سازشیں اُس "شہرِ دل" کو گھُن کی طرح کھا رہی تھیں جس میں معاشرہ ایک معشوقِ طرح دار کی طرح حکمراں رہا کرتا تھا۔ سرسید تحریک اور ترقی پسند تحریک دراصل، اس انفعالیت سے باہر نکلنے کی شعوری کوششیں تھیں۔ حالی نے اپنی عصری شاعری کو سنڈاس کے تعفن سے تشبیہ دی تھی اور ترقی پسند اس رائے سے آگے بڑھے اور انھوں نے بیرونی سامراج اور ہندوستانی سماج پر قابض سامراج کے اندرونی گماشتوں سے گلو خلاصی کے مقصد کو اولین اہمیت دی تھی۔ آزادی کے بعد فرقہ وارانہ فسادات اور نقلِ مکانی جیسے المیوں کے نتیجہ میں جس نوع کی حُزنیہ غزل کا احیاء ہوا اور بقول انتظار حسین گم شدہ "علامتوں کی بازیابی" کے جس عمل کا آغاز ہوا وہ ایک طرف علامتوں کے زوال کا نوحہ تھا تو دوسری طرف اس احساسِ زوال پر ماتم تھا۔ دونوں دھارے ساتھ ساتھ بہتے رہے اور ان دو دھاروں میں سے ایک دھارے کے ساتھ کیفی اعظمی کی بھرپور آواز شاملِ حال رہی۔ کیفی اعظمی کی شاعری علامتوں کے زوال کی مجلسِ غم نہیں بلکہ سارتر کے مطابق کامل آزادی کے لیے جد و جہدِ پیہم ہے، ایک نعرۂ مستانہ ہے۔ جس کی ضرورت کا احساس فارسی شاعری کی روایت میں سب سے پہلے رومی کے یہاں پیدا ہوا تھا۔

ہر بنائے کہنہ کا باداں کنند
اوّل آں تعمیر راں ویراں کنند

پھر غالب نے خرابی کی ایک اور صورت دیکھی اور کہا ؎

مری تعمیر میں مُضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

اور پھر اقبال نے اس خیال کو حالی سے بھی زیادہ اصرار کے ساتھ پیش کیا :

عہد تو برق ہے آتش زنِ ہر خرمن ہے — ایمن اس سے کوئی صحرا نہ کوئی گلشن ہے

اس نئی آگ کا اقوامِ کہن ایندھن ہے ملّتِ ختمِ رُسل شعلہ بہ پیراہن ہے
آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

اقبالؒ بار بار ظلمتِ شب سے نورِ سحر کی پیدائش کا ذکر کرتے ہیں:

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
روز ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
دیکھ لوگے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر ہی اُسے زنجیر پا ہو جائے گی

اور پھر وہ اس کلیدی نکتہ کی طرف آئے:

خودی کی موت سے مشرق کی سرزمینوں میں
ہوا نہ کوئی خُدائی کا راز داں پیدا

کیفی اعظمی کی شاعری پر اب تک ہونے والے بنیادی اعتراضات میں پہلا اعتراض یہ ہے کہ یہ بہت شعوری نوعیت کی شاعری ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاعری کے بارے میں آخر یہی ایک تعریف کیوں قابلِ اعتنا ٹھہرے کہ شاعری کا تعلق لاشعور سے ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ بہتر "جلالی" شاعری ہے اور "جمال" سے بہت دور ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ دونوں آرا طبقاتی سوچ کی پیداوار ہیں اور ایک لاطبقاتی شاعر پر ان تعریفوں کا اطلاق اس دعوا کو صحیح ثابت کرنے کے مترادف ہے کہ طبقاتی سوچ کے طبقاتی نقاد، لاطبقاتی سوچ کی لاطبقاتی شاعری سے شروع ہی سے برسرِ پیکار ہے۔ اگر یہ حضرات اپنی رائے کے پسِ پشت اپنی تاریخی عصبیت کا برملا اعلان کر سکتے تو ہم ان آرا کے سیاسی تناظر سے صرفِ نظر کر سکتے تھے لیکن سرِ دست ایسا ممکن نہیں ہے۔

ہمیں اس موقع پر علامہ اقبال سے منسوب ایک واقعہ یاد آرہا ہے جس کے راوی ڈاکٹر سید محمد عبداللہ مرحوم ہیں وہ اپنے مضمون "اقبال — دیدہ و شنیدہ" میں فرماتے ہیں کہ وہ ایک روز علامہ سے ملاقات کے لیے ان کے دولت کدہ پر تشریف لے گئے۔ بات عربی اور فارسی کی تعلیم کے متعلق ہونے لگی۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ رقم طراز ہیں کہ علامہ اقبال نے "تھوڑی دیر کے بعد مجھ سے

فرمایا۔ یہ کاغذ لو اور اس پر خواجہ حافظ اور جامی کی نشان زد غزلیات لکھ دو جن کے مطلعے علی الترتیب یہ ہیں۔

شاہ شمشاد قداں خسروِ شیریں دہناں
کہ بمژگاں شکند قلب ہمہ صف شکناں
اے ہمہ سیم بَراں سنگِ تو بر سینہ زناں
تلخ کام از لبِ مے گوں تو شیریں دہناں

اس اثنا میں وہ گنگناتے رہے۔ جب میں لکھ چکا تو فرمایا۔ تم فارسی کے فارغ التحصیل ہو۔ بتا سکتے ہو ان میں سے کون سی غزل اچھی ہے؟ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا جواب دوں۔ بہر حال میں نے عرض کیا کہ حافظ کی غزل اچھی ہو گی۔ فرمایا یہ حافظ کی جادوگری ہے ورنہ شیراز اور خراسان کا فرق تو واضح ہے۔ شیرازی میٹھی باتوں سے دلوں کو لُبھا رہا ہے اور جامی ہرات والا کوہستانی لہجہ میں بات کر رہا ہے اور ہم لوگوں کو اب کوہستانی لہجہ کی زیادہ ضرورت ہے۔"

تو صاحبو قصہ کوتاہ یہ اپنے کیفی اعظمی صاحب بھی کوہستانی لہجہ کے شاعر ہیں۔ کوہستانی شاعر ہونے کے لیے ہرات میں پیدا ہونے کی شرط نہیں ہے۔ اعظم گڈھ کے میدانی علاقہ میں بھی کوہستانی شاعر پیدا ہو سکتا ہے۔ یقین نہ آئے تو کیفی اعظمی کی شاعری کا مطالعہ کیجیے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر وہ شاعر جو طبقاتی شعور کی تپش سے بہرور ہو گا، ظلم و استبداد کے خلاف شمشیر برہنہ ہو گا کہ اس کے لیے طاؤس و رباب کے بجائے شمشیر و سناں ہی وہ موسیقی فراہم کر سکتے ہیں جس سے پچھڑے ہوئے طبقہ کو کامیابی و کامرانی مل سکتی ہے۔ یہی وہ شاعری ہے جو ہیرے کی طرح پتھر کا جگر کاٹ سکتی ہے۔ کیفی اعظمی نے اپنی تمام شاعری کو اس خیال کی تصدیق اور تشریح بنا دیا ہے کہ ہماری زندگیوں میں اس وقت تک مسرت و شادمانی کے نغمات نہیں گائے جا سکتے جب تک ہمارے سماج میں موجود غربت اور ناانصافی کے STRUCTURES نہیں ڈھائے جاتے۔ یہی وُہ ناانصافیاں ہیں جن کی وجہ سے ہماری ذوقیات تک پابندِ سلاسل ہے اور ہمارے یہاں حُسن کی تعریف بھی سیاسی طور پر بدصورت اور ظالمانہ داعیوں کے تحت کی جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ کیفی اعظمی اس سادہ سی بات کو ہمارے دلوں اور ذہنوں میں اُتارنے کے لیے

ہمہ وقت جدّ و جہد کرتے رہے ہیں۔ وہ چاہتے تو حافظؔ کا نرم و نازک اور انتہائی شیریں لہجہ اختیار کر سکتے تھے۔ فیضؔ نے اسی لہجہ سے معرکتہ الآرا کام لیا ہے اور اس لہجہ کے باوجود اُن کی شاعری میں انقلابی شعور کا وفور ہے۔ انھوں نے کھُردری اور دُرشت حقیقت کا بیان جلالی لہجہ میں کیا، جامیؔ کے لہجہ میں کیا، کوہستانی لہجہ میں کیا، ہر چند کہ وہ اپنی ترکیب میں میدانی ہیں وہ چاہتے تو اپنی شاعری کو پوربی شاعری کی حلاوت میں غُسل دے سکتے تھے۔ وہ ٹیگور اور فراقؔ کے لب و لہجہ میں بات کر سکتے تھے لیکن انھوں نے یہ لہجہ اپنی فلمی شاعری کے لیے مخصوص کر دیا اور جاننے والے جانتے ہیں کہ کیفیؔ اعظمی اس لہجہ کے بھی ایک بلند درجہ گیت نگار ہیں لیکن کیفیؔ کے یہاں فلم اور زندگی میں چنداں فرق نہیں ہے۔ جب وہ زندگی کی طرف آتے ہیں تو وہ اپنے لہجہ میں بات کرتے ہیں۔ اس لہجہ میں بلا کی تُندی اور کاٹ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ 'آخرِ شب' کا شاعر ہماری زندگی کے بنیادی مسائل سے اس طرح گُتھم گُتھا ہے کہ جیسے وہ ایک بڑے محاذ پر ہو جہاں صحیح نشانہ پر تیر و تفنگ اندازی ہی حُسنِ بیان بھی ہو اور حُسنِ معنیٰ بھی۔ یہ دونوں حُسن صرف اُسی وقت یک جا ہو سکتے ہیں جب شاعر، شاعری اور سیاستِ دوراں کے حقائق کو یک جا کر پایا ہو ماؤزے تنگ نے ۱۹۴۲ء میں YENAN FORUM کی شہرہ آفاق "گفتگوؤں" (TALKS) میں بہت پتہ کی بات کہی ہے:-

WHAT WE DEMAND IS THE UNITY OF POLITICS AND ART, THE UNITY OF CONTENT AND FORUM, THE UNITY OF REVOLUTIONARY POLITICAL CONTENT AND THE HIGHEST POSSIBLE PERFECTION OF ARTISTIC FORUM. WORKS OF ART WHICH LACK ARTISTIC QUALITY HAVE NO FORCE, HOWEVER PROGRESSIVE THEY ARE POLITICALLY. THEREFORE WE OPPOSE BOTH WORKS OF ART WITH A WRONG POLITICAL VIEW POINT AND THE TENDENCY TOWARDS THE "POSTER AND SLOGAN STYLE" WHICH IS CORRECT IN POLITICAL VIEWPOINT BUT LACKING IN ARTISTIC POWER. ON QUESTION OF LITERATURE WE CARY A STRUGGLE ON TWO FRONTS".

(SELECTED READINGS FROM THE WORKS OF MAO TSE TUNG P 140)

میرا خیال ہے کہ کیفی اعظمی کی شاعری مندرجہ بالا کلیہ پر پوری اُترتی ہے۔ اُن کی شاعری کی بوطیقا میں ہیئت اور مواد کے مابین کامل اتصال ہے۔ جب کوئی نقاد دوسرے مکتبِ فکر کے شاعر کے کلام کو اپنی شعری بوطیقا کے معیارات پر پرکھتا ہے اور دو مختلف زاویوں کی ایماندارانہ نشاندہی کے بجائے اپنی بوطیقا کو واحد قابلِ قبول بوطیقا تسلیم کر کے زیرِ تبصرہ شاعری کو ہدفِ تنقید بناتا ہے تو وہ ایک طرف معروضی نہیں رہ پاتا اور دوسری طرف اس اصول سے انحراف کرتا ہے کہ ہر مکتبِ فکر میں ہیئت اور مواد کی یکجائی کا منفرد اسلوب ہوتا ہے۔

کیفی اعظمی نے جس طرح اپنی شعری روایت میں حافظ کے بجائے جامی، روایتی غزل کے مانوس لب و لہجہ کے بجائے اقبال کے لہجہ کا ساتھ دیا ہے۔ وہ صنائع و بدائع کے معروف اصولوں پر جس بلاغت کے ساتھ پورا اترے ہیں وہ "آخرِ شب" کی بہت سی نظموں کے علاوہ "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ، دوسرا اجلاس" کی ہر سطر سے عیاں ہے۔ کیفی نے ایک طرف اقبال سے یعنی فارسی روایت کے ڈکشن کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے اور دوسری طرف اقبال کی "مجلسِ شوریٰ" کی اختتامی سطر شیطان کے اس خیال کی ترجمانی کرتی ہے۔

کیفی نے اس طرح سے اپنی بات کا آغاز کیا ہے اور اشتراکیت ہی کو سب سے زیادہ سائنسی نظامِ فکر ثابت کیا ہے۔ انھوں نے اس طویل نظم میں مواد اور ہیئت کی دوئی کو جس خوب صورتی سے پاٹا ہے وہ کیفی اعظمی کی بوطیقا کا شاہ کار ہے۔ کیفی اعظمی کی شاعری کو "پروپیگنڈہ" شاعری کہنے والوں پر لازم آتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنی طبقاتی سوچ اور مادر پدر آزاد شعری زبان کی برملا وکالت کر لیں تاکہ اُن کے اعتراض کو وہ سیاسی سیاق مل سکے جسے مصلحتاً مخفی رکھا جاتا ہے۔ شاعری کی یہ تعریف بھی ممکن ہے کہ وہ لاشعور کی ترجمان ہے لیکن سیاست لاشعور کی ترجمان نہیں ہوتی بلکہ لمحۂ موجود کے دو متحارب مکاتبِ فکر میں سے کسی ایک کا شعوری انتخاب ہوتی ہے اور اس طرح شعری جمالیات اور طبقاتی یا لاطبقاتی اندازِ نظر باہم مربوط ہوتے ہیں۔

ترقی پسند شعرا اپنے شعری مواد (CONTENT) اور ہیئت (FORUM) کے بارے میں خاصے حساس ہوتے ہیں۔ وہ حساس ہونے کے ساتھ ساتھ، اس باب میں، واضح بھی ہوتے ہیں۔ یہی وہ

شعوری کیفیت ہے جو اُن کی شاعری کے سیاسی سیاق کو اُجاگر کرتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو شاعر اپنی سیاست کو مخفی رکھتے ہیں صرف اس وجہ سے اچھے فن کار ثابت ہو پاتے ہیں کہ وہ سیاسی طور پر گُنگ یا لاتعلق نظر آتے ہیں۔

جب کیفی اعظمی کہتے ہیں :

ہیں وہی شیرِ خدا کے شیر جو آزاد ہوں
ورنہ محکومی میں بن جاتے ہیں وہ ہی گوسفند

تو انھوں نے اپنی طویل نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ ۔ دوسرا اجلاس" میں حقیقی جمہور اقدار کی وکالت کی ہے۔ اگر اشتراکیت سے جمہوری اقدار منہا کر دی جائیں تو یہ شرفِ انسانیت کے اُسی قدر خلاف ہوگا جس طرح سرمایہ دارانہ جمہوریت سے معاشی مساوات اور عدل کی مفقود الخبری انسانیت کے ساتھ مذاق کا درجہ رکھتی ہے۔

کیفی اعظمی، اقبال اور جوش سے متاثر ہیں۔ وہ بہت واضح طور پر اپنے نظریہ کے ساتھ از اوّل تا ایں دم ثابت قدم ہیں۔ اور یہی وہ خوبی ہے جو انھیں دیگر شعرا سے ممتاز و متمیز کرتی ہے۔ جنھوں نے کبھی شاعری کو نظریہ پر اور نظریہ کو شاعری پر قربان کرنے میں کوئی عار محسوس نہ کی۔

آج جب ہم کیفی اعظمی کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے جمع ہیں تو یہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ کیفی اعظمی کی نظریاتی ثابت قدمی اور اُن کے کوہستانی لب و لہجہ کے درمیان تعلق کی تعظیم کی جائے کہ نقد و نظر کا بنیادی مسئلہ، بنیادی طور پر، اقدار کے تحفظ کا فریضہ ہے۔ کیفی اعظمی ترقی پسند شاعری میں مواد اور ہیئت کے خوب صورت ملاپ کا دوسرا نام ہیں۔ ؎

آیئے ایک جام اس علَم بردار کے نام

خلیل الرحمن اعظمی

کیفی اعظمی : ایک تاثر

کیفی اعظمی ایک شاعرانہ شخصیت لے کر پیدا ہوئے ہیں۔ مخدوم کی طرح ان کی ابتدائی نظمیں بھی لطیف کیفیتوں اور دل کی دھڑکنوں سے معمور ہیں اور ان میں ادائے بیان کی ایک ابیج بھی ہے اس سلسلے کی ایک خوبصورت نظم "اندیشہ" ہے جس کے چند بند یہ ہیں ــ

روح بے چین ہے اک دل کی اذیت کیا ہے
دل ہی شعلہ ہے تو یہ سوزِ محبت کیا ہے
وہ مجھے بھول گئی اس کی شکایت کیا ہے
رنج تو یہ ہے کہ رو رو کے بھلایا ہوگا

دل نے ایسے بھی کچھ افسانے سنائے ہوں گے
اشک آنکھوں نے پئے اور نہ بہائے ہوں گے
بند کمرے میں مرے خط جو جلائے ہوں گے
ایک اک حرف جبیں پر ابھر آیا ہوگا

ضبط کی سعی میں جذبات ابل آئے ہوں گے
غم پشیمان تبسم میں ڈھل آئے ہوں گے
اشک یوں نام پہ میرے نکل آئے ہوں گے
سر نہ کاندھے سے سہیلی کے اٹھایا ہوگا

"پشیمانی"، "ٹرنک کال"، "پامسٹ"، "حوصلہ" اور "تبسم" اسی نوع کی خوبصورت

اور ترشی ہوئی نظمیں ہیں جن میں آج بھی تازگی اور ندرت کا احساس ہوتا ہے۔ بعد میں کیفی میں ایک فرق یہ محسوس ہوتا ہے کہ کیفی کی نظموں میں بھی خطابت کا عنصر بہت ہے لیکن ان کے لہجے میں درشتی اور کرختگی نہیں نیز کیفی کے اسلوب بیان میں انیس کے مرثیوں کی روایات کے بہت سے عناصر جذب ہو گئے ہیں۔ جن کی وجہ سے ان کی آواز جعفری کی طرح پھٹ کر بکھر نہیں جاتی۔ بلکہ فصاحت اور روانی باقی رہتی ہے۔ مسدس کے طرز میں انھوں نے نظمیں لکھی ہیں ان سب میں توانائی کے ساتھ شعریت کے عناصر بھی ہیں ۔

منجمد خون میں شعلے سے تپاں ہیں دیکھو　　　افق دار سے لاشیں نگراں ہیں دیکھو

پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ تر نظمیں فرمائش پر لکھنے لگے یا دوسروں کے مطالبات پر اس لئے اس طرز کو بھی چھوڑ کر انھوں نے شبلی اور ظفر علی خان کی نظموں کا طرز اختیار کر لیا کیونکہ اس طرز میں نظم لکھنے میں نسبتاً آسانی ہوتی ہے اور وقت مقررہ پر موضوع کو نظم کیا جا سکتا ہے اس طریقہ کار نے کیفی کے یہاں وقتی شاعری کو کافی جگہ دی "گاندھی جناح کی ملاقات پر" "سوویت یونین اور ہندوستان" "سوے برلن جا رہی ہے سرخ فوج" "فتح برلن" "میں کلکتے میں کیفی آج پہلی بار آیا ہوں" "سلام اے روس ترے شعلے عجب شگوفے کھلا رہے ہیں" "لال جھنڈے پھینک دو اے دیس بھگتو کیا کہا" "قومی حکمراں" "ریاست ٹرانکور کے مجاہدوں کا ترانہ" "الیکشن کے دوران میں مولانا آزاد اور خضر حیات کی ملاقات"۔ وغیرہ نظمیں کیفی کا کارنامہ سمجھی جانے لگیں۔ ان نظموں میں دیرپا عناصر نہیں ہیں لیکن ان کی زبان معیاری ہے اور کہیں کہیں خوبصورت بند یا مصرعے بھی آجاتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ بنیادی طور پر شاعر کے ذہن میں تخلیقی عناصر دبے ہوئے ہیں۔ بعد میں کیفی نے اور آسانی کے لئے بعض شاعروں کی مقبول عام نظموں کے ڈھانچے کو سامنے رکھ کر نظمیں لکھنی شروع کر دیں۔ مثلاً "مژدہ" شبلی کی نظم "ہنگام بلقان" کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے اور انھیں کے شعر سے شروع ہوتی ہے (حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک) "سپردگی" میں اقبال کے "شکوہ" کا طرز اختیار کیا گیا ہے ۔

آگیا عین لڑائی میں جو لندن سے مشن　　　شمدرو ہو کے جھکا دی گئی آخر گردن

دروبول پہ بھرتی اور غنی ایک ہوئے　　　اس کے دربار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

اسی نظم میں ایک بند اکبر کے طرز کا ہے ۔

اے کہ تم دورِ غلامی کی دوا بھول گئے　　　کھا کے دلّی کی ہوا عہدِ وفا بھول گئے

"مولانا آزاد اور خضرِ حیات کی ملاقات" پر جو نظم ہے وہ اسمٰعیل میرٹھی کی ایک نظم کے طرز پر ہے۔

سناؤں تمہیں بات اک رات کی　　　ہے وہ رات خفیہ ملاقات کی

"ناقص بھرتی" کے آخر میں اسمٰعیل میرٹھی کے اس شعر کو بھی درج کیا گیا ہے ۔

چمکدار کیڑا جو بھایا اسے　　　تو ٹوپی میں جھٹ پٹ چھپا یا اسے

اس سلسلے کی سب سے زیادہ کامیاب نظم مثنوی "خانہ جنگی" ہے جو حالی کے "شکوۂ ہند" کے طرز پر لکھی گئی ہے اور فرقہ وارانہ فسادات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ کیفی نے طنزیہ اسلوب کو بھی خوبی سے نبھایا ہے جس کی کامیاب مثال "قومی اخبار" ہے "عالمی امن" پر کیفی نے بہت سی نظمیں لکھیں اور "کوریا کا نعرہ" وغیرہ اس ذیل میں آتی ہیں۔ لیکن امن پر ایک چھوٹی سی نظم بہت خوبصورت ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے

شکریہ امن کا پرچم مجھے دینے والی　　　میں ترے ساتھ ہمیشہ اسے لہراؤں گا

اس نظم کا ایک شعر یہ بھی اچھا ہے ۔

مڑ کے جاتی ہے جس راہ سے میری زندگی　　　ہم وہاں سے کبھی فوجیں نہ گزرنے دیں گے

امن والی اس نظم میں گہرائی تو نہیں لیکن معصومیت اور خلوص کے عنصر نے اسے موثر بنا دیا ہے۔

کیفی کو اپنی ہنگامی شاعری کا جلد یا بدیر احساس ہو گیا جس کے نتیجہ میں انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ اس دور میں ان کی ایک رومانی نظم "ایک بوسہ" شائع ہوئی جس میں کیفی نے پھر شعریت کی روح کو چھو لیا ہے

جب بھی چوم لیتا ہوں ان حسین آنکھوں کو　　　لمحہ بھر کو سب پتھر مسکرانے لگتے ہیں

کیفی اگر اپنی شخصیت کے ان تخلیقی عناصر کو پروان چڑھائیں تو ان کے ہاتھوں اردو شاعری میں گراں قدر اضافے ہو سکتے ہیں ۔

جوگندر پال

کیفی اعظمی، ایک تاثر

کرشن چندر نے کیفی اعظمی کو ایک مخصوص تناظر میں (دن کا شاعر) قرار دیا تھا، لیکن حقیقت یہ کہ اعظمی کی اہم شاعری بلا تحفظ طلوع کی کیفیات کی پیامبر ہے۔ اردو شاعری میں ساری باتیں پردے ادر [illegible] میں بنتی آئی ہیں، اس اعتبار سے کسی شاعر کے یہاں اجالے کی خو کا اِس قدر احساس ہوتا رہے تو بصارت بلا تامل کھٹ کھٹ قدم اٹھاتے ہوئے بصیرت کے دروازے کے عین سامنے لا کھڑا کرتی ہے اور الفاظ معانی کو جگ مگ جگ مگ پھیلائے چلے جاتے ہیں۔

ریت کی ناؤ جھاگ کے مانجھی
کاٹھ کی ریل سیپ کے ہاتھی
ہلکی بھاری پلاسٹک کی کلیں
موم کے چاک جو رُکیں نہ چلیں

سارے راستے پر کوئی تاریک دھبہ نہیں کہ چلنے والا ٹھوکر کھا جائے:

اُون کی تیر، رُوئی کی شمشیر
صدر مٹی کا اور ربر کے وزیر

آپ کا جی چاہنے لگتا ہے کہ دوڑتے چلے جائیں لیکن کیفی آپ کو ہولے سے روک کے کہتا ہے، بس، آگئے:

اپنے سارے کھلونے ساتھ لئے
دست خالی میں کائنات لئے
دو ستونوں میں باندھ کے رسی
ہم خدا جانے کب سے چلتے ہیں
نہ تو گرتے ہیں نہ سنبھلتے ہیں

بند آنکھوں کی واردات پر سر دھننے کی عادت آدمی کو اس چھوٹی سی فطری صلاحیت سے بھی عاری کر دیتی ہے کہ وہ اپنے سامنے کی اشیاء سے ربط پیدا کر پائے تخلیقی جان پہچان کا منظر نامہ تو اسی وقت بننے میں آتا ہے جب آس پاس کی مٹی دیکھ دیکھ کر نظر میں رگڑ پیدا نہ ہو۔ کیفی اعظمی کی وارداتیں اس کی کھلی کھلی آنکھوں کی دین ہیں۔ گردوپیش اس کی نظر میں رگڑ پیدا کرنے کی بجائے بستا چلا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری پر سچے جھوٹ کا گمان نہیں ہوتا، بلکہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ سچائیاں جھیل جھیل کر لکھتا ہے:

دیواریں تو ہر طرف کھڑی ہیں
کیا ہو گئے مہربان سائے

—— ٭ ——

بہار آئے تو میرا سلام کہہ دینا
مجھے تو آج طلب کر لیا ہے صحرا نے

تغزل سے شعر میں وقار اور قیام کی صورتیں تو ہو جاتی ہیں مگر کیفی کو اپنی بے چارہ بھی محبوب ہے کہ وقار اور قیام کا حاصل اس کی جرأتوں کا انسداد نہ کرے:

جرم ہے تیری گلی سے سر جھکا کر لوٹنا
کفر ہے پتھراؤ سے گھبرانا تیرے شہر میں

اور مزید دستور سے شناسائی کے باوجود اس کا اپنی شرکتوں پر اصرار

بنا رہے:

جہاں سے پچھلے پہر کوئی تشنہ کام اٹھا
وہیں یہ توڑے ہیں یاروں نے آج پیمانے

کئی لوگ ٹھہری ٹھہری شاعری کو کھڑے پانیوں کی گہرائی سے تعبیر کرتے ہیں اور جہاں مفہوم اپنی صدا اور حرکت سے اپنی مادی موجودگی کا احساس دلوا رہا ہو، وہاں وہ اسے اتھلا قرار دے کر ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں۔ سوال یہ نہیں کہ سمندر نہ ہو سوال یہ ہے کہ دریا بھی کیوں نہ ہوں۔ دریا نہ ہوں تو میٹھے پانی، کا کال نہ پڑ جائے؟ دریا تو دریا ہیں، پیاس سے دم نکل رہا ہو تو اوک بھر میٹھا پانی پورے دریا سے کم معلوم نہیں ہوتا — بیلچے لاؤ، کھولو زمین کی تہیں
میں کہاں دفن ہوں کچھ پتہ نہ چلے

جو دریا سوکھ بھی اپنا اتہ پتہ بنائے رکھتے ہیں وہ موسم آتے ہی پھر کہیں سے نکل آتے ہیں اور اُتھلے ہونے کے باوجود اوّل تا آخر ایک جنبش بہتے چلے جاتے ہیں اور اُن کے بہاؤ سے زندگی کے اسباب قوی تر ہوتے چلے جاتے ہیں

ایسے بھی ہوتے ہیں جو کوڑی کوڑی خیال جمع کر کر کے بڑے مالدار ہو جاتے ہیں مگر کیفی اعظمی کے پاس جس دم جو اور جتنا بھی خیال ہو وہ اسے اُسی دم بے جھجک صرف کر دیتا ہے — اللہ مالک ہے کل کی زندگی لکھی ہے تو کل کا رزق بھی لکھا ہوگا — اسی باعث اُس کی شاعری رواں دواں اور برمحل ہے اور اُس پر "اِس وقت" کے ہونے کا خیال گزرتا ہے۔ آگے پیچھے کی بہت ہو لی۔ چلتے جانا تو تبھی ہوگا جب وہیں قدم رکھو جہاں یہ عین اُسی دم پڑ رہا ہو:

کبھی آگے کبھی پیچھے کوئی رفتار ہے یہ
ہم کو رفتار کا آہنگ بدلنا ہوگا

"اُس وقت" کے گیت بھی دلوں کو گرفت میں لئے ہوتے ہیں:

جب میں چوم لیتا ہوں اِن حسین آنکھوں کو
سو چراغ اندھیرے میں جھلملانے لگتے ہیں

لیکن 'اِس وقت' کی شاعری نہ ہو تو خوابناک بلندیاں ہمیں بے زینہ سی لگیں ــــ کرشن چندر نے کیفی اعظمی کو بجا طور پر دن کا شاعر قرار دیا ہے۔ اُن کے تاثر میں غالباً شاعر کا یہی 'اَب پن' کارفرما تھا جو اردو قاری کی خصوصی توجہ کا طالب ہے۔

انور سدید

کیفی اعظمی — معاملاتِ جہاں کا شاعر

اگست ۱۹۷۷ء میں مکتبہ دانیال کراچی سے کیفیؔ[1] اعظمی کی نظموں کا دوسرا مجموعہ "آخرِ شب" شائع ہوا تو مجھے اس میں دو باتیں نسبتاً زیادہ قابلِ توجہ نظر آئیں۔ اوّل یہ کہ "آخرِ شب" پہلی مرتبہ مئی ۱۹۴۷ء میں چھپی تھی، اور یہ واقعی غلامی کی طویل شب کا آخری لمحہ تھا، انگریزی سامراج اپنا تام جھام سمیٹ رہا تھا اور وہ تمام آوازیں جو ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر احتجاج کی صورت اختیار کر گئی تھیں اب اپنی تعبیر سامنے لانے اور آزادی کے سویرے کو روبہ طلوع کرنے میں کامیاب ہو چکی تھیں، اس تاریخی موقعے پر کیفی اعظمی کا اپنا مجموعۂ کلام پیش کرنا اور اسے "آخرِ شب" کے عنوان سے موسوم کرنا مجھے معنی خیز نظر آتا ہے۔

دوسری اہم چیز جو مجھے "آخرِ شب" کے پاکستانی ایڈیشن میں نظر آئی وہ ایلیا اہرن برگ کا پیش لفظ

---

[1] کیفی اعظمی ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ "جھنکار" ۱۹۴۳ء میں چھپا تھا۔

ہے جو مختصر لیکن بہت خیال انگیز ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

"ایک ادیب کے لیے یہی ضروری نہیں کہ وہ ایسے ادب کی تخلیق کرے
جو مستقبل کی صدیوں کے لیے ہو، اسے ایسے ادب کی تخلیق پر بھی قدرت ہونی چاہیے
جو صرف ایک لمحے کے لیے ہو۔ اگر اس لمحے میں قوم کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے"

ایلیا اہرن برگ نے بات عمومی انداز میں کی ہے اور یہ ان ادیبوں اور شاعروں کے لیے آئینہ ہے جو اپنے جلال اور جمال کو عالمی سطح پر پھیلانے اور صدیوں پر محیط کرنے میں کوشاں رہتے ہیں لیکن قوم کی قسمت کے فیصلے کا لمحہ آتا ہے تو اپنے گاؤں چلے جاتے ہیں اور لمبی چادر تان کر سو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فیصلے کا لمحہ انھیں ہی نہیں پوری قوم کو روند کر آگے نکل جاتا ہے۔

اس "پیش لفظ" کے اجمال میں کیفی اعظمی کا مطالعہ کریں تو ہمیں مایوسی نہیں ہوتی بلکہ ایک عجیب نوع کی مسرت محسوس ہوتی ہے۔ ان کی شاعری نے رومانویت کی گود میں آنکھ کھولی تھی۔ انھوں نے ابتدا میں ایسی نظمیں لکھیں جن میں بہ قول خلیل الرحمٰن اعظمی "ادائے بیان کی اپج بھی ہے اور یہ لطیف کیفیتوں اور دل کی دھڑکنوں سے معمور بھی ہیں۔" "حوصلہ"، "ترکِ کال"، "پشیمانی"، "تصور"، "نغمگی"، "تبسم"، "تجدید"، "پلاسٹ" اور "تم" چند ایسی ہی نظمیں ہیں جن میں شاعر کا دل کیفِ فراواں سے لطافت بار ہے اور وہ ان لطافتوں کو قاری کے دل پر بھی شبنم بار کر رہا ہے۔ فیض صاحب نے لکھا ہے کہ "کیفی کی شاعری کا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ ہے۔" اور کیفی چونکہ "ایک شاعرانہ شخصیت لے کر پیدا ہوئے تھے" اس لیے یہ کہنا درست ہے کہ ان کی ابتدائی شاعری میں ان کی شخصیت کا عکس موجود تھا اور وہ جب اس قسم کے اشعار لکھ رہے تھے:

کسی نے آج اک انگڑائی لے کر
نظر میں ریشمی گرہیں لگا دیں
تلاطم، ولولے، ہیجان، ارمان
وہی چنگاریاں پھر مسکرا دیں

تو خورشید ہے بادلوں میں نہ چھپ

تو مہتاب ہے جگمگانا نہ چھوڑ
تو شوخی ہے شوخی ــ رعایت نہ کر
تو بجلی ہے بجلی ــ جلانا نہ چھوڑ
ابھی عشق نے ہار مانی نہیں
ابھی عشق کو آزمانا نہ چھوڑ

روح بے چین ہے اک دل کی اذیت کیا ہے؟
دل ہی شعلہ ہے تو یہ سوزِ محبت کیا ہے؟
وہ مجھے بھول گئی، اس کی شکایت کیا ہے؟
رنج تو یہ ہے کہ رو رو کے بھلایا ہوگا

تو صاف نظر آتا ہے کہ کیفی اعظمی ایک ایسی تہذیب کے زائیدہ ہیں جو جسم اور زمین کے تقاضوں کو اہم تصوّر کرتی ہے اور عشق و محبت جس کی نمو اور فروغ کا وسیلہ ہے، یہ شاعری ہندوستان کے ایک خاکی انسان کی شاعری ہے اس لیے اس میں مٹّی کا جادو اپنا اثر دکھا کر خوبی اور خوب صورتی سے جگاتا اور شاعر کو افلاطونی بننے سے بچا لیتا ہے۔ اس قسم کی شاعری کیفی اعظمی کی منزل نہیں تھی، انھوں نے بہت جلد اس حقیقت کو پالیا کہ محبت زمانے کا اوّلیں غم نہیں ہے۔ اور عشق صرف مٹّی کی ذی روح مورتوں ہی سے نہیں کیا جاتا بلکہ اس مٹّی پر بسنے والے عوام بھی ــ جن کا کوئی چہرہ نہیں، جن کا کوئی مستقبل نہیں، جو صدیوں سے سامراج کی چکّی میں پِس رہے ہیں اور جو غلامی کا سلسلہ در سلسلہ اور نسل در نسل شکار ہیں ــ شاعر کے عشق کا کچھ حق رکھتے ہیں، چنانچہ کیفی اعظمی کی شاعری میں ایک بڑا موڑ اس وقت آیا جب انھوں نے اپنے گرد و پیش میں کلبلاتے ہوئے عوام کا درد محسوس کرلیا اور یہ تاریخ کا وہی لمحہ تھا جب قوم کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ اور جس لمحے میں ادب تخلیق کرنے کا تقاضا ایلیا اہرن برگ نے پوری دنیا کے تخلیق کاروں سے کیا تھا۔

خلیل الرحمن اعظمی نے لکھا ہے کہ:

"پشیمانی"، "ٹرنک کال"، "پاسٹ"، "حوصلہ" اور "تبسم"....
خوب صورت اور ترشی ہوئی نظمیں ہیں جن میں آج بھی تازگی اور ندرت کا
احساس ہوتا ہے۔ بعد میں کیفی ہنگامی واقعات پر بھی فوری نظمیں لکھنے کی طرف
مائل ہو گئے...... ان نظموں میں دیرپا عناصر نہیں ہیں لیکن ان کی زبان معیاری
اور کہیں کہیں خوب صورت بند یا مصرعے بھی آجاتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے
کہ بنیادی طور پر شاعر کے ذہن میں تخلیقی عناصر دبے ہوئے ہیں۔"

خلیل الرحمن اعظمی کا تجزیہ بڑی حد تک درست ہے لیکن انھوں نے شاید اس بات کو نظر انداز کر دیا کہ ابتدا میں کیفی اعظمی شاید صدیوں پر محیط ہونے کی کوشش کر رہے تھے اور رومانی نظمیں لکھ کر بائرن بننے میں مصروف تھے لیکن جب وقت نے آواز دی، اور لمحے نے اپنی ضرورت آشکار کر دی تو کیفی اعظمی پر یہ حقیقت بھی منکشف ہوئی کہ:

"نویدِ فتح ہے قلبِ عوام کی دھڑکن" ــــ (کیفی اعظمی)

چنانچہ انھوں نے اپنے دل کی دھڑکن کو محبوب کی آوازِ پا سے ہم آہنگ کرنے کے بجائے عوام کے دل کی دھڑکن سے ہم رشتہ کر لیا۔ اور اس عمل میں اپنی اس شاعری کی قربانی دی جس میں بہ قول خلیل الرحمن اعظمی آج بھی تازگی اور ندرت کا احساس ہوتا ہے۔

گزشتہ نصف صدی کے دوران کیفی اعظمی چونکہ اس فیصلے سے منحرف نہیں ہوئے اور نہ انھوں نے اپنے بعض معاصرین کے ساتھ راستہ بدل کر دولت، شہرت اور خود ساختہ عظمت کی جوہا دوڑ میں شرکت کی ہے اس لیے یہ کہنا درست ہو گا کہ کیفی اعظمی اپنے عہد کے بہت سے شعراء سے مزاجاً اور عملاً مختلف تھے، انھوں نے لمحے کو گرفت میں لینے کے لیے موجود زندگی کی خارجیت کو گرفتِ شعر میں لیا اور معروضی رویے سے اس کی عوامی اپیل کو زندہ رکھا۔ میں نے اپنی کتاب "اردو ادب کی تحریکیں" میں کیفی اعظمی کو نقطۂ نظر کی فوقیت کو تسلیم کرنے اور شاعری کو مستقیم انداز میں نظریاتی تبلیغ کا وسیلہ بنانے والا شاعر قرار دیا اور لکھا کہ:

"ان کی شاعری میں محبت کا عمودی زاویہ بہت جلد حقیقت کے افقی زاویے
کے ساتھ منطبق ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ مزدور کا اور دہر کا غم بتدریج ابھرتا چلا جاتا ہے۔"

کیفی اعظمی نے اپنی شاعری میں گرد وپیش کے انسان کو اہمیت دی ہے، انھوں نے حوادث وحالات کو موضوع بنایا ہے۔ اور اس طرح ہمارے سامنے وہ شاعر ابھرتا ہے جو خواص پسند نہیں اور جسے گفتگو عوام سے ہے۔ اب وہ شاعری کے اونچے سنگھاسن سے اتر کر زمین پر ننگے پاؤں چل رہے ہیں۔ سنگ ریزوں اور کانٹوں نے ان کے پاؤں کو زخمی کر دیا ہے لیکن ان کے گرد عام لوگوں کا ہجوم ہے اور وہ اپنی ذات کو سرفراز کرنے کے بجائے اپنی آواز کو ہجوم کی آواز کے ساتھ ملانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دوسری طرف یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ ہجوم ان کی آواز پر لپکتا چلا جا رہا ہے۔ اور رجز خواں ہے۔

الٹ کر ایک ٹھوکر میں ستم کا راج رکھ دیں گے
اٹھا کر اپنی پستی کو سرِ معراج رکھ دیں گے
وہ اک گل کی حکومت تھی کہ گلشن لٹ گیا سارا
ہم اب کے غنچے غنچے کی جبیں پر تاج رکھ دیں گے
ہم اب کے تنکے تنکے کو چمن بندی سکھائیں گے
نئے ہندوستاں میں ہم نئی جنت بسائیں گے

("نئی جنت"۔ ۱۹۴۴ء)

اس عزمِ جواں کے ساتھ اب حقیقت کا المیہ روپ دیکھیے:

خزانۂ رنگ و نور تاریک رہ گزاروں میں لٹ رہا ہے
عروسِ گل کا غرورِ عصمت سیاہ کاروں میں لٹ رہا ہے
تمام سرمایۂ لطافت ذلیل خاروں میں لٹ رہا ہے

گھٹی گھٹی ہیں نمو کی سانسیں چھٹی چھٹی نبضِ گلستاں ہے
ہیں گرسنہ پھول، تشنہ غنچے، رخوں پہ زردی لبوں پہ جاں ہے
اسیر ہیں ہم صفیر جب سے، خزاں چمن میں رواں دواں ہے
اس انتشارِ چمن کی سوگند — بابِ زنداں ہلا کے اٹھنا

("نئے خاکے"۔ ۱۹۴۴ء)

اس قسم کی نظموں میں کیفی اعظمی ہمیں ایک ایسے خواب کار نظر آتے ہیں جس نے زمانۂ حال کے انتشار کو مستقبل میں سمیٹنے کی آرزو کی ہے، اس عہد کی پراگندگی کو محسوس کیا ہے لیکن امید کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ چنانچہ ان کے یہاں چہکار کم اور للکار زیادہ پیدا ہوئی۔ محمد علی صدیقی نے کیفی اعظمی کے اس دور کی شاعری کے بارے میں رائے دی ہے کہ :

"شاعر کا تصورِ حیات اپنی تمام تر تہوں کے ساتھ ہمارے ذہنوں پر دستک دیتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ شاعر ایک نئے طرزِ احساس کا شاعر ہے۔ وہ اپنے اردگرد کے مسائل سے الجھا ہوا ہے۔ اس صدی کے چوتھے عشرے کی ہلچل کو، دورِ دبیوں کے معاملات کو ــ شبِ فتنہ، گرداں کر غنودہ نہیں ہو جاتا، ہر انسانی مسئلہ کو اپنا مسئلہ سمجھتا ہے۔ ایک نئی بین الاقوامیت سے موجزن ہے جو بہت ولولہ اور طاقت کے ساتھ اردو شاعری میں در آیا ہے۔ کیفی اعظمی اس ہمہ جہت اجتماعی احساس کی شاعری کا ایک اہم نام ہے۔"

(نئی روایت ــ پیش لفظ "آخرِ شب")

کیفی اعظمی کی منفرد خوبی یہ ہے کہ وہ معاملاتِ جہاں کو اپنی چشمِ تماشا ہی سے نہیں دیکھتے بلکہ اپنی چشمِ بصیرت کو بھی زمانے کا نگراں بنائے رکھتے ہیں، ان کا یہ عمل "آخرِ شب" کی شاعری کے دور تک محدود نہیں بلکہ جیسے جیسے عالم گردی نے ان کے تجربے اور مشاہدے کو وسعت دی ان کی اجتماعیت کا ہمہ جہت احساس شدت اختیار کرتا گیا۔ اور ان کے اظہار کی بوقلمونی میں طنز کا عنصر شامل ہوتا گیا۔ ابتدا میں طنز زیرِ سطح رہتی ہے اور کیفی اعظمی پُر امید ہیں کہ وہ ناہمواریوں پر قابو پالیں گے اور اعتدال و توازن کی حکمرانی ہوگی۔ لیکن بعد میں درد حد سے گزر جاتا ہے اور طنز سطح پر ابھر آتا ہے۔ ایسے مواقع پر بھی کیفی اعظمی کی طبع رجائیت پسند نے اگرچہ امید کو قائم رکھا ہے لیکن یہ امید ایک ایسے انسان کی ہے جسے حال نے بے بس کر دیا ہے اور اب وہ مستقبل کی کرنوں کو امید سے روشن کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر ان کی نظم "چراغاں" کی یہ چند سطور ملاحظہ کیجیے :

ایک دو بھی نہیں چھبیس دیئے
ایک اک کر کے جلائے میں نے

اک دیا نام کا آزادی کے
اس نے جلتے ہوئے ہونٹوں سے کہا
چاہے جس ملک سے گیہوں مانگو
ہاتھ پھیلانے کی آزادی ہے

اک دیا نام کا خوش حالی کے
اس کے جلتے ہی یہ محسوس ہوا
کتنی بدحالی ہے
پیٹ خالی ہے مرا جیب مری خالی ہے

دور سے بیوی نے جھلا کے کہا
تیل مہنگا بھی ہے ملتا بھی نہیں
کیوں دیئے اس نے جلا رکھے ہیں
اپنے گھر میں نہ جھروکہ نہ منڈیر
طاق سپنوں کے سجا رکھے ہیں
آیا غصے کا اک ایسا جھونکا
بجھ گئے سارے دیئے
ہاں مگر ایک دیا نام ہے جس کا اُمید
جھلملاتا ہی چلا جاتا ہے

(۲۶ جنوری ۱۹۴۷ء)

زمانی اعتبار سے یہ نظم اس احساس کی عکاسی ہے جسے کیفی اعظمی نے آزادی کے ۳۶ سال بعد اپنی بیاضِ نظر سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنا ضروری سمجھا۔ اسی سال ستمبر میں جب وہ ماسکو گئے تو ان کے سفر کا ایک مقصد شاید نئے انسان کی بھی تلاش تھا۔ لیکن جب معاملاتِ جہاں اور مشاہداتِ عالم نے تخلیقی عمل

سے گزر کر شعر کی صورت اختیار کی تو ان کا درد پہلے سے بھی زیادہ دبیز ہو چکا تھا۔ اور وہ لکھ رہے تھے :

میں ڈھونڈتا ہوں جسے وہ جہاں نہیں ملتا — نئی زمین، نیا آسماں نہیں ملتا
نئی زمین، نیا آسماں بھی مل جائے — نئے بشر کا کہیں کچھ نشاں نہیں ملتا
وہ میرا گاؤں ہے، وہ میرے گاؤں کے چولہے — کہ جن میں شعلے تو شعلے، دھواں نہیں ملتا
کھڑا ہوں کب سے میں چہروں کے ایک جنگل میں — تمہارے چہرے کا کچھ بھی نشاں نہیں ملتا

(ماسکو ۱۹۷۴ء)

بلاشبہ ان اشعار میں قدرے مایوسی نظر آتی ہے، ان میں بے بسی کا شائبہ بھی موجود ہے لیکن کیفی اعظمی نے ترقی اور تغیر کے امکانات کو معدوم نہیں ہونے دیا اور اس جہان کی تلاش سے کنارہ کشی اختیار نہیں کی جس کی زمین بھی نئی نہیں ہے اور آسمان بھی نیا ہے۔ اور جو نئے بشر کا جہان ہے۔ کیفی اعظمی نے یوٹوپیا میں پناہ گزین ہونے اور انفرادی طمانیت حاصل کرنے کے بجائے شاید ہمیں اس حقیقت سے نا آشنا کیا ہے جو ان کے گرد و پیش میں موجود ہے اور جس کی ناہمواریاں کیفی اعظمی کے دل میں تلاطم برپا کر رہی ہیں۔

کیفی اعظمی کے ایک منفرد خوبی یہ ہے کہ ان کی شاعری سے ہم زمانے کا چہرہ دیکھ سکتے ہیں اور اس سے کیفی اعظمی کا کردار بھی مرتب کر سکتے ہیں۔ ان کی بیشتر نظموں میں ان کا روئے سخن اپنے وطن کے عوام الناس کی طرف ہے، اور انھیں اپنی پُرزور اور سحر کار خطابت سے نگارِ وطن کا چہرہ سجانے کی تلقین کرتے ہیں، سازشوں کو پہچاننے اور سرِ وقار بلند کرنے کا درس دیتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانے کا موجودہ روپ کچھ زیادہ باعثِ تسکین و مسرت نہیں اور اسے تغیر کی شدید ضرورت ہے۔ تبدل کا ایک جھونکا ۱۹۴۷ء میں مژدۂ آزادی لے کر آیا لیکن کیفی اعظمی کے صحائفِ شعر سے صاف نظر آتا ہے کہ آزاد زندگی کے کئی سال گزار لینے کے بعد بھی زمانے کا چہرہ متغیر نہیں ہوا۔ بلکہ یہ جمود اور انتشار کی زد میں آ گیا۔ اور اب کیفیت کچھ یوں ہے :

تمام جسم ہے بیدار، فکر ہے خوابیدہ — دماغ پچھلے زمانے کی یادگار سا ہے
سب اپنے پاؤں پہ رکھ رکھ کے پاؤں چلتے ہیں — خود اپنے دوش پہ ہر آدمی سوار سا ہے
میں کس کو اپنے گریباں کا چاک دکھلاؤں — کہ آج دامنِ یزداں بھی تار تار سا ہے

جسے پکارا ہے، ملتا ہے اک کھنڈر سے جواب — جسے بھی دیکھیے ماضی کا اشتہار سا ہے

(انتشار)

آج اندھیرا مری نس نس میں اتر جائے گا
آنکھیں بجھ جائیں گی، بجھ جائیں گے احساس و شعور
اور یہ صدیوں سے جلتا سا سلگتا سا وجود

......

راکھ ہو جائے گا جلتے جلتے
اور پھر راکھ بکھر جائے گی

(زندگی)

اس قسم کے نامساعد حالات اور سفاک ماحول میں کیفی اعظمی گرم سرد چشیدہ اور سیاست آشنا انسان کی صورت میں سامنے آتے ہیں، وہ حادثات زمانہ کا تجزیہ ایک صحت مند انسان کی طرح کرتے اور صحیح نتائج تک پہنچتے ہیں، رزمِ باطل میں وہ فولاد کی طرح سخت اور گرم دم جستجو ہونے والا کردار معلوم ہوتے ہیں، کیفی اعظمی سے مجھے ملاقات کا شرف حاصل نہیں لیکن ان کی شاعری سے میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ وہ مردم بیزار آدمی نہیں ہیں، ان کی شاعری ایک حق گو اور نیک خُو انسان کی شاعری ہے. جو عظیم شاعر کے بجائے عظیم انسان کو منظر پر لاتی ہے. اور بڑا انسان بننے کے لیے انھوں نے اپنی جماعت کے ڈھول کو استعمال نہیں کیا، اس حیثیت کو قائم کرنے کے لیے غیر ادبی حربے سے کام نہیں لیا. بلکہ وہ ان معدودے چند شاعروں میں ہیں جن کی عظمت کا سکّہ ان کی شاعری دلوں پر بٹھا دیتی ہے. اور وہ اس مردِ دانا کی صورت میں سامنے آتے ہیں جس نے عمروں کے معمورے سے دولت و ثروت کے بجائے تجربات کی مایا حاصل کی ہو اور اب اس مایا کو عوام الناس میں بے دریغ تقسیم کر رہا ہو:

بجلیاں نزدِ نشیمن ہیں خبر ہے، کہ نہیں
دوست کی شکل کے دشمن ہیں خبر ہے کہ نہیں
کچھ فسوں گر پسِ چلمن ہیں خبر ہے کہ نہیں
اور کچھ دست بہ دامن ہیں خبر ہے کہ نہیں

دے کے امداد، کوئی پھر نہ دغا دے تجھ کو
یہ چراغِ تہہِ داماں نہ جلا دے تجھ کو

حوادثِ زمانہ سے بے خبر انسان کو کیفی اعظمی نے یوں باخبر کرنے کی سعی کی ہے :

غضب کا بھونچال ہے ہرانے محل سے باہر نکل بھی آؤ
یہ میہماں راہزن سے بدتر تھے ان پہ اتنا ترس نہ کھاؤ
اکھڑ چکے پاؤں جس کے اس فوج کی نہ ٹوٹی صفیں جماؤ
بھڑک چکی آتشِ بغاوت اسے نہ گھبرا کے اب بجھاؤ
کہیں لپک کر تمہارا دامن پکڑ لیں شعلے تو کیا کرو گے

ڈبلیو بی ییٹس (W. B. YEATS) نے لکھا ہے کہ وہ نوجوانی کے زمانے میں "دی فیری کوئین" (THE FAERIE QUEEN) ، دی سیڈ شیپرڈ (THE SAD SHEPHRD) اور شیلے (SHELLEY) کی پرومی تھی اس ان باؤنڈ" (PROMETHUS UNBOUND) جیسی نظموں کے سحر میں گرفتار تھا۔ جان اولیری (JOHN O'LEARY) نے اسے تھامس ڈیوس (THAMAS DAVIS) کی نظمیں پڑھنے کے لیے دیں اور کہا "یہ اچھی شاعری نہیں لیکن ان نظموں نے ایک نوجوان کی کایا پلٹ دی ہے۔" ییٹس کہتا ہے :

"میں نے یہ نظمیں پڑھیں تو حیران رہ گیا۔ ان نظموں میں ایک انسان دوسرے انسان سے باتیں کرتا چلا جاتا تھا۔ اور یہ انسان نہ صرف آپس میں جڑتے چلے جاتے تھے بلکہ کئی نسلیں آپس میں ہم رشتہ ہوتی ہوئی نظر آتی تھیں۔"

ایک جدید اور انفرادیت پسند شاعر کے طور پر ییٹس کی حیثیت بہت مستحکم ہے لیکن وہ تھامس ڈیوس کا اتنا شیدائی ہو گیا کہ ان کی خوبیوں کو سراہتا اور سراہتا ہی چلا گیا۔ اور اس تحسین میں اُس نے شاعری کے محاسن و معائب کے بارے میں ایک لفظ کہنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔

مجھے یہ واقعہ بیان کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی ہے کہ "آخرِ شب" کے دیباچے میں محمد علی صدیقی نے کیفی اعظمی کی شاعری کی بحث میں یہ بات بھی لکھی ہے کہ :

"شاعری صرف باطن کے اندر سفر کرنے کا نام نہیں اور اگر ایسا ہے تو یہ بہت ہی مجہول سی تعریف ہے۔"

صد نقی صاحب کا دیباچہ پڑھنے کے بعد میں نے اس میں پلکے سے وشام اور استدراک کی روئیے کو محسوس کیا اور فیصلہ کر لیا کہ اس مقالے میں شاعری اور ناشاعری کی بحث میں پڑے بغیر کیفی اعظمی کی شاعری کی اکائی کو ان کے مدار میں جانچنے کی کوشش کروں گا۔ میرے نزدیک خارج کی کائنات کی طرح باطن کی کائنات بھی شاعر پر معنیٰ کے نئے جہان روشن کرتی ہے۔ صرف خارج کی مصر عہ سازی اعلا درجے کی شاعری پیدا نہیں کرتی حقیقت یہ بھی ہے کہ زندگی کا جو ہنگامہ منظر پر سامنے آتا ہے وہی شاعر کے باطن میں کہرام بپا کرتا اور اسے شعر کا روپ دیتا ہے۔ مجھے یہ کہرام کیفی اعظمی کے داخل میں اس دور کے متعدد نامور شاعروں سے زیادہ نظر آتا ہے۔ اور لبِ نے نواز پر وہی کچھ آرہا ہے جو سینہ ئے پر گزر رہی ہے۔ چنانچہ کیفی اعظمی کی شاعری میں بھی ایک انسان دوسرے انسان سے باتیں کرتا ہے، ایک نسل دوسری نسل کے ساتھ مربوط ہو جاتی ہے اس کا موازنہ فیض کی رومانیت سے، یا مخدوم کے روایت اور بغاوت کے امتزاج سے، یا علی سردار جعفری کی تعقل پسندی سے کرنا شاید موزوں نہیں۔ کیوں کہ کیفی اعظمی اول بھی کیفی اعظمی ہیں اور آخر بھی کیفی اعظمی ہی ہیں۔ ایلیا اہرن برگ نے تو لمحے کی شاعری کو بھی بہت اہم قرار دیا ہے کہ اسی لمحے میں اگر قوم کی قسمت سنور جائے تو شاعری میں عمرِ جاوداں کا سراغ مل جاتا ہے۔ میں نے ابتدا اسی نقطے سے کی تھی۔ تاہم جب میں آگے بڑھا تو محسوس ہوا کہ بعض مقامات پر کیفی اعظمی لمحے کو عبور کر جاتے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ فیض صاحب نے انھیں اپنے دور کا نمائندہ اور اپنے زمانے کے باکمال معتبر شاعروں میں شمار کیا ہے۔ اور اب میں کہہ سکتا ہوں کہ:

"یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا   ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں؟"

شارب ردولوی

کیفی کا شعری سفر

کیفی نے جس وقت اپنا شعری سفر شروع کیا اس وقت نثر و نظم میں رومانویت کا غلبہ تھا۔ نثر میں ایک طرف مہدی افادی، سجاد حیدر یلدرم کی مرصع نثر تھی دوسری طرف نیاز فتحپوری اور مجنوں گورکھپوری کے رومانی افسانے، شاعری میں جوش ملیح آبادی کی حسن کاری اور اختر شیرانی، عظمت اللہ خاں، میراجی اور دوسرے شعرا کی عشق و محبت اور ناکامی و محرومی میں ڈوبی ہوئی آوازیں تھیں اور ہر تخیل نفیس آدازوں کا اسیر تھا کہتے ہیں۔ نیاز اور مجنوں کے افسانے پڑھ کر کتنے ہی نوجوانوں نے خودکشی کرلی۔ مہدی افادی اور یلدرم کے اسلوب کی نقل کی کوشش عام تھی۔ سلمیٰ، نورا، ناہید اور پروین کی جستجو میں ہر شاعر اور نوجوان دیوانہ تھا۔ اس وقت وہی شاعر کامیاب تھا جو ناکام محبت تھا۔ خیالی بنتِ مریم شاعروں کے تصور کا مرکز تھی۔ اس رومانیت کا سبب کیا تھا؟ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے لیکن اردو میں رومانویت کی کوئی باقاعدہ تحریک نہ ہوتے

ہوئے بھی اس عہد کی بڑھتی ہوئی رومانویت کسی تحریک سے کم نہیں تھی۔ کیفی کا بھی اپنے عہد کے اس مقبول رجحان سے متاثر ہونا فطری بات تھی۔ اس لیے کیفی کی شاعری کی ابتدا اسی رومانویت سے ہوئی۔

رومانویت میں تصوریت اور ماورائیت کے باوجود ایک غالب عنصر بغاوت کا ہوتا ہے۔ خواہ وہ فنی قیدو بند سے بغاوت ہو یا معاشرے کے اصول و ضوابط سے بغاوت ہو یا روایت اور رواج سے یا ان اقدار اور تہذیبی و معاشرتی پابندیوں سے جو اس سوسائٹی کا حصہ ہوں۔ اس لیے اس وقت یہ بغاوت ان اقدار سے تھی جو اردو شاعری یا اردو ادب میں واضح تھیں۔ ان اقدار میں فن اور اظہار کی روایات بھی تھیں اور سماجی روایات بھی۔ فن اور اظہار کے ساتھ زبان و بیان کی وہ پابندیاں تھیں جن سے سرِ مو انحراف ممکن نہیں تھا۔ بحر، قافیہ اور ردیف کی قید نے فکر کو اساتذہ کی کہی ہوئی باتوں تک محدود کر دیا تھا اور بہت مشکل سے نئی بات کوئی پیدا کر پاتا تھا۔ سماجی روایات میں جاگیردارانہ نظام کی کچھ قدریں اور وضع داریاں تھیں۔ دوسری طرف وہ کچھ جس کو غزل کی تہذیب کا نام دیا گیا ہے۔ حالانکہ غزل کی شاعری، عشقیہ شاعری تھی۔ مثنوی کا موضوع بھی زیادہ تر عشقیہ تھا لیکن غزل کی ایک روایت بن گئی تھی جو صدیوں بعد بھی غزل کا حصہ تھی یعنی اس میں عورت یا اس کا نام لے کر اظہارِ عشق نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عام اردو شاعری میں بھی یہی صورت تھی اور اگر کوئی ان پابندیوں کو توڑتا تو کمزور درجے کا شاعر گردانا جاتا یا ریختی گو کہلاتا۔

ادب اپنے عہد کے عقائد اور تعصبات سے متاثر ہوتا ہے وہ سماجیات اور تاریخ نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے عہد کی سماجی تاریخ ہوتا ہے وہ صرف تفننِ طبع کا ذریعہ نہیں اس میں جہاں تک کہ کسی بھی عہد کی رائج قدروں کو دیکھا جا سکتا ہے اردو شاعری میں اظہار و بیان کی متانت اور احتیاط ان تہذیبی ضابطوں اور پابندیوں کی نشاندہی کرتی ہیں جو اس سرمایہ دارانہ سماج میں رائج تھیں جہاں محبت بالاخانوں پر تو پھل پھول سکتی تھی لیکن گھر کے آنگن اور دالانوں میں اس کا اظہار

ممنوع تھا۔ کیفی کی شاعری کی ابتدا ان رائج ضابطوں سے بغاوت کے عہد میں ہوئی جس میں عذرا، سلمیٰ، ناہید غزلوں اور نظموں کا موضوع بن گئیں۔ کیفی نے بھی شعری اظہار کی ابتدا اس عشقیہ اور رومانی شاعری سے کی اور انھیں رنگین لب و رخسار کے ذکر میں ان کی شاعری نے بلوغت کی شہ نشینوں میں قدم رکھا۔ ان کی جھنکار کی نظمیں اور غزلیں اردو کی عشقیہ و رومانی شاعری کا ایک خوبصورت حصّہ ہیں۔ ان کی اسی زمانے کی نظموں کے یہ چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے :

یہ جسم نازک، یہ نرم باہیں، حسین گردن، سڈول بازو!
شگفتہ چہرہ، سلونی رنگت، گھنیرا جوڑا، سیاہ گیسو
نشیلی آنکھیں، رسیلی چتون، دراز پلکیں، مہین ابرو
تمام شوخی، تمام بجلی، تمام مستی، تمام جادو
ہزاروں جادو جگا رہی ہو
یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو

——— تصوّر

یہ خد و خال، یہ خوابوں سے تراشا ہوا جسم
اور دل جس پہ خد و خال کی نرمی بھی نثار
خار ہی خار شرارے ہی شرارے ہیں یہاں
اور تھم تھم کے اٹھا پاؤں بہاروں کی بہار

کلی کا روپ پھول کا نکھار لے کے آئی تھی
وہ آج کل خزانۂ بہار لے کے آئی تھی
وہ قامتِ بلند جیسے بھیرویں کی مست تان
وہ لوچ جیسے موج جوئے بار لے کے آئی تھی

——— ملاقات

کیفی کی رومانی شاعری، جسے ان کے شعری سفر کا پہلا دور کہا جا سکتا ہے، بڑی نرم، سبک رفتار، مترنم اور نغمگی سے بھرپور شاعری تھی۔ ان کے مصرعوں اور نظموں میں اتنی بے ساختگی، روانی اور رس ہے کہ پڑھنے والا ایک سحر آگیں کیف میں ڈوب جاتا ہے۔ کیفی کی رومانی شاعری میں اثر پذیری ہے اس کا ایک سبب ان کی زبان کی سادگی اور جذبے کی سچائی ہے۔ ان کے اشعار پڑھتے وقت اس پر خیال آرائی کا شبہ نہیں ہوتا بلکہ وہ خود اپنی واردات محسوس ہوتی ہے۔ ان کی نظم "کسی کی آواز سن کر" کے یہ بند ملاحظہ ہوں:

یا بج رہی ہوں جھٹپٹے میں مندروں کی گھنٹیاں
یا منہ اندھیرے دور سے آتی ہو آواز اذاں
یا بند کر دے جھینپ کر خلوت کی کوئی کھڑکیاں
اور بج رہی ہوں چوڑیاں
اے بنتِ مریم گنگنا!
اے جانِ نغمہ گائے جا
جیسے شگوفوں میں سما کر گنگناتی ہے ہوا
جیسے خلا میں رات کو گھنگھرو بجاتی ہے گھٹا
جیسے کسی دوشیزہ کے دل کے دھڑکنے کی صدا
زندہ رہے نغمہ ترا
اے بنتِ مریم گنگنا
اے جانِ نغمہ گائے جا

کسی کی آواز سن کر

ان بند میں کیفی نے کسی کی آواز کی دل کشی اور خوبصورتی ہی نہیں بیان کی ہے بلکہ اس آواز کی تصویر کشی کرنے کی کوشش کی وہ اس تصویر کو دکھانے کے لیے دوسری مختلف تصویروں کی مدد لیتے ہیں۔ کبھی غروبِ آفتاب کے وقت مندروں سے اٹھنے والی گھنٹیوں

کی آواز کی تصویر سے اسے بنانے کی کوشش کرتے ہیں جس میں مندر اور گھنٹیوں کے ساتھ چراغوں کی کیفیت اور پجاریوں کی عقیدت بھی شامل ہے اس کے علاوہ جھٹپٹے سے شام کی جو خوبصورت تصویر وہ پیش کر رہے ہیں ان میں نہ جانے کتنے رنگ اور کیفیتیں شامل ہیں۔ اسی طرح دوسری تصویر وہ منہ اندھیرے دور سے آتی ہوئی اذان کی آواز سے بناتے ہیں ان دونوں تصویروں میں عقیدت اور پرستش کا جذبہ شامل ہے۔ تیسری تصویر شرم، شوخی اور الفاظ میں نہ بیان ہو پانے والی کیفیت اور چوڑیوں کے بیچ اٹھتے ہوئے بجتی ہے۔ اور اسی طرح دوسرے بند میں ہوا کے گنگنانے، گھٹاؤں کے گھنگھرو بجانے اور دل کے دھڑکنے کی آوازوں کی تصویریں ہیں۔ ایک آواز کی تصویر یا اس کی خوبصورتی کا احساس دلانے کے لیے کیفی نے صرف ان دو بند میں کتنی ہی آوازوں کی تصویریں بنا دی ہیں اور ان کی کامیابی یہ ہے کہ اس میں سے ہر آواز اپنی تصویر میں محسوس بھی ہوتی ہے اور سنائی بھی دیتی ہے۔

کیفی کی شاعری ابہام، ایہام اور مشکل تراکیب سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتی۔ ان کے یہاں جوش اور سادگی ہے لیکن اس جوش اور سادگی کے ساتھ اس کی ایک بڑی خصوصیت اس کا تاثر اور تصویر ہے۔ وہ اپنی ہر بات کو تصویر کے ذریعے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور تصویر کی یہ صفت ہے کہ انسان الفاظ بھول سکتا ہے تصویریں نہیں بھول پاتا وہ ذہن پر لفظوں سے زیادہ سرعت کے ساتھ اثر انداز ہوتی ہیں اور اپنا دیرپا اثر چھوڑ جاتی ہیں۔ ان کی ایک نظم "دوشیزۂ مالن" کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

لو پَو پھٹی وہ چھُپ گئی تاروں کی انجمن
لو جامِ مہر سے وہ چھلکنے لگی کرن!
چھوڑا سحر نے تیرگیٔ شب کو کاٹ کے
اڑنے لگی ہوائیں کرن اوس چاٹ کے

جھونکے چلے ہوا کے شجر جھومنے لگے
مستی میں پھول کانٹوں کا منہ چومنے لگے
تھم تھم کے ضوفشاں ہوا ذرّوں پہ آفتاب
چھڑکا ہوا نے سبزۂ خوابیدہ پر گلاب
رندان مست اور بھی بدمست ہو گئے
تھرّا کے ہونٹ جام میں پیوست ہو گئے
دوشیزہ ایک خوش قد و خوش رنگ و خوبرو
مالن کی نورِ دیدہ گلستاں کی آبرو
مہکا رہی ہے پھولوں سے دامانِ آرزو
طفلی لیے ہے گود میں طوفانِ رنگ و بو
فطرت نے تول تول کے چشمِ قبول میں
سارا چمن نچوڑ دیا ایک پھول میں

ان اشعار کو آپ دیکھیں تو محسوس ہوگا کہ ہر شعر ایک خوبصورت تصویر ہے اور سارا چمن نچوڑ دیا ایک پھول میں جو کیفیت ہے اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

کیفی کے شعری سفر کا دوسرا دور انقلابی شاعری سے تعلق رکھتا ہے۔ حالات اور وقت کی تبدیلی نے شاعر کی فکر کو بھی متاثر کیا اور ۱۹۳۶ء سے شروع ہونے والی اہم ترین ادبی تحریک نے پہلی بار ادیبوں اور شاعروں کو غیرت دلائی تھی۔ یہ غیرت بہت پہلے میر نے بھی یہ کہہ کر دلائی تھی کہ:

شاعر ہو مت چپکے رہو، چپ میں جانیں جاتی ہیں

لیکن اس وقت کی بھگدڑ میں لوگ اتنے بدحواس تھے کہ میر کی آواز نہ سن سکے۔ اس بار اس طرح کی نفسی نفسی نہیں تھی اس لیے فاشزم کے خلاف فرانس سے جو آواز اٹھی تھی وہ ملک ملک گلی گلی کوچے کوچے پھیل گئی۔ اس نے زبانوں کے بندھن بھی توڑ دیے اور اس کے بعد شاعری میں ایک نیا لب و لہجہ اور ایک نئی آواز پیدا ہوئی۔

یہاں پر ایک بات کی وضاحت کی ضرورت ہے۔ ترقی پسند تحریک پر یہ اعتراض ہوتا رہا ہے کہ وہ کمیونسٹ پارٹی کا ادبی محاذ تھا۔ دوسرے ترقی پسند شاعری یا ادب نعرہ بازی کا ادب ہے۔ کسی حد تک یہ اعتراض درست ہے۔ اس میں بیشتر لوگ ایسے تھے جن کا کمیونسٹ پارٹی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ اس نقطۂ نظر کے ہمدرد بھی نہیں تھے لیکن جیسے جیسے تحریک آزادی ایک عوامی تحریک بنتی گئی۔ انقلاب کی لے بھی بڑھتی گئی۔ بین الاقوامی سطح پر کمیونزم کے بڑھتے ہوئے اثرات، پنڈت نہرو کے سوشلزم کے نعرے کے تحت ترقی پسند تحریک اور تنظیم میں کمیونسٹ پارٹی کے ممبروں اور ہمدردوں کی تعداد بڑھتی گئی اور ایک زمانے میں وہ پارٹی کی ادبی محاذی تنظیم بن گئی۔

ترقی پسند تحریک دراصل مارکسزم سے زیادہ انسانیت کے وسیع تصور، امن و آشتی، بہتر مستقبل اور پُرمسرت زندگی، اسی لیے ہر گروہ اور ہر طبقے کے ادیبوں میں وہ مقبول ہوئی۔ ہر دور میں اس میں غیر کمیونسٹ ادیبوں کی ایک بڑی تعداد رہی ہے۔ آزادی کے پندرہ بیس سال کے اندر رفتہ رفتہ سیاسی تحریک سے پہلے اس میں آزاد خیال ترقی پسند ادیبوں کا اثر بڑھنے لگا ــــــ کیفی اس عہد کے شاعروں میں ہیں جو اس میں سیاسی شدت کا عہد تھا۔ رومانیت کے باغی مزاج کو انقلاب کی گھن گرج میں بڑی اپنائیت محسوس ہوئی۔ اور کیفی نے پوری شدت کے ساتھ اس آواز کو لبیک کہا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ کیفی جس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اس نے انسانیت کی تذلیل اور بے حرمتی کو زیادہ قریب سے دیکھا تھا وہ کسان اور بے زمین مزدوروں کی صورت حال، ان کے غم زدہ چہروں اور بھوک سے نڈھال جسموں کو قریب سے جانتے تھے ان کے سامنے جاگیردارانہ سماج کی وہ تصویر بھی تھی جسے دیکھ کر انسانیت کو شرم آئے۔ اس صورت میں اگر کوئی ہر شخص کو اس زمین اور دولت کا حصہ دار بنانے کا وعدہ کرے۔ بھوک سے نڈھال جسموں کو غذا اور غمزدہ چہروں کو خوشیوں کی تازگی دینے کی اُمید دلائے تو اسے مسیحا کون نہیں سمجھے گا۔ اس لیے کیفی جو کبھی کہا کرتے تھے کہ :

پیکرِ شاعری نہ جا، روحِ مصوّری نہ جا
تجھ سے فروغِ نغمگی اے ہمہ نغمگی نہ جا
تیرا ہی عکسِ حسن ہے یہ مرے گھر کی چاندنی
اے مرے گھر کی چاندنی لے کے یہ چاندنی نہ جا

——— منتیں

انھوں نے سب کو سُرخ عَلم اُٹھا کر چلنے کی دعوت دی۔ اپنے لیے نہیں سب کی بھلائی اور خوشی کے لیے:

کاندھے پہ رکھ کے سُرخ عَلم آن بان سے
یہ سازِ انقلاب ہے کچھ گنگنائیے

وہ جانتے تھے کہ نیا زمانہ ظلم اور زیادتیوں سے پاک ہوگا۔ انھوں نے نئے زمانے کی تمنّا اس لیے کی تھی کہ وہ سب کو خوش دیکھنا چاہتے تھے اسی اُمید میں انھوں نے لکھا تھا:

اب نہ روٹی کے ایک ٹکڑے پر
مائیں بیچیں گی اپنے لختِ جگر
اب نہ بکھریں گے دِل جوانوں کے
اب جھکیں گے نہ سر کسانوں کے
اب یہ طوفان بڑھتا جائے گا
اب یہ سیلاب چڑھتا جائے گا

کیفی کی دوسرے دور کی شاعری احتجاجی شاعری ہے اور احتجاج بھی ایک جوشیلے نوجوان کا احتجاج ——— جس کے سامنے صرف ایک مقصد ہے کہ کس طرح زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اپنی بات پہنچا سکیں۔ اسی لیے وہ اسی لب و لہجے اور اسی زبان میں بات کرتے ہیں۔ ان کے موضوعات شاعری پر آج کسی کو اعتراض یا اس سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن کیفی نے اپنی شاعری کے لیے جو ڈکشن اپنایا ہے اس کی اثر انگیزی سے کسی کو انکار ہو

یہ مشکل ہے۔ اس میں جوش بھی ہے اور اثر بھی۔ وہ اپنی نظموں میں جس طرح کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور جو آہنگ پیدا کرتے ہیں وہ تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی ہر شخص کو بہا لے جاتا ہے۔

احتجاجی شاعر کا یہ المیہ ہے کہ اسے ایسے موضوعات پر شعر کہنے ہوتے ہیں جو عموماً وقتی ہوتے ہیں اور اگر شاعر خود سیاست میں فعال ہو تو اسے احتجاج کے لیے فنکاری کی دیدہ زیب اور خوبصورت قبا پر اظہار کی سادہ لباسی کو فوقیت دینی پڑتی ہے اور بعض لوگوں کی نگاہ میں وہ نعرہ بازی بن جاتی ہے۔

ہر شاعری کو سودا، میر، غالب کے پیمانے پر ناپنا درست نہیں ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب نظیر اکبر آبادی نے اپنے مخاطب کو پیش نظر رکھ کر شعر کہے تو لوگوں نے ان کا نام بھی شاعروں میں شامل کرنا گوارہ نہ کیا اور ایک زمانے کے بعد نظیر کی اہمیت کا احساس اس وقت ہوا جب ان کے شعری پیمانوں کے تحت ان کے کلام کو دیکھا گیا۔ شاعری کے لیے اظہار و بیان کی خوبی اپنی جگہ پر صفتوں، علامتوں، تشبیہوں اور استعاروں کا حسن اپنی جگہ پر اس کی اشاریت اور علامت کی ہیئت مسلّم ہے لیکن وقت کا تقاضا کسی موقع پر اگر چیخ پڑنے کا متقاضی ہو اور آپ اشاروں اور کنایوں میں گفتگو کریں تو وہ خواہ کتنی ہی خوبصورت گفتگو کیوں نہ ہو لیکن وہ وقت کی ضرورت کو پورا نہیں کرے گی۔ کیفی کا احتجاج وقت کے تقاضوں کا احتجاج ہے۔ ایک مقصد کے لیے احتجاج ہے۔ اگر وہ اس وقت کے تقاضے اور اس مقصد کو پورا کرنے کا ہے تو وہ کامیاب شاعر ہیں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا وہ یہ سوچ کر نہیں لکھا کہ وہ فن کی تخلیق کر رہے ہیں۔ ان کے سامنے تو وہ حالات تھے جس پر ان کا قلم چیخ پڑتا تھا۔ وہ وقت اور اس کے تقاضے اگر تاریخ کا حصہ ہو گئے، تو وہ قلم کی چیخ مٹ نہیں گئی وہ بھی تاریخ کا حصہ ہے ــــ اس تاریخ کو جب بھی دیکھا جائے گا کیفی کے احتجاج کے بغیر وہ مکمل نہیں کہلائے گی، کیفی کی شاعری کی یہ ایک بڑی اہمیت ہے۔ کیفی اردو شاعری کے اس احتجاجی

عہد کا ایک اہم حصہ ہیں جس میں ان کے ساتھ اُردو کے کئی اور اہم نام شامل ہیں۔
کیفی نے اپنی شاعری اور بلند آہنگی سے لوگوں کو صرف جھنجھوڑا اور جگایا ہی نہیں ہے بلکہ انھیں اپنی ذمہ داری کا احساس دلایا ہے۔ بعض ناقدوں نے کیفی کی شاعری پر اعتراض کرتے ہوئے ان کے یہاں خطابت کے پہلو پر زور دیا ہے لیکن خطابت ایک فن ہے اور اہلِ زبان اس کی اہمیت سے واقف ہیں جس کو 'بیان' کا مترادف قرار دینا مناسب نہیں ہے۔ خطابت میں لفظ کی پوری فن کاری اور صناعی آجاتی ہے۔ بشرطیکہ وہ فن کاری اور صناعی شعر کے مقصد کو مجروح نہ کرے۔ 'بیان' کسی طرح کی فنکاری، صناعی اور تصویری کیفیت سے خالی ہو سکتا ہے لیکن خطابت نہیں۔ خطابت کے لیے لفظی مصوری اور وہ تمام صفات ضروری ہیں جو شعر کے اثر میں اضافہ کریں اگر اسے خطابت کہہ کر شاعری سے نکال دیا گیا تو ادب رجزیہ، رزمیہ اور خطابت کے زمرے میں آنے والے ایک بڑے ادبی ذخیرے سے محروم ہو جائے گا۔
کیفی کی شاعری میں خطابت کا پہلو ضرور ہے لیکن وہ سپاٹ شاعری نہیں ہے۔ ان کی نظموں میں کیفیت اور دردانگیزی بھی ہے اور اثر پذیری بھی۔ ان کے یہاں 'آہنگ' کا زور، اثر اور تصویر کشی ہے۔ لفظوں کی آواز اور آہنگ سے وہ سماں پیدا کرنا جانتے ہیں مصرعوں اور ٹکڑوں کو تصویر بنا دینے کا فن ان کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ ان کے یہ بند ملاحظہ ہوں:

سفید پلکوں، کھنچی ہوئی جھرّیوں میں شعلے مچل پڑے ہیں
جواں نگاہوں، جواں دلوں سے ہزاروں طوفاں ابل پڑے ہیں
بھرے ہوئے دامنوں میں پتھر، گھروں سے بچے نکل پڑے ہیں
سب ایک ہی سمت چل پڑے ہیں

تباہ و قصرِ حکومت کے سب مکینوں کو

بچا سکیں تو بچالیں گے شہ نشینوں کو
ترستے رہتے ہیں جو ہاتھ آستیں کے لیے
جلال میں وہ الٹ دیتے ہیں زمینوں کو

یا

وہ کھیت کون اُجاڑے گا کون لُوٹے گا
اُگی ہوئی ہیں منڈیروں پہ جن کے شمشیریں

یا

کہیں کی فوج سہی اس طرف کا رُخ نہ کرے
یہاں زمیں میں بم منچلوں نے بوئے ہیں

یہ ایسی خوبصورت، پُر اثر اور دلکش تصویریں ہیں کہ انھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری شاعری میں پُر اثر اظہار کا یہ نظمیں ایک حوالہ ہیں۔ یہ بات پرانی ہو سکتی ہے کہ یہ نظمیں کس موقع پر کہی گئی تھیں۔ سیاسی حالات اور نظریات کی تبدیلی سے اس واقعہ کی اہمیت کم ہو سکتی ہے لیکن شاعر نے جس طرح اسے نظم کیا ہے جس طرح اس کی تصویر بنائی ہے اور اثر پیدا کیا ہے اس نے ان نظموں کو اس واقعہ سے الگ ایک اہمیت دے دی ہے اور یہ نظمیں آج صرف احتجاجی نظمیں ہیں اور جہاں کہیں جب کہیں ظلم و زیادتی اور تشدد کی حکمرانی ہو گی یہ تصویریں وقت کی آواز بن جائیں گی۔

کیفی کی نظموں کی ایک خوبی ان کا علامتی نظام ہے۔ بالعموم خطابت اور علامت کا ساتھ نہیں ہوتا لیکن کیفی خطیب نہیں شاعر ہیں اس لیے ان نظموں کو چھوڑ کر جن کا پس منظر کوئی خاص واقعہ ہے ان کے یہاں علامت کا پورا نظام نظر آتا ہے ان کی علامتیں ایسی نہیں کہ وہ نظم میں ابہام پیدا کریں۔ بلکہ کیفی نے ان علامتوں کے ذریعے ایک وسیع معنویت پیدا کی ہے۔ ان کی نظم عادت کے یہ مصرعے

ملاحظہ ہوں :

مدتوں ایک اندھے کنوئیں میں اسیر
سر پٹکتا رہا، گڑگڑاتا رہا

روشنی چاہیے، چاندنی چاہیے، زندگی چاہیے
روشنی پیار کی، چاندنی یار کی، زندگی دار کی

اپنی آواز سنتا رہا رات دن
دھیرے دھیرے یقیں دل کو آتا رہا
سونے سنسار میں

. . . . . .

روشنی بھی نہیں
چاندنی بھی نہیں
زندگی بھی نہیں

. . . . . .

واہمہ کائنات
لوگ کوتاہ قد
شہر شہر حسد
گاؤں ان سے بھی بد
ان اندھیروں نے جب پیس ڈالا مجھے
پھر اچانک کنوئیں نے اچھالا مجھے
اپنے سینے سے باہر نکالا مجھے
سینکڑوں مصر تھے سامنے

سینکڑوں اس کے بازار تھے
ایک بوڑھی زلیخا نہیں
جانے کتنے خریدار تھے
بڑھتا جاتا تھا یوسف کا مول
لوگ بکنے کو تیار تھے

یہ بند اور مصرعے نظم کے علامتی نظام کو بڑی حد تک ظاہر کرتے ہیں لیکن اگر پوری نظم نگاہ میں ہو تو علامتوں کی معنویت اور تہہ داری کا بہتر طریقہ پر اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس نظم میں کیفی نے بعض مشہور تلمیحات مصر، بازار، زلیخا اور یوسف سے فائدہ اٹھایا ہے۔ کنویں کا تعلق بھی واقعۂ حضرت یوسف کا ایک حصہ ہے لیکن یہاں کیفی نے اسے ایک علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس نظم میں جن تلمیحات کا ذکر آیا ہے وہ بھی تلمیح کے طور پر شاعر نے استعمال نہیں کی ہیں بلکہ وہ ایک علامت ہیں اور کیفی انھیں علامت بنا کر تلمیح کے علاوہ دائرے سے معنی کی وسیع دنیا میں لے آتے ہیں۔ اور اپنے عہد کے المیہ کو پُراثر انداز میں پیش کیا ہے۔

اس طرح ان کی نظم 'دائرے' میں دیوار، مسجد، میخانے، رام اور راون، نظم کو معنوی وسعت دیتے ہیں اور یہ دائرے اپنے معنی کے ساتھ پھیلتے جاتے ہیں۔

کیفی کی نظم 'ابنِ مریم' جس میں ان کی صناعی، زندگی کے گہرے تاثر اور رنگ کے ساتھ اس کا بد نما رُخ بھی نمایاں ہے، ایک بے حد پُراثر نظم ہے۔ اس میں شاعر خود مجبور اور بے بس انسان کی علامت ہے۔ نظم کا ارتقا بہت اچھا ہے۔ کیفی نے نظم کو بڑے خوبصورت انداز میں شروع کیا ہے:

تم خدا ہو

خدا کے بیٹے ہو
یا فقط امن کے پیمبر ہو
یا کسی کا حسیں تخیل ہو
جو بھی ہو مجھ کو اچھے لگتے ہو
مجھ کو سچے لگتے ہو

اور پھر یہ شعر :

اس ستارے میں جس کی آبادی
امن بوتی ہے جنگ کاٹتی ہے

چند لفظوں میں ہندوستان کی پوری تاریخ بیان کر دیتا ہے۔ کس طرح ہمیشہ یہاں دیوتاؤں، رشیوں، منیوں اور صوفیوں نے امن کا درس دیا اور ساری دنیا کو امن و آشتی، دوسروں کے جذبات کے احترام، رواداری، محبت اور دوستی کے ساتھ رہنے کا پیغام دیا لیکن اس پیغام کے باوجود اس پر جنگ لادی گئی۔ کبھی کوئی چنگیز خاں، اور کبھی کوئی ایسٹ انڈیا کمپنی یہاں کے سکون کو درہم برہم کرتی رہی۔ اس نظم میں انسان کی بے بسی کے اظہار کے لیے کیفی نے کئی علامتیں استعمال کی ہیں اور غروب آفتاب کا ایسا خوبصورت استعارہ اور غروب کا ایسا منظر پیش کیا ہے جو مجھے کسی اور جگہ نظر نہیں آیا :

اور جب وہ دہکتا انگارہ
چھن سے ساگر میں ڈوب جاتا ہے

اس میں صرف سورج کے ڈوبنے ہی کا منظر نہیں بلکہ آواز سے اس ڈوبنے کی جو تصویر کشی کی ہے وہ بے مثال ہے۔ سمندر کے کنارے سورج کے غروب کا منظر دوسری جگہوں سے مختلف ہوتا ہے۔ سورج کو دہکتا ہوا انگارہ کہہ کر سمندر میں اس کے ڈوبنے کی آواز پیدا کرے۔ سمندر کے کنارے غروب آفتاب ساری کیفیت کو کیفی نے نظم کر دیا ہے۔

کیفی کمیونسٹ نقطۂ نظر کے حامی ایک اشتراکی شاعر ہیں۔ اشتراکیت ہی ان کی

توانائی' اور اشتراکیت ہی ان کی کمزوری ہے۔ اشتراکیت ہی ان کا المیہ اور اشتراکیت ہی ان کی آواز ہے —— انھوں نے کمیونسٹ پارٹی کے تقسیم ہونے پر ایک بہت خوبصورت نظم 'آوارہ سجدے' لکھی تھی جس کے لفظ لفظ میں اس شخص کا کرب سمٹ آیا ہے جس نے اپنی ساری توانائی اور ساری زندگی پارٹی کو نذر کردی:

کوئی قاتل سرِ مقتل نظر آتا ہی نہیں
کس کو دل نذر کروں اور کسے جاں نذر کروں
اپنی لاش آپ اُٹھانا کوئی آسان نہیں
دست و بازو مرے ناکارہ ہوئے جاتے ہیں

. . . .

راہ میں ٹوٹ گئے پاؤں تو معلوم ہوا
جُز مرے اور مرا راہ نما کوئی نہیں
ایک کے بعد خدا ایک چلا آتا ہے
کہہ دیا عقل نے تنگ آکے خدا کوئی نہیں

کیفی کی ایک کمزوری یہ ہے کہ انھوں نے اپنے سارے شعری TALENT کو کمیونسٹ پارٹی اور اشتراکیت پر لگا دیا اور اس نقطۂ نظر سے اس طرح کی وابستگی میں ہمیشہ ہی ایک خطرہ ہے کہ سیاست وقت کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے اور اس کی تبدیلی بعض وقت پوری نسل کو بے زمین اور بے ذہن کر دیتی ہے جس طرح جنگ میں شکست یا غیر متوقع معاہدے سے ان چند حاکمانِ وقت کو تو کچھ فرق نہیں پڑتا، لیکن لڑنے والی فوج کو جس احساسِ ذلت سے گزرنا پڑتا ہے وہ بہت اندوہ ناک ہوتا ہے۔ کمیونسٹ پارٹی نے آزادی کے وقت جس نقطۂ نظر کو اپنایا یا پھر تلنگانہ تحریک کے ساتھ جو کیا۔ اور اس کے بعد اپنے پورے انقلابی کردار کو جس طرح حکومتِ وقت کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس نے ان لوگوں کو کہیں کا نہ رکھا جنھوں نے اپنے خون سے انقلاب زندہ آباد لکھا تھا۔ کیفی کے خواب بھی پارٹی کے نشیب فراز سے ٹوٹتے

اور کھونے کی ایک تصویر آدارہ سجدے ہے۔

کیفی کی شاعری میں سیاسی بلند آہنگی نے انھیں نقصان پہنچایا۔ ان میں اظہار کی جو بلا کی صلاحیت تھی اس کی جھلک ان کی ہر نظم، اس کے اشعار اور ان کی لفظی صورت گری میں نظر آتی ہے لیکن جب وہ سیاست پر زور دیتے یا تبلیغ کرنے لگتے ہیں تو ان کی شاعری کا تاثر کم ہو جاتا ہے۔ سیاست تو بہت آسانی سے اپنا چولا بدل دیتی ہے لیکن شاعر جو اس سیاست کو اپنی فکر بنا لیتا ہے، بدل نہیں پاتا۔ آج جس طرح مشرقی یورپ کے ممالک اور روس میں تبدیلیاں ہوئی ہیں اور جس طرح وہاں کمیونسٹ پارٹی اور اشتراکیت کو زوال ہوا ہے اس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ شاعر سیاسی خزاں سے واقف نہیں ہوتا اور نہ وہ اس سے واقف ہوتا ہے کہ کل کیا ہونے والا ہے وہ تو صرف انسانیت، نیکی اور بھلائی پر اعتماد کرتا ہے اور سب کے بہتر مستقبل اور خوش آئند زندگی کی تمنا میں قلم کے ساتھ علم بھی اٹھا لیتا ہے اور محبت بھرے گیتوں کے ساتھ نعرے بھی لگا لیتا ہے۔ وہ تو ہر چھوٹے بڑے کے لیے صرف ایک پُرامن، پُرمسرت حال اور مستقبل چاہتا ہے۔

کیفی نے علامہ اقبال کی مشہور نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" سے متاثر ہو کر "ابلیس کی مجلس شوریٰ" دوسرا اجلاس" لکھی۔ اقبال کی نظم بھی ابلیس اور اس کے پانچ مشیروں کے مکالمے پر مشتمل ہے جو اس وقت کی سیاسی صورت حال، اشتراکیت کے اثرات اور مسلمانوں سے متعلق ہے جس میں ابلیس کے تیسرے مشیر کے الفاظ میں اقبال نے مارکس کی اہمیت کا اظہار کیا ہے:

وہ کلیمِ بے تجلی، وہ مسیحِ بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہِ پردہ سوز
مشرق و مغرب کی قوموں کے لیے روزِ حساب

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیمے کی طناب

اور آخر میں اقبال نے ابلیس کے ذریعے مسلمانوں کو لعنتوں میں گرفتار رکھنے کا نسخہ بتایا تھا:

تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
ہے وہی شعر و تصوّف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

کیفی کی نظم ابلیس کی مجلسِ شوریٰ دوسرا اجلاس اقبال کی نظم توسیع ہے۔ اقبال کی نظم ۱۹۳۶ء کی نظم ہے اور کیفی کی نظم ۱۹۸۳ء کی۔ اقبال نے اپنی نظم میں جس طرح کی خدشات کا اظہار کیا تھا جو پیش گوئیاں کی تھیں وہ ۴۷ سال کے عرصے میں سامنے آچکی تھیں۔ کیفی نے آج کے حالات میں نئی مجلسِ شوریٰ کا تصور کیا۔ کیفی کا موضوع عالمِ انسانیت اور اشتراکیت ہے۔ انھوں نے اشتراکیت کے معترضین کے جواب بھی دیے ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی کے تقسیم ہو جانے اور اس کے زیادہ وسیع ہو جانے کا ذکر بھی کیا ہے۔ انھوں نے لفظیات اور آہنگ کو بھی اقبال سے ملانے کی کوشش کی ہے لیکن یہ ایک المیہ ہے کہ اس اجلاس میں ان کی پیشین گوئی کے علاوہ ابلیس اور چوتھے مشیر کی پیشین گوئیاں لفظ لفظ صحیح ہوئیں۔ مثلاً چوتھے مشیر نے کہا تھا:

روضۃ الکبریٰ کے ایوانوں سے اٹھا ہے جو شور
دب کے رہ جائے گا اس میں سارا شورِ انقلاب

اشتراکی روس اک کنجشکِ ہے جس کو کبھی
داب کر پنجے میں اڑ جائے گا یہ فاشی عقاب

اور اشتراکیت نواز چوتھے مشیر کے جواب میں ابلیس نے کہا تھا :

روس سے دست و گریباں ماؤ وادی چین ہے
دو لگاسے بدگماں یوں لینن گڑ کی ہے آبجو
ہو رہا ہے آئے دن تازہ تضادوں کا ظہور
ہے زوال آمادہ لینن کا جہانِ آرزو
اختلافوں نے کیا خامی کو اس کی بے نقاب
جس کے استحکام کا بجتا ہے ڈنکا چار سُو

آگے پانچویں مشیر اور ابلیس کے مکالمات اسی طرح ہیں جس میں پانچواں مشیر اشتراکیت کی قوت اور اہمیت کو سمجھا رہا ہے۔ یہاں ان تمام تفصیلات میں جانے کا موقع نہیں۔ یہ نظم سیاسی اعتبار سے کامیاب نظم نہیں ہے۔ اس کے لیے اس میں شاعر نے جو نقطۂ نظر بنایا اور جس نظریے کو پیش کیا گیا وہ چند ہی سال بعد رونما ہونے والے حالات میں غلط ثابت ہوا۔ ظاہر ہے کہ جب نظریہ یا پیشین گوئی غلط ثابت ہو تو اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ لیکن یہ نظم کیفی کے شعری سفر میں اہمیت رکھتی ہے اور ان کے کلام میں منفرد ہے۔ کیفی کی تمام نظمیں رومانی ہوں یا انقلابی بڑی گھن گرج اور بلند آہنگ والی نظمیں ہیں لیکن اس نظم کے سیاسی موضوع کے باوجود اس میں بلند آہنگی کے بجائے ایک ٹھہراؤ ہے اور اظہار میں فکر کا پرتو ہے۔ کیفی کا یہ شعری سفر ابھی جاری ہے ان کی شاعری کا یہ رُخ نئے حالات میں کیا صورت اختیار کرتا ہے اس کا انتظار ہے۔

عتیق اللہ

کیفی اعظمی

کی شاعری کا بنیادی لحن

آج کیفی اعظمی کی شاعری پر جب میں نے قلم اُٹھایا تو الیگزنڈر ہرزن کے کسی مضمون کا ایک ٹکڑا آپ ہی آپ حافظے میں گونجنے لگا۔ بڑی تلاش کے بعد یہ چند سطریں ٹوٹی بکھری شکل میں اپنی ایک پرانی ڈائری میں نکل آئیں انھیں پاکر مجھے بالکل اسی طرح محسوس ہوا جیسے ہرزن خود کہہ رہا ہو دیکھو ماضی کا ایک حصّہ کس قدر توانا اور زندہ تھا کہ تمھیں سو سوا سو برس بعد بھی اس کی ضرورت پیش آتی اور میری دلیل کو قطعی طور پر جھٹلانا کس قدر مشکل ہے۔ ہرزن نے کچھ اس طرح لکھا تھا۔

"بعض مسائل آندھی کے مانند اٹھتے ہیں اور پھر آندھی کے مانند ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک طوفان بپا ہوجاتا ہے اور پھر وہ غائب ہوجاتے ہیں ان کے غایب ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ مسائل حل ہوجاتے ہیں بلکہ یہ کہ ہم سب کے سب ان مسائل سے اوب جاتے ہیں .... جب بھی ہم اپنے ماضی کی

طرف مڑ کر دیکھتے ہیں تو گزشت کی ایک نئی شکل ہمیں
دکھائی دیتی ہے۔ ہر مرتبہ ایک نیا پہلو اجاگر ہوتا ہے
.... ماضی کی جتنی گہری جستجو ہو گی اتنے ہی
مستقبل کے معنیٰ واضح ہوں گے ماضی کی طرف ہم مڑ کر
دیکھتے ہیں اور مستقبل کی سمت بڑھتے ہیں۔ ماضی کو بار بار
کریدنا اس معنیٰ میں سودمند بھی ہے کہ ہمیں معلوم ہو جاتا
ہے کہ وہ کون سا حصّہ ہے جو ایک دم سڑ گل گیا ہے اور
کتنا کچھ باقی رہ گیا ہے جو اب بھی کام دے سکتا ہے۔"

آج کے حوالے سے کل کا مطالعہ یا کل کے حوالے سے آج کا مطالعہ، کتنا دلچسپ کتنا با معنیٰ، اور کتنا حیرت ناک ہو سکتا ہے۔ اس تجربے سے ہم آئے دن دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ ہماری دانش کی ترجیحات ایک دم بدل گئی ہیں۔ انسانی صورتحال موٹے طور پر کافی تبدیل ہو چکی ہے۔ چیزوں کو سمجھنے کے طور اب پہلے سے نہیں رہے۔ حال کے تناظر میں ماضی کافی مختلف اور معنیٰ خیز ہے۔ ہم اسے اپنی محفوظ علیٰحدگیوں کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ کئی نوع کی رومانی دلچسپیاں ہمارے آڑے آتی ہیں۔ کئی قسم کے تعصّبات ہماری فہم کو مکدّر کرتے ہیں۔ کچھ حیرتیں ہمارے حصّے میں آتی ہیں کچھ نئی فاصل حدیں ہم اپنے مابین کھینچ لیتے ہیں۔ کسی حصّے کو گوارہ کرنے میں ہماری جرأتیں بچھڑ جاتی ہیں ہمارے حوصلے مردہ ثابت ہوتے ہیں۔ کوئی باب ہمارے ادراک پر چیلنج کا کام کرتا ہے۔ ہم عموماً نئی قبولیتوں کے دور میں پرانی سچائیوں کے ادراک وا ظہار سے گریز برتتے ہیں کہ فی زمانہ اپنی پس ماندگی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے۔

کیفی اعظمی کی شاعری کا مطالعہ۔ اس پوری ترقی پسند ادبی تحریک کے مطالعے کے مترادف ہے۔ جو ہمارا قریبی پیش رو ماضی بھی ہے اور جس کے رابطے کی کڑیاں ابھی تتر بتر نہیں ہوئی ہیں۔ کیفی اعظمی اور ترقی پسند تحریک کا

مطالعہ آج کے پس منظر میں کل سے زیادہ بامعنی اور متعلق ہے۔ دونوں کی رفتار عروج اور آثار میں بڑی حد تک یکسانیت ہے۔ کیفی اعظمی کے نزدیک ترقی پسندی وقت اور فن کا تقاضہ ہے کہ فن نہ تو مکمل طور پر شیشہ گری کے مماثل ہے کہ اس لواح میں ایک سانس بھی اگر زور سے لی جائے تو کوئی خطرے در آئیں اور نہ زندگی اتنی مخصوص کہ اس کی تعمیم ہی غلط اور اس کا اظہار ہی معیوب کیفی نے جمالیات کے مروّج فلسفیانہ منظریات کے برخلاف زندگی اور فن کو ایک ہی فعال حقیقت کا نام دیا ہے اور لمحے لمحے کی اذیتوں اور جسارتوں کو اس طور پر رقم کرتے رہے ہیں کہ ان کی تمام سرکتیں محفوظ و حستبر ہو گئیں۔"

آج بھی ہمارا گردوپیش متنوع مسائل سے دوچار ہے۔ سماجی زندگی کا تقریباً ہر صیغہ فریاد کناں اور ہر درجہ ناآہنگیوں سے معمور ہے انسان اور اس کی محنت کی بے وقعتی ہمارے نظام کا شناخت نامہ ہے ہریجنوں، اقلیتوں، قبائلیوں اور پس ماندہ طبقات پر روز بروز عرصۂ حیات تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ انصاف، صداقت، حق جوئی، انسان دوستی، بھائی چارہ اور مساوات جیسی قدریں ہمارے نام نہاد دانشوروں اور سیاسی شعبدہ بازوں کے کلمات بن گئے ہیں۔ بے معنی اور بے مصرف۔ ظاہر ہے مکمل تبدیلی کے ضمن میں صوفیانہ عرفان و آگہی کی نہیں مزاحمت و مجادلے کی ضرورت ہے، فوری اور قطعی فیصلوں کی ضرورت ہے۔ انسانیت کشی کا یہ موڑ تہذیبی اور عمرانی تاریخ کا انتہائی اذیت ناک اور حسرت خیز دور ہے کہ اب ہم اس دور میں جینے کے گنہ گار ہیں جس میں دانش کی پرستاری ہمارا شیوہ اور حقیقت جوئی ہمارا مسلک ہے۔ ہم بین الاقوامی برادری کی فلاح اور اس کی خوش حالی کے متمنی اور ایک عظیم بین الانسانی شیرازہ بندی کے مدّعی ہیں۔ فکر و عمل کے مابین اس قسم کی تفریق ہمارے نظام کا ناگزیر نتیجہ ہے۔ ہماری سوسائٹی تقریباً ہر سطح پر دوئی کا شکار ہے، ایسے

معاشرے میں یکسوئی، توازن اور اعلیٰ تصورات کی بارآوری کی توقع کم از کم رہ جاتی ہے۔ تخلیق کاروں کا ایک طبقہ اس صورت حال میں ناامیدانہ رویوں پر قناعت کو ترجیح دیتا ہے اور دوسرا اپنی پسپائیوں اور عدم مساواتوں کے درمیان اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہے۔ کیفی اعظمی کا تعلق اسی دوسرے گروہ سے ہے جس نے کھلی نگاہ کی تعذیب بھوگی ہے۔ جس کا احساس شدید اور نازک ہے اور جس نے کبھی صورت حال کی آہنی سے آہنی حقیقت سے فرار اختیار کرنے کی سعی نہیں کی۔

کیفی اعظمی کا اپنا ایک واضح نقطۂ نظر ایک مخصوص نظریہ ایک محفوظ فکر ہے۔ اور یہ فکر مادی بنیادوں پر قایم ہے۔ انھوں نے حیات و کائنات کو اسی نظریے کی روشنی میں سمجھا اور محسوس کیا ہے۔ اسی کی روشنی میں عصری معاشی اور معاشرتی اختلال کی وجوہ تک پہنچنے کی سعی کی ہے۔ ایک کمیٹڈ شاعر کی حدود بس یہیں ختم نہیں ہو جاتیں بلکہ اس کی نظر چیزوں اور چیزوں کے دیگر تلازموں اور رابطوں کو بھی محیط ہوتی ہے۔ وہ وقت کے تیوروں کو بدلنے کی کلید بھی اپنے کیسے میں رکھتا ہے۔ وہ تبدیلی کا خواہاں ہوتا ہے کہ تبدیلی زندگی کی فطرت اور زندگی کا مزاج ہے۔ کیفی اعظمی کی اپنے عہد کے سماجی حقائق اور مسلّمہ انسانی اقدار سے وابستگی اٹوٹ ہے۔ انھوں نے ایک بورژوا، نیم بورژوا معاشرے میں علاحدگی کے فن کو قبول کرنے سے انکار کر کے اپنے آپ کو اس طبقہ سے وابستہ کیا ہے جو مسلسل ناانصافی، محرومی، تنگ دستی اور ذلالت کا شکار رہے۔ وہ طبقہ جس کی انا شکست و ریخت سے گزرتی رہی ہے اور اور جس کی خودی تہس نہس ہوتی رہی ہے۔ اسے اپنی دریافت کا استحقاق ہے نہ اپنی تشخیص کا حق۔ خود نگری اس کی تقدیر ہے نہ خود گری اس کا اختیار۔ کیفی اعظمی نے اسی کے حقوق کے تحفظ کے لئے اپنے قلم کو نشتر بنایا

ہے۔ جب کسی دہانِ زخم سے کراہ نکلتی ہے۔ جب کوئی دیوانہ شہید ہوتا ہے۔ جب کسی کی چیخ سے گردوپیش گونج اٹھتا ہے کیفی اعظمی کا قلم وہیں اپنے وجود اور اپنی عضہ وری کا احساس دلاتا ہے۔ گویا کیفی کے یہاں انسانیت کشی کا تجربہ کتابی نہیں ہے بلکہ وہ ان کا اپنا تجربہ ہے۔ ان کے عہد کی کتاب کا ایک خوں آشام باب ہے۔ اور یہی سارا تناظراتی آشوب کیفی اعظمی کے لحن کو احتجاج کی راہ عطا کرتا ہے اور اسے زیادہ بامعنی اور عصری بنا دیتا ہے

کیفی اعظمی کا ایک ایک لفظ مشروط ہے۔ وہ زردار کے مقابلے میں نادار اور ظالم کے مقابلے میں مظلوم کو منتخب کرتے ہیں۔ ان کی تخلیق میں عوام سانس لیتے ہیں۔ انھوں نے ہر محاذ پر عوام کے خوابوں، عوام کی امنگوں، عوام کی عظمتوں کے نغمے گائے ہیں۔ کمیٹڈ ادیب، ادب میں عوام کے حق کو تسلیم ہی نہیں کرتا بلکہ ادب کو "سنوبر کلاس" کا اجارہ گرداننے والوں کے خلاف احتجاج بھی کرتا ہے۔ جنگ بھی لڑتا ہے۔ کیفی اعظمی نے اس ادبی اجارہ داری کے خلاف شاعری کی آواز کو دور تک پہنچانے اور عوام کو اپنی حقیقت اور اپنی عظیم طاقت کا احساس دلانے کا بہتر ذریعہ مانا ہے۔ ان کی ترجیحات اصلاً انقلابی اور عوامی ترجیحات ہیں۔ ان کی لسانی سلاست کا رویہ بھی اسی ترجیح کی کوکھ سے نشو پاتا ہے۔ کیفی، حتی الامکان تجربے کو استعاراتی یا علامتی شیوۂ اظہار سے دو چند دور رکھتے ہیں۔ انھوں نے فقط ان استعارات کو بڑی ہنرمندی اور سلیقے سے کام میں لیا ہے جن سے معنی کی کوئی نہ کوئی نئی سطح تو روشن ہوتی ہے لیکن حقیقت کا بنیادی کردار مسخ نہیں ہوتا۔ اس معنی میں کیفی اعظمی نے اپنے فن کو اپنا حق سمجھا ہے اور اس حق کو انھوں نے بیچ کیا۔ اپنے فن کو شئے میں تبدیل کیا۔ بنکاری اور نظامِ زر کی سنگ دلی کے محور پر گردش کرنے والی سوسائٹی کے پاس زر ہر چیز کو ناپنے کا پیمانہ ہوتا ہے۔ ایسے معاشرے میں فنکار SOPHESTICATAL بااختیار اور سرمایہ دار طبقے خود مقبول عام

فیشن کے مطابق اپنے فن کو ڈھالنے کی سعی کرتا ہے۔ فنکار خود اپنے ہی فنکار استحصال کرتا ہے اور صرف وحاصل کا جبر قبول کرلیتا ہے فن پارہ ایک شئے بن کر بازار اور ڈرائنگ روم کی زینت بن جاتا ہے۔ کیفی اعظمی ایک عظیم مقصد لے کر چلے تھے اس لئے انھوں نے عارضی منفعتوں سے گریز اختیار کر کے اپنے عہد کے اجتماعی آشوب اور انقلابی جدوجہد پر اپنے فن کی اساس رکھی کیفی اعظمی بخوبی واقف ہیں کہ جس معاشرے میں مذہبی ریاکاریوں کی پردہ پوشی کی جاتی ہو جہاں محنت کش کے حقوق کو پامال کیا جاتا ہو۔ رشوت وسالوسی ایذارسانی اور عصبیت جس کے مزاج میں شامل ہو۔ فرد و اجتماع جہاں لخت لخت ہوں۔ ایسی سوسائٹی میں سچی آزادی یا سچی آزادی کا امکان مفقود ہو کر رہ جاتا ہے۔

کیفی اعظمی کا سفر اپنی وابستگی کی بنا پر بہت مشکل اور پیچدار ہے۔ کمیٹڈ شاعر ہمیشہ ایک سپاہی کی طرح جنگ پر آمادہ ہوتا ہے۔ اس کی آواز کا سُر اونچا اور منظم کا مجموعی ٹون رزمیہ اور رجزیہ اصوات سے عبارت ہوتا ہے۔ کیفی ایک پروپگنڈسٹ تو ایک ری ایکشنری بھی ہوتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ری ایکشنری سامراجی طاقتوں کا وکیل اور اجارہ داروں کا رفیق بن کر۔ نہایت مہذب و سجیع پیرائے میں سرمایہ داری کے حق میں پروپگنڈا کرتا ہے اور محنت کش عوام کی بدحالی، بھوک اور افلاس سے صرف نظر کرتا ہے یا ان لعنتوں کو اس طبقے کی تقدیر گردانتا ہے۔ اپنے فن کو Cash کرنے میں اس کی دلچسپی بیش از بیش ہوتی ہے جب کہ ایک کمیٹڈ شاعر محنت کش کے حقوق کا محافظ اور ماؤتھ پیس بن کر ہمیشہ نقصان میں رہتا ہے کہ اس کی نظر ہمیشہ عظیم تبدیلیوں پر ہوتی ہے۔ اس کی سمت معین، اور اس کا اسلوب زیست ایک خاص طرح کو منتج ہوتا ہے۔ سچ کی ہمیشہ کوئی سمت ہوتی ہے وہ کبھی غیر جانبدار نہیں ہوتا۔ یہی سبب ہے کہ کیفی نے اپنے عہد کی کڑوی سچائیوں کا زہر پینا گوارہ کیا ہے کہ غیر جانبداری فرار کا دوسرا خوبصورت نام ہے۔

اسلاف نے اڑلئے تھے جو رزم گاہ میں
ہم نے اٹھا لیے ہیں وہ شعلے نگاہ میں
بے شک بچھڑ گئے تھے کبھی کارواں سے ہم
بے شک دبے پڑے تھے کبھی گردِ راہ میں
اے ہمرکاب اب جرسِ کارواں ہیں ہم

"ہم"

یہ جو دنیا کا پرانا نقشہ
میز پر تم نے بچھا رکھا ہے
اس میں کیا اک لکیروں کے سوا کچھ بھی نہیں
تم مجھے اس میں کہاں ڈھونڈتے ہو
میں اک ارمان ہوں دیوانوں کا
سخت جاں خواب ہوں کچلے ہوئے انسانوں کا

لوٹ جب حد سے سوا ہوتی ہے
ظلم جب حد سے گزر جاتا ہے
میں اچانک کسی کونے میں نظر آتا ہوں
کسی سینے سے ابھر آتا ہوں

(بنگلہ دیش)

کیفی اعظمی نے اپنے تخلیقی اظہار میں جن اوزاروں کو بڑی ذکاوت اور ہنرمندی سے کام لیا ہے وہ ہیں سٹایر اور سارکازم۔ بلکہ وہ ایک SATIRIST ہی ہیں۔ رومانوی لمحے انھیں بے چین ضرور کر دیتے ہیں اور اکثر اوقات ان کی وابستگی ان لمحوں سے اٹوٹ بھی ہو جاتی ہے۔ پھر بھی ان کا اپنا بنیادی لحن اسی اسلوب میں پُر کار ثابت ہے جس میں طنز کی کاٹ گہری لگے ہے اور جس کے موضوعات موجودہ صدی کے وسطی عشروں سے ماخوذ ہیں۔

کیفی اعظمی کا احتجاج ایک باخبر اور معلوم شخصیت کا احتجاج ہے۔ آگہی اور شرکت کے بغیر نہ تو طنز کی معنویت گہری اور دور رس ہوتی ہے نہ احتجاج کا اثر شدید فوری اور وسیع ممکن ہے۔ کیفی اعظمی اپنے دور کی مروّجہ قبولیتوں اور منظوریوں کے پسِ پشت اُن سلسلوں پر نظر رکھتے ہیں جو ایک مقام پر مفاد پرستی اور انسانیت کُشی سے جا ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کیفی اپنی چھوٹی سے چھوٹی نظم میں بھی خارج اور داخل کی عدم موافقتوں کی قلعی کھولے بغیر اطمینان کی سانس نہیں لیتے۔ وہ اپنے فن میں بڑی چابک دستی اور فوری پن سے سیاقی رشتوں کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں

بے سمجھے دل کا حال ترس کھا رہے ہیں آپ
کس درجہ مہربان نظر آ رہے ہیں آپ
ہم بدنصیب قدرِ کرم جانتے نہیں
دعوئی بغیر جہد و عمل مانتے نہیں
اس اہتمام راہ نمائی کا شکریہ
ہم تو مگر حضور کو پہچانتے نہیں
کس انجمن سے اٹھ کے چلے آ رہے ہیں آپ

(نئے مہربان)

نخلِ حسرت اک نہ اک دن بارور ہو جائیگا ∴ چل مرے نقشِ قدم پر تو بھی سر ہو جائیگا
دیکھ پھر جلتا ہے کیونکر سیم و زر کی چھاؤں میں ∴ ڈال لے پہلے یہ زنجیرِ غلامی پاؤں میں
ہاں دکھا دے کفش برداری میں سعی کامیاب ∴ حاکمانِ وقت کے قدموں کے نیچے ہے خطاب
یاد رکھ ملّت فروشی میں ترقی کا ہے راز ∴ مصلحت ہے مولویوں سے بھی کرنے ساز باز
مگر تیرے واسطے غدّاریاں تیرے لئے ∴ چھوڑتا ہوں اپنی سب عیاریاں تیرے لئے
اور تو کیا وہ اگر فرمائیں میرے ہونہار ∴ اپنی ٹھوکر سے مٹا نا باپ کا نقشِ مزار
جس سے یہ پھر جائینگے ان سے خدا پھر جائیگا

(سر کی موت اور وصیت)

جھونپڑوں سے گھرا یہ ویرانہ
مچھلیاں دن میں سوکھتی ہیں جہاں
بلیاں دور بیٹھی رہتی ہیں
اور خارش زدہ سے کچھ کتّے
لیٹے رہتے ہیں بے نیازانہ
دُم مروڑے کہ کوئی سر کچلے
کاٹنا کیا وہ بھونکتے بھی نہیں

(ابن مریم)

کیفی اعظمی کا ایک سیاسی اور اخلاقی نظریہ ہے۔ باہر کی صورت حال ان کے آئیڈیا سے قطعی نامربوط ہے۔ سو اس قسم کا عدم ارتباط ان کے یہاں تشنج ضرور پیدا کر دیتا ہے۔ مگر یہ تشنج انقباض سے میل نہیں کھاتا۔ ان کا سارا کرب کیا ہے۔ اور کیا ہونا چاہئے۔ کا کرب ہے۔ سیاسی سماجی اور اقتصادی نظام کی بے اخلاقیوں اور بے ترتیبیوں کا کرب ہے۔ ان تناقضات کا کرب ہے جو تصوّر اور موجود کے مابین نمایاں ہیں (حقیقتیں، گم راہ ولی عہد، لیڈر کی آمد، تاج محل، اشتباہ) کیفی اعظمی نے اکثر بے حد خردوش کے ساتھ اپنے عہد کی عام فرسودہ رسوم، سیاسی پس ماندگی، ریاکاری اور مکاری کے خلاف احتجاجی آہنگ اختیار کیا ہے۔ ایسی نظموں میں ان کا رویّہ تلوار کی تیز دھار کے مماثل ہے۔ اس میں تلخی ہے، نالہ زنی ہے، بیکار اور ستیزہ کاری ہے۔ لہجہ خاصہ اونچا ہے لے خاصی بلند ہے (تاج، جیل کے در پر، آندھی، قومی اخبار، نئے مہربان) کیفی اپنے موضوع کو مسئلہ بنا لیتے ہیں اور پھر اس طور پر لے برتتے ہیں کہ ان کی قوم میں وہ سب کا مسئلہ بن جاتا ہے یا سب کو اس مسئلے کی کی سنجیدگی کا شدید احساس ہونے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ ہمیں اس نظام (ﻁﻬ ﺴﻪ ﺽ) سے نفرت

ہونے لگتی ہے جس کی کوکھ سے اس مسئلے نے جنم لیا ہے۔ طنز کا ایک کام یہ بھی ہے کہ وہ ہمارے اندر اس چیز سے نفرت پیدا کر دے جو خام، معیوب، بدہیئت اور ناآہنگ ہے۔ اور پھر اسے تبدیل کرنے کی خواہش ہمارے اندر نمو پانے لگے۔ طنز ہمیشہ یہ کام نہیں کرتا بلکہ بعض حالات میں اس طور کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ خصوصاً ایک ایسے معاشرے میں جو انتہائی نامرادانہ زندگی گزر رہا ہے اور باوجود اس کے اس میں انجماد، قناعت اور ایک مسلسل تعطل کی صورت قائم ہو۔

کیفی اعظمی کا طنز ان کے عہد کے فرسودہ نظام اور اس نظام سے وابستہ انسانیت کش قدروں اور سیاسی بوالعجبیوں سے برہمی کا نتیجہ ہے۔ زندگی جس قدر منتشر ہوگی، ماحول جس قدر مبہم اور ابتر ہوگا۔ طنز نگار کی نگاہ اسی قدر روا ہوگی۔ اسی قدر ردِعمل کے طور پر ان کے لہجے میں نشتریت، درشتی اور تاکید راہ پائے گی۔ کیفی نے جس نظام کی فرسودگی کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے اس کے ہر دو متضاد پہلو انھوں نے بیان کئے ہیں۔ سب سے مضحک بلکہ اذیت ناک پہلو یہ ہے کہ انسان، پسپائی اور پس ماندگی کی انتہا پر ہے۔ لیکن وہ اپنی پسپائیوں اور پس ماندگیوں کی وجوہ سے ناآشنائے محض ہے عوام کو زرداروں کی مکارانہ سازشوں کا علم ہے نہ سیاسی چال بازوں کے نت نئے طلسمی فریبوں کی خبر تنگدستی اور افلاس نے انھیں ذلالتوں کے کس دوزخ میں جھونک دیا ہے اس احساس سے بھی وہ محروم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کیفی اپنے OBJECTS پر ہنستے ہیں نہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں بلکہ ان پر کڑھتے ہیں، جھلاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس صورتِ حال سے نفرت کرتے ہیں اور اسے تبدیل کرنا چاہتے ہیں اس طرح صورت حال سے مفاہمت کے بجائے مزاحمت کی راہ ان کے یہاں روشن ہے۔

کیفی اعظمی کی وہ نظمیں جن میں رومانی لمحوں کی کارفرمائی ہے اور جن کا تعلق شاعر کی شخصی واردات سے ہے۔ دو طرح کی مثالیں قائم کرتی ہیں۔ ایک تو وہ جن

میں شاعر اور محبوب کے مابین ایک Ration کام کر رہا ہے۔ اپنی کم مائیگی اور بے بضاعتی کا ذکر ہے۔ زمانے کو بدلنے کا عزم ہے۔ کہیں وطن پرستی آڑے آجاتی ہے تو کہیں وقت اور سماج کے سنگ باش تعصبات (آواز کی شکست "الجھن" آندھی) نظموں کی دوسری طرح وہ ہے جن میں محض وحرف رومانی تاثرات رقم ہوئے ہیں۔ کہاں کیفی کی "کے آنگن استقلال" اور "اتحادیوں کے نام" جیسی ہیجانی نظمیں اور کہاں "پہلا سلام" معذرت، "تم" "پشیماں" "اندیشے" اور "احتیاط" جیسی نازک بافت کی حامل نظمیں، جن میں سکوت آمیز لفظیات کا استعمال ہے اور شروع سے آخر تک جذباتی تناؤ کی ایک زیریں لہر بھی۔ ان میں کیفی نے فوری احساسات کے انتشار کو مرکوز کر کے پیش کیا ہے۔ کیفی کی کم سخنی اور کم آمیزی ان نظموں میں حیرت خیز یوں ہے کہ عموماً سیاسی نظموں میں وہ اس طور کا اعادہ نہیں کر سکے ہیں۔ گو رومانی جذبوں میں خود یہ اندیشہ مضمر ہوتا ہے کہ جہاں شاعر نے غفلت برتی وہاں پھر محض خود رحمی سے معمور لفظ اور لفظوں کے گچھے اسے اپنے اختیار سے باہر جانے نہیں دیتے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کیفی نے ان ہر دو قسم کی نظموں کے مابین ایک واضح حد فاصل قائم کر رکھی ہے۔ وہ جب سیاسی نظم کہتے ہیں تب ان کے سامنے پھر ان کا "میں" نہیں رہتا بلکہ وہ زندہ کھڑکھڑاتے ہوئے ہڈیوں کے پنجر میں وہ تحلیل ہو جاتا ہے۔ "میں" اس "ہم" میں تبدیل ہو جاتا ہے جو ایک عہد اور ایک مخصوص نظام کے جبر کا شکار ہے اس حوالے سے وہ ایک نہیں کئی ہے۔ فرد محض فرد ہی نہیں اجتماع بھی ہے۔ اس کے کرب میں وہ سارے لوگ برابر کے شریک ہیں جو اس کے اپنے عصر میں زندہ رہنے کے گنہگار ہیں۔ کیفی نے ایسی نظموں میں فنکارانہ مکر یا لسانی چالاکیوں کو راہ نہیں دی ہے۔ انھوں نے اپنے احساسات اپنے ردِعمل اپنے حقیقی اور نیک جذبوں سے قصداً فرار اختیار کرنے کے بجائے اپنی جراتوں کو آزمایا

اور اپنے اظہار میں بے ساختگی کو قایم رکھا۔ شاید اسی باعث یہ نظمیں کسی نامانوسیت کو راہ دینے کے بجائے اپنے سے وابستہ کر لیتی ہیں۔ ان کے بے محابا پن میں بھی ایک معصوم سی کشش اور دل آویزی ہے۔ رومانی نظموں میں کیفی کا جمالیاتی برتاؤ تہ نشیں طور پر کام کرتا ہے۔ دوسری قسم کی رومانی نظموں میں تخلیقی اکائی قایم ہے۔ جب کہ پہلی قسم کی نظموں میں مختلف النوع جذبات و مسائل خلط ملط ہو گئے ہیں۔ اسی لئے یہ نظمیں پیش پا افتادہ ہیئتوں کی بنیاد پر بڑھتی پھیلتی جاتی ہیں۔ ان میں عمودی توسیع کی شکل نے تو نمو پایا ہے مگر افقی توسیع سے عاری ہیں۔ "آخری رات" "گر بھوتی"، "ایک لمحہ"، "بہروپنی"، اور "کھلونے" وغیرہ نظموں میں افقی توسیع کا عمل زیر زمین ہے۔ ان تخلیقی تجربوں میں عدم تعلقی یا جذباتی نفاق کی وہ کیفیت ناپید ہے جو پہلی قسم کی رومانی اور دیگر موضوعاتی و مقصدی نظموں میں عمومیت کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ علاوہ اس کے ان نظموں کی ابتدا اور انتہا میں افسانوی غیر متوقع پن ہے اور جمالیاتی فصل کا لحاظ ملتا ہے۔

زندگی نام ہے کچھ لمحوں کا
اور انھیں میں بھی وہ اک لمحہ
جس میں دو بولتی آنکھیں
چائے کی پیالی سے جب اٹھیں
تو دل میں ڈوبیں
ڈوب کر دل سے کہیں
آج تم کچھ نہ کہو
آج میں کچھ نہ کہوں
بس یوں ہی ـــــ بیٹھے رہیں
ہاتھ میں ہاتھ لئے
غم کی سوغات لئے

گرتی جذبات لیے
کون جانے کہ اس لمحے میں
دور پربت پہ کہیں برف پگھلنے ہی لگے

(ایک لمحہ)

کیفی اعظمی کے یہاں غزلوں کی مقدار کم ہے۔ بلکہ یہ مقدار بہ مشکل تمام پانچ سات عدد ہی تک محدود ہے۔ غزلوں کا یہ قلیل ترین سرمایہ ان کے تیسرے مجموعۂ کلام "آوارہ سجدے" میں شامل ہے۔ کیفی نے جس طرح نظموں کے انتخاب کے سلسلے میں بڑی سختی سے کام لیا ہے۔ اسی اصول کا اطلاق انھوں نے غزل پر بھی کیا ہے۔ وہ اساسی طور پر نظم کے جانے پہچانے شاعر ہیں نظم ہی ان کے اصل اسلوب کی شناخت گر ہے۔ ان کی یہ غزلیں عین اس زمانے میں منظر عام پر آئی تھیں جب کہ جاں نثار اختر نے اچانک اپنے سفر کا رخ غزل کی طرف موڑ دیا تھا۔ غزل ان کی تخلیقی انجماد کا توڑ اور ایک نئے تحرک کی سبیل ثابت ہوتی تھی۔ لیکن میرے نزدیک جاں نثار اختر کی غزل کوئی اپنا انفرادی آہنگ قایم نہ کر سکی۔ جاں نثار اختر سے قبل خورشید احمد جامی نے بھی ایک ایسی ہی مثال قایم کی تھی۔ ان دونوں شعرا کی کہنہ مشقی نے جدید غزل کے مجموعی اور انتخابی اسلوب کو بڑی کامیابی اور موثر انداز میں برت تو لیا لیکن ان کے یہاں نئی بصیرت بلکہ نئی تخلیقی بصیرت کا فقدان ہے۔ محض نئے مروجہ اور مستعمل استعاروں، علامتوں، بلکہ اسماء اور لفظوں کو دہراتے رہنے یا صاف ستھرے اور بے عیب ڈھنگ سے انھیں ازسر نو پیش کر دینے سے نیا اور منفرد آہنگ پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ زندگی کو بلونے کا شخصی عمل اور لینے دو۔ رخ کو تنہا پار کرنے کا کرب ان کی غزل کے صیغے میں بار نہیں پا سکا ہے۔ لفظ اور تجربے میں وہ تخلیقی وحدت بھی مفقود ہے جو امکان میں حقیقت کا شائبہ پیدا کر دیتی ہے اور حقیقت میں ایک نئی

حقیقت کے ظہور کا احساس دلاتی ہے ۔ ان کے یہاں نئی غزلوں کے عمومی تجربات کا سنیس بیان تو ملتا ہے لیکن وہ تخلیقی شرکت نہیں ملتی جس کے باعث ایک حقیقی تجربہ اپنے اظہار کو پہونچ کر ایسے سالم فنی تجربے کی شکل اختیار کرلیتا ہے کہ اس کے مختلف اجزا کو پارہ پارہ کرکے دیکھنا مشکل بلکہ کبھی کبھی ناممکن سا ہو جاتا ہے ۔ اسی وجہ سے یہ غزلیں انکی اپنی واردات سے دو چند دور ہی دکھائی دیتی ہیں ۔ اختر اور جامی کا یہ المیہ ہمارے سامنے کا تجربہ ہے ۔ کیفی اعظمی نے ان غزلوں میں اپنی نظم کی آواز سے انحراف نہیں برتا ہے ۔ وہ دوئی جو اختر کی نظموں اور اواخر غزلوں کے مابین پائی جاتی ہے ۔ کیفی کے یہاں اس کا شائبہ تک نہیں ملتا ۔ کیفی کی غزلیں ان کے اپنے حقیقی تجربے سے ماخوذ ہیں ۔ ان غزلوں میں بلا کا تیکھا پن ہے ، گہری نشتریت ہے مصرعوں کی بنت میں کاٹھ داری اور چستی ہے ، اور سب سے اہم بات یہ کہ کیفی کی اپنی شخصیت کی TRANSPARANCY ان غزلوں کا بھی خاصہ ہے ۔ کیفی اگر اب اپنی تخلیقی لمحوں کو غزل کے نام کردیں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک فال نیک ہوگی ۔ غزل ان کی تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لانے میں غیر معمولی کردار انجام دے سکتی ہے ۔ درج ذیل اشعار سے ان کی غزل گوئی کی غیر معمولی صلاحیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔

وہ تیغ مل گئی جس سے ہوا ہے قتل مرا ؛ کسی کے ہاتھ کا اس پر نشاں نہیں ملتا

سب اپنے پانو پہ رکھ رکھ کے پانو چلتے ہیں ؛ خود اپنے دوش پہ ہر آدمی سوار سا ہے

اتنی لاشیں میں کیسے اٹھا پاؤں گا ؛ آپ اینٹوں کی حرمت بچا تو چلے

بیلچے لاؤ کھولو زمیں کی تہیں ؛ میں کہاں دفن ہو کچھ پتہ تو چلے

جنگل کی ہوائیں آرہی ہیں
کاغذ کا یہ شہر اڑ نہ جائے

علی سردار جعفری

انگریزی سے ترجمہ — ڈاکٹر شتما بھٹناگر

کیفی اعظمی

"اردو شاعری کے باغ میں سُرخ گلاب" ان الفاظ کے ساتھ ادبی منظرنامے پر کیفی اعظمی کی آمد پر سجاد ظہیر نے استقبال کیا تھا۔ جو ایک جانے پہچانے نقاد اور کل ہند ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری تھے۔ ایک اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانے کے فرزند کیفی اعظمی نے گاؤں (مجواں، اعظم گڑھ، اترپردیش) سے بمبئی تک کا لمبا سفر طے کیا اور ملک گیر شہرت حاصل کی۔

روایتی ڈھنگ سے مدرسے میں مشرقی تعلیم حاصل کرتے ہوئے اطہر حسین (اصلی نام) نے اردو اور فارسی سیکھی۔ بچپن سے ہی شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اردو اور فارسی زبانیں مشرق کی سب سے زیادہ شاعرانہ زبانوں میں شمار ہوتی ہیں۔ دلکش اور خوبصورت، جس کا تمثیلی ڈھانچہ بہت دولت مند اور فکر میں گہرائی ہے۔ باضابطہ تعلیم حاصل کرنے سے پہلے ہی انھیں کچھ چیدہ اشعار زبانی یاد تھے جنھیں وہ آسانی کے ساتھ دہرایا کرتے تھے۔ بیت بازی کے کھیل میں وہ بہت ماہر تھے۔ بچے اس کھیل کو بزرگوں کی موجودگی میں کھیلا کرتے تھے، جو امپائر کا رول ادا کیا کرتے تھے۔ بچے ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے۔ ایک کے بعد دوسرا شعر پڑھے۔ اس شرط کے ساتھ کہ ہر شعر، بیت کا پہلا حرف اگلے بیت کا پہلا حرف ہوگا۔ اسی کھیل میں لڑکیاں بھی شرکت کرتیں۔ اطہر حسین، جو عام طور پر اس کھیل میں جیتا کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ کسی خوبصورت لڑکی سے ہار جایا کرتے تھے۔ ان کی موجودگی میں ان کا حافظہ ساتھ نہ دیتا تھا۔ ان کی اس کمزوری سے ان کے خاندان کے دوسرے بچے بخوبی واقف تھے لہٰذا وہ جب چاہتے انھیں شکست دے دیا کرتے۔

ایک معمولی سی چال کارآمد ہو جاتی۔ ایک خوبصورت سی لڑکی کو مٹھائی کھلا کر اُسے دوسری ٹیم میں شامل کر لیا جاتا۔

جیسے جیسے کیفی بڑے ہوئے انھوں نے ایران کے حافظؔ اور سعدیؔ اور دلّی کے میرؔ اور غالبؔ جیسے کلاسکل استادوں کو پڑھا۔ اعلا شاعری کو جذب کرنے کے اس تجربے نے ان کی روح کو بالیدگی بخشی اور ذہن کو آزاد کیا۔ اردو اور فارسی شاعری، زندگی نیچر اور انسانیت کے جذبے سے لبریز ہے، چاہے وہ انسان گنہ گار کیوں نہ ہو۔ جو کہ ایرانی اثرات کی دین ہے انھوں نے اپنے طالب علمی کے زمانے سے ہی "کیفیؔ اعظمی" کے قلمی نام سے شاعری کرنا شروع کر دیا تھا۔ جس کے لفظی معنی ہیں "وجد و سرور کا بچہ، جو اعظم گڈھ سے تعلق رکھتا ہے"۔

تحریک آزادی کے سنہرے دور میں مہاتما گاندھی کی قیادت میں انڈین نیشنل کانگریس کے لکھنؤ اجلاس میں پنڈت جواہر لعل نہرو نے اپنے صدارتی خطبے میں سوشلزم کا نعرہ دیا۔ اسی سال اس شہر لکھنؤ میں اردو، ہندی افسانوں کے ادب کے بابائے آدم منشی پریم چند نے ترقی پسند مصنفین کے پہلے اجلاس میں اپنے صدارتی خطبے میں اعلان کیا "ہمیں حسن کا پیمانہ بدلنا ہوگا"۔ اس اعلان نے ہندوستانی ادب کو نیا رُخ دیا۔ اس زمانے میں ۱۹۴۳ میں کیفی اعظمی نے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے مرکزی دفتر بمبئی کی راہ پکڑی۔ یہاں انھوں نے ایک شاعر اخبار نویس کی حیثیت سے چالیس روپے ماہوار کی تنخواہ پر کام کیا۔ یہاں انھیں ہندوستانی تہذیب اور ادب کی عظیم ترین ہستیوں سے ملنے کا موقع ملا۔ جیسے ہندی شاعر سمترا نندن پنت، اردو شاعر جوشؔ ملیح آبادی، ملیالم کے مشہور شاعر اور کتھا کلی کے ترجمان و تے تول، مراٹھی ڈراما نویس ماما ورکیر، مقبول رقاص اودے شنکر، فلم اداکار کے۔ ایل سہگل اور پرتھوی راج کپور اور ان جیسی بہت سی ہستیاں جو پارٹی کے مرکزی ہیڈ کوارٹر میں برابر آیا کرتے تھے۔ جسے "راج بھون" کہا جاتا تھا۔ ان تعلقات سے کیفی صاحب کی شاعری کو ایک اچھوتی تازگی اور خیالات کو بلندی عطا کی۔ ۱۹۴۵ میں ان کا پہلا مجموعہ کلام "جھنکار" شائع ہوا۔

کیفی اعظمی، ڈاکٹر ذاکر حسین کی نظر میں آئے جو اس زمانے میں جامعہ ملیہ نئی دہلی کے وائس چانسلر تھے۔ کیفی اعظمی کو ۱۹۴۵ میں جامعہ کی سلور جوبلی تقریبات کے سلسلے میں منعقد آل انڈیا

مشاعرے میں مدعو کیا گیا تھا۔

یہ سال کیفی صاحب کی زندگی میں ایک اہم موڑ لے کر آیا۔ ایک ادبی کانفرنس کے دوران، حیدرآباد میں ان کی ملاقات شوکت خان نام کی نوجوان لڑکی سے ہوئی۔ جو ان کے میزبان کی سب سے چھوٹی سالی تھی۔ کیفی کو ان کے حسن نے اپنی طرف متوجہ کیا اور وہ خود ان کی خوبصورت شاعری اور پڑھنے کے زوردار انداز کی طرف راغب ہوئیں۔ شوکت کی نسبت ہو چکی تھی اور شادی کی تاریخ بھی طے ہو چکی تھی۔ اس وجہ سے کچھ مشکل پیدا ہوئی۔ لیکن ان کے والد، جو سابق نظام کی ریاست کے ایک سرکاری ملازم تھے، بہت روشن خیال شخص تھے وہ سگائی توڑنے پر راضی ہو گئے اور اپنی صاحب زادی کو لے کر بمبئی آ گئے۔

ایک سادی سی شادی کی رسم ۹۶۔ سیکری بھون میں مکمل ہوئی۔ یہ سجاد ظہیر کا گھر تھا جہاں ترقی پسند ادیبوں کی میٹنگیں ہوا کرتی تھیں، شادی پر کل سو روپے خرچ ہوئے جس میں قاضی صاحب کی فیس بھی شامل تھی۔ دولہن کو جو واحد تحفہ ملا، وہ تھا کیفی صاحب کی نئی کتاب کی پہلی جلد "آخر شب" عنوان کا یہ مجموعہ شوکت کے نام تھا۔ انتساب میں لکھا تھا۔

"ش کے نام۔ میں اپنے فن کو آخرِ شب تک لے آیا ہوں۔ تم آجاؤ کہ سحر ہو جائے"

یہ نوجوان جوڑا بہت برسوں تک نہایت معمولی زندگی بسر کرتا رہا، لیکن ان کی سرگرمیوں کا دائرہ بہت اہم اور وسیع تھا، کیفی صاحب شاعری کرتے رہے۔ شوکت، انڈین پیپلز تھیٹر اسوسیشن میں کام کرتی رہیں۔ جس کا سنٹرل کلچرل اسکواڈ مشہور تھا جن شہرت یافتہ ناموں نے اس تنظیم کی بنیاد ڈالی اور اسے چمکایا، ان میں خواجہ احمد عباس، پنڈت روی شنکر اور بلراج ساہنی بھی شامل تھے۔ ۱۹۴۷ کے فوراً بعد پرتھوی راج کپور نے پرتھوی تھیٹرز شروع کیا جس میں شوکت بحیثیت ادارہ گئیں اور برسوں وہاں کام کرتی رہیں۔

کیفی صاحب شوکت کے ساتھ ناگپاڑہ بمبئی کے ایک چھوٹے سے کمرے میں رہا کرتے تھے جب ان کے یہاں ایک بچی پیدا ہوئی۔ یہ آج کی مشہور اداکارہ شبانہ تھی، یہ ۱۸ ستمبر ۱۹۵۰ کی بات ہے۔ کیفی اور شوکت کے پاس بہت آرام دہ رہائش تو نہیں تھی۔ البتہ انھوں نے شبانہ کو بہتر سے بہتر تعلیم دلوائی۔ بمبئی کے کوین میری ہائی اسکول میں پڑھ کر شبانہ نے

سینٹ زیویر کالج سے بی۔اے پاس کیا اور پھر پونہ فلم انسٹی ٹیوٹ میں داخل ہوئیں، شبانہ کی تعلیم پر اتنا روپیہ خرچ کرنے کے لیے کیفی اور شوکت کو بہت سی ذاتی قربانیاں کرنی پڑیں۔ اسی دوران کیفی اعظمی ایک فلم رائٹر کی حیثیت سے اُبھرے۔ انھوں نے فلموں کے لیے ڈائلاگ اور گیت لکھے۔ ان کی تخلیقی شخصیت کا یہ ایک نیا پہلو تھا۔ ایک بار چیتن آنند نے ان سے "ہیر رانجھا" مکمل اسکرپٹ منظوم لکھنے کی فرمائش کی، کیفی نے اس چیلنج کو قبول کیا اور اس میں کامیاب ہوئے۔

۱۹۷۲ میں جب انھیں دل کا دورہ پڑا، انھوں نے بریچ کینڈی اسپتال میں ایک بہت دلچسپ نظم لکھی، دو برس کے بعد وہ اپنا علاج کرانے سوویت یونین گئے، اس وقت وہ اپنے نئے مجموعے "آوارہ سجدے" کو آخری شکل دے رہے تھے۔ اسی کی اشاعت پر انھیں ساہتیہ اکادمی کا انعام ملا۔ اس کتاب کا پیش لفظ فیض احمد فیض نے لکھا تھا، جو اس وقت ماسکو کے اس اسپتال میں زیر علاج تھے۔ ۱۹۸۲ میں کیفی کو اپنی کُل تصنیفات کے لئے افرو ایشین رائٹرز اسوسیشن کا لوٹس اوارڈ حاصل ہوا۔

آج کیفی اعظمی کو برِ صغیر کا ممتاز ترقی پسند شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ ایک بے حد آرٹسٹک خاندان کے سربراہ ہیں جو بمبئی کے جوہو علاقے میں پرتھوی تھیٹر کے قریب پھولوں سے آراستہ اپنی خوبصورت کاٹیج میں رہتے ہیں۔ شوکت اپنی طرح کی نرالی فلم اور اسٹیج کی اداکارہ ہیں۔ شبانہ اعظمی بہت مشہور فلم اسٹار اور سوشل ورکر ہیں۔ کیفی اعظمی کے صاحبزادے بابا آعظمی ایک کامیاب سنے فوٹو گرافر ہیں۔ ان کی بہو تنوی اعظمی ایک بہترین اداکارہ ہیں۔ جو خاص نام کما چکی ہیں اور ان کے داماد جاوید اختر فلم انڈسٹری کے اعلاترین اسکرپٹ رائٹروں میں سے ایک ہیں جو اب قابلِ تعریف شاعری بھی کر رہے ہیں۔

کیفی کے زوردار اور مہذب پڑھنے کے انداز نے ان کی شاعری کو ایک خاص معنی عطا کئے۔ اپنی نوجوانی کے زمانے میں وہ بھی دوسرے شاعروں کی مانند مشاعروں کی روایت کی طرح اپنے شعر ترنم کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ ۱۹۴۵ میں ایک دفعہ جب انھوں نے اپنی ایک نظم مسز سروجنی نائیڈو کو پڑھ کر سنائی تو آخر میں انھوں نے مسکرا کر پوچھا:

"تمھیں اپنی آواز کا کچھ اندازہ ہے۔ تم نے کبھی سُنا ہے؟" اور پھر انھوں نے کیفی سے اپنی شاعری تحت اللفظ میں پڑھنے کے لئے کہا۔ جس پر کیفی راضی ہو گئے اور اس کے بعد ہمیشہ کے لئے کیفی اور ان کی شاعری کی سیرت ہی بدل گئی۔

عزیز قیسی

کیفی صاحب ـــــ دو نیم مسکراہٹ کا نام

کیفی صاحب پر کیا لکھوں؟ کہاں سے بات شروع کروں یہ فیصلہ مشکل ہے لاکھ یاد کرتا ہوں یاد نہیں آتا کہ کیفی صاحب سے میں پہلی بار کہاں ملا کسی مشاعرے میں؟ کسی مشاعرے کے بعد۔ کسی گھر میں میکدے میں (مسجد میں ملنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا) کچھ یاد نہیں آتا ویسے یہ ضرور یاد ہے کہ کیفی صاحب سے ملنے سے پہلے میں ان کے بارے میں بہت کچھ سن چکا تھا جب میں نے ہوش سنبھالا۔ اور علم و ادب کے ایوان میں ڈرتے ڈرتے قدم رکھا ان دنوں کیفی صاحب کی آواز اس ایوان میں گونج رہی تھی۔

سنہ ۴۸ء یا سنہ ۴۹ء کی بات ہے میں دار العلوم کالج میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا ادب کی نامور شخصیتوں سے ربط ضبط بڑھانے کا شوق نیا نیا تھا۔ اس شوق میں اپنی بے بضاعتی کا احساس بھی شامل تھا۔ مغنی تبسم میرے اسکول کے ساتھیوں میں تھے اور کالج میں بھی مجھ سے ایک سال سینئر تھے۔ مغنی ادب اور شعر کے سلسلے میں بڑے سنجیدہ تھے (اب بھی ہیں) کالج کے سالانہ مشاعرے کے انتظام و اہتمام میں وہ آگے آگے تھے ان کے تعلقات اس وقت کے ابھرتے ہوئے اور ابھرے ہوئے شاعروں سے بہت اچھے تھے اس مشاعرے کے وہ منتظم تھے اس مشاعرے میں حمایت علی شاعر لوگوں کے ذہن پر چھا گئے تھے۔ انہوں نے اپنی سات آٹھ نظمیں پڑھی تھیں (وہ دور نظموں اور خاص طور پر ترقی پسند نظموں کا تھا) حمایت سے میری پہلی ملاقات اسی مشاعرے میں ہوئی۔ اور مجھے معلوم ہوا کہ حمایت کیفی اعظمی کی طرح شعر پڑھتے ہیں۔ آواز کی گھن گرج ڈرامائی اتار چڑھاؤ اور لفظوں کے ذریعے VISUALS بنا دینے کا انداز انہوں نے کیفی صاحب سے سیکھا ہے۔ حمایت سے میری ملاقات دوستی اور دوستی ایک اٹوٹ تعلق میں بدل گئی۔ حمایت کیفی صاحب کے عاشق تھے۔ ان کی نظمیں انہیں زبانی یاد تھیں۔ اورنگ آباد میں غالباً کیفی صاحب نے سنہ ۴۴ء، ۴۵ء میں مشاعرے لوٹے تھے وہاں حمایت کیفی صاحب سے

متاثر ہوئے تھے۔ کیفی صاحب سے میں بھی اسی وسیلے سے متاثر ہوا۔

کیفی صاحب نے اورنگ آباد لوٹ لیا تھا۔ اور اس مال غنیمت میں شوکت خانم بھی تھیں جو اب تک "مال عرب" کے طور پر کیفی صاحب کی شریک حیات کی حیثیت سے "پیش عرب" رہتی ہیں شوکت خانم اور کیفی صاحب کا معاشقہ مشاعرے کا نتیجہ تھا۔ اورنگ آباد کے آثار قدیمہ میں جوانی اور جنوں کے آثار پروان چڑھے۔ رابعہ دورانی کے مقبرے، اور پن چکی کے گلزاروں میں اور نہ جانے کہاں کہاں عہد و پیماں ہوئے۔ اور تلواروں کی چھاؤں اور بندوق کی نالوں کی زد میں کیفی صاحب نے شوکت خانم سے کہا۔ "اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے اور شوکت خانم جو بیٹھی ہوئی بھی نہیں تھیں (کیوں کہ عشق میں بھلا کون بیٹھتا ہے) اٹھیں اور ان کے ساتھ چل دیں یہ ۱۹۴۷ء کا حادثہ ہے جب وہ دیوار اجنتا سے اتر آئی تھیں (ویسے شوکت خانم کا کہنا ہے کہ دیوار اجنتا سے کوئی اور اتر کے آئی تھی میں نہیں")

کیفی صاحب کے مشاعرے لوٹنے (اور مشاعروں کے ذریعے کچھ اور لوٹنے) میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان ڈرامائی انداز سے شعر پڑھنے کا کافی دخل ہے۔ میں نے پتہ نہیں انہیں کتنی بار شعر پڑھتے سنا ہے۔ مشاعروں میں، مشاعروں کے علاوہ گھریلو نشستوں میں، نگارانِ شوق پرور کی محفلوں میں۔ اگر صرف ڈرامائی انداز ہی ان کی شہرت کا باعث ہوتا تو۔ پھر ڈرامے میں کام کرنے والے ایکٹر، کیفی صاحب سے زیادہ مشہور رہتے۔ صرف شعر پڑھنا کچھ نہیں ہوتا۔ برا شعر لاکھ ڈرامائی انداز میں پڑھا جائے برا شعر ہی رہتا ہے۔ ہاں اگر اچھا شعر ہو، اور پڑھنے کا انداز بھی اچھا ہو تو پھر۔ شعر، کانوں اور آنکھوں کے ذریعہ سیدھے دل میں اتر جاتا ہے۔ کیفی صاحب شعر کے ذریعہ دلوں تک پہونچنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کی شہرت اور کامیابی میں ان کی آواز کے (جادو) اور سوز کا۔ ان کی وجاہت اور گورے چٹے رنگ کا۔ ان کی زلف پریشاں کی بے اختیاری کا۔ اور ان کی آنکھوں کی خواب گوں بے قراری کا بھی دخل ہے۔ کیفی صاحب کی مشاعرہ بازی نے جہاں انہیں کئی فائدے پہونچائے وہیں "ان کی شاعری کی" ادبی قدر و قیمت کے اندازے میں وہ ایک رکاوٹ بھی بن گئی ہے۔

میں کیفی صاحب کی نجی زندگی کے بارے میں ان کے حالات و کوائف کے بارے میں بہت

کم جانتا ہوں۔ وجہ اس کی دو طرفہ ہے۔ ایک تو خود کیفی صاحب اپنے نجی حالات بتانے میں بہت کنجوس ہیں۔ دوسرے میں بھی اس سلسلے میں "کم طلب" ہوں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ ان کا نام سید اطہر حسین ہے۔ اعظم گڑھ کے ایک قصبے مجواں کے وہ رہنے والے ہیں۔ گھرانا ان چھوٹے زمین داروں کا ہے جو اصل میں وہ کسان ہیں جو خوش قسمتی سے زمین کے مالک بھی ہیں اور جن پر "حاکمی" کی قبا تنگ ہوتی ہے۔ اس لیے کیفی صاحب کے قصبے کے لوگ انہیں زمین دار نہیں سمجھتے۔ شاعر سمجھتے ہیں اور شاعر بھی ایسا کہ بقول ان کے "ہمارے بھیا کے آگے کوئی سر ہول انڈیا (WHOLE INDIA) میں ٹھہر نہیں رہ سکتا۔"

کم سے کم مشاعروں میں تو میں نے دیکھا ہے کہ مجواں کے اس "بھیا" کے آگے کوئی سر ٹھہر نہیں سکتا۔ ۱۹۵۲ء کی بات ہے حیدرآباد میں اردو والوں نے ایک کلچرل کانفرنس کی تھی اس کانفرنس کی آخری رات مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ اس مشاعرے کے لئے برسوں کے بعد جوش ملیح آبادی حیدرآباد آئے تھے۔ جوش صاحب اس صدی کے "حافظ و خیام" تو تھے ہی۔ حیدرآباد والوں کے لئے بڑی افسانوی شخصیت رکھتے تھے۔ نظام حیدرآباد سے ان کے "تکرار" نظام کے عتاب اور ان کے راتوں رات ریاست سے باہر کرنے کا واقعہ۔ دارالترجمہ کے زمانے ملازمت میں ان کے حیدرآباد کے ادبی محافل مجادلوں اور محبتوں کے قصے ذہنوں میں تازہ تھے۔ وہ برسوں کے بعد شاہ کے معتوب اور شہر کے محبوب کی حیثیت سے حیدرآباد آئے تھے۔ لوگ انہیں سننا چاہتے تھے۔ دیکھنا چاہتے تھے۔ اور ان ہی کے لئے ٹھٹھ کے ٹھٹھ آئے ہوئے تھے دور استانی گرلز اسکول کا میدان انسانی سروں سے سا ہوا تھا۔ اس مشاعرے میں حیدرآباد کے نوجوان شعراء میں صرف یہ خاکسار بار پاسکا تھا۔ سروجنی نائیڈو اور مخدوم بھی شہر کے محبوب تھے یہ تمام تفصیل میں نے اس لیے بیان کی ہے کہ ایسے ماحول میں کیفی صاحب بھی شعر پڑھنے کھڑے ہوئے۔ جوش صاحب سنا چکے تھے لوگ "نقل من عزیز" کے موڈ میں تھے۔ کیفی صاحب اگرچہ شہر کے داماد تھے (شوکت خانم اورنگ آبادی ہیں اور اورنگ آباد ان دنوں حیدرآباد کا ایک صوبہ تھا) اور کیفی صاحب کو حیدرآباد کے مشاعروں میں ایسا لگتا تھا کہ داد نہیں وصول کرتے بلکہ سسرال کے عزیزوں سے سلامی لیتے ہیں۔ پھر بھی جوش صاحب کے بعد پڑھنا

اس ماحول میں مشکل تھا اور بڑھ کر جنا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ کیفی صاحب نے اس مشاعرے میں جوشؔ صاحب سے زیادہ نظمیں سنائیں اور جوشؔ کے بعد سنائیں اور مشاعرہ انہیں پر ختم ہوا۔ یہ ایک نہیں کتنے ہی مشاعرے ایسے ہوں گے جہاں کیفی صاحب پر مشاعرے ختم ہوئے ہوں گے۔ اس واقعے سے جوشؔ صاحب کی شاعرانہ عظمت پر حرف زنی مقصود نہیں ہے) کہنا یہ ہے کہ "کوئی سر ہول انڈیا میں ہمارا بھیّا کے آگے کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔

کیفی صاحب ویسے میرے بھیا نہیں ہیں۔ میرے تعلقات ان سے اور نوعیت کے ہیں لیکن۔ تعلقات نوعیت کیا ہے؟ میں اب تک سمجھ نہیں پایا۔

۵۰ء کی بات ہے۔ ان دنوں حیدرآباد میں یہ خاکسار بھی "مشاعرہ بازوں" کی صف میں آچکا تھا۔ ایک دن اچانک کیفی صاحب بقر افسر کے گھر پر (بقر افسر اس وقت مرے وقت تھے۔ ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری تھے۔ کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم کارکن تھے اور اب مرے سالے ہیں) آغاپورے میں آگئے۔ صبح دس بجے کا وقت تھا۔ بقر افسر کا گھر ان دنوں "ادبی فضا" لئے ہوئے تھا۔ کیفی صاحب نے مجھے وہاں پاکر ایسا تاثر دیا جیسے وہ مرے لئے آئے ہیں۔ کیفی صاحب کی یہ نوازش اس دور کے اعتبار سے میرے لیے بہت اہم تھی میں محاورے کے مطابق اپنے جامے میں پھولا نہیں سما رہا تھا۔ کیوں کہ کیفی صاحب کے اس طرح آجانے سے مری وقعت مرے دوستوں کی نظر میں بڑھ گئی تھی خاص طور پر ایک محترمہ کی نظر میں۔ کیفی صاحب اس روز صبح سے رات کے ایک بجے تک مرے ساتھ رہے۔ مری اپنی "اہمیت" کی غلط فہمی اس وقت دور ہوئی جب مجھے پتہ چلا کہ کیفی صاحب۔ مرے لیے نہیں ان محترمہ کے لئے لطیفے سنا رہے ہیں۔ شعرا کی نقلیں کر رہے ہیں ہنس رہے ہیں ہنسا رہے ہیں۔ دھیرے دھیرے مرے پاؤں کے نیچے کی زمین کھسک رہی تھی۔ انتہا یہ ہوئی کہ شام تک کیفی) صاحب نے مجھے اپنا بیٹا بنالیا۔ اور ان محترمہ نے بھی کیفی صاحب کے تتبع میں مجھے اپنے دوست سے اپنا بیٹا بنالیا۔ اس عمر میں۔ رشتے کی یہ تبدیلی۔ مرے لئے بہت بڑا سانحہ تھی۔ میں کیفی صاحب سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ لیکن اندر اندر ان محترمہ اور کیفی صاحب سے جو دکھ ہو چکا تھا۔ وہ مرے لیے ایک صدمے سے کم نہ تھا۔

کیفی صاحب جو کم گو اور کم آمیز مشہور ہیں۔ اس دن وہ زود گو اور زود آمیز ہو گئے تھے۔

اور میرا ان کا تعلق رقیبانہ ہو گیا تھا کیفی صاحب رقیب اور وہ کامیاب رقیب تھے۔

کیفی صاحب اتنے کم گو اور کم آمیز مشہور ہیں کہ ان کی مقبولیت اور ان کے اطراف جمع لوگوں کے ہجوم کو دیکھ کر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بات مشہور کیوں ہو گئی۔ کیفی صاحب کے ایک اعظم گڈھ کے بچپن کے دوست (اور ہم جماعت انہیں کے بیان کے مطابق) ہندی کے پرسدھ کوی ہیں مرے ان کے درمیان۔ کیفی صاحب ہمیشہ بات چیت کا موضوع بنے رہے ہیں۔ وہ جب بھی ملتے تھے تو کیفی جی کے بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ سنا کر مجھ پر یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ کیفی جی سے مجھ سے زیادہ بے تکلف اور نزدیک ہیں۔ ایک بار وہ کیفی صاحب کے ذکر پر بہت جھلائے ہوئے تھے۔ واقعہ یوں تھا کہ وہ کیفی صاحب سے ملنے گئے۔ دو گھنٹے تک دیوان خانے میں کیفی صاحب کے ساتھ بیٹھے رہے۔ اور ان دونوں کی بات چیت کی تفصیل کچھ یوں تھی۔

کوی = "کیفی جی نمستے"

کیفی صاحب = "نمستے"

کوی = سوچا بہت دن سے ملا نہیں ملتا چلوں آپ سے۔ کئی باتیں کرنی تھیں۔ ساہتیہ کے بارے میں نجی باتیں۔ گھر بچوں رشتہ داروں کے بارے میں وغیرہ (دو منٹ)

کیفی = "ہوں"

کوی = ویسے تو کشل منگل ہے سنا ہے کہ اعظم گڑھ میں آپ نے ایک فارم خرید لیا ہے اور اب وہاں کھیتی کرنے والے ہیں۔ کھیتی کرنے کو تو میرا من بھی چاہتا ہے کیوں کی میں بھی کسان ہوں۔ کوی تو ویسے بن گیا۔ پر کویتا میں بھی کھیتی ہی کرتا ہوں دھرتی سے جیسے بیج بیج سے اکھوے اکھوے سے کونپلیں اور کونپلوں سے پتے۔ ڈال۔ وغیرہ...... (۵ منٹ)۔

کیفی = "جی"

کوی = مجھواں میں کیفی جی میری سسرال ہے۔ آپ پنڈت فلاں کے بیٹے فلاں کو جانتے ہی ہوں گے ان کے سالے کی بیٹی ہے میری پتنی۔ ..... (دس منٹ)

کیفی = "ہوں"

کوی = پھر خاموشی ۔ کئی منٹ

کیفی = چائے لیجیے

کوی = کیفی جی آپ جس کوی سمیلن میں بھاگ لیتے ہیں ۔ وغیرہ وغیرہ ... (کئی منٹ)

کیفی = خاموشی

کوی = خاموشی

جواب خاموشی

اس طرح خاموشی ۔ خاموشی کئی بار لکھ لیجیے

کوی = اچھا کیفی جی پھر آؤں گا

کیفی = "اچھا"

کوی = نمستے

کیفی = نمستے

کوی جی بگڑے ہوئے تھے ۔ یہ کوئی بات ہوئی ۔ کوئی ریت ہوئی ۔ وہ اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں میں نے دل میں کہا ۔ وہ اپنے آپ کو جو بھی سمجھتے ہوں لیکن اس تفصیل سے مری سمجھ میں آگیا کہ وہ آپ کو کیا سمجھتے ہیں ۔ کیوں کہ کیفی صاحب کے سلسلے میں میرا تجربہ اس کے برعکس ہے میں نے گھنٹوں انہیں باتیں کرتے دیکھا ہے ۔ باتیں کرتے ہوئے سنا ہے ۔ اپنے ہی گھر کا وہ واقعہ جس میں ۔ مری دوست مری ماں بن گئی تھیں ۔ انہیں بے اختیار قہقہے لگاتے ۔ لطیفے سناتے شعراء کی نقل کرتے ہوئے دیکھا ہے ۔ شاید جن سے ان کا مزاج نہیں ملتا ان سے وہ زیادہ بات نہیں کرتے ۔ اور شوکت بھابھی کا خیال ہے کہ ان کی ساری خاموشیوں کا قرضہ وہ اپنی بات چیت سے ادا کر دیتی ہیں کہ جب وہ بولنے پر آتی ہیں تو بمبئی کی پولس بھی انہیں روک نہیں سکتی (یہ اور بات ہے کہ وہ سمجھتی ہیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہیں ۔ TO THE POINT کہہ رہی ہیں اور بہت جامع اور مختصر کہہ رہی ہیں اور ان کی باتیں کافی پر مغز اور بامعنی ہیں)

شوکت بھابھی کے بے دھڑک بولنے کے کتنے ہی "لطیفے" کیفی صاحب سنا چکے ہیں ۔ کیفی صاحب ان کی اس بے روک گفتار سے جتنا گھبراتے ہیں ۔ اتنا ہی مزہ بھی لیتے ہیں ۔

لیکن گھبراہٹ اور لطف دونوں کا اظہار۔ وہ صرف ایک مسکراہٹ بلکہ نیم مسکراہٹ سے
کرتے ہیں۔ کبھی کبھی بے لبسی میں یہ مسکراہٹ دو نیم ہو جاتی ہے۔ لطف شوکت بھابھی کے لئے اور
گھبراہٹ دوسرے اہلِ محفل کے لئے۔

۴۷ء یا ۴۸ء کی بات ہے کیفی صاحب ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں پٹنہ گئے
تھے جہاں شوکت بھابھی بھی ان کے ساتھ تھیں (جب سے کیفی صاحب بیمار ہوئے ہیں وہ
ہمیشہ ہر جگہ ان کے ساتھ رہتی ہیں) کانفرنس سے واپسی کے بعد ایک رات ان کے گھر میں ادیبوں
شاعروں کا مجمع لگا (جو اکثر لگا کرتا ہے) یہ خاکسار بھی اس مجمع میں تھا۔ شوکت بھابی نے حسبِ
عادت پٹنہ کی کانفرنس کی باتیں شروع کیں اور باتیں اتنی ہی TO THE POINT تھیں
جتنی ہمیشہ ہوا کرتی ہیں۔ کسی (POINT) پر مجھ میں ان میں گفتگو تیز ہو گئی۔ کیفی صاحب
حسبِ معمول نیم مسکراہٹ سے یہ مناظرہ دیکھتے رہے۔ نوبت یہاں تک آئی کہ شوکت
بھابی نے "اپنے گھر کے دروازے میرے لیے بند کر دیئے" میں بھی کھلے دروازے سے باہر
نکل گیا اور یہ سوچ کر چلا گیا کہ اب کبھی نہیں آؤں گا۔ دکھ اس بات کا زیادہ تھا کہ کیفی
صاحب نے گفتگو میں دخل کیوں نہیں دیا کیفی چپ کیوں رہے۔ شاید دو ایک برس تک
میں کیفی صاحب کے گھر نہیں گیا۔ ایک دن اچانک کیفی صاحب مل گئے۔ وہ کرشن چندر
کی عیادت کے لیے ہسپتال آئے تھے۔ شوکت بھابھی بھی ساتھ تھیں۔ کیفی صاحب نے
اسی نیم مسکراہٹ سے کہا۔ بھئی۔ تم کو شوکت نے کیا کہا۔ میں نہیں جانتا۔ میں نے تو کچھ نہیں
کہا۔ تم کیوں نہیں آئے۔ چلو ابھی میرے ساتھ چلو۔ شوکت کو جو بولنا ہے بولنے دو۔ شوکت بھابھی بھی
مصر ہو گئیں اور انہوں نے بہت "TO THE POINT" آدھے گھنٹے میں سمجھایا کہ انہیں یاد بھی نہیں کہ
کیا بات تھی۔ اور انہوں نے گھر کے دروازے کیوں اور کب مجھ پر بند کیے تھے۔

کیفی صاحب سے میری ناراضگی کا یہ شاید تیسرا واقعہ تھا۔ پہلا واقعہ تو رقابت کا تھا جس کا ذکر
اوپر آ چکا ہے۔ دوسرا واقعہ اس واقعہ کے بعد ہوا میرے دل میں کیفی صاحب سے "بغض" تو پیدا
ہو ہی چکا تھا۔ اس جلتی پر تیل کا کام اس واقعہ نے کر دیا۔ ۱۹۵۵ء میں حیدرآباد کی انجمن ترقی
پسند مصنفین کے سکریٹری حسین شاید تھے۔ انجمن کی ایک میٹنگ میں کیفی صاحب بھی

شریک ہوئے۔ میں نے ایک نظم پڑھی۔ حسینی شاہد، لاہوتی، سلیمان ادیب وغیرہ نے مختصر تنقیدی تعریفی جملے نظم کے بارے میں کہے۔ یہ دستور تھا۔ ان دنوں میں اپنی دانست میں حیدرآباد کے ابھرتے ہوئے شاعروں میں سب سے اچھا شاعر تھا۔ ظاہر ہے کہ مری نظم بھی اچھی ہی تھی۔ لیکن کیفی صاحب نے جب تنقید شروع کی تو تنقید تقریر بن گئی اور تقریر بڑی تلخ تھی۔ مری نظم کیفی صاحب کی نظر میں بے حد معمولی تھی اور ان سیکڑوں ہزاروں نظموں میں سے ایک تھی جو ان دنوں روز ہر شہر میں لکھی جا رہی تھیں۔ ایسی نظموں پر کسی مجھ سے شاعر کا نام لکھ دیا جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیفی صاحب نے کہا تھا ایسا لگتا ہے کہ سیکڑوں شاعر مجھ کانے حلقہ بنائے کھڑے ہیں۔ ایک نعرہ کوئی لگاتا ہے اور سب اپنی اپنی آواز میں وہی نعرہ دہرا دیتے ہیں۔

مری ان کی دشمنی مضبوط ہوگئی تھی۔

اس واقعے کے بعد میں سال بھر ان سے نہیں ملا۔ سال بھر میں نے کوئی نظم نہیں لکھی۔ اپنی والدہ محترمہ سے بھی ہمیشہ کے لئے رشتہ منقطع ہو گیا۔ "ایک ذہنی تاریکی" کا دور مجھ پر کیفی صاحب کی وجہ سے طاری رہا۔ اندر اندر کیفی صاحب کے ذکر سے ان کے نام سے میں کھولتا رہا لیکن ان کی تنقید جو بہت تلخ لگی تھی اپنا اثر کھونے لگی رفتہ رفتہ مجھ پر منکشف ہوا کہ بات ان کی صحیح تھی۔ انہیں دنوں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر پیدا ہونے والی شاعری پر تنقیدیں شروع ہوئیں اور ۵۶ء تک کیفی صاحب کی تنقید نے مرے ذہن سے وہ تاریکی ہٹا دی مری شاعری کا نہج بدل گیا۔ حلقہ بند شاعری سے میں نکل آیا۔ مری شاعری بچ گئی ورنہ نہیں بچی کہ اور برباد ہو گئی۔

پھر جب کیفی صاحب ملے تو ان میں مجھ میں کوئی فاصلہ نہیں تھا۔ ۶۸ء کے آخر میں جب "اپنے سارے جہاز جلا کر" میں بمبئی آیا تو اس وقت تک بمبئی کے اور مشاہیر شعرا فلموں میں بہت نام اور دام کما چکے تھے۔ وہ اگرچہ مجھ سے واقف تھے۔ مری شاعری کی تعریف بھی کرتے تھے لیکن پتہ نہیں کیا ہوا۔ ان کے اور میرے درمیان ایک اجنبیت کی دیوار کھڑی ہو گئی۔ ایک بزرگ شاعر عمر کے لحاظ سے مجھ سے بڑے ہیں، جو مری شاعری کے آئنے

قائم تھے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین بمبئی کے ایک جلسے میں ۔ میری نظم اپنی زبان سے سنا کر یہ اعلان کر چکے تھے کہ نظم اسے کہتے ہیں اور بڑی شاعری ایسی ہوتی ہے ۔ ان سے جب میں بمبئی آنے کے بعد ملا تو ۔ تو مجھ سے مسکرا کر کہنے لگے

" تیسی اگر فلم میں گانے لکھنے کے لیے آئے ہو تو واپسی کا ٹکٹ مجھ سے لے لینا ۔ تکلف مت کرنا "
میں ان سے یہ بھی نہیں کہہ سکا کہ میں گانے لکھنے کے لیے نہیں آیا ہوں میں تو اس لیے آیا ہوں کہ حیدر آباد میں معیشت کے دروازے مجھ پر بند ہو چکے ہیں (میں نے موڑ بند کر لیے ہیں) یہاں صرف زندہ رہنے کے لیے نان جویں کی تلاش میں آیا ہوں وہ چاہے کسی وسیلے سے ملے ان کے اس " خاتمانہ " اعلان کے بعد وہ واپسی کا ٹکٹ مجھے دینے کے لیے تیار ہیں پھر کسی شاعر کسی قدر دانِ ادب سے ملنے کی ہمت نہیں ہوئی ۔ کوئی چھاؤں شناسائی کی اس تپتے دہکتے شہر میں میرے لیے نہیں تھی ۔ دھوپ کڑی دھوپ ۔ افلاس سخت افلاس فاقہ ۔ تین تین دن کا فاقہ ۔ ایسے میں کیفی صاحب ملے ۔ کیفی صاحب بھی ان دنوں کھیت واڑی کے ریڈ فلیگ ہال میں ایک کمرے میں رہتے تھے ان کے گھر کی چھاؤں بھی ایسی ہی تھی جیسی کسی خزاں کے مارے ببول کی چھاؤں ہوتی ہے ۔ لیکن نہ انہوں نے یہ پوچھا کہ کیوں آئے ہو ؟ نہ کہا کہ واپسی کا ٹکٹ میں دے دوں گا ۔ کیفی صاحب اس طرح ملے جیسے حیدر آباد میں ملتے تھے ۔ دونوں دونوں بانہیں پسارے ۔ اسی خزاں زدہ ببول کی چھاؤں میں پہر دو پہر میں بھی گزارتا رہا ۔

کیفی صاحب ان دنوں انجمن نوجوان مصنفین کے سرگروہ تھے ۔ نوجوانوں کے رئیس ایک طرف ۔ سورن سنگھ ۔ گلزار ۔ جسیم سین ساگر سرحدی ۔ پریتم بیلی ۔ داؤد غازی ۔ اختر راہی ' وغیرہ ان کے اطراف جمع تھے ۔ دوسری طرف حیدر آباد کے موسیقار اور گلوکار جن میں اقبال قریشی ۔ (جو میرے بے تکلف دوست ہیں) اور خورشید یاور ابھی تھے ۔ کیفی صاحب نے اس گروپ سے نہ صرف مجھے متعارف کرایا بلکہ اس طرح مجھے اس حلقے (دائرے) نے گھیر لیے بمبئی میں رہنا ۔ اور تپتی دھوپ میں ۔ زندہ رہنا آسان ہو گیا ۔

کیفی صاحب مجھے مشاعروں میں لے جاتے ۔ مقامی مشاعروں میں ۔ باہر کے مشاعروں میں ، کبھی اور شاعروں کے ساتھ ۔ کبھی کبھی صرف میں اور کیفی ہی جاتے ۔ سورت اور احمد آباد کے

مشاعرے مجھے یاد ہیں جہاں صرف میں اور کیفی صاحب گئے تھے۔ کچھ لوگوں کو ان دنوں یہ غلط فہمی ہو گئی تھی۔ کہ میں ان کا بھائی ہوں۔ قیسی اور کیفی۔ کی مناسبت سے یا پتہ نہیں کس اور وجہ سے اعظم گڑھ (مثلاً پھولپور) میں ان کی بیماری کے زمانے میں منائے ہوئے جشنِ کیفی اعظمی میں شبانہ بھی ساتھ تھیں کئی لوگوں نے یہی سوال کیا تھا کہ۔ کیا قیسی کیفی کے بھائی ہیں۔ جیندر جیت یادو کو تو یقین تھا (شاید اب بھی ہو) کہ میں کیفی صاحب کا بھائی ہوں۔ وہ مجھے قیسی اعظمی کہہ کر بلاتے رہے۔ تخلص کی اس صوتی مشابہت کے اور بھی لطیفے ہیں۔ جب میں فلمستان میں ملازم تھا تو فلمستان کے سیٹھ تولارام جالان مجھے کیسی کہہ کے بلاتے تھے۔ اور میں ہر بار ان کے تلفظ کی اصلاح کرتا تھا۔ پر وہ باز نہیں آتے اور کہتے تھے "کیسی اور کیسی میں کیا فرق ہے۔ ایک دن میں نے انہیں فرق بہت تفصیل سے سمجھایا اور انہیں یاد دلایا کہ کیفی صاحب وہ ہیں جو آپ کے ادارے کی فلم "ہیر رانجھا" کے ڈائلاگ لکھ چکے ہیں۔ تب سیٹھ جی کو یاد آیا کہ "وہ جو کرتا پاجامہ پہنتے ہیں اور جن کے بال بکھرے ہوئے رہتے ہیں" اور انہوں نے وعدہ کیا کہ اب یہ گڑبڑ نہیں کریں گے لیکن وہ پھر اپنے وعدے سے پھر گئے اور مجھے "کیسی" ہی کہتے رہے۔ میں نے ایک دن درخواست کی کہ سیٹھ جی جب آپ میرے کسی سین کی برائی کریں تب بے شک کیسی کہا کریں اس کی جب تعریف کریں تو قیسی کہیں۔ وہ پھر وعدہ کر گئے اور وعدہ سے مکر گئے۔ ویسے اکثر وہ میرے لکھے ہوئے سین کی برائی ہی کرتے تھے۔ اور صرف میرے لکھے ہوئے سین کی کیا وہ ہر رائٹر کے لکھے سین کی برائی کرتے تھے۔ لیکن دوسرے رائٹرس کے مقابلے میں خوش قسمت تھا کہ ان کی برائی وہ انہیں کا نام لے کر کرتے تھے اور میری برائی کیفی صاحب کا نام لے کر کرتے تھے۔

کیفی صاحب نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں مشاعرہ شراب پی کر نہ پڑھوں مشاعرے کے بعد ان کے ساتھ شراب پیوں۔ میں اس وعدے پر اکثر قائم رہا۔ مشاعروں کے سلسلے کے بڑے دلچسپ واقعات ہیں ایک مشاعرہ احمد آباد میں ہوا تھا۔ تقریب اس مشاعرے کی یہ تھی کہ ظفر گورکھپوری اپنا پہلا مجموعہ کلام "آتش سیال" چھپانا چاہتے تھے۔ اور ان کے مداحین اور یوپی کے شعر پرست احباب نے انہیں احمد آباد میں مشاعرہ کر کے کافی رقم دینے کا وعدہ کیا

تھا۔ ظفرؔ، کیفیؔ صاحب کو عزیز ہیں اور میں کیفیؔ صاحب کا پسندیدہ شاعر ہوں اس لیے اور شاعروں کے علاوہ میں بھی اس مشاعرے میں شریک ہوا تھا۔ یوں تو اس مشاعرے کی کئی باتیں بھلائی نہیں جاسکتیں ہیں۔ لیکن ایک حادثہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جب ہم احمد آباد جارہے تھے تو ریل میں کیفیؔ صاحب بار بار نظیری کا یہ مصرعہ

قتیل شیوہ خوبان احمد آبادم

یاد کر رہے تھے اور خوبان احمد آباد سے ملنے کی توقعات پر خوش تھے جس سرائے میں ہم لوگ ٹھہرائے گئے تھے۔ معلوم ہوا کہ اس سرائے کی مالکن ایک خاتون ہیں۔ کیفیؔ صاحب کی نیم مسکراہٹ اس اطلاع پر مجھ سے کہہ رہی تھی کہ دیکھو ہم "یکے از خوبان احمد آباد" کے مہمان ہیں، مشاعرہ بہت ناکام رہا۔ ظفرؔ گورکھپوری کے مداح اور احباب مشاعرے کے بعد غائب ہوگئے اور مشاعرے کی اگلی شام تک نہیں آئے۔ دن میں سارے شاعر بغیر چائے پیے کڑھتے جلتے ہوئے سرائے کے ہال میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اور کسی خاتون کی تیز تیز گفتگو سن رہے تھے۔ گجراتی میں دشنام بار گراں نہیں لگتی تھی اور کیفیؔ صاحب کی نیم مسکراہٹ "خوبان احمد آباد" کی متوقع ملاقات کی منتظر تھی۔

خاتون مذکورہ کمرے میں در آئیں۔ دروازے میں کمر پر ہاتھ رکھے کھڑی رہیں ادھر ادھر شعراء پر نظر ڈالی۔ کیفیؔ صاحب کی نیم مسکراہٹ غائب ہوچکی تھی کیوں کہ "یکے از خوبان احمد آباد" نہ صرف آواز کے اعتبار سے موٹی تھیں، بلکہ ڈیل ڈول اور عقل کے اعتبار سے بھی موٹی تھیں۔ میزبان خاتون نے مجھ سے ڈانٹ کر پوچھا "اے بھائی تمہارا صدر قوال کون ہے رے" سب چونکے خاتون سنجیدہ تھیں۔ میں نے بھی اسی سنجیدگی سے کیفیؔ صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا: "وہ جاڑا بھائی ہمارا صدر قوال ہے"۔

خاتون نے فوراً یقین کرلیا کیوں کہ کیفیؔ صاحب ڈیل ڈول اور سنجیدگی کی وجہ سے "صدر" ہی لگ رہے تھے۔ اور تنک کر بولی

"دیکھو رے۔ ادھر گھاں (گھٹا) کر کٹ ہا نہیں کرنے کا سمجھا"

"ہوں"

"ہس ہوں کیا بولتا ہے۔ پہلے جو قوال لوگ آیا تھا بہت گھان کر کے گیا تھا۔ بولو تم نہیں کریگا؟

"نہیں کرے گا" کیفی صاحب اسی سنجیدگی سے اقرار کر رہے تھے۔

"اور ہاں دیکھو بلہام بوم (شور) نہیں کرنے کا ادھر تم قوال لوگ بہت بوم مارتا ہے"۔

"نہیں ماریں گے" کیفی صاحب نے دوسرا وعدہ کیا۔ کیفی صاحب کی بھاری آواز اور عہد صمیم سے مطمئن ہو کر وہ جانے لگی لیکن پھر پلٹی اور کیفی صاحب سے مخاطب ہو کر بولی۔

" اور دیکھو۔ کوئی بھیج (چیز) چرا کے نہیں لے جائے گا" میں سمجھا اب کیفی صاحب ہنس دیں گے۔ لیکن وہ اسی گھمبیر انداز میں بولے۔

"تم سے نہیں لے جائیں گے"۔

جب وہ چلی گئی۔ تو ہم سب بے تحاشہ ہنسنے لگے لیکن کیفی صاحب ویسے ہی چپ بیٹھے رہے جیسے کچھ رہے ہوں۔ بھائی میں نے تمہارے صدر قوال کی حیثیت سے ایک خاتون سے وعدہ کیا کہ ہم چوری نہیں کریں گے اس وعدے کا پاس رکھنا۔"

کیفی صاحب کا مزاج بہت (CADIFIED) ہے۔ وہی لوگ جو ان سے بہت قریب ہیں اسے (DEUPHER) کر سکتے ہیں کسی کا بھی مذاق اڑانا ہو تو وہ کبھی کھل کر نہیں اڑاتے کسی بھی مضحک عمل، گفتگو، شعر یا شخصیت کے لیے ان کے اپنے اشارے ہیں جو ان کے مزاج داں سمجھ لیتے ہیں۔ ہاں غیر شخصی باتوں میں وہ کھل کر ہنستے اور ہنساتے ہیں۔

۱۹۷۳ء میں جب ان پر فالج کا حملہ ہوا اور کئی گھنٹوں کی مسلسل بے ہوشی کے بعد جو بہت تشویشناک تھی انہیں ہوش آیا تو لوگ بہت ڈرے ڈرے سہمے ان سے ملنے ان کو دیکھنے کے لئے بیچ کینڈی ہاسپٹل کے وارڈ میں جارہے تھے۔ شوکت بھابھی کی ہدایات تھیں کہ ان کے سامنے کوئی ایسی حرکت نہ کی جائے جس سے انہیں یہ محسوس ہو کہ ان کی حالت نازک ہے۔ ایک ایک آدمی باری باری اندر جارہا تھا کچھ دیر ٹھہر کر دو چار رسمی لفظ کہہ کر واپس آرہا تھا۔ میں دانستہ ان سے ایسی بات کرنا چاہتا تھا کہ وہ مسکرا دیں "تیل خراب ہونے کی کمزوری سے میں واقف ہوں۔ میں نے دیکھا کہ ان کے وارڈ میں جو نرس مامور ہے وہ بہت حسین اور خوش بدن ہے۔ میں نے کیفی سے دھیرے سے کہا کیفی صاحب نرس اچھی ہے۔ کیفی صاحب

مسکرائے۔ وہی نیم مسکراہٹ۔ اور دھیرے سے بولے ہاں۔ مگر اتنا دیکھ لیجئے بیماری کی اس حالت میں بھی ان کی حس مزاح۔ بیدار تھی۔ پھر جب میں نے کہا کیفی صاحب برین ہیمرج سے ایک بات تو ثابت ہوئی کہ برین تو موجود ہے۔ تو پھر وہ مسکرائے۔ کسی شاعر کی مری نظم کسی مرے شعر کسی بری حرکت کے بارے میں مرے ان کے درمیان ایسے ہی (CODE) میں۔۔۔ کبھی کبھی ہم دونوں کو کسی بات پر ہنسنے کے لیے کچھ کہنا بھی نہیں پڑتا۔

بیماری کے اثر کے نتیجے میں کیفی صاحب کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں نارمل تھے اس پر ایک حادثہ اور گزرا وہ لکھنؤ میں سیڑھیوں سے گر گئے اور متاثرہ پاؤں ہی زخمی ہوا اور اس کی ہڈی ٹوٹ گئی اس حادثے کے بعد قدرتی طور پر ہر وہ شخص جو ان سے نزدیک ہے۔ انہیں بے ارادہ چلنے میں سہارا دینے کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ کیفی صاحب کو یہ پسند نہیں جس کا اظہار وہ کبھی ایک جھلائی ہوئی نظر اور کبھی ہلکے سے ایک جھٹکے سے کرتے ہیں کہ "بلیز ہٹ جائیے آپ کے سہارے کی ضرورت نہیں" یہ نظر اور جھٹکا میں بارہا بھگت چکا ہوں اور لوگ بھی اس کے مارے ہوئے ہیں۔ لیکن ایک بار کلکتہ ائیر پورٹ پر جب ایک ایر ہوسٹس نے یہی حرکت کی تو میں نے دیکھا۔ نہ وہ نظر۔ نہ وہ جھٹکا۔ نہ بے زاری۔ بلکہ کیفی صاحب اور بے سہارا سے ہو کر اپنے دونوں بازوؤں سے اپنا بوجھ اس نازک اندام پر ڈال چکے تھے اور یقین سے آز کہ۔ ائیر پورٹ کے باہر آنے تک اس کی مدد کو دل وجان سے قبول کر چکے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ ائیر پورٹ کے آگے بھی اگر وہ سہارا دیتی ▮ رہے تو اچھا ہے۔ میں اور شوکت جب بھی دونوں اس حرکت کو نہ صرف نوٹ کر رہے تھے بلکہ لطف لے رہے تھے۔ کہ کیفی صاحب نے ہم کو دیکھا اور جواب میں مسکرا دیئے۔

کیفی صاحب۔ کم آمیز ہیں۔ لیکن ان کے دوست بے شمار ہیں۔ کیفی صاحب کم گو ہیں لیکن ان کے اطراف ان کو سمجھنے اور ان کو چاہنے والوں کا ہجوم رہتا ہے۔ کیفی صاحب تنہائی پسند ہیں۔ لیکن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم سے لے کر کمیونسٹ پارٹی اور پھر اپٹا کے ہر ہنگامے اور ہر سرگرمی میں کیفی صاحب سرگرم رہتے ہیں۔ کیفی صاحب بہت کم ہنستے ہیں لیکن پتہ نہیں انہیں کیوں دیکھ کر ان سے مل کر ایک خوش وقتی کا احساس ہوتا ہے۔ کیفی

صاحب لکھتے نہیں لیکن ان کے چاہنے والے برسوں سے ان کے چاہنے والے ہیں۔ اس سے کسی بھی دوستی کا راستہ مختصر نہیں ہوتا۔ خود میری ان کی دوستی کی عمر تیس برس ہے۔

ان کے میرے درمیان کبھی ایسی بے تکلفی نہیں رہی جو برابر کے دوستوں کے درمیان ہوتی ہے لیکن کبھی ایسا بھی تکلف نہیں جو چھوٹے اور بڑے کے درمیان ہوتا ہے۔ میں نے ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں بہت کم جاننے کی کوشش کی۔ انہوں نے بھی بہت کم بتایا وہ میری ذاتی زندگی کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ میں نے بھی بہت کم بتایا لیکن ایسا لگتا ہے جیسے میں اور وہ ایک دوسرے کی ذاتی زندگی میں شریک ہیں۔ اس تعلق کو میں کوئی نام نہیں دے سکتا۔ اس رشتے کو کوئی لیبل نہیں لگا سکتا۔ شاید وہ دوست ہیں بڑے بھائی ہیں۔ شاید ان کے برتاؤ میں پدرانہ شفقت ہے۔ شاید رقیبانہ رازداری ہے۔ شاید یہ سب کچھ نہیں یا شاید یہ سب کچھ ایک ساتھ ہے ان کی شخصیت میں اودیاتی شاعر بھی ہے جو حسن پرست ہوتا ہے۔ دل ٹھینک ہوتا ہے۔ وفاکیش ہوتا ہے۔ ہوش و جنوں کے درمیان کی کیفیت اس پر ہمیشہ طاری رہتی ہے۔ وہ اردو شاعری کے "سرخ پھول" بھی ہیں اور یو پی کے ذاکروں اور مرثیہ خوانوں کے سوز و گداز اور دردمندی کے امین و وارث بھی۔ وہ کسان بھی ہیں اور زمیندار بھی۔ ایسا زمیندار جو ٹالسٹائی کی طرح کسانوں میں بٹ گیا ہو۔ ایسا کسان جو شہر میں رہ کر بھی پیڑ پودوں سے اپنی محبت بھلا نہ سکا ہو جو بڑے شہر سے گھبراتا نہیں اسے للکارتا ہے۔ اور اسے جیتنے پر تیار ہو جاتا ہے اور جب اس کے بچپن کا کوئی کسان دوست اس کی ہمت کی داد دیتا ہے کہ "ہمرے بھیا کے آگے ہول انڈیا میں کو دسر کھڑا نہیں رہ سکت ہا" تو وہ مسکرا دیتے ہیں جو نیم مسکراہٹ۔ جو اس تعریف سے گھبراہٹ کا اظہار بھی ہے اور خوشنودی کا بھی۔

ساگر سرحدی

کیفی اعظمی ۔ ایک خواب اور

جب کبھی میں کیفی صاحب کے بارے میں سوچتا ہوں تو نہ جانے کیوں مجھے وہ شامیں یاد آتی ہیں جو ان سے وابستہ تھیں۔ ہم اکثر شامیں اُن کے ساتھ گذارتے تھے۔ ایک شام خاص طور سے یاد میں اُبھرتی ہے۔ شاید شرد پورنیما تھی۔ ہم سب لکھنے والے ساتھی رات بھر ٹھرّا پیتے رہے، شعر سنتے رہے سناتے رہے۔ پھر جو ہوسے ورسوا تک رات بھر پیدل چلتے رہے۔ صبح ہو رہی تھی۔ ہم نے ایک صاحب کے دروازے پر دستک دی۔ ان سے کہا وہ ہمیں چائے پلائیں۔ چائے پی کر ہم وہاں سے جدا ہوئے اور اپنے اپنے مکان کی جانب چل پڑے۔ وہ کیا جستجو تھی، ہمیں کس چیز کی آرزو تھی، دلوں میں کیا تجسس تھا، ہم نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اور پھر کیفی صاحب کو ہم نوجوانوں سے کیا دلچسپی تھی، وہ کیوں رات بھر ہمارے ساتھ پیدل چلتے رہے۔ وہ کیوں ہمیں بلاتے تھے، بٹھاتے تھے، ہم سے باتیں کرتے تھے، حسب عادت چھوٹے چھوٹے لطیفے دوستوں یاروں کے بارے میں سناتے تھے۔ ان سب سوالوں کے جواب ہم نے اُس وقت تک جانے نہ تھے۔ اُن کی دل آویز شخصیت نے ہمیں سوچنے ہی نہیں دیا تھا۔ اور آج جب ہم کو ان سوالوں کے جواب گئے ہیں تو دل میں ایک کسک سی ہوتی ہے اور اُن کی صحبت میں گذری شامیں، اور ڈھلتی ہوئی راتیں یاد آتی ہیں۔

اِپٹا سے میری وابستگی ذہنی طور پر تو پہلے سے ہی تھی لیکن میں نے ہمیشہ اپنی انفرادیت کو بچائے رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں کچھ تو میری مڈل کلاس کی رومانیت

شامل رہی ہے اور کچھ خود کو بھیڑ میں نہ کھونے کا خوف۔ نوجوان مصنفین ابھی زندہ تھی جب میں نے چند دوستوں کے ساتھ مل کر اپنا ذاتی ڈرامہ گروپ "دی کرٹین" (The Curtain) کے نام سے شروع کیا۔ میرے پاس اچھے اداکار بھی تھے اور اچھے ہدایت کار بھی۔ اس کے باوجود جب کبھی اپٹا کا ڈرامہ ہوتا تو ہم فرض سمجھ کر اسے دیکھتے اپٹا کی روایت سے واقف تھے ہم۔ اُن قدروں کا احساس تھا ہمیں جن کی بنیادوں پر اپٹا قائم ہوا تھا۔ لیکن اُن دنوں جب کبھی ہم نے اپٹا کا ڈرامہ دیکھا تو ایک عجیب سی اُداسی لے کر واپس آئے، جیسے ہم اپنے کسی عزیز دوست کو دفنا کر لوٹے ہوں، بہت بڑا بوجھ دل پر لے کر آئے ہوں۔ ایسا اس لئے تھا کہ خلوص اور محنت اور لگن کے باوجود اپٹا کے ڈراموں میں تفریح کی کمی کا احساس ہوتا تھا، ایک تشنگی باقی رہتی تھی۔ ہم لوگ مزدوروں کی بستی میں جا کر ناٹک تو کھیلتے تھے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ لوگ جیب سے ٹکٹ لے کر انھیں دیکھیں۔ اپٹا نے اُس وقت یہ بات نہیں سمجھی تھی کہ اچھا تھیٹر، اچھی تفریح بھی ہوتا ہے جس طرح ایک بڑی فلم، کامیاب فلم بھی ہوتی ہے۔ ان تاریک دنوں میں کیفی صاحب نے اپٹا کی باگ ڈور سنبھالی اور اسے نئے سرے سے تنظیم کا روپ دیا۔

انڈین پیوپلز تھیٹر یعنی اپٹا سے کیفی صاحب کی نظریاتی وابستگی پہلے ہی سے تھی۔ اپٹا ایک طرح سے ترقی پسند نظریے کا ثقافتی اظہار تھا۔ لیکن اب جب پرتھوی راج جی کا تھیٹر بند ہو گیا اور شوکت کیفی اپٹا میں شامل ہو گئیں تو کیفی صاحب کی دلچسپی اپٹا سے بڑھنے لگیں۔ وہ اب جو ہوتے چلے آئے تھے۔ نوجوان مصنفین اب اتنے نوجوان نہیں رہے تھے، نشستیں بہت کم ہوتی تھیں۔ کیفی صاحب نے اپنا پورا وقت اپٹا کے لئے وقف کر دیا۔

کیفی صاحب نے اپٹا کے لئے جو سب سے بڑا کام کیا وہ تھا اس کے حلقے کو وسیع کرنا۔ اپٹا کے اندر ایک چھوٹا سا گروہ بہت دنوں سے اس کوشش میں تھا۔ کیفی صاحب کی شمولیت نے اسے تقویت بخشی۔ بلراج ساہنی کا جوہو آرٹس تقریباً بند ہو چکا تھا۔ وہ کیفی صاحب کی دعوت پر اپٹا میں آ گئے۔ ساتھ ہی نتن سیٹھی، میں، رمیش تلوار،

قادر خان اور بہت بعد میں کچھ دنوں کے لئے ستیہ دیو دوبے بھی شامل ہو گئے۔
شمع زیدی اور سیتو جو دلی سے آئی تھیں وہ بھی آملے۔ کیفی صاحب نے انھیں دنوں اپٹا کی صدارت سنبھال لی۔ بہت سے کام کرنے والے ایک ساتھ آگئے۔ اچھے اچھے آرٹسٹ، ڈائرکٹرز ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے۔ جہاں پہلے ہندوستانی اسٹیج پر لڑکیاں آٹے میں نمک کے برابر تھیں وہاں اب اپٹا میں لڑکیوں کی ریل پیل ہو گئی۔

غالب صدی تقریبات کے سلسلے میں کیفی صاحب نے "آخری شمع" لکھا۔ اس ڈرامے میں بلراج ساہنی نے غالب کا کردار ادا کیا۔ ڈرامہ بہت کامیاب ہوا۔ یہ ڈرامہ کبھی دلی میں، کبھی بنگلور، کبھی حیدر آباد اور کلکتے میں اسٹیج کیا گیا۔ تیس چالیس افراد پر مشتمل ہمارا گروہ سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں سفر کرتا۔ کیفی صاحب، بلراج ساہنی، اے کے ہنگل، انجن سیٹھی، قادر خان، اور دوسرے ساتھی ایک طرح کی "کمیونٹی لائف" گذار رہے تھے۔ ایک عجیب فضا بن گئی۔ پہلی بار اپٹا کے ساتھیوں میں شعر و شاعری کا چرچا ہونے لگا۔ اتنی قربت، اتنی دوستی، اتنی چاہت کا احساس اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا ہنسی، قہقہے، لطیفے، چٹکلے، شعر گوئی جیسے زندگی ایک دم سے خوشگوار ہو گئی ہو۔ اس فضا کو بنانے میں کیفی صاحب نے بہت بڑا رول ادا کیا تھا۔ ان کی دل آویز شخصیت ایک مقناطیس تھی جس نے بہت سے سنجیدہ اچھے فنکاروں کو اُن کے گرد جمع کر دیا تھا۔

کیفی صاحب نے اپٹا کی تنظیمی ذمہ داری پوری طرح سنبھال لی۔ وہ ڈونیشنز (Donations) جمع کرنے لگے، پیسے اکٹھے کرنے لگے، ہال بھرے رہنے لگے، سولڈ آؤٹ شوز ہونے لگے۔ اب پہلی بار ڈرامہ اسٹیج کرنے کے بعد ہمیں فرحت اور تازگی کا احساس ہونے لگا۔ یہ ہمارے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔ پہلے جب کبھی اپٹا نے ڈرامے سٹیج کئے تھے تو شو کے بعد وہی لوگوں کی بے اعتنائی کا گلہ، ہال کے خالی رہنے کا شکوہ، دوسرا شو کیسے کریں، پیسے کہاں سے لائیں، اور جو اس شو میں قرضہ اٹھایا ہے اسے کہاں سے ادا کریں؟ اس خیال ذہن پر بوجھ بنا رہتا۔ آج صورتِ حال بدل چکی ہے۔ اپٹا اب خود مکتفی ہے۔

ایسی ہی ایک رات تھی۔ بنگلور میں ہم ایک گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ شو ہو چکا تھا بہت سراہا گیا تھا۔ اور اب بھی بہت سے مقامی فنکار اور شائقین ہمیں گھیرے ہوئے تھے۔ کیفی صاحب حسب معمول مسکرا کر چھوٹے چھوٹے لطیفے دوست احباب کے بارے میں سنا رہے تھے۔ ہم سب بہت خوش تھے۔ بات بات پر ہنسی کے فوارے پھوٹ نکلتے۔ رات گئے تک ہم جاگتے رہے۔ کیفی صاحب اس کامیابی پر ہر ساتھی کو مبارک بادپیش کرتے رہے۔ دوسری صبح کوئی پانچ بجے انھوں نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور سنجیدگی سے کہا ساگر، تم اپٹا کے لئے ایک اور ڈرامہ لکھو۔ وہ جانتے تھے کہ ایک ڈرامے کے سلسلے میں میرے دل میں اپٹا کی طرف سے کچھ رنجش تھی۔

"بھگت سنگھ" میرے لئے ایک ڈرامہ ہی نہیں تھا، شاید ایک نصب العین تھا، ایک سنگ میل تھا، منزل کی طرف بڑھنے کی ایک کوشش تھا۔ جس طرح سے وہ ڈرامہ پیش کیا گیا تھا اور جس فارم میں ڈائرکٹ ہوا تھا، اس کا فلاپ ہونا یقینی تھا اور وہ فلاپ ہوا۔ میں اس بات سے بہت رنجیدہ تھا اور اپٹا سے کچھ ناراض سا رہنے لگا تھا۔ اس سے پہلے میرے تقریباً سبھی ڈرامے اپٹا کی طرف سے پیش ہوئے تھے لیکن بنگلور کی اس صبح کو، کیفی صاحب نے جس پیار سے، لگاؤ سے مجھ سے ڈرامہ لکھنے کی فرمائش کی، میرے دل کا غبار دھل گیا۔ مجھے اپنی ناراضگی سے نفرت سی ہو گئی۔ اور میں نے ڈرامہ لکھنے کا وعدہ کر لیا۔ کیفی صاحب کے پاس اپٹا کے لئے ڈراموں کی کمی نہیں تھی۔ اُرجینل (طبعزاد) ڈرامے نہ سہی، دوسری زبانوں کے ڈرامے تو ہندوستانی روپ میں وہ سٹیج کر سکتے تھے لیکن انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں ڈرامہ لکھوں۔ یہ کیفی صاحب کا خاص کردار تھا۔ اپٹا میں آنے سے پہلے بھی وہ نوجوان مصنفین کے ہر ساتھی کو فرداً فرداً ابھارتے، آمادہ کرتے کہ تم مضمون لکھو، تم کہانی لکھو، تم ڈرامہ لکھو۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں ہم سب نے بہت لکھا جس میں کچھ مضامین، کچھ ڈرامے اچھے بھی تھے اور کچھ نظمیں، غزلیں اور کہانیاں آج بھی زندہ ہیں۔ کیفی صاحب ایک طرح سے آکسیجن گیس کی طرح ہیں

جو خود نہیں جلتی لیکن اس کے بغیر آگ پنپ بھی نہیں سکتی۔ انہوں نے ہمارے دلوں میں اعتماد، بھروسہ اور تخلیق کی جو چنگاری جگائی تھی وہ آج بھی روشن ہے۔

پھر کیفی صاحب پر فالج کا حملہ ہوا۔ خبر ملی تو ہمیں یقین نہیں آیا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ کل تو وہ اپٹا کی میٹنگ میں شریک تھے۔ کل تو وہ ہم سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔ لیکن ہمارے یقین نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ کیفی صاحب زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار تھے۔ حملہ بہت شدید تھا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو شاید نہیں بچ پاتا۔ لیکن کیفی صاحب نے موت کو شکست دے دی۔ معلوم ہوا کہ وہ کسی سے نہیں مل سکتے۔ ملنے کا یارا بھی کسے تھا جسے ہم نے ہزاروں کے مجمع کے سامنے گھن گرج سے نظمیں سناتے دیکھا تھا، جسے کسی پل قرار نہیں تھا، جو ٹریڈ یونین تحریک میں مزدوروں کے ساتھ مل کر ان تھک کام کیا کرتا تھا، اسے کس دل سے بستر پر بے بس دیکھتے۔ ہم جو بزدل تھے، اُن سے کترانے لگے۔ پھر معلوم ہوا کہ کیفی صاحب اب بیٹھ سکتے ہیں اور ساتھیوں سے ملنا چاہتے ہیں۔ اب ملنا ضروری تھا۔ ہم پہلی بار اس حادثے کے بعد اُن سے ملنے گئے۔ انھیں دیکھ کر ایسا لگا جیسے ہم اپنی کوئی بہت پیاری چیز کھو آئے ہوں۔ انھیں بیٹھنے اُٹھنے کے لئے بھی سہارے کی ضرورت تھی۔ ہم نگاہ ملا کر ان سے بات بھی نہیں کر رہے تھے کہ کہیں ہمارے دل کا چور آنکھوں سے نہ پکڑا جائے لیکن کیفی صاحب اس حالت میں بھی، جب وہ ٹھیک سے بول نہیں سکتے تھے، مسکرا مسکرا کر، ٹھہر ٹھہر کر اپنی کیفیت سناتے رہے، ہماری خیریت پوچھتے رہے۔ ان کی آنکھوں میں زندگی کا شعلہ پہلے ہی کی طرح لپک رہا تھا۔ پھر انھیں کمرے میں لے جایا گیا اور ہم اپنی بزدلی پر شرمسار رہ گئے۔

دھیرے دھیرے کیفی صاحب کی صحت بہتر ہوتی گئی۔ پھر سے وہ اپٹا کی میٹنگوں میں شریک ہونے لگے، مشورے دینے لگے اور جلد ہی انھوں نے پہلے کی طرح تنظیم سنبھال لی۔

آج جب ہر عقیدہ بکھر چکا ہے، ہر قدر سے انکار ہے، لوگ اکائیوں میں بٹ گئے ہیں، ایک لاتعلقی کا احساس ہے اس میں کچھ سیاسی حالات کا ہاتھ ہے اور کچھ باشعور طبقے کا کمٹمنٹ سے انکار اور اس سے پیدا ہونے والے خطرات سے دامن

بچانے کا خیال ہے، وجہ چاہے کچھ بھی ہو، لیکن ایسے حالات میں ایک شخص اپنے انداز میں، مقدور بھر کوشش کر رہا ہے کہ جو خواب اُس نے جوانی میں دیکھا تھا اور جس کی تکمیل میں وہ زندگی بھر سرگرداں رہا ہے، آج بھی اُس کی حسین تعبیر ڈھونڈ رہا ہے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ اپنے ساتھیوں میں اکیلا وہی اجتماعی طور پر برسرِ پیکار ہے۔

شام کا وقت تھا۔ میں روٹی روزی کی جدوجہد سے تھک ہار کر اپنے گھر پہنچا۔ ابھی سانس دُرست بھی نہیں کر پایا تھا کہ کیفی صاحب کا ڈرائیور میرے پاس آیا۔ کیفی صاحب نے مجھے بلایا تھا۔ کوئی اشد ضروری کام تھا۔ ڈرائیور اسی سلسلے میں دو بار پہلے بھی آچکا تھا۔ میں پریشان تھا کہ کیفی صاحب کو وہ کون سا ضروری کام تھا مجھ سے جس کیلئے انہوں نے اپنے ڈرائیور کو تین دفعہ میرے یہاں بھیجا۔ رات ہو رہی تھی میں ان کے گھر پہنچا۔ وہ حسبِ معمول باہر لان میں کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بھی ایک خالی کرسی پر براجمان ہو گیا۔ منتظر تھا کہ کیفی صاحب وہ ضروری کام مجھے بتائیں۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا ساگر، میں سوچتا ہوں کہ اپٹا کے لئے ایک ورک شاپ، ایک تربیت گاہ کا انتظام کیا جائے، تمہارا کیا خیال ہے۔ میں نے جواب دیا کیفی صاحب، اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔ اور واقعی تھا بھی یہی۔ نئے نئے اداکار اور ہدایت کار آئے دن اپٹا میں شامل ہو رہے تھے اور پرانے لوگ اسٹیج سے فلموں میں جا رہے تھے۔ ضروری تھا کہ اِن نئے آنے والوں کی تربیت کا انتظام کیا جائے تاکہ اپٹا بہ حیثیت تنظیم باقی رہے اور پرانے منجھے ہوئے لوگوں کی غیر حاضری کا احساس نہ ہو۔ کیفی صاحب نے کہا۔ ساگر، میں نہیں چاہتا کہ اس تربیت گاہ کے لئے اپٹا کے سرمائے سے کچھ لیا جائے۔ ہمیں اس کے لئے الگ سے فنڈ جمع کرنا ہوگا۔ یہ کہہ کر انھوں نے عطیے کی رسیدیں میری طرف بڑھا دیں تاکہ میں اپنے اثر و رسوخ سے کچھ رقم اکٹھا کر سکوں۔

یہ کیفی صاحب کا ایک نیا خواب تھا۔ کیفی صاحب کے خوابوں کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ جب کبھی وہ ایک خواب کی تعبیر پاتے ہیں تو فوراً کوئی دوسرا خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ اپٹا کی معاشی کامیابی کے بعد، اس کے خود مکتفی ہونے کے بعد انھوں نے

ہندی ڈراموں کے ساتھ، مراٹھی ڈرامے کا خواب دیکھا۔ اور جب جنت نگاہ کی آرزو کی تکمیل ہوئی تو فوراً فردوسِ گوش کی تمنا ان کے دل میں جاگی۔ انھوں نے میوزیکل سکواڈ بنانے کا خواب دیکھا۔ جب یہ خواب پورا ہوا تو دوسرا شروع ہوگیا۔ ان کا تازہ خواب نئے نئے اداکاروں، ہدایت کاروں اور ٹیکنیشنز Technicians کیلئے تربیت گاہ قائم کرنا۔

مجھے سخت حیرت ہوتی ہے کہ ایک ایسا شخص جس کا سٹیج سے صرف اتنا ہی تعلق تھا کہ عوامی جلسوں میں، سیاسی محفلوں میں تقریریں کر دیا، نظمیں سنا دینا، وہ کیسے تھیٹر کی دنیا کا اٹوٹ حصّہ بن گیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے ہندوستانی سٹیج کو ایک خیال سے حقیقت میں بدل دیا۔ وہ تو اداکار نہیں، نہ ہی ہدایت کار ہے اور نہ ڈرامہ نویس۔ یہ سب نہ ہوتے ہوئے بھی وہ بہت کچھ ہے۔

کیفی صاحب ایک گلیشیر کی طرح ہیں۔ ان کی شخصیت اور عظمت کو سمجھنے کے لئے سطح کے نیچے غوطہ لگانا ہوگا۔ اور یہ کام ہر ایک کے بس کا نہیں۔

بھیشم ساہنی

کیفی صاحب

۱۹۴۷ء کے آس پاس کے دن تھے۔ ملک کی تقسیم ہو چکی تھی یا ہونے والی تھی۔ اس دور کے بارے میں سوچو تو آنکھوں کے سامنے ایک غبار سا اٹھتا ہے۔ بہت کچھ دھندلا دھندلا لیکن بہت کچھ دھڑکتا ہوا۔ اسی غبار میں لاکھوں ہندوستانیوں کے پاؤں کی آہٹ اور بے چین دلوں کی دھڑکن بھی تھی آگے کیا ہوگا؟ ملک کون سی کروٹ بدلے گا؟ بڑے بڑے حادثوں کا گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ ہر واقعہ بہت بڑے پیمانہ پر واقع ہو رہا تھا۔ دوسری جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی جس میں ہٹلر کے خونی پنجوں کو توڑنے کے لئے لاکھوں روسی نوجوانوں نے قربانی دی تھی۔ اسی دوران ہمارے ملک میں ۱۹۴۲ء کی تحریک شروع ہوئی تھی جس نے ہمارے ملک کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ جنگ کے ختم ہوتے ہوتے پہلے بنگال کا خوفناک قحط اور پھر بمبئی میں جہازیوں کی بغاوت ہوئی تھی۔ اور اس کے فوراً بعد ہی ہندو مسلم فسادات اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

میں ان دنوں بمبئی میں تھا۔ بمبئی کے بارے میں اگر یوں بھی خیال کرو تو بھیڑ ہی آنکھوں کے سامنے ابھرتی ہے سڑک پر چلتے انسانوں کی بھیڑیں، لوکل گاڑی پر سوار بھیڑیں، چوپاٹی کے میدان کی بھیڑیں، سیاسی جلسوں اور جلوسوں کی بھیڑیں۔ اب لگتا ہے ویسی ہی بھیڑیں ملک بھر میں اٹھ رہی تھیں۔

ان ہی دنوں بمبئی میں اپٹا کے ناٹک بھی کھیلے جا رہے تھے۔ اپٹا کی سرگرمیوں کے بارے میں سوچوں تو وہ بھی ان دنوں کے ہزاروں اشخاص کی مشترکہ سرگرمیوں کا حصہ معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو اپٹا کے ناٹک کسی حال میں نہ کھیلے جا کر سڑکوں کے کنارے کھلے ہوئے میدانوں میں گلیوں کے سروں پہ یا فیکٹریوں کے باہر کھیلے جاتے تھے جن میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ شامل ہوتے تھے۔ دوسرے ان گیتوں اور ناٹکوں کے موضوع بھی عوام کی جد وجہد سے وابستہ ہوا کرتے تھے، جو ملک میں ہونے والی جد وجہد کا

ہی حصہ تھے۔

اوپیرا ہاؤس کے نزدیک دیودھر میوزک کالج کا چھوٹا سا ہال تھا جس میں اپٹا کی ریہرسلیں ہوا کرتی تھیں ایک ننھا سا اسٹیج اور ناظرین کے بیٹھنے کے لئے ہال کا فرش، وہیں کسی گوشہ میں ساز بھی رکھے رہتے تھے، اور نہ جانے کن لوگوں کی دھوتیاں، کوٹ اور ٹوپیاں بھی ٹنگی رہتی تھیں۔ بغل والی چھوٹی سی کوٹھری میں گانے والوں کی منڈلی ریہرسل کرتی۔ ان گانے والوں میں امر شیخ بھی تھے اور بنے رائے بھی، انا بھاؤ ساٹھے بھی اور گاؤ انکر بھی، شنکر شیلندر اور پریم دھون بھی۔ وہ سبھی لوگ جن کی آواز ہزاروں کے مجمعوں میں گونجا کرتی تھی اور غور کرو تو اب بھی دل میں لہریں اٹھنے لگتی ہیں۔ ہال کے ایک کونے میں کوئی نیا ناٹک پڑھا جا رہا تھا۔ جس روز میں پہلی بار وہاں گیا تو خواجہ احمد عباس اپنا نیا ناٹک "میں کون ہوں" پڑھ رہے تھے۔ اور ان کے آس پاس بلراج ساہنی، اعصمت، صفدر، دینا بنگوی، شانتا گاندھی اور کتنے ہی اور لوگ بیٹھے تھے۔ شہروں میں فسادات ہو رہے تھے اور یہ ناٹک فساد زدہ علاقوں میں کھیلا جانے کے لئے تیار کیا جا رہا تھا۔ ہال کے باہر ایک چھوٹا سا میز تھا جہاں اپٹا کی گجراتی منڈلی کے چاملی بھائی اور دوسرے لوگ جمع ہوتے اور جہاں اپٹا کے پروگرام طے کئے جاتے۔

یہاں پر تقریباً سبھی لوگ بے روزگار تھے لیکن سبھی بے حد مصروف کسی کو سانس لینے کی فرصت نہیں تھی۔ عجیب فاقہ مستی اور جنون کا ماحول تھا۔ لوگ ایک دوسرے کے بارے میں اتنا تو جانتے تھے کہ کون اپٹا کی کس منڈلی میں کام کر رہا ہے لیکن یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ کام دھندا کیا کرتا ہے۔ اور اس بات کی کوئی اہمیت بھی نہیں تھی۔ اہمیت صرف اس بات کی تھی کہ ملک میں ایک جدوجہد چل رہی تھی اور اس جدوجہد میں اپٹا کے ہر فرد کو اپنا رول ادا کرنا تھا۔

اسی ماحول میں میں نے پہلی بار کیفی صاحب کو دیکھا تھا میں بھی ان دنوں بے روزگار تھا اور اپنے بڑے بھائی کی انگلی پکڑ کر ایک دن دیودھر ہال میں جا پہنچا۔

اپٹا کی سرگرمیاں بھی نرالی تھیں۔ دیر تک شام کو ریہرسلیں چلتی رہتیں۔ ریہرسل کے بعد بھائی لوگ لوکل گاڑی میں سوار ہوتے اور اندر گھستے ہی اپٹا کے گیت گانے لگتے۔ کبھی ریل ہڑتال کا گیت ہوتا کبھی ہندو مسلم اتحاد کا، کبھی انگریزوں کے خلاف جدوجہد کا۔ ایک ایک اسٹیشن پر گاڑی رکتی، اپٹا کے جس ساتھی کا اسٹیشن آجاتا وہ گاڑی سے اتر جاتا اور باقی لوگ اپنی محفل جمائے رکھتے۔ یہ روزانہ کا

پروگرام تھا۔ ہزاروں مسافر ان گیتوں سے واقف ہو چکے تھے۔

گلیوں اور محلوں میں ڈرامے کھیلے جاتے۔ عباس صاحب کا ناٹک "میں کون ہوں" بڑا جو کھم بھیل کر لگ بھگ ساٹھ بار کھیلا گیا۔ ناٹک کے بعد جھولی پھیلائی جاتی۔ جھولی میں کوئی اکنی ڈال دیتا تو کوئی چونی اور کوئی روپیہ۔ میں نے اس جھولی میں کچھ عورتوں کو اپنے سونے کے گہنے ڈالتے بھی دیکھا ہے۔ لیکن یہ اس وقت تھا جب بنگال میں قحط سالی کا زمانہ تھا اور اپٹا کی منڈلی قحط زدہ لوگوں کی امداد کے لئے ملک کا دورہ کر رہی تھی۔ اپٹا کے سبھی ارکان کے دروازے ایک دوسرے کے لئے کھلے رہتے۔ کوئی "کوٹھری" میں رہتا تھا کوئی "چال" میں "فلیٹ" میں اور کسی کے پاس "کھولی" تھی لیکن ایک مشترکہ جنون سب کو ایک رشتہ میں باندھے ہوئے تھا۔ جب پانی گہرا ہو تب ہی تو تنکے بکھر کر نیچے تہہ میں بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ یادوں کو تب کاٹتے ہیں جب پانی اتھلا ہو جاتا ہے۔ تحریک زور پکڑ رہی تھی اور دوستوں کے دل بھرے بھرے تھے۔ ان دنوں کے ماحول میں سانس لینا ہی بڑی خوش قسمتی کی بات تھی۔ کبھی کبھی پی سی جوشی گھٹنوں سے نیچے تک لٹکتا ہوا نیکر پہنے ہوئے اس جگہ پہنچ جاتے جہاں اپٹا کا کھیل چل رہا ہوتا تو ماحول میں گویا بجلی دوڑ جاتی۔ اپٹا ان ہی کے دماغ کا "فتنہ" تھا۔ جب اپٹا کا پہلا شاہکار "زبیدہ" کھیلا گیا تو پی سی جوشی سندرا بائی ہال کے باہر دیر تک منڈلاتے رہے تھے اور فن کاروں کی پیٹھ تھپتھپاتے رہے تھے۔

سڑک پر کھڑے ہو کر اشتہار بانٹنے سے لے کر دریاں بچھانے اور کہیں کہیں اسٹیج کھڑا کرنے تک کا کام اپٹا کے اراکین خود ہی کرتے تھے۔ ایک بار گجراتی پریشد کا ناٹک ورلے پارلے میں ہوا اور دریاں لپیٹنے اور میز کرسیاں اکٹھا کر کے دیوڈھر ہال میں پہونچانے کا کام مجھے اور پریم دھون کو سونپا گیا۔ رات کو اسٹیج پر ہی سوئے اور صبح کو سامان جٹا کر بیل گاڑی میں رکھا اور ورلے پارلے سے گرانٹ روڈ کی طرف روانہ ہوئے۔ صبح دس بجے کے چلے ہم شام چار بجے دیوڈھر ہال پہونچے۔ گلی گلی بازار بازار ہم سامان سے بھری بیل گاڑی پر بیٹھے چلے جا رہے تھے اور بمبئی شہر کا نظارہ کر رہے تھے جب دیوڈھر ہال پہونچے تب ریہرسل کا وقت ہو چکا تھا۔ اب گھر جانے کی کوئی تک نہیں تھی۔ وہیں ایرانی ہوٹل میں چائے ناشتہ کر کے ہم ریہرسل کو پہونچ گئے۔

اسی ماحول میں پہلی بار کیفی صاحب سے ملنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ تب ان کی شادی ہوئے

کچھ ہی مہینے گذرے تھے۔ وہ اور شوکت کبھی کبھی دیودھر ہال کے اندر جھانک جاتے تھے۔ ترقی پسند ادیبوں کی بیٹھک دیودھر ہال میں نہیں ہوا کرتی تھی۔ بانکا چھریرہ جسم نازک سا چہرہ گھنگھرالے بال اور سفید کرتا پاجامہ پہنے وہ ادھر سے گذر جایا کرتے۔ نزدیک سے دیکھنے کا موقع تب ملا جب جینت ڈیسائی کے اسٹوڈیو میں ایک بنگالی فلم کو ہندستانی میں ڈب کرنے کا کام نکلا اور اس کام کے لئے اپٹا کے کچھ فنکاروں کی مانگ کی گئی۔ ان دس بارہ لوگوں میں جن کے نام دیئے گئے تھے ایک بے روزگار میں بھی تھا اور ساتھ میں میری بیوی بھی تھی۔ اور ان ہی میں کیفی بھی تھے اور شوکت بھی اور جعفری صاحب کی بیوی سلطانہ بھی اور پریم دھون وغیرہ وغیرہ۔ ان دنوں ریڈیو کے کسی پروگرام میں کام مل جاتے تو پندرہ سے پچیس روپے تک ملتے تھے اور یہی کچھ کسی اخبار سے بھی ڈبنگ کا کام لگ بھگ تین ہفتے کا تھا۔ اور اس میں فی کس پچیس روپے روزانہ ملنے کی امید تھی۔ یہ بہت بڑی دولت تھی۔ چنانچہ ہم دس بارہ لوگ تھیلے لٹکائے اور چپل گھسیٹتے ہوئے جینت ڈیسائی کے اسٹوڈیو کی طرف ترکیں ملاپتے چلے جا رہے تھے۔ اپٹا کے فن کار ہونے کی نسبت سے اس بات کا فخر بھی تھا کہ ہم چھوٹے موٹے فن کار نہ ہو کر ایک بڑی انجمن کے کارکن بھی تھے۔

منڈلی جب سڑک پر چلی جا رہی تھی تو ہم نے دیکھا جہاں اور لوگوں کے پاؤں میں گھسے پٹے چپل تھے۔ محمد عمر نے تو کب سے اپنے فوجی جوتوں کے تسمے باندھنا چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ باندھیا نہ باندھو وہ بڑے تو کھرم کھرم کرکے ہی چلتے تھے۔ لیکن ایک آدمی کے پیروں میں کالے رنگ کے چمچماتے جوتے تھے جو دور سے چمک مار رہے تھے۔ ان پر آنکھیں پڑتیں تو خیرہ ہو جاتیں۔ سفید کرتا سفید اُجلا پاجامہ اور نیچے چمکتے کالے پمپ شو۔ یہ کیفی صاحب تھے۔ وہ آگے آگے چل رہے تھے نہ چمکتے ہوئے جوتے پہننے کے سبب ان کو یہ حق حاصل ہو گیا کہ وہ سب سے آگے چلیں، یا شاید وہ دکھانا چاہتے تھے کہ دیکھو! اپٹا کے فنکار صرف گھسے پٹے چپل ہی نہیں پہنتے پیٹنٹ لیدر کے جوتے بھی پہنتے ہیں۔ لیکن یہ جوتے کیفی صاحب کو کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ناچ رہے تھے اور اگر میں بھولتا نہیں تو وہ ان کے سائز سے بھی تھوڑے بڑے تھے۔

"کچھ کم چمچمانے والے جوتے تمہیں نہیں مل سکتے تھے کیفی؟"
پیچھے سے سلطانہ کی آواز آئی۔

"وہ بورے شو ورکر یونین کے لیڈر کا مرید۔ پران نے اپنے ہاتھ سے بنا کے مجھے پہنائے تھے۔"
"پمک دیکھ کر ہی تو خریدے ہوں گے" وہ جوتا کیا جو دوسرے کشش نہ کرے"
کسی اور نے جوڑا۔
کیفی رک گئے اور بولے!
"تم سب جلتے ہو۔ تمہارے کہہ دینے سے نہ تو میں جوتے
اتار کر تمہیں دے دوں گا اور نہ ہی انہیں پہننا چھوڑ دوں گا۔"
"انہیں پالش کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ بس تھوڑا سا مکھن
چپڑ لیا کرنا کبھی کبھی۔" کسی نے کہا —
"اور جو مکھن بچ جائے وہ ہمیں دے دینا۔"
کیفی پھر آگے چل رہے تھے، شستا ان سنا کر رہے تھے۔
"اب تو تیچھے آجاؤ یار کیا یہ ضروری ہے کہ یہ جوتے پہن کر تم
ساری بستی کو دکھاؤ...... ہمیں یوں بھی جینت ڈیسائی کے
اسٹوڈیو میں گھسنے سے کوئی نہیں روکے گا۔"
کیفی ان جوتوں پر بیچ بیچ اتفلا رہے تھے، بالکل بچوں کی طرح نئے جوتے پہننے کا لطف لے رہے
تھے۔ ایک جگہ پر کیفی رک گئے اور کہنے لگے
"تم کیا جانو ان جوتوں کی اہمیت۔ یہ ہمیں بڑے عزیز ہیں۔"
اور پھر آگے چلنے لگے۔
"شادی کے جوتے رہے ہوں گے"
کسی نے آہستہ سے کہا۔
"کیوں شوکت؟ اگر شادی میں پمپ شو ہی لینا
تھا تو ان کے سائز کا تو لیا ہوتا۔"
جوتوں کا بھید تب کھلا جب ہم جینت ڈیسائی کے اسٹوڈیو میں پہنچ چکے تھے اور ایک کمرے
میں بیٹھے منیجر کا انتظار کر رہے تھے۔

"یہ جوتے ہمیں تحفہ میں ملے ہیں۔" کیفی نے کہا اور ان کی آواز میں ہلکی سی لرزش ہوئی۔
انہوں نے سیلاق ہوئی سی نظروں سے ایک بار جوتوں کی طرف دیکھا اور بولے:۔
"جانتے ہو یہ کس نے عطا کئے ہیں؟ ایک مزدور بستی کے مزدوروں نے۔
ہم ان کے یہاں اپنے اشعار سنانے گئے تھے۔ انہوں نے ہمارے
شعر سن کر ہمیں گلے لگایا اور پھر یہ جوتوں کا جوڑا بخشا۔ اب ان کے
بارے میں کچھ مت کہنا۔"

ان کی آواز میں پھر لرزش ہوئی جو دل کی گہرائیوں میں ایک لہر کی طرح اٹھتی ہے۔

ہم لوگ سچ مچ چپ ہو گئے اور بڑی عقیدت سے ان جوتوں کی طرف دیکھنے لگے جواب جوتے نہ رہ کر ہماری نظر میں ایک بہت بڑا خطاب لگ رہے تھے جس سے ہمارے ایک ساتھی کو نوازا گیا تھا۔ اور سچ مانئے تو وہ خطاب ہی تھا۔ محنت کش عوام کے شاعر کو مزدوروں ہی نے نوازا تھا۔ یہ تحفہ ان ہی کی اس پہچان اور محبت کی علامت تھا۔ کیوں نہ انہیں پہن کر کیفی اٹھلا اٹھلا کر چلتے۔!

اس طویل مدت میں کیفی کی شاعری نے ایک نئی بلندی کو چھوا ہے۔ بس شوی جو اس وقت ایک بستی کے مزدوروں کی علامت تھی۔ آج وہ ہمارے ملک کے لاکھوں محنت کش لوگوں کی علامت ہے۔ عوام کے شاعر کا رتبہ جو چھتیس سال پہلے ان ہی مزدوروں کی ایک چھوٹی سی بستی میں ملا تھا آج ملک بھر سے مل چکا ہے اور اس بستی کے مزدوروں ہی کو نہیں ملک کے ادیب دانشوروں شہروں اور قصبوں کے لاکھوں باشندے ان کی شاعری کو اپنے دل کی آواز سمجھتے ہیں۔ اور ان کے کلام میں اب بھی وہی تڑپ، وہی جذبہ، وہی سوز آزادی، انسانی مساوات اور انسانی دردمندی کا وہی احساس جس کی لَو کو دیکھ کر بستی کے مزدوروں نے انہیں گلے سے لگایا تھا۔ مسلسل اور زیادہ روشن اور تیکھا ہوتا گیا ہے۔

حامد اللہ ندوی

کیفی صاحب: — چند جھلکیاں

تقریباً پچیس سال پہلے کی بات ہے انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ریسرچ فیلو کی حیثیت سے میرا تقرر ہوا تھا۔ اُن دنوں پروفیسر نجیب اشرف ندوی مرحوم انسٹی ٹیوٹ کے آنریری ڈائرکٹر تھے اور مولوی فضل اللہ فاروقی لائبریرین، میں نیا تھا، خاموشی مزاج میں تھی، لوگوں سے ربط ضبط بس برائے نام تھا۔

ایک دن گیارہ بجے کے قریب میں دفتر پہنچا تو دیکھا کہ ایک نوجوان سے آدمی بیٹھے فاروقی صاحب سے باتیں کر رہے ہیں، قد پورا، بدن بھرا ہوا، بال لمبے اور گھنگرالے، آواز بھاری اور کھنک دار، رنگ گندمی، ناک نقشہ کوئی غیر معمولی نہ تھا، مگر ان کی آنکھوں میں بلا کی کشش تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ان کے مزاج کا سارا خلوص، ساری محبت اور ساری گرمی دل کی گہرائیوں سے نکل کر ان کی آنکھوں میں سمٹ آئی ہے، لب خاموش تھے اور آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ یہ کون صاحب ہوں گے کہ اتنے میں مولانا مہر محمد خان شہاب مرحوم تشریف لے آئے — مولانا کا آنا تھا کہ وہ صاحب بے حد احترام کے ساتھ اٹھے اور السلام علیکم کہہ کر پوری گرمجوشی کے ساتھ ان سے بغلگیر ہو گئے — عجیب ملاپ تھا، ایک طرف مولانا اپنی خاص وضع قطع اور داڑھی شیروانی کے ساتھ اور دوسری طرف ایک بے داڑھی مونچھ مسٹر سادہ سے کرتے پاجامے میں،

دونوں میں کیا تعلق ہو سکتا ہے لیکن دونوں تھے کہ بڑی بے تکلفی اور محبت کے ساتھ کافی دیر تک ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے، ایک طرف بزرگی تھی جو مزے لے کر اپنے تجربات کی داستان سنا رہی تھی اور دوسری طرف نوجوانی تھی اور نہایت سعادت مندی کے ساتھ گوش بر آواز تھی۔ میری سمجھ میں اب بھی نہ آیا کہ وہ کون صاحب ہیں، مگر ان کی شخصیت مجھے بڑی پیاری لگی۔ میں نے دل میں سوچا ہو نہ ہو کوئی غیر معمولی شخصیت ہے، جب ایک بجے کے قریب محفل برخاست ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ کیفی صاحب تھے۔

وہ زمانہ سیاسی طور پر بڑی کشمکش کا زمانہ تھا، تقسیم ہند کی تلخی ابھی تک دلوں میں باقی تھی۔ مسلمان مسلم لیگ کے نام سے اپنی ایک الگ تنظیم باقی رکھتے ہوئے ڈرتے تھے، انہوں نے بمبئی کی حد تک اس کا نام بدل کر فورتھ پارٹی کر دیا تھا۔ کانگریس پورے عروج پر تھی اور ہر طرف اسی کا زور و شور تھا کمیونسٹ اور سوشلسٹ تحریکیں نہایت بے باکی کے ساتھ عوام کو ترقی پسند طاقتوں کا ساتھ دینے کی ترغیب دیتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک ملک میں سماجی مساوات اور ترقی پسند اصولوں کا چلن عام نہ ہو ہماری آزادی آزادی کہلانے کی مستحق نہیں ہے۔ ہر طرف ایک عجیب جوش و خروش تھا، ایسے میں میونسپل الیکشن کا اعلان ہو گیا۔ شاید آزادی کے بعد میونسپلٹی کا یہ پہلا الیکشن تھا۔ اور ہر پارٹی اپنا زور بازو آزمانے کیلئے میدان میں آ چکی تھی۔ بہت سے آزاد امیدواروں نے بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کا فیصلہ کر لیا۔

ناگپاڑہ سے فورتھ پارٹی نے حافظ کا کو اپنے امیدوار کی حیثیت سے کھڑا کیا تھا۔ اور ان کے مقابلے میں سید شہاب الدین دسنوی ایک آزاد امیدوار کی حیثیت سے صف آرا تھے۔ دسنوی صاحب کی پشت پناہی ترقی پسند طاقتیں کر رہی تھیں۔ پیچھے سے حاجی نور محمد احمد، معین الدین حارث اور اشوک مہتا انھیں سہارا دے رہے تھے تو آگے سے ابراہیم مدعو، کامریڈ

جبار، اور غلام عباس مولوی جیسے نوجوانوں نے انھیں اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔

ناگپاڑہ کے بعد دوسرا اہم حلقہ کاماٹی پورہ کا تھا جہاں شاید تلّا اور ایس کے پاٹل ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے، کمیونسٹ ہر قیمت پر ایس کے پاٹل کو ہرانا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے اپنی ساری طاقت تلّا کے پیچھے لگا دی، ان کے انتخابی جلسے بڑی دھوم سے ہوتے تھے اور ان میں سب سے زیادہ کیفی صاحب کی آواز گونجتی تھی، اور مسلم علاقوں میں ہر جگہ انھیں کی تقریروں کا چرچا تھا۔

ان دنوں میں کلیر روڈ پر رہتا تھا اور انجمن کا ملازم ہونے کی وجہ سے دسنوی صاحب کے لئے کام کر رہا تھا، جس دن ان کا کوئی انتخابی جلسہ نہ ہوتا میں کمیونسٹ پارٹی کے جلسوں میں چلا جاتا۔ مجھے اِن جلسوں سے کوئی زیادہ دلچسپی نہ تھی، البتہ کیفی صاحب کی تقریر سننے کا بے حد شوق تھا، ایک رات کچھ ایسا ہی موقع تھا، میں سورتی محلہ پہنچا وہاں کیفی صاحب بھی آنے والے تھے، اسٹیج سیدھا سادا سا تھا۔ اور اسٹیج کے دونوں بازو دور دور تک ٹاٹ بچھے ہوئے تھے، ہزاروں آدمی نہ صرف ان پر بیٹھے تھے بلکہ کنارے کنارے چھوٹی ہوئی جگہ میں بھی سیکڑوں لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ اپنی اپنی عمارتوں اور بالکنیوں سے جھانکنے والے الگ، ایک عجیب سماں تھا اور عجیب جوش وخروش کا عالم تھا۔

چھوٹی موٹی تقریروں اور نظموں کا سلسلہ ابھی جاری تھا کہ تقریباً گیارہ بجے اپنے دو ایک دوستوں کے ساتھ کیفی صاحب تشریف لے آئے۔ ان کا آنا تھا کہ فضا "کیفی اعظمی زندہ باد" "کمیونسٹ پارٹی زندہ باد" کے نعروں سے گونج اٹھی۔ کیفی صاحب کا چہرہ گلستاں بنا ہوا تھا، شبنم کے قطرے ان کی پیشانی پر چمک رہے تھے، نعروں کی گونج سے فضا جو تھرتھرائی تو ستاروں کی طرح دو چار قطرے ٹوٹ کر اسٹیج پر گر پڑے اور انہوں نے ایک سپاہیانہ شان کے ساتھ مائیک سنبھال لیا۔ اس وقت مجھے یہ تو یاد نہیں کہ کیفی صاحب نے اپنی تقریر میں کیا کہا، لیکن اتنا یاد ہے کہ جیسے جیسے فضا میں ان کی آواز بلند ہوتا

شروع ہوئی ہر طرف سناٹا سا چھا گیا۔ تقریر کیا تھی بادل کی گھن گرج تھی، اور طوفانی ہواؤں کا ریلا تھا جو رات کی خاموشی میں مسلسل سنناتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا آدھ گھنٹہ ہوا، پون گھنٹہ ہوا، ایک گھنٹہ ہوا نہ گھن گرج میں کمی آئی نہ طوفان تھما، کیفی صاحب کی گرجدار آواز اور گرجدار ہوتی چلی گئی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ایک ایک کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہہ رہے ہوں ۔

مادرِ ہند کے ہونٹوں پہ فغاں ہے کہ نہیں
روئے ملت پہ غلامی کا دھواں ہے کہ نہیں
روح کو آج بھی احساسِ زیاں ہے کہ نہیں
پاؤں میں آج بھی زنجیر گراں ہے کہ نہیں
جہد و قربانی و ایثار کا حاصل ہے یہی؟
کیا جہاں دوڑ کے تم بیٹھے ہو منزل ہے یہی؟ (سپردگی)

قیصر باغ کو آج لوگوں نے تقریباً بھلا ہی دیا ہے لیکن ان دنوں وہ مسلمانوں کی علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز تھا مسلمانوں کے جتنے بڑے علمی ادبی جلسے ہوتے زیادہ تر وہیں ہوتے تھے۔ ایک بار اسی قیصر باغ میں بڑے پیمانے پر ایک آل انڈیا مشاعرہ کا انتظام کیا گیا، اس میں شرکت کی غرض سے دور دور سے نامور شعراء تشریف لائے، بمبئی کے اکثر و بیشتر مشہور شعراء کے علاوہ فلمی دنیا کے بعض اہم آرٹسٹوں نے بھی اس میں حصہ لیا مشاعرہ بہت ہی شاندار اور منظم تھا بیرونِ بمبئی کے بعض شعراء بیکل اتساہی اور فنا نظامی کانپوری تو جیسے پورے مشاعرے پر چھا گئے، خورشید باورا نے صبا کی یہ غزل

ہاتھ پڑتا ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتے ہیں
سب کی ہے ان کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں

اپنی دل کش آواز میں سنا کر سامعین کا دل ہی جیت لیا۔ یہ مشاعرہ صبح کی اذان تک جاری رہا جس کو کسی باذوق نے ذوق کی یہ غزل

موذن مرحبا بروقت بولا
تری آواز مکّے اور مدینے

سنا کر بڑی خوبصورتی کے ساتھ اختتام کو پہنچایا۔

ظاہر ہے کیفی صاحب بھی اس مشاعرے میں موجود تھے اور ان کے چاہنے والوں کی ایک بڑی تعداد بھی ان کے انتظار میں چشم براہ تھی۔ جونہی کیفی صاحب اپنے مخصوص والہانہ انداز میں اسٹیج پر آئے سامعین خوشی کے مارے تالیاں بجانے لگے، کیفی صاحب اپنا کلام ہمیشہ اپنی اونچی اور بھاری آواز میں ایک مجاہد کی طرح پورے جوش وخروش کے ساتھ سنانے کے عادی تھے اور سناتے وقت اپنے اشعار کے ایک ایک لفظ پر زور دے کر اپنے ہاتھوں کے اشاروں سے اس خوبصورتی کے ساتھ ان کو مصوّر کر دیتے تھے کہ سامعین پر بھی ایک جوش کا سا عالم طاری ہو جاتا تھا۔

اُن دنوں اُن کی ایک نظم "نوجوان" بہت مقبول تھی۔ وہ جس مشاعرے میں بھی جاتے لوگ ان سے اسی نظم کے سنانے تقاضا کرتے تھے، یہاں بھی یہی ہوا انہوں نے ابھی ایک آدھ قطعہ ہی سنایا ہوگا کہ ہر طرف سے شور اٹھا "نوجوان" "نوجوان"۔ آخر کیفی صاحب کو وہی نظم سنانی پڑی۔ انھوں نے پہلا بند پڑھا۔

مژدہ! مایوس وطن، گود کے پالے آئے
پھر سرِ بزم ترے چاہنے والے آئے
سازشیں دیکھ کے ظلمت کی اجالے آئے
پیاسے ہونٹوں کی طرف اُڑ کے پیالے آئے

انھیں جکڑے ہوئے ہاتھوں میں اٹھالے ہم کو
کبھی آنکھوں کبھی ہونٹوں سے لگالے ہم کو

"پیاسے ہونٹوں کی طرف اُڑ کے پیالے آئے" کیا خوب تصور کشی تھی، ہر سامع اس کے تصور سے جھوم اُٹھا۔ انھوں نے دوسرا بند سنایا:

بستیوں میں کوئی رونق ہے نہ میدانوں میں
گلستاں خاک بہ سر پھرتے ہیں ویرانوں میں
خار ہی خار ہیں تعمیر کے گلدانوں میں
قحط کے ڈھیر لگا رکھے ہیں کھلیانوں میں
کبھی کاٹے تھے انگوٹھے تری عیاری نے
آج بازو بھی قلم کردئے بیکاری نے

"گلستاں خاک بہ سر پھرتے ہیں ویرانوں میں" ایک اور خوبصورت تصویر کشی اور فوراً بعد کل اور آج کی بعض تلخ حقیقتوں کی طرف اشارہ، جیسے کسی نے سامعین کے احساس خودداری کو للکارا ہو، انہوں نے پھر ایک اور بند سنایا۔

ہم وہ دیپک ہیں جو آندھی میں جلا کرتے ہیں
ہم وہ غنچے ہیں جو بجلی میں ہنسا کرتے ہیں
درد بن کے دل گیتی میں اُٹھا کرتے ہیں
اُٹھ کے آئینِ فغاں توڑ دیا کرتے ہیں
ظلمتِ غم میں چمک اُٹھتے ہیں تاروں کی طرح
دوڑ جاتے ہیں ہواؤں میں شراروں کی طرح

کیفی صاحب کا جوش و ہمت سے بھر پور نعرۂ حیدری، واقعی ایسا لگتا تھا جیسے مایوسیوں کے پردوں کو پھاڑ کر ہر طرف سے اجالے چلے آرہے ہوں۔
انہوں نے آخری بند سنایا۔

زندگی ہم سے سدا شعلہ زبانی مانگے
علم و حکمت کا خزانہ ہمہ دانی مانگے
ایسی للکار کہ تلوار بھی پانی مانگے
ایسی رفتار کہ دریا بھی روانی مانگے

جوش سینوں میں بھڑکتا ہے جوالہ جیسے
اتحاد اتنا منظم ہے ہمالہ جیسے

جونہی یہ نظم ختم ہوئی ہر طرف سے آواز آئی، "کیفی صاحب! ایک اور" "ایک اور" لیکن کیفی صاحب نے معذرت چاہی کیونکہ اور بہت سے شعراء اپنی باری کے انتظار میں تھے اور رات کا کافی حصہ بیت چکا تھا۔ وہ سامعین کے دل میں اپنی للکار کو گونجنے کے لئے چھوڑ کر بیٹھ گئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے:

نکلی تو لبِ اقبال سے ہے کیا جانئے کس کی ہے یہ صدا
پیغام سکوں پہنچا بھی گئی دل محفل کا تڑپا بھی گئی

دن گزرتے رہے اور میں کیفی صاحب کی تقریروں اور مشاعروں میں حاضری دیتا رہا اور میرے دل میں ان کے لئے جو ایک روحانی کشش تھی وہ بڑھتی ہی چلی گئی۔ یہاں تک کہ کچھ سال بعد جب میں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا لائبریرین بن گیا تو میرا جذبِ دروں انھیں وہاں کھینچ لایا۔ اور وہ لائبریری کے باقاعدہ ممبر بن گئے۔ مہینے دو مہینے میں ایک بار لائبریری آتے اور اپنی ضرورت کی کتابیں لے جاتے، وہ جب بھی لائبریری آتے مجھے بڑی خوشی ہوتی اور میں اُن کا ہر طرح خیال رکھتا تھا، ان کی بات چیت میں ایک بے تکلفی اور اُن کے رویّہ میں ایک اپنا پن ہوتا۔ جب جب وہ لائبریری آتے میرے دل پر ایک نیا نقش چھوڑ گئے اور ان کی شخصیت کی نت نئی خوبیاں مجھ پر ظاہر ہونے لگیں۔

کتابیں حاصل کرنے کے لئے لائبریری کے ٹیکنیکی تقاضوں کو پورا کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ اس لئے وہ براہ راست اپنی ضرورت کی کتابیں مجھ سے مانگتے اور میں فوراً نکال دیتا۔ یا موضوع بتا دیتے اور میں اس موضوع سے متعلق لائبریری میں موجود ساری کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اُن کے سامنے ڈھیر لگا دیتا اور وہ اس میں سے اپنی کام کی کتابیں چن لیتے۔ وہ ٹھوس قسم کی علمی ادبی اور کلاسیکی کتابوں کا مطالعہ زیادہ کرتے تھے۔ ادب کے علاوہ

تاریخ اور ثقافت سے بھی انھیں بے حد دلچسپی تھی۔ ثقافت مسلم بھی اور ہندو بھی، حالی، شبلی اور سرسید ان کے پسندیدہ مصنفین تھے۔

بے باکی اور صاف گوئی ان کے مزاج کا جز ہے۔ ایک بار میں سال بھر کی چھٹی پر لائبریری ٹریننگ کیلئے پونا چلا گیا تھا۔ میری غیر موجودگی میں جمیل الدین بغدادی مرحوم لائبریرین کے فرائض انجام دینے لگے۔ میں جب اپنی ٹریننگ پوری کر کے واپس آیا تو ایک دن کیفی صاحب تشریف لائے۔ مجھے لائبریرین کی کرسی پر دیکھ کر بے حد خوش ہوئے، کہنے لگے "اچھا ہوا آپ آ گئے، جمیل الدین صاحب نے تو میرا لائبریری میں آنا بند کر دیا تھا۔ میں جب بھی لائبریری آتا وہ مجھے کتابیں دینے کی بجائے فیس کا تقاضا شروع کر دیتے تھے۔ ایک دن میں نے تنگ آکر کہدیا میں نے فیس دیدی ہے، انہوں نے کہا رجسٹر میں تو درج نہیں ہے۔ میں نے کہا حامد اللہ نے کھا لیا ہوگا، تب جا کر جان چھوٹی، بھئی! میں کیا کرتا اپنی جان بچانے کے لئے مجھے جھوٹ بولنا پڑا" پھر کہنے لگے "آپ سے انہوں نے کچھ کہا تو نہیں" میں نے کہا نہیں۔ پھر اطمینان کا سانس لے کر کہنے لگے چلئے آپ بھی بچ گئے، میں بھی بچ گیا۔

جس بات کو وہ سچ سمجھتے ہیں اسے برملا کہنے میں انھیں کوئی باک نہیں ہوتا۔ سہ ماہی غالب کراچی کے مدیر مرزا ظفر الحسن جن دنوں فیض احمد فیض اور مخدوم محی الدین کی زندگی اور تخلیقات پر "عمر گذشتہ کی کتاب" لکھنے میں مصروف تھے۔ انہوں نے مجھے خط لکھا کہ میں کرشن چندر، سردار جعفری، ظ انصاری، مجروح سلطانپوری، ساحر اور کیفی سے ملوں اور ان کے خطوط پہنچا کر ان سے درخواست کروں کہ فیض اور مخدوم کی مناسبت سے وہ اپنے مشاہدات و تجربات قلمبند کر کے دیں تاکہ ان کو اس کتاب میں شریک کیا جا سکے، میں باری باری ان سب سے ملا انھیں مرزا صاحب کے خطوط پہنچائے اور ان سے اپنے تاثرات قلم بند کر کے دینے کی درخواست کی، سبھوں نے بغیر کچھ کہے حامی بھر لی، مگر میں جب کیفی صاحب

کے پاس پہنچا تو انھوں نے مرزا صاحب کا خط پڑھا اور کہنے لگے بھئی! میں فیض کو پسند نہیں کرتا، البتہ مرزا صاحب نے درخواست کی ہے تو کچھ نہ کچھ لکھوں گا ضرور۔

ان پر مذہب بیزاری کا الزام درست نہیں۔ جب ان کا دوسرا مجموعۂ کلام "آدارہ سجدے" شائع ہو کر بازار میں آیا تو بعض دوستوں کو نام سے غلط فہمی ہوئی اور انہوں نے اسے ایک مذہبی کتاب سمجھ کر پڑھنا شروع کر دیا، اور لگے ان کے بعض اشعار پر مذہبی نقطۂ نظر سے اعتراض کرنے، اس مجموعہ میں ان کی ایک نظم ہے۔ "پیر تسمہ پا" لکھتے ہیں

میرے کاندھے پہ بیٹھا کوئی
پڑھتا رہتا ہے انجیل و قرآن و وید
مکھیاں کان میں بھنبھناتی ہیں

زخمی ہیں کان

اپنی آواز کیسے سنوں
رانا ہندو تھا، اکبر مسلمان تھا
سنیے وہ پہلے انسان تھا
ہستا پور میں جس نے قبل مسیح
ملی وژن بنایا
اور گھر بیٹھے ایک اندھے راجا کو
بدھ کا تماشا دکھایا
آدمی چاند پر آج اترا تو کیا

یہ ترقی نہیں

اب سے پہلے بہت پہلے
جب ذرہ ٹوٹا نہ تھا
"چشمہ جوہر کا پھوٹا نہ تھا

فرش سے عرش تک جا چکا ہے کوئی
یہ اور ایسی بہت سی جہالت کی باتیں
میرے کاندھے پہ ہوتی ہیں
کاندھے جھکے جا رہے ہیں
قد مرادات دن گھٹ رہا ہے
سر کہیں پاؤں سے مل نہ جائے

اور بہت سے اعتراضات کے ساتھ اس نظم کا آخری بند بھی خصوصیت کے ساتھ اعتراض کا نشانہ تھا۔

ایک دن کیفی صاحب لائبریری آئے، کہنے لگے، بھئی! آپ کے ہاں مقالات سرسید ہے، میں نے کہا ہاں، کہنے لگے میں نے معراج کے بارے میں کونسی ایسی بات کہدی جو شبلی اور سرسید نے نہیں کہی ہے، ممکن ہے شعر کی روانی میں ایک آدھ لفظ سخت آگیا ہو، لوگ مجھے مذہب بیزار سمجھتے ہیں، میں جواب دوں گا، پھر وہ مقالات سرسید مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی کا حصہ یازدھم مانگ کر لے لئے، یہ حصہ آنحضرت کی سیرت طیبہ کے متعلق سرسید کے بارہ تحقیقی اور تنقیدی مقالات پر مشتمل ہے جس میں ایک مقالہ کا عنوان ہے، "شق صدر کی حقیقت اور واقعۂ معراج کی ماہیت"

کیفی صاحب نے اپنی شاعری میں مذہبی مسائل کو بہت کم چھیڑا ہے، جہاں کہیں اس کے اشارے آگئے ہیں ان کو محض ایک ایسا شاعرانہ خیال سمجھنا چاہئے جو ہمیں فارسی شعراء سے ورثہ میں ملا ہے۔ اگر ان کے محض ایک شاعرانہ خیال کی بنیاد پر انھیں مذہب بیزار قرار دیدیا جائے تو پھر ان دعاؤں کا کیا ہوگا۔

ایک دعا

(شبانہ کے جنم دن پر)

اب اور کیا ترا بیمار باپ دے گا تجھے
بس اک دعا کہ خدا تجھکو کامیاب کرے

وہ ٹانک دے ترے آنچل میں چاند اور تارے
تو اپنے واسطے جس کو بھی انتخاب کرے (آوارہ سجدے)

ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ ہم مر کر کہاں جائیں گے؟ یہ دنیا بنائی کس نے ہے؟ کیا اس دنیا کے علاوہ بھی کوئی اور دنیا ہے؟ اس وسیع کائنات میں ہم کیا حیثیت رکھتے ہیں؟ بھلا کیا ہے؟ برا کیا ہے؟ ہم جو کچھ کرتے ہیں اس کے اثرات اسی زندگی کے ساتھ ختم ہو جائیں گے؟ یا کسی اور زندگی میں ہمیں ان کا حساب دینا ہوگا؟ یہ اور اس قسم کے بیسیوں سوالات ہیں جو ہر زمانے میں مفکرین کے دل و دماغ کو پریشان کرتے رہے۔ اور ہر زمانہ میں مفکرین نے اپنی اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق ان سوالوں کے جواب دینے کی کوشش کی ہے، مگر سچ یہ ہے کہ کچھ بھی سچ نہیں ہے کیونکہ ہمارے چھوٹے چھوٹے دماغ اتنے بڑے بڑے سوالوں کے صحیح جواب معلوم کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ سچ کا علم صرف خدا کو ہے۔

اس بے بسی اور مجبوری کا ردِ عمل مفکرین پر دو طرح سے ظاہر ہوا۔ ایک گروہ نے اس زندگی کو فضول سمجھ کر دنیا ہی سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور خدا سے لو لگا کر اپنی ہستی کو بھول گئے۔ دوسرے گروہ نے زندگی کے ان چند لمحوں کو خدا کی ایک بڑی دین سمجھا اور ہر لمحے کو اپنے لئے ایک بے خودی و مسرت میں بدلتے چلے گئے۔ پہلے گروہ میں جنید، شبلی، اور عطار جیسے بزرگ پیدا ہوئے اور دوسرے گروہ نے عمر خیام، حافظ، اور غالب جیسے شعراء کو جنم دیا۔

عمر خیام کا کہنا ہے:

با بادہ نشیں کہ ملک محمود این است
وز چنگ شنو کہ لحن داؤد این است
از نامدہ و رفتہ دگر یاد مکن
حالا خوش باش کہ تا مقصود این است

(جام ہاتھ میں لو، محمود کی ساری دولت اسی میں ہے، چنگ و رباب سنو داؤد کی ساری

خوش الحانی اسی میں ہے۔ جو کچھ نہیں آیا یا گزر چکا اس کی فکر مت کرو۔ بس فی الحال خوش رہو، زندگی کا مقصد یہی ہے)

حافظ کا کہنا ہے:

با شاہد شوخ و شنگ و با بربط و نے
کنجی و فراغتی و یک شیشۂ مے
چوں گرم شود ز بادہ مارا رگ و پے
منت نہ بریم یک جو از حاتم طے

(حسین دوشیزہ ہو، بانسری ہو، کنج تنہائی ہو، فرصت ہو، جام و سبو ہوں اور جب شراب سے ہمارے رگ و پے میں گرم خون دوڑنے لگے تو پھر ہم حاتم طائی کا بھی رتی برابر احسان نہیں اٹھائیں گے)

غالب کا کہنا ہے:

اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

جنید و شبلی و عطار کی طرح "جام و سنداں" سے ایک ساتھ کھیلنا "ہر کس و ناکس" کے بس کی بات نہیں ہے، اس لئے کیفی صاحب نے چپکے سے ہاتھ میں جام لیا اور پیر مغاں کے پیچھے ہو لئے، اب وہ تھے، جام تھا، تصور جاناں کی سرمستی تھی، غالب نے تو تصور جاناں میں کھوئے رہنے کی محض تمنا کی تھی۔ کیفی صاحب تصور جاناں میں سچ مچ کھو گئے۔

یہ کس طرح یاد آ رہی ہو، یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو
کہ جیسے سچ مچ نگاہ کے سامنے کھڑی مسکرا رہی ہو

یہ جسم نازک، یہ نرم باہیں، حسین گردن، سڈول بازو
شگفتہ چہرہ، سلونی رنگت، گھنیرا جوڑا، سیاہ گیسو
نشیلی آنکھیں، رسیلی چیتون، دراز پلکیں، مہین ابرو
تمام شوخی، تمام بجلی، تمام مستی، تمام جادو

ہزاروں جادو جگا رہی ہو
یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو

گلابی لب، مسکراتے عارض، جبیں کشادہ، بلند قامت
نگاہ میں بجلیوں کی جھل مل، اداؤں میں شبنمی لطافت
دھڑکتا سینہ، مہکتی سانسیں، نوا میں رس، انکھڑیوں میں امرت
ہمہ حلاوت، ہمہ ملاحت، ہمہ ترنم، ہمہ نزاکت

لچک لچک گنگنا رہی ہو
یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو (تصور)

لیکن یہ "تصور" محض کوئی شاعرانہ خیال تھا یا جیتی جاگتی حقیقت، جو شعر کے پیمانے میں ڈھل کر امر ہو گئی ہے۔ ایسی کتنی جیتی جاگتی حقیقتیں اور کتنی حسین سچائیاں ہیں جو اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ کیفی صاحب کی زندگی میں آئیں اور آکر چلی گئیں۔ انہوں نے بھی خیام کی طرح جام ہاتھ میں لے بیا مرہ و رفتہ کو بھول' حال کی خوشیوں سے کھیلا ہے، انہوں نے بھی حافظ کی طرح آتش سیال کی گرمی میں حاتموں کو ٹھکرا کر شاہد وے کے ساتھ کنج تنہائی آباد کیا ہے۔ انہوں نے بھی غالب کی طرح چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے۔ نو بہاران ناز کو تاکا ہے۔ وہ رند ہیں لیکن ایسے رند جن کو مستی میں بھی اپنی وضع کا پاس رہا۔ جن کے قدم مدہوشی میں بھی نہیں لڑکھڑائے، ان کی زندگی حسن، محبت اور مستی کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے، آج بھی جب میں کیفی صاحب کے متعلق سوچتا ہوں تو میرے دل میں ایسی ہی ان کی رومانی کشش اور بڑھ جاتی ہے اور آرزو کا یہ شعر ذہن میں ابھر آتا ہے۔

دور مسرت آرزو اپنا کیسا زلزلہ انگیز تھا ❊ ہاتھ سے منہ کو آتے آتے چھوٹ پڑا پیمانہ بھی

خلش جعفری

"اپنی کلاہ کج ہے اُسی بانکپن کے ساتھ!"

کیفی اعظمی

کچھ باتیں، کچھ یادیں۔

کیفی کو دیکھکر کسان کی، کھیتوں میں لہلہاتی فصلوں کی، شام کے جھٹپٹے کی، اور ایک شانت ندی کی گہرائی یاد آنے لگتی ہے۔ ان کی شاعری کا سارا سہانا پن بھی اسی مٹی اور دھرتی کی دین ہے۔ جس سے علم و تہذیب کی تمام شاخیں پھوٹی ہیں۔ اور فنونِ لطیفہ کی ساری اصناف نے جنم لیا ہے۔

رام کو ۱۴ برس کا بن باس دیا گیا تھا۔ لیکن کیفی کو تو مستقل طور پر شہر اور وہ بمبئی جیسے مشینی شہر میں زندگی کاٹنے کی سزا دی گئی ہے۔ بمبئی نے کتنے ہی لوگوں کو بدل کر رکھ دیا ہے یہاں تو بہت سے اچھے بھلے لوگوں کے دل بھی سیاہ ہوتے دیکھے گئے ہیں۔ لیکن وہ کیفی کے اندر کسان کو اور دھرتی سے اس کے رشتے کو نہیں بدل سکا...... تو اس مشینی شہر نے شاید جھنجھلا کر کیفی کو اپنے عہد کا منحوس مرض "فالج" بخش دیا۔ اسے بے دست و پا بنا دینے کے لئے۔ لیکن وہ اس کی پرواز کیسے روک سکتا تھا۔

کیفی کے ارادے تو کوئی نہیں جکڑ سکتا۔ اور سب نے دیکھا کہ اس کی مضبوط قوتِ ارادی نے مرض کی ساری زنجیروں کو توڑ کر رکھ دیا.....

کئی برس پہلے۔ ایک شام ہم بہت سے احباب اور کیفی کے بہت سے چاہنے والے بیچ کینڈی ہسپتال کے وزیٹرز روم میں بیٹھے تھے۔ اس دن کے اخبارات میں ایک نیوز ایجنسی کی فراہم کردہ یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ "کیفی اعظمی کی حالت تشویشناک ہے"

سردار جعفری ابھی یہ بیان کر ہی رہے تھے کہ کس طرح کسی غلط فہمی کی وجہ سے ایک نیوز ایجنسی نے یہ غلط خبر دیدی تھی کہ شوکت آپا[1] نے ہم سب کو یہ کہہ کر مسرت آمیز حیرانی سے دوچار کر دیا کہ رات تو کیفی نے ایک نظم کہی ہے ..... یہ نظم تھی "دھماکہ" یہ نظم شمع زیدی نے نوٹ کر رکھی تھی۔

دو شاعر۔ ساحر اور سردار اس نظم کو لے کر بیٹھ گئے۔ شمع نے جو اوریجنل نظم نوٹ کی تھی وہ کچھ بے ترتیب سی تھی۔ یہ تخلیقی عمل کی بے ترتیبی فطری تھی۔ لیکن نظم کے فکری محور میں کوئی بے ترتیبی یا الجھن نہیں تھی۔ اس کی صرف ترتیب ٹھیک کی گئی۔ اور پھر ان دونوں کے مشورے اور میری خواہش پر یہ نظم اسی رات اشاعت کے لئے "انقلاب" میں دے دی گئی۔ یہ نظم شائع ہوئی تو پھر نیوز ایجنسی کی خبر کی تردید کرنے کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ کیفی نے تو اس دھماکہ کے ذریعہ یہ اعلان کر دیا کہ ....

میں زندہ ہوں یہ مشتہر کیجئے

کیفی اور ساحر مجھے ہمیشہ ایک دوسرے سے بہت قریب لگے ہیں۔ مگر ترقی پسند تحریک اور پارٹی کی سرگرمیوں کے سلسلے میں کیفی کا نام ہمیشہ سردار جعفری کے نام کے ساتھ جڑا رہتا تھا۔

کیفی تو شکل و صورت اور لہجے کی گھن گرج سے بھی انقلابی لگتے ہیں۔ ساحر اپنی دلنواز شخصیت نرم لہجے اور اپنی شاعری کی انقلابی رومان پسندی کی وجہ سے بظاہر انقلابی نہ لگتے ہوں۔ لیکن ادب سے فلم تک اپنی حق گوئی اور بیباکی کے باعث

---

[1] کیفی کی شریک حیات شوکت خانم

ان جیسے انقلابی حقیقتاً بہت کم ہوں گے۔ ان دونوں میں مجھے تنی گیوارا کا سا جلال اور نہرو کا سا جمال نظر آتا ہے۔

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ آج کے اور تیس سال پہلے کے کیفی میں کیا فرق ہے تو میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکوں گا کہ کوئی خاص فرق نہیں۔ تیس سال پہلے پارٹی یا انجمن کے کسی کام کے لئے وہ گرگام سے ناگپاڑہ تک پیدل جاتے تھے کہ بعض اوقات ایک آنہ بھی ان کی جیب میں نہ ہوتا تھا (اس وقت ٹرام چلتی تھی اور گرگام سے دادر تک کا کرایہ ایک آنہ ہوا کرتا تھا) اور ایک بار ساحر اور مجاز مرحوم بھی بھنڈی بازار سے ملابار ہل تک پیدل گئے۔ اور بنّے بھائی کے گھر پہنچنے کے بعد مجاز نے اپنی فطری خوش مذاقی سے مجبور ہو کر کہا تھا۔ آج دیکھ لیا کہ بے بس ہونا کس کو کہتے ہیں......اور آج بھی جب اردو کے نام پر گورنمنٹ گیسٹ ہاؤس یا کہیں اور کوئی جلسہ ہوتا ہے تو کیفی جوہو سے بمبئی تک سفر کی تکلیف برداشت کرنے کا کوئی شکوہ نہیں کرتے۔

آج کچھ لوگ جن میں ہمارے بعض مخلص احباب اور ساتھی بھی ہیں۔ کیفی کو جوہو کے ایک بنگلے میں بے فکری کی زندگی بسر کرنے کا طعنہ دینے لگے ہیں۔ (یا یہ کہ صاحب ساحر تو پرچھائیاں میں رہتے ہیں اور اب ترقی پسندی سے ان کو کیا واسطہ!) ان احباب سے صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ تیس سال پہلے ناگپاڑہ اور مدن پورہ کے محنت کش عوام کی بستیوں میں پارٹی کے سرخ پرچم کی آواز بلند کرنے اور اپنی نظموں اور تقریروں سے عام آدمی کے دلوں کو گرمانے والے کیفی کا رنگ بالکل نہیں بدلا ہے اور ان کا ایمان سلامت ہے۔

۴۹ء، ۵۰ء کی بات ہے بنّے بھائی[1] پاکستان جا چکے تھے لیکن ان کے گھر میں ترقی پسندوں کی ایک پوری جماعت آباد تھی۔ سردار جعفری، کیفی، اوتار عادل جیتب، تنویر وغیرہ یہیں سے ترقی پسندوں کا پرچہ تحریک بھی نکالا جاتا تھا۔ یہیں

---

[1] سجاد ظہیر مرحوم

ترقی پسند مصنفین کے اجلاس بھی ہوا کرتے تھے۔ ان سے ہٹ کر ایسے ساتھیوں کیلئے اسٹڈی سرکل بھی یہیں چلایا جاتا جو پارٹی کے باقاعدہ ممبر بھی تھے۔ ان ہی دنوں بمبئی میں مرارجی بھائی کی سرکار ترقی پسندوں پہ کچھ زیادہ ہی مہربان تھی۔ سردار جعفری تو جیل میں تھے۔ اور کیفی انڈر گراؤنڈ ہو گئے تھے۔

کیفی سے میری ملاقات اسی انڈر گراؤنڈ حالت میں ہوئی تھی۔ وہ اپنی بیوی شوکت سے ملنے آتے تھے۔ اور جب اسٹڈی سرکل میں مباحثہ ختم ہو گیا تو ہم لوگ چاء پینے دوسرے کمرے میں گئے۔ جہاں ہمیں بتایا گیا کہ یہ بڑی بڑی مونچھوں والے کامریڈ کیفی اعظمی ہیں۔

کچھ عرصہ بعد انجمن ترقی پسند مصنفین کے ہفتہ وار جلسے اوپیرا ہاؤس کے قریب دیودھر ہال میں کئے جانے لگے۔ ان میں چھوٹے بڑے تمام رائٹرز بڑی پابندی سے شریک ہوا کرتے تھے۔

کیفی سے ان جلسوں میں ملاقاتیں ہوتیں۔ لیکن بس رسمی اور سرسری سی۔ اسی زمانے میں بنے بھائی کا گھر کسٹوڈین نے ہتھیا لیا تھا۔ اور وہاں جتنے احباب رہ رہے تھے وہ سب تقریباً بے گھر ہو گئے تھے۔

کسٹوڈین سے نئی نسل کے لوگ تو قطعی واقف نہ ہوں گے۔ یہ وہ حضرت تھے (سرکاری محکمہ) جو ہندوستان سے ترک وطن کرنے والوں کی تمام جائیداد بحق سرکار ضبط کر لیا کرتے تھے۔ اور اب بھی جب کبھی کسٹوڈین کا ذکر آجاتا ہے تو بے ساختہ کیفی کی "گرم ہوا" کی وہ بوڑھی "دادی" یاد آجاتی ہیں جنہوں نے بڑے بے پناہ انداز میں کہا تھا۔ میں نے تو دو بیٹے ہی جنے تھے۔ یہ تیسرا (یعنی کسٹوڈین) حقدار کہاں سے پیدا ہو گیا۔ (بمبئی میں تو ایک کمرہ اور فلیٹ بھی بڑی جائیداد ہوا کرتا ہے) بنے بھائی کا فلیٹ تو کافی لمبا چوڑا تھا)

اس افرا تفری کے عالم میں ایک دن کیفی ہمارے گھر آگئے۔ اب نہ وہ الفاظ یاد ہیں نہ وہ وقت اور نہ وہ عالم۔ جس میں کیفی نے کہا تھا کہ وہ کچھ دنوں ہمارے

ایک کمرے میں رہنا چاہتے ہیں۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ میں نے اس وقت کیا کہا تھا۔ اور کون "شرائط" پر انھیں ایک کمرہ دے دیا تھا۔ (گویہ گھر میرے بڑے بھائی مسعود صدیقی کی ملکیت تھا۔ اور میں ان کا مہمان تھا) بس اتنا یاد ہے کہ ایک کمرہ ان کے لئے خالی کر دیا گیا تھا۔ اور ہم سب بغیر کنبوں والے لوگ دوسرے کمرے میں منتقل ہو گئے تھے۔

یہ گھر جو اب بھی ناگپاڑہ جنکشن پر سروی ہوٹل کے ٹاپ فلور پر موجود ہے۔ صرف اسی لئے تاریخی نہیں تھا کہ یہاں کیفی اپنی بیوی اور بچی (شبانہ) کے ساتھ رہنے آگئے تھے۔ بلکہ بعد میں یہ اور بہت لوگوں کی "پناہ گاہ" بھی ثابت ہوا تھا۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کی بھوپال کانفرنس کے بعد جب بہت سے ادیبوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو اختر سعید خاں روپوش ہو کر بمبئی آگئے تھے اور اس گھر میں سال بھر سے زیادہ ٹھہرے تھے۔

جاں نثار اختر کی شریک حیات صفیہ اختر جو پہلی اور آخری بار اپنے دو بچوں کے ساتھ آئی تھیں وہ بھی یہیں ٹھہری تھیں۔ اس وقت جادو اور سلمان بہت چھوٹے تھے۔ اور بڑے پیارے پیارے سے تھے اور روز صبح اٹھ کر باکسنگ کیا کرتے تھے۔

جادو کی ذہانت کا انہی دنوں بڑے دلچسپ انداز میں انکشاف ہوا تھا ایک رات ناگپاڑہ کے مستان تالاب پر "مشاعرہ امن" ہوا تھا۔ جس میں جاں نثار نے اپنی ایک طویل نظم پڑھی تھی وہ کچھ اس طرح تھی۔

میں نے آبشاروں سے پوچھا
کناروں سے پوچھا ستاروں سے پوچھا
امن یا جنگ تم ان میں کیا چاہتے ہو۔
آبشاروں سے آواز آئی.....
امن، ہم امن چاہتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

دوسرے دن صبح جادو ایک گدّے پر بیٹھے تھے۔ اور اپنی ایک نظم سنا رہے تھے۔

میں نے گدّے سے پوچھا

میں نے تکیے سے پوچھا...

امن یا جنگ... تم ان میں کیا چاہتے ہو!

کیفی اتنے قریب آ گئے تو ان کے اور اوصاف بھی نمایاں ہونے لگے۔ ان کی سادگی اور شرافت کی تو قسم کھائی جا سکتی تھی۔ لیکن ان میں سب سے بڑا وصف جو مجھے نظر آیا وہ ہے قوت برداشت اس کی تو جیسے کوئی حد، کوئی تھاہ ہی نہیں تھی۔ گرگام سے ناگپاڑہ تک پیدل سفر کی بات میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ اور ٹرام میں چڑھ جانے کے بعد یہ انکشاف ہونے پر کہ کرتے کی جیب میں کچھ نہیں چپ چاپ ٹرام سے اتر گئے۔ یا پھر کبھی گوشت خریدنے قریب کی دوکان پر گئے جو گلی میں تھی۔ اور خاموشی سے دیکھتے رہے کہ قصائی ان کے مال میں چھیچھڑے اور ہڈیاں بھر رہا ہے...... اور پھر بیوی سے یہ طعنہ بھی سن لیا کہ کیفی تمہیں تو گوشت خریدنا بھی نہیں آتا۔ (اب سوچتا ہوں کہ آخر کسی ترقی پسند شاعر کے لئے اس طرح کی لیاقت کا ہونا کوئی ضروری تو نہیں ہے)

کیفی دراصل کسی فرد سے جھگڑا کر ہی نہیں سکتے تھے۔ اب بھی نہیں کر سکتے۔ میں نے گھر میں بھی کبھی انہیں چیختے چلاتے نہیں سنا۔ گھر میں تو ہمیشہ موتی آپا کی آواز ہی گونجا کرتی تھی۔ ہاں جلسوں اور مشاعروں میں کیفی خوب گرجتے تھے اور پورے انقلابی نظر آتے تھے۔

موتی آپا پرتھوی تھیٹر میں کام کرتی تھیں۔ بے پناہ آرٹسٹ ہیں۔ وہ (پھر "گرم ہوا" کا حوالہ دوں گا اس میں بلراج ساہنی جیسے بڑے آرٹسٹ سے وہ برابری کی سطح پر رہی ہیں) وہ جلسوں میں بھی شریک ہوئیں اور مجھے یاد ہے ایک بار جب دیو دھر ہال میں ترقی پسند مصنفین کے اجلاس کے دوران اپٹا کا ڈرامہ

ہو رہا تھا۔ تو پولس ہال میں گھس آئی تھی۔ اور ڈرامہ بند کرنے پر اصرار کرنے لگی تھی۔ اس موقع پر موتی آپا، سلطانہ اور دوسری خواتین اسٹیج پر چڑھ گئی تھیں۔ اور پولس کی اس بے جا مداخلت اور فسطائی طریق کار پر ایسی زبردست لعنت ملامت کی تھی کہ پولس والوں کو پسپائی اختیار کرنی پڑی تھی۔ تھیٹر کے ساتھ وہ کبھی کبھی باہر بھی جایا کرتیں۔ منّی (شبانہ) کی دیکھ بھال ان دنوں حیدر آباد سے "درآمد شدہ" ایک آیا کیا کرتی تھی اور منّی کو باہر گھمانے پھرانے کی ذمہ داری میری تھی۔ مجھے بچّوں اور خاص طور پر چھوٹی بچیوں سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ رہا ہے۔ اس لئے منّی بیشتر وقت میری گود میں لدی رہتی تھی.......

بڑے صبر آزما تھے وہ دن۔ جب پیسہ بہت کم اور بڑی مشکل سے آتا تھا اور اچھا کھانا بھی کبھی کبھار ہی نصیب ہوتا تھا۔ لیکن کیفی نے کبھی ان حالات کی شکایت نہیں کی اور وہ کبھی مایوس اور دل گرفتہ نہیں دکھائی دیئے۔

وہ جانتے تھے کہ ہندوستان کے عام آدمی کی طرح وہ بھی سرمایہ داری کے اس نظام کی چکّی میں پس رہے ہیں۔ اور ہر طرح کی مادّی سہولتوں کی محرومی کے ساتھ انھیں اپنے آدرشوں کیلئے زندہ رہنا اور جدوجہد کو جاری رکھنا ہے۔ ترقی پسندوں کے نقّاد اور مخالفین تو ایسے حالات میں شاید ٹوٹ کر بکھر جاتے۔ اور ہر مصلحت پسندی کو گلے لگا لیتے کہ جینے کا یہ سلیقہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ کیفی کی ایک ابتدائی غزل کا مصرع ہے۔

میری طرح ہنسو تو کلیجہ نکل پڑے

یہ چیلنج بھی ہے۔ اعلان بھی ہے۔ اور ایسی حقیقت کا روپ بھی اختیار کر گیا ہے۔ جس سے ابتدا میں شاید کیفی بھی واقف نہ ہوں گے.......

کیفی کی وجہ سے بہت سے ترقی پسند رائٹرز اور پارٹی کے ساتھی ہمارے گھر آنے لگے تھے۔ اور جب پاکستان میں بنّے بھائی، فیض اور کچھ اور لوگوں کو نام نہاد راولپنڈی سازش کیس کے تحت گرفتار کیا گیا تو بمبئی میں اس کے خلاف احتجاج کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

اس احتجاجی جلسے کی تیاریاں ہمارے ہی گھر میں کی گئیں۔ اور عام جلسے کیلئے بنّے بھائی کی جو بڑی تصویر بنائی گئی تھی وہ کئی دنوں تک ہمارے کمرے کی زینت بنی رہی تھی۔ مستان تالاب پر بہت بڑا جلسہ ہوا تھا۔ اس جلسے کے بعد مجروح سلطان پوری کو حراست میں لے لیا گیا تھا۔ مجروح کے خلاف وارنٹ اس سے پہلے کے ایک جلسے میں گڑبڑ کرنے کے "جرم" میں جاری کیا جا چکا تھا۔ دراصل یہ ایک روایتی مشاعرہ تھا۔ جہاں مجروح اور نیاز حیدر کے پہنچنے کے بعد مشاعرے کے روایتی صدر "فرار" ہو گئے تھے۔ اور پھر اسٹیج پر پہنچ کر ان دونوں شاعروں نے جی کھول کر غزلیں اور نظمیں سنائی تھیں۔ بعد میں منتظمین کی شکایت پر مجروح کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کئے گئے تھے۔ لیکن وہ ہاتھ نہیں لگے تھے۔ پھر جب وہ احتجاجی جلسہ میں شریک ہوئے تو پولس نے اپنا فرض پورا کیا تھا۔

کیفی اب ہمارے گھر کے ایک فرد ہو گئے تھے۔ اسی زمانے میں چند برس میں مدھیہ پردیش کے ایک چھوٹے سے شہر برہان پور میں پارٹی کا کام کرتا رہا۔ وہیں میرے والدین بھی تھے۔ اور گھر بھی۔ جو چند برس وہاں گذارے وہ بہت اچھے تو نہیں تھے۔ لیکن کیفی کے دم سے وہاں بڑی رونق ہو جایا کرتی تھی۔ ہوتا یہ تھا کہ ہم لوگ کسی نہ کسی بہانے کوئی مشاعرہ ادبی تقریب اور الیکشن کا موسم ہوتا تو سیاسی جلسے منعقد کرتے اور ان میں کیفی اعظمی لازمی طور پر مہمان خصوصی ہوتے۔ کیفی بڑی پابندی سے ان میں شرکت کرتے۔ اور ان کے ساتھ پوربی زبان کے شاعر علاؤالدین صابر مرحوم ہوا کرتے تھے۔ شاذونادر ہی ایسا ہوا ہو کہ کیفی آئے ہوں اور صابر نہ آئے ہوں یا صابر آئے ہوں اور کیفی نہ آئے ہوں۔

کیفی اکثر میرے گھر ٹھہرتے۔ رات کو کھانے میں عموماً کھچڑی ہوتی۔ جو برہان پور کی عام اور مرغوب غذا ہے وہ بڑے شوق سے کھچڑی کھاتے اور دال چاول کے اس سیدھے سادے مکسچر کو تہاری کہا کرتے تھے۔

میرے والد دیوبند کے فارغ التحصیل اور اجمل خاں کے شاگرد تھے۔ اور تکمیل طب و جراحت کی سند انھیں گولڈ میڈل کے ساتھ دی گئی تھی۔ انہوں نے

تحریک خلافت میں بھی حصہ لیا تھا۔ لیکن اس کے بعد سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ گر اس زمانہ میں بھی یہ جنس گندگی سے آلودہ تھی۔ وہ عالم دین اور احکام دین کے سخت پابند تھے۔ اور اپنے سارے بچوں کی پرورش پرداخت بھی انہی پابندیوں کے درمیان کی تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے ہم دونوں بھائیوں کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی پر کبھی برہمی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں صرف ایک ترقی پسند سے ملے تھے۔ کیفی اعظمی سے۔ اور اس ترقی پسند کی سادگی اور شستگی سے یقیناً متاثر ہوئے تھے۔ کیفی نے ان سے کئی بار دینی مشورہ بھی لیا تھا۔ اور شاید کچھ دوائیں بھی لی تھیں کیفی کو وہ بھی اپنی خاندان کا ایک فرد سمجھنے لگے تھے۔ آج جب میں وہ دن یاد کرتا ہوں تو ایک بہت پرانی فلم کے دھندلے پرنٹ کی طرح بہت سی تصویریں ابھرتی ہیں۔ پروگرام بس ایک دن کا ہوتا اور عموماً دوسرے دن رات کی ٹرین سے کیفی واپس چلے جاتے۔ اور یہ واپسی اکثر بڑی تکلیف دہ ہوتی۔ ٹرین میں ٹھیک سے بیٹھنے تک کی جگہ نہیں ہوتی۔ لیکن کیفی اور صابر جیسے تیسے کر کے بندوبست کر لیتے۔ اور اس تکلیف دہ سفر کو تحریک کا ایک ناگزیر حصہ سمجھ کر برداشت کر لیتے۔ کیونکہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے تحریک کے کسی پروگرام کے سلسلے میں انھیں بلایا ہو اور وہ نہ آئے ہوں۔ میرا گھر کیفی کو شاید اس لئے بھی پسند ہو کہ وہ ان کے گاؤں کے مکان کی طرح ہو۔ اور میرے گھر کھانوں میں شاید انھیں اپنی ماں اور بہنوں کے ہاتھ کے کھانوں کا مزہ آتا ہو۔ اور یہ ایسے مزے اور رابطے ہوتے ہیں جنھیں آدمی زندگی پھر نہیں بھول سکتا۔

۱۹۵۶ء میں جب میں پھر بمبئی آگیا تو ناگپاڑہ والا مکان ہاتھ سے جا چکا تھا۔ اور کھیت واڑی میں ریڈ فلیگ ہال کے ایک کمرے میں کچھ عرصہ قیام کے بعد کیفی جوہو منتقل ہو گئے تھے۔

ریڈ فلیگ ہال میں کیفی کے قیام کے دوران میں ایک بار اپنی ماں کو بمبئی لایا تھا۔ موتی اور سلطانہ آپا (سردار جعفری بھی اس زمانہ میں وہیں رہتے تھے) ان کا بجد

خیال رکھتی تھیں ۔ بمبئی میں وہ قیام مجھے اس لئے بھی ہمیشہ یاد رہے گا کہ اس دوران میں
نے چند ساتھیوں کے ساتھ ناز میں ستیہ جیت رے کی پہلی فلم "پاتھیر پنچالی" دیکھی تھی
بمبئی میں یہ پہلی بار صرف اتوار کے میٹنی شو میں دکھائی جا رہی تھی ۔

اس زمانے میں کیفی فلموں میں لکھنے لگے تھے ۔ ریڈ فلیگ ہال کے قیام کے دوران
ان کے فلمی تعلق میں سب سے اہم مقام ایک گجراتی فلم ساز نانو بھائی وکیل کو حاصل تھا ۔ یہ
محض اتفاق ہے کہ جب کبھی میں ان سے ملنے ریڈ فلیگ ہال جاتا ۔ نانو بھائی کی گاڑی نیچے
سڑک کے کنارے کھڑی ہوتی ۔ وہ اور ان کے رائٹر کیفی ہوتے ۔ اور تھوڑی دیر وہ
اپنے رائٹر سے کچھ ڈسکشن کرتے اور چلے جاتے ۔ اس کے بعد ہم اوپر جاتے اور
ہال کے ایک کنارے کرسیاں بچھا کر بیٹھ جاتے ۔ یہ کیفی کا ڈرائنگ روم تھا ۔ پھر
وہ نانو بھائی کی فلموں کا اور ان کے خالص کاروباری انداز کا ذکر کرتے اور اکثر کہا کرتے
ان (نانو بھائی) کے معاملہ میں ہر بات ٹھیک ہے ۔ اب تو انہوں نے ایک اور گاڑی
لے لی ہے ۔ لیکن بس ان کا لباس سمجھ میں نہیں آتا ۔ آخر دھوتی اور بش شرٹ کا کیا
میل ہے ؟ وہیں ہم لوگ چائے پیتے اور چار مینار پھونکتے ۔ اور وہیں کیفی کے دوسرے
احباب اور ملاقاتی آجاتے ۔ کیفی ان دنوں بڑے شب بیدار تھے (ایک بار ان کے
بلاوے پر میں شب کو ساڑھے نو بجے ریڈ فلیگ ہال پہنچا تھا ۔ اور رات بارہ بجے
تک انتظار کر کے چلا گیا تھا) اس لئے وہ صبح کے کسی پروگرام میں شریک نہیں ہوتے تھے ۔

ایک دفعہ جب کسی صاحب نے علی الصبح نو بجے انھیں کسی پروگرام میں مدعو کرنا چاہا
تو وہ ٹال گئے ۔ ان صاحب کے چلے جانے کے بعد انھوں نے ہنس کر کہا تھا ۔ ...... اگر صبح
"انقلاب بھی آجائے تو وہ اٹھ کر اس کا استقبال نہیں کریں گے ۔

چار مینار کیفی کا محبوب سگریٹ رہا ہے ۔ اور اس زمانہ میں بھی جب وہ ایس
ڈی برمن کے ساتھ کام کر رہے تھے ۔ انہوں نے چار مینار سے "بے وفائی" نہیں کی ۔
برمن دا کے وہ کئی دلچسپ قصے سنایا کرتے تھے ۔ .... ایک دن برمن دا
ان سے اس قدر خوش ہوئے (ظاہر ہے کہ کوئی گیت ان کو بے حد پسند آگیا ہوگا

کہ انھوں نے کیفی کے لئے چار مینار کا ایک پورا پیکٹ منگوا کر انھیں پیش کیا تھا۔

"کاغذ کے پھول" کیلئے کیفی کا ایک گانا ریکارڈ ہوا تھا۔

وقت نے کیا، کیا حسیں ستم
ہم رہے نہ ہم تم رہے نہ تم

مکتبہ جامعہ کے فٹ پاتھ پر میں نے یہ پورا گانا لکھا اور ہفتہ وار فنکار میں اسے شائع کیا تھا۔ اس فلمی ہفت روزہ میں ہر ہفتے زیر تکمیل فلموں کے لئے ریکارڈ کئے جانے والے نغموں میں سے کوئی ایسا گیت شائع کیا جاتا تھا جو پڑھا بھی جا سکتا ہو۔

اس دن کیفی نے برمن دا کا ایک اور قصہ سنایا تھا۔ کہتے ہیں کسی فلم ساز کے ہاں جاتے ہوئے۔ برمن دا کی گاڑی کو اس فلم ساز کی گاڑی نے معمولی سی ٹکر ماری۔ اس پر برمن دا بے حد خفا ہوئے۔ اور انھوں نے اس کی فلم میں میوزک دینے سے انکار کر دیا۔ اس بیچارے نے نہ صرف خوشامد کی بلکہ یہ پیشکش بھی کی کہ دادا کوئی بات نہیں۔ میں آپ کے لئے نئی کار لے آؤنگا۔

مرحوم نے ایک بار اسے دیکھا اور پھر کہا۔ آج ہماری گاڑی کو دھکا دے کر بولتا ہے نئی گاڑی لے آؤں گا ــــ کل ہم کو دھکا دے کر بولے گا نیا برمن لے آؤں گا۔

اس زمانے میں کچھ نقادوں نے جن میں ترقی پسندوں کے ہمدرد اور دوست بھی شامل تھے۔ کیفی کو اس لئے تنقید کا نشانہ بنایا کہ وہ نہ صرف فلموں کے لئے لکھ رہے تھے بلکہ گھٹیا فلموں کے لئے لکھ رہے تھے۔ ان میں ایک صاحب کچھ زیادہ ہی ترقی پسند تھے انھوں نے کیفی کی ایک فلم پر تبصرے کا اعلان اپنے اخبار کے صفحہ اول پر کیا اور اندر کے صفحے میں تبصرے کے طور پر صرف اتنا لکھا۔ آہ! کیفی اعظمی

یہ نقاد بڑے معصوم تھے۔ جو یہ چاہتے تھے کہ کیفی ایسی فلموں میں انقلابی نعرے بھر دیں۔ یا پھر ایسے لوگ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی ترقی پسند رائٹر فلموں میں لکھ کر دو پیسے کما سکے۔

ابتدا میں فلموں میں ترقی پسندوں کی شمولیت پر مخالفین تو چونکے ہی تھے۔ لیکن ان کے حامیوں کا ایک بڑا طبقہ بھی اسے ناپسند کرتا تھا۔ کیفی کو تو اس نے بھی قصوروار ٹھہرانے کی

کوشش کی گئی تھی کہ وہ پارٹی کے انتہائی سرگرم رکن تھے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ فلموں میں شمولیت کے نتیجے میں ترقی پسند تحریک سے ان کا رشتہ منقطع ہو جائے گا۔

فلموں میں لکھنا "خالص تخلیقی عمل" تو نہیں ہے۔ لیکن یہ ایسا کام بھی نہیں ہے جسے چھونے سے ترقی پسندی رخصت ہو جاتی ہو۔ جس صنعت میں تک بندی کرنے والے بے شمار لوگ پنپ رہے ہیں۔ اس میں ترقی پسند رائٹرز مکالمے یا اسکرپٹ یا گیت لکھ کر (جو بیشتر صاف ستھرے اور بہت سے ہیئت اور مواد کے لحاظ سے عمدہ) کھانے پینے کا سامان فراہم کر لیں تو اس میں قابل اعتراض بات کیا ہو سکتی ہے۔ ترقی پسند رائٹرز نے فلموں کے لئے فن بیچا تو ہے۔" لیکن اسے نہ بازاری بنایا ہے اور نہ اپنے نظریات کا سودا کیا ہے۔ اور پھر فلموں میں جو مقام بھی وہ حاصل کر سکے ہیں اپنے ہی بل بوتے پر۔ کسی کے کرم و عنایت اور مہربانی سے نہیں۔ پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ کیفی نے خود کو صرف فلموں کے لئے وقف کر دیا ہو۔ ایسے مواقع آئے تھے جب ان کے لکھے ہوئے گیت بہت مقبول ہوئے تھے اور وہ اس کا تجارتی فائدہ اٹھا سکتے تھے یعنی جس طرح ایک خالص فلم رائٹر ایسے موقعوں پر چاروں طرف ہاتھ مار کر زیادہ سے زیادہ فلمیں حاصل کرنے کا چکر چلاتا ہے۔ وہ بھی کچھ ایسا "چکر" چلا سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ایسی کوشش نہیں کی۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب ان کی زندگی کے سب سے بڑے جسمانی مرض نے ان پر حملہ کیا تو ان کی مالی حالت بہت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ اور اگر کم و بیش اسی زمانے میں ان کی بیٹی شبانہ ایک عمدہ اداکارہ کی حیثیت سے نہ ابھر پاتی تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کیفی کو اپنے نصف جسم کے ساتھ صرف زندہ رہنے کے لئے کتنی ہی جدوجہد کرنی پڑتی۔

ساحر نے ایک بار کہا تھا "موجودہ سیاسی اور انتظامی نظام کسی کو روزگار کی ضمانت نہیں دیتا۔ بے روزگاری کا الاؤنس یا بڑھاپے کی پنشن اور علاج معالجے کی سہولت نہیں مہیا کرتا۔ ..... اگر ایسا سیاسی اور سماجی نظام قائم ہو جاتا تو کیفی کو کمرشیل فلموں میں لکھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ وہ شاعری کرتے انسانوں کی، نیچر کی، عشق و محبت کی اور مختلف کیفیات کی۔ اور وہ سوشلسٹ سماج کی تعمیر میں ہاتھ بٹاتے۔ کسان اور مزدور کے شانہ بشانہ ......

جن دنوں میں برہان پور میں کچھ عرصہ کے لئے پارٹی کے کام میں مصروف تھا۔ انہی دنوں مسعود بھائی بمبئی میں تھے۔ اور کیفی سے ان کی خوب گاڑھی چھننے لگی تھی۔ وہ دونوں اکثر

جلسوں اور مشاعروں میں شریک ہوتے۔ ایک دفعہ دربھنگہ کے ایک چھوٹے سے شہر ملکا پورہ کے ایک مشاعرے میں وہ دونوں شریک ہوئے اور وہاں سے میں انھیں برہان پور گھسیٹ لے گیا۔

جس بس میں ہم سفر کر رہے تھے۔ اس میں چند نوجوان اور بھی تھے۔ راستہ آسانی سے کاٹنے کے لئے کیفی نے ہم سب کو قوالوں کی ٹولی میں تبدیل کر دیا۔ ہم سب نے جس طرح بھی بن پڑا قوالوں کے اسٹائل میں گانا شروع کیا۔ کوئی غالب کا شعر پڑھتا کوئی میر کا۔ جسے جو شعر جس طرح یاد تھا بس وہ لمبی تان کے ساتھ لے گانا شروع کرتا۔ باقاعدہ کان پر ہاتھ رکھ کر اور پھر سب مل کر مصرع اٹھاتے۔۔۔۔ اتفاق سے ایک شعر گاتے ہوئے اس کے کسی لفظ کا مجھ سے غلط تلفظ ادا ہو گیا تو کیفی نے بے ساختہ واہ کی صدا بلند کی اور یہ کہا۔

قلش کے تو تلفظ کی ادائیگی بھی قوالوں جیسی ہے! اس بس میں سفر کرنے والوں نے قوالی فری کاسنی۔ اور یقیناً وہ سب محظوظ ہوئے ہوں گے۔ اور ہم لوگوں کا کئی گھنٹوں کا سفر چند قوالیوں کے ذریعہ طے ہو گیا۔

۱۹۵۲ ۱۹۵۲ء میں کلکتے میں کل ہند امن کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ امن پسندوں کی یہ سب سے بڑی کانفرنس تھی اور بمبئی سے ہم ڈبہ بھر لوگ (شاعر، ادیب، مغنی وغیرہ) اس میں شریک ہوئے تھے۔ تھرڈ کلاس کے جس ڈبے میں ہم لوگ سفر کر رہے تھے اس میں ایک نہایت عمدہ مغنی بھی ساتھ تھے۔ وہ مہاراشٹر میں رہتے تھے اور اب مجھے ان کا نام یاد نہیں رہا۔ کیفی ان سے بار بار ایک فلمی گیت گانے کی فرمائش کرتے اور وہ ذرا سے رسمی تکلف کے بعد بڑی باٹ دار اور صاف آواز میں وہ گیت سناتے اور جتنی دیر وہ گیت سناتے پورے کمپارٹمنٹ میں سناٹا چھایا رہتا۔۔۔ وہ گیت تھا

امر شیخ

"او پرگگن وشال"

کیفی ہی کو نہیں۔ مجھے بھی یہ گیت بہت پسند تھا۔ لیکن کیوں پسند تھا؟ اس کی وجہ بتلانا ذرا مشکل ہے۔ اور پھر ہر پسند کی کوئی وجہ ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔

کیفی کم سے کم الفاظ میں لیکن بھرپور انداز میں اپنا مدعا بیان کر سکنے کی

قدرت رکھتے ہیں۔ ان کے اشعار تو اس کی گواہی دیتے ہیں۔ لیکن ایک واقعہ اس کی ایسی مثال ہے جسے ہم سب لوگ کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

برہان پور میں مسعود بھائی کی شادی طے ہوئی تو ظاہر ہے کیفی خاص مدعوئین میں سے تھے بلکہ خاص الخاص اور ہم سب ان کا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہے تھے۔ نکاح والے دن بھی جب وہ نہیں آئے تو ہم سب کو بڑی مایوسی ہوئی۔

لیکن اس دن کی ڈاک سے ان کا ایک خط ضرور آیا۔ کسی بچے کی کاپی سے نکالے ہوئے دو، لائن والے ورقوں کے تیسرے صفحے پر بس ایک شعر تحریر تھا۔

مفلسی سب بہار کھوتی ہے

مرد کا اعتبار کھوتی ہے

یہ شعر ہماری ماں کو سنایا گیا تو وہ تڑپ کر رہ گئیں۔ رہ گئے ہم...... تو ہم تو بہت کچھ پینے کے عادی سے ہو گئے تھے!

جب تک کیفی پارٹی کی ناگپاڑہ کمیٹی کے ممبر رہے۔ وہ جوہو اور فلمی کاموں کو چھوڑ کر برابر میٹنگوں میں شریک ہوئے۔ کانفرنسوں کا اہتمام اور عام جلسوں کا انتظام کرتے اور ادبی اور سیاسی جلسوں سے خطاب کرتے۔

ہماری ملاقاتیں اکثر پارٹی کی میٹنگوں میں ہوا کرتی تھیں۔ ان طول طویل میٹنگوں میں محنت کشوں اور عام آدمیوں کے مسائل پر پارٹی کے کارکنوں کے ساتھ خوب بحث ہوتی۔ اور ایسے جلسوں کے اختتام پر جب چار مینار پھونکتے پھونکتے منھ کا مزہ کڑوا کسیلا ہو جاتا۔ اور رات اپنا آدھے سے زیادہ سفر طے کر لیتی۔ ہم چند ساتھی باہر نکل کر کسی ایسے ہوٹل کا رخ کرتے جہاں صرف باکڑے[1] بچھے ہوتے۔ ہم لوگ وہاں جم کر بیٹھ جاتے اور منھ کا مزا بدلا کرتے۔ اس وقت کیفی پورے موڈ میں ہوتے اور ادبی اور نیم ادبی واقعات اور لطائف سناتے۔ اور ہم سب جی کھول کر ہنسا کرتے تھے۔ یہ ایسی محفلیں ہوتیں جنھیں صرف یاد کیا جا سکتا ہے۔ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے موقعوں پر وہ اکثر مستان تالاب کے قریب سڑک کے کنارے ایک سیاہ رو موٹی بھدی سی عورت کے خوانچے پر جانے اور وہاں مونگ کی روٹی کھانے

---

[1] بغیر ٹیکے والی چو

پر اصرار کیا کرتے تھے۔ اس خاتون کا نام انھوں نے "سنگِ اسود" رکھ چھوڑا تھا۔

میں نے کیفی کو کبھی کسی کی دلآزاری اور تضحیک کرکے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ البتہ خود پر طنز کرنے اور ہنسنے کا حوصلہ وہ خوب رکھتے ہیں۔

ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی کی بات ہے۔ فیض ہندوستان آئے ہوئے تھے۔ ایک رات وہ کیفی کے ہاں مدعو تھے۔ جب سارے مہمان آچکے اور اپنی اپنی نشستوں پر جم گئے۔ تو کیفی اٹھ کر اندر گئے۔ اور تھوڑی دیر بعد ایک ہی ہاتھ میں چھڑی اور اسکاچ کی بوتل کو دبوچے ہوئے باہر کے کمرے میں آئے۔ ظاہر ہے سب کی نگاہیں ان کی طرف تھیں...... اپنی نشست پر بیٹھتے بیٹھتے انھوں نے کہا...... آپ سب لوگ یہی دعا مانگ رہے ہوں گے کہ یہ بھلے ہی گر پڑے...... مگر بوتل نہ گرے...... اردو کے ایک سرکاری ادارے کی طرف سے دو جلسے آگے پیچھے منعقد کئے گئے۔ ان میں سے دوسرے جلسے میں کیفی اور دوسرے کئی اور لوگ بھی مدعو تھے۔ اور جب یہ لوگ جلسہ گاہ پہنچے تو معلوم ہوا ابھی پہلا جلسہ شروع ہوا ہے۔ ان سب کو ایک ملحقہ کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ تاکہ پہلے جلسے والے "اردو کی خدمت" کر چکیں تو پھر انھیں موقع دیا جائے۔ کیفی بیٹھے کسی رسالے کی ورق گردانی کر رہے تھے کہ ایک ملاقاتی نے ان سے پوچھ لیا...... آپ اس جلسے میں کیوں نہیں گئے...... تو کیفی نے بڑی معصومیت سے کہا...... وہ لوگ سمجھتے ہیں اُس اردو سے میرا کوئی تعلق (جس پر وہاں بحث ہو رہی ہے)

ان دنوں کیفی پھر بہت "ایکٹیو" ہو گئے ہیں۔ ان کے من میں عمل کا جذبہ انھیں اکساتا رہتا ہے۔ انہی کی تحریک پر انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے پھر ہونے لگے ہیں۔ پھر انہی کی تحریک پر ایک پندرہ روزہ ادبی اخبار جاری کرنے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ اور انھوں نے کئی پرانے ساتھیوں کو انجمن اور مجوزہ اخبار کی سرگرمیوں میں گھسیٹ لیا ہے ایک دن تو وہ کہنے لگے کہ چند ساتھیوں کی مدد سے وہ جوہو میں پارٹی کا ایک چھوٹا سا یونٹ قائم کرنا چاہتے ہیں۔

حرکت و عمل ہی کیفی کا مقصدِ حیات رہا ہے، ظاہر ہے وہ ہاتھ پر ہاتھ

دھرے نہیں بیٹھے رہ سکتے۔

ان دنوں وہ اپنے گاؤں جانے کا بھی کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں گنواتے۔ اپنے کھیتوں اور فصلوں کو دیکھنے کے لئے اور گاؤں کی مٹی کی خوشبو کو پھر سے دل میں بسا لینے کے لئے تو وہ اکثر بے تاب ہو ہی جاتے ہیں۔ لیکن ابھی جب وہاں سوکھا پڑا تھا تالاب اور کنویں خشک ہو گئے تھے اور دھرتی کا سینہ جیسے شق ہو گیا تھا۔ وہ لکھنؤ کا سکھ چین چھوڑ کر اپنی سوکھی دھرتی کا حال پوچھنے وہاں گئے تھے۔ دھرتی سے ان کا یہ رشتہ دوسرے سارے رشتوں ناتوں سے بہت گہرا اور دائمی ہے۔ لیکن یہ رشتہ زمین کے ایک ٹکڑے سے نہیں ہے۔ صرف اپنی جنم بھومی سے نہیں ہے۔ اس وشال دھرتی اور اس کے ان گنت جانے اور انجانے لوگوں سے ہے۔ جنہوں نے آغاز آبادی سے اب تک اس دنیا کو خوبصورت اور انسانوں کے رہنے کے قابل بنانے کی جد وجہد کی ہے۔ اور پھر اسی دھرتی سے تو پہلی کونپل پھوٹی تھی۔ بارش کا پہلا قطرہ اس کے سینے پر گرا تھا۔ پہلے شعر کی تخلیق اسی کے منظروں میں ڈوب کر کی گئی تھی۔ اور موسیقی کا پہلا سُر میں کسی جھرنے یا ندی کی سرسراہٹ سے نکلا ہوگا.....!

کیفی کے شانت اور گمبھیر چہرے سے ان کی دلی کیفیت کا پتہ لگانا بہت دشوار ہے.... اپنے کھردرے سے تن کی تہ میں ایک دردمند نازک اور حساس سا دل ہے۔ اُن کا جو اپنے پرایوں کی مصیبتوں اور افتاد پر تڑپ اٹھتا ہے۔ اور یہ ان کے کردار کی خصوصیت ہے کہ وہ دوستوں کے دوست تو ہیں۔ مخالفین اور دشمنوں کے بھی بدخواہ نہیں ہیں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ پہلے ہسپتال اور پھر ماسکو سے علاج کے بعد گھر آ گئے تھے۔ دلی کے ایک رائٹر کسی ایوارڈ کے سلسلے میں کیفی کو شکست دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس کا آسان طریقہ تلاش کر لیا۔ "آوارہ سجدے" میں کیفی کی ایک نظم کے سلسلے میں بس ایک شوشہ چھوڑ دیا۔ اور پھر بمبئی میں چند لوگوں نے کیفی کے خلاف باقاعدہ مہم شروع کر دی۔ جب یہ سلسلہ کافی بڑھ گیا تو یہ افواہ اڑا دی گئی کہ انہوں نے وہ متنازعہ نظم مجموعہ کلام سے خارج کر دی ہے۔

اس ساری مہم کے دوران وہ ذہنی طور پر کچھ پریشان رہے ہوں گے۔

لیکن جو لوگ ان سے ہتھیار ڈلوا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ کیفی سے واقف نہیں تھے۔

انہی دنوں میں نے کیفی کو ٹیلی فون کیا اور پوچھا کہ انہوں نے "سرنڈر" کر دیا ہے تو ان کا جواب تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پھر ایک دن میں ساحر صاحب کے ساتھ ان کے گھر گیا تاکہ اس سارے ڈرامے کا پس منظر معلوم کیا جا سکے تو کیفی نے سارا قصہ سنایا۔ اور اس کے اہم کرداروں کا بھی ذکر کیا۔ لیکن اپنی ساری گفتگو میں انہوں نے ذرا سی بھی بدکلامی نہیں کی۔ کیفی نے تو شاید کبھی کسی کو وہ گالیاں بھی نہیں دی ہیں۔ جو شرفا اکثر دیا اور کھایا کرتے ہیں ۔!

۲۵ برس تو تقریباً ہو گئے ہوں گے۔ اُس وقت ایک خاصے سنجیدہ طبیعت کے شاعر نے جو اپنی قومی نظموں کے لئے بڑی شہرت رکھتے تھے۔ اور ترقی پسندوں کے مخالف کیمپ میں پہنچ چکے تھے۔ شاید جل کر یا ہم لوگوں کو چڑانے کے لئے کہا تھا کہ صاحب! آپ کے کیفی کے پڑھنے کا انداز تو بالکل ویسا ہی ہے جیسے سڑک چھاپ دوا فروش۔ مجمع لگانے کے لئے بار بار یہ شعر پڑھتا ہے ۔

آنکھ والا تیرے جوبن کا تماشہ دیکھے

(انہوں نے دوا فروش کے انداز میں پڑھ کر سنایا بھی تھا۔ یہ شعر جس کا مجھے ایک ہی مصرعہ یاد ہے) لیکن اس وقت بھی اور آج بھی، اور ہر وقت ہر آنکھ والے نے دیکھا کہ کیفی کے تحت اللفظ پڑھنے کے انداز کے آگے "بڑے بڑے ترنم ریز" شعراء پھیکے پڑ جاتے ہیں۔ دراصل ان کے پڑھنے کا انداز ان کی جاندار شاعری کو دو آتشہ بنا دیتا ہے ۔

لیکن کیفی کی شاعری کے سلسلے میں میں کچھ نہیں کہوں گا۔ اس پر تنقید و تبصرہ کرنے والے بہت ہیں۔ نقادانِ فن و سخن، نئے بھی اور پرانے بھی جو فنی پیمانوں سے اس کی ناپ تول اور تشریح کریں گے۔ میں صرف یہ

کہوں گا۔ بڑا بانکپن ہے کیفی کے شعروں میں۔ میں اس کی تشریح نہیں کر سکتا۔ چونکہ اچھی شاعری تشریح کی محتاج نہیں ہوتی۔ اور تشریح کرنے والے حضرات تو غالب کے اشعار کی بھی ریڑھ مار دیتے ہیں۔

یہ شعر :۔

سر پہ ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

مجروح نے کہا ہے
لیکن یہ شعر مکمل طور پر کیفی پر صادق آتا ہے ••

سہیل عظیم آبادی

کیفی اعظمی

ترقی پسند ادبی تحریک بڑی تیزی کے ساتھ پھیلی اور مقبول ہوئی ملک کے سارے باشعور ادیبوں اور شاعروں نے اس تحریک میں شرکت کی، جیسے وہ اس صحت مند تحریک کے انتظار میں تھے۔ اس تحریک نے سارے باشعور شاعروں اور ادیبوں کو ذہنی اور جذباتی طور پر ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا اس ذہنی اور جذباتی قربت کے لئے ملاقات ضروری تھی اور نہ جان پہچان۔ ایک زبان کا ترقی پسند شاعر اور ادیب دوسری زبان کے ترقی پسند شاعر اور ادیب کو اپنا رفیق سفر اور دوست سمجھنے لگا۔ سب کے سامنے ایک عظیم مقصد تھا۔ یہ لوگ ادب کو وقت کاٹنے کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ سمجھتے تھے کہ ادب صرف تعصبات و توہمات کے خلاف ہی نہیں بلکہ بہت سی سماجی برائیوں بلکہ سامراج اور ہر قسم کے استحصال کے خلاف جنگ کا کامیاب آلہ بھی ہے۔ اس نظرئے نے ملک کے سارے ترقی پسندوں کو ایک مضبوط رشتۂ محبت سے باندھ رکھا تھا۔ سب ایک دوسرے کو اپنا سمجھتے تھے اور ایک دوسرے کی تخلیق کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ آج بہت سے مخالف جھٹکوں کے باوجود نہ صرف یہ تحریک زندہ ہے بلکہ ترقی پسندوں میں یہ جذبہ بھی باقی ہے

کیفی اعظمی جب ادبی افق پر نمودار ہوئے تو ترقی پسند تحریک ملک کی ادبی فضا پر چھا چکی تھی۔ کیفی بھی اس تحریک میں شریک ہوئے اور اسی کے ہو کر رہ گئے اور اپنی اعلا شاعری کی وجہ سے بہت جلد ہی اپنی مستقل جگہ بنالی۔ ان کا شمار ملک کے اچھے شاعروں

میں ہونے لگا اور ان کی مقبولیت دن بدن بڑھتی گئی۔

یہ محض اتفاق کی بات تھی کہ کیفی اعظمی سے میری ملاقات بہت دیر کر کے ہوئی ورنہ عام طور سے اردو کے سارے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں سے میری ملاقات تھی۔ ان میں اکثر میرے پیارے دوست تھے۔ اس دیر کی وجہ شاید یہ ہوئی کہ تحریک میں شریک ہونے کے بعد کیفی اعظمی بمبئی چلے گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ میں پٹنہ میں رہتا تھا پھر رانچی میں۔ اور بمبئی جانے کا موقع نہیں مل پاتا تھا۔ لکھنؤ اور دہلی میں رہنے والے ترقی پسندوں سے ملاقات تھی اور قریبی تعلقات تھے۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور علی سردار جعفری سے ملاقات تھی۔ لیکن دہلی کی۔ یہ بھی اتفاق ہی سمجھئے کہ کیفی شاعر کی حیثیت سے مجھے بے حد پسند تھے لیکن ذاتی طور پر ان سے واقف نہیں تھا اور ان سے ملاقات نہیں تھی۔ گرچہ ان سے ملنے اور ان کی زبان سے ان کا کلام سننے کی بہت خواہش تھی۔ دوستوں سے کیفی کے بارے میں بہت سی باتیں سنی تھیں اور ان سے ملنے کی کافی خواہش ہوتی تھی۔

پھر ایسا ہوا کہ بھیمڑی کانفرنس کے بعد ترقی پسند تحریک اختلافات کا شکار ہو گئی۔ جو ترقی پسند کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ تھے۔ ان کا رویہ سخت ہو گیا بہت سے غیر کمیونسٹ ارکان تحریک سے الگ ہو گئے۔ کچھ مخالف بن گئے اور کچھ جو ادب میں ترقی پسندی کو ضروری سمجھتے تھے لیکن کمیونسٹوں کی شدت پسندی کے ساتھ نہیں تھے، خاموش ہو گئے۔ کیفی اعظمی کمیونسٹ تھے اور شدت پسندوں میں تھے۔ شاید وہ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر تھے اور ہر آفت جھیلنے کے لئے تیار رہتے تھے۔

کیفی اعظمی اُتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ کے ایک متوسط درجہ کے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ گھرانا مذہب پرست اور اپنے عقائد میں سخت تھا۔ انھیں بچپن میں دینی تعلیم دلائی گئی، شاید ایک ایسے مدرسے میں جہاں سخت قسم کے مناظرہ باز مولوی تیار ہوتے تھے اور وہاں سے فراغت حاصل کرنے کے بعد کچھ دنوں تک وہ سخت مولوی رہے بھی۔ لیکن ذاتی مطالعہ اور ادبی بصیرت نے ان کو ترقی پسندوں کی صف میں لا کھڑا کیا اور زندگی کی جدوجہد میں مشغول ہو گئے اور اب جبکہ ان کے حالات بہت اچھے ہیں تب بھی وہ ترقی پسند ہیں

اور ذرا بدلے نہیں وہ ترقی پسند ہیں صرف خیالات کے لحاظ سے نہیں بلکہ عمل کے اعتبار سے بھی۔

میری ملاقات کیفی اعظمی سے صرف دو بار ہو سکی۔ ایک بار ۱۹۵۳ء میں۔ جب حیدرآباد میں اردو کانفرنس تھی۔ پنڈت کشن پرساد کول نے صدارت فرمائی تھی احتشام حسین بھی شریک تھے۔ میں بھی کانفرنس میں شرکت کے لئے گیا تھا۔ ان دنوں میں ایک ماہانہ رسالہ تہذیب مرتب کرتا تھا۔ رسالہ ترقی پسند تھا۔ کمیونسٹ نہیں تھا لکھنے والوں میں ہر خیال کے سنجیدہ لوگ تھے۔ کانفرنس میں شرکت کے علاوہ میری غرض یہ بھی تھی کہ بہت سے لکھنے والوں سے ملاقات ہو جائے گی۔ لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ اور کون لوگ شریک ہو رہے ہیں۔ کانفرنس کے آخر میں مشاعرہ تھا اور باہر سے بھی کچھ شاعر مدعو تھے۔ ان میں کیفی اعظمی بھی تھے۔ اس اطلاع سے قدرتی طور پر مجھے خوشی ہوئی۔

مشاعرے میں جوش ملیح آبادی اور چند دوسرے بڑے شاعر آئے تھے مقامی شعرا میں سکندر علی وجد، سلیمان اریب اور دوسرے خوش گو شعرائے کرام تھے۔ مشاعرہ سننے والوں سے میدان بھرا ہوا تھا۔ کیفی مشاعرے میں دیر سے پہنچے۔ وہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ مجھے سلیمان اریب نے ان سے ملایا۔ اور ہم ایک دوسرے سے اس طرح ملے جیسے مدت سے بچھڑے ہوئے ملتے ہیں۔ کیفی اعظمی مجھے سیدھے سادے آدمی معلوم ہوئے۔ دُبلے پتلے سانولے رنگ کے آدمی۔ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی۔ سفید کھدر کا کُرتا اور پاجامہ۔ ملنے کے بعد وہ میرے پاس ہی بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ ان کی باتوں میں ذرا بھی بناوٹ یا نمائش نہیں تھی۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ کیفی نے مجھ سے مل کر کیا تاثر قائم کیا۔

اس وقت مجھے یاد نہیں کہ کیفی سے پہلے کس شاعر نے اپنا کلام سنایا۔ اتنا ضرور یاد ہے کہ جس نے بھی اپنا کلام سنایا تھا، ترنم سے سنایا تھا اور بہت داد ملی تھی ایک سماں بندھ گیا تھا۔ میں نے یہ سن رکھا تھا کہ کیفی تحت اللفظ پڑھتے ہیں۔ مجھے قدرے مایوسی ہوئی اور خدشہ ہوا کہ شاید کیفی اس ترنم کے بعد جم نہ سکیں۔ ان سے پہلے جس شاعر نے اپنا کلام سنایا تھا اس کا کلام

بھی اچھا تھا اور ترنم بھی۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ترنم سے پڑھنے والے معمولی شاعروں کے بعد بھی اچھے شاعر نہیں جمتے۔ لیکن کیفی جیسے ہی کھڑے ہوئے مجمع میں ایک نئی ہلچل سی پیدا ہوئی۔ اور پھر لوگ خاموش ہو گئے۔ کیفی نے بڑی سادگی کے ساتھ لیکن اشعار کے ہر لفظ کو مناسب انداز سے ادا کیا جس سے پڑھنے میں ایک نیا حسن پیدا ہو گیا اور سارا مجمع بے ساختہ داد دینے لگا۔ ان کا ہر مصرعہ اور ہر شعر بار بار دہرایا گیا۔ اور وہ اپنی نظم سناتے رہے۔ ان سے قبل پڑھنے والے شاعر کے ترنم کا اثر پھیکا پڑ چکا تھا۔ اور کیفی کی آواز جیسے ہر طرف گونج رہی تھی۔ میں نے بہت سے شاعروں کو سنا ہے۔ تحت اللفظ پڑھنے والوں کو بھی اور ترنم سے پڑھنے والوں کو بھی لیکن شعر کے الفاظ اور شاعر کی آواز میں جو لطافت میں نے کیفی میں پائی وہ مجھے کسی دوسرے کے یہاں نہیں ملتی اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ کیفی کے کلام اور ان کے انداز بیان میں یگانگت ہے دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ کیفی کے کلام سے ان کی آواز کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔

کانفرنس کے بعد بھی میں حیدر آباد رہ گیا۔ کیفی دو تین دنوں کے بعد بمبئی واپس چلے گئے۔ لیکن ان کے کلام اور ان کی آواز کا اثر مجھ پر بہت دنوں تک رہا بار بار کیفی کو سننے کی خواہش پیدا ہوئی لیکن موقع نہیں ملا۔ پٹنہ میں کئی مشاعرے ہوئے اور لوگوں نے کیفی کو بلانے کی کوشش کی لیکن کیفی مشاعروں میں شرکت نہیں کر سکے۔

پھر میری زندگی نے بھی نیا رخ اختیار کیا۔ میں آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو کر سری نگر (کشمیر) چلا گیا۔ وہاں میرے زمانے میں ریڈیو نے دو آل انڈیا مشاعروں کا انعقاد کیا۔ اور میں نے کیفی کو بلانے کی کوشش بھی کی لیکن وہ نہیں آ سکے۔ کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیدا ہو ہی گئی۔ کیا رکاوٹیں پیدا ہوئیں ان کی تفصیل لاحاصل ہے۔

کیفی سے میری دوسری ملاقات بائیس تیئس سال کے بعد گیا میں ہوئی ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس میں وہ شرکت کرنے کے لیے بمبئی سے آئے تھے۔ ان کی صحت پہلے جیسی نہیں رہ گئی ہے ایک بار فالج کا حملہ ہو چکا ہے اور ایک پاؤں کمزور ہو چکا ہے چلنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن جب ان کو دعوت ملی تو وہ لمبا سفر طے کر کے گیا پہنچ گئے۔ جلسوں اور مشاعرے میں شرکت کی۔ بحثوں میں حصہ لیا۔ دوسرا کوئی بھی شاید ایسی صحت لے کر

جلسے میں حصّہ لینے کے لئے اتنا لمبا سفر نہیں کرتا۔ مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ دوستوں نے انھیں ضرور منع کیا ہوگا۔ لیکن جب کہیں ترقی پسندوں کا جلسہ ہوتا ہے تو وہ رک نہیں پاتے اور ضرور شرکت کرتے ہیں۔ اس سے یہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان کو ترقی پسندی سے دلی لگاؤ ہے اور جب بھی کچھ کرنے کا موقع ملتا ہے تو اپنا حق ادا کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔

اتفاق کی بات ہے کہ کیفی سے قربت کبھی نہیں رہی یعنی ان سے قریب رہنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ دو مرتبہ کی ملاقات اور وہ بھی مختصر سی۔ لیکن اس سے اندازہ ہوا کہ کیفی سراپا خلوص اور سراپا محبت ہیں۔ ان کی زندگی میں نمائش نہیں۔ ان میں جوش ہے اور عمل کا شوق بھی۔ اور وہ اپنے خیالات پر پامردی کے ساتھ قائم ہیں۔ کیفی سے مجھے جو دلی لگاؤ ہے وہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا اور آنے والے ہر لمحہ کے ساتھ یہ رشتۂ محبت مضبوط ہوتا جائے گا۔

کیفی شاعر ہیں۔ ان کے کلام سے میں نے ہمیشہ لطف اٹھایا ہے۔ جو بھی نئی تخلیق ملتی ہے اسے ضرور پڑھتا ہوں۔

میں تنقید نگار نہیں اس لئے ان کے کلام کی قدر و قیمت مقرر کرنا میرے بس کی بات نہیں البتہ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ ان چند شاعروں میں ہیں جن کی فنکاری کا مطالعہ کر کے دل کے تاروں میں لرزش پیدا ہونے لگتی ہے۔ ایک عجیب سی تھرتھراہٹ اور ایک عجیب سی کیفیت کا احساس جاگ اٹھتا ہے اور جس کیفیت کے بیان میں الفاظ اپنا ایمان کھو بیٹھتے ہیں۔

کیفی اعظمی کا کلام مجھے بے حد پسند ہے ٹھیک ان کی دلنواز شخصیت کی طرح ـــ

جگن ناتھ آزاد

کیفی اعظمی کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر

ابھی کچھ مدت قبل کراچی کے ایک مقتدر ماہنامے کو انٹرویو دیتے ہوئے ہندوستان کے ایک نامور شاعر نے کہا:

اسی طرح ایک اور صاحب ہیں کیفی اعظمی، بڑا نام ہے اُن کا، آئے دن اُن کے جشن ہوتے رہتے ہیں، ترقی پسندوں کے مقبول شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ ہماری بھی دوستی ہے لیکن شاعری کے معاملے میں انھیں میں GENUINE شاعر نہیں سمجھتا اُن کے ہاں VERRIFACATION کے سوا کچھ نہیں۔ اب آپ اپنی کوشش یا گروپ کی کوشش سے تو شاعر نہیں بن سکتے۔ یہ تو خداداد معاملہ ہے۔ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ، ایسے بے شمار لوگ ہیں جو پراپیگنڈے کے زور سے راتوں رات شہرت حاصل کر لیتے ہیں لیکن شہرت کس کام کی اور وہ کتنے دن چل سکے گی۔

یہ بات اگر کوئی ایرا غیرا کہتا تو میں اُسے نظر انداز کر دیتا، لیکن یہ چونکہ اُردو کے ایک مشہور شاعر کی رائے ہے اس لیے میں نے سوچا کہ کیفی کی شاعری کے بارے میں جو کچھ مجھے کہنا ہے اُس کا آغاز اسی اقتباس سے کروں۔

جو کچھ اوپر کے اقتباس میں کہا گیا ہے یہ ہماری تنقید کے اُس پہلو کی ایک جھلک ہے جسے ناپختہ تنقید کہتے ہیں اور جس کا چلن بہت عام ہو گیا ہے۔ اس قسم کی باتیں ہمارے پیشہ ور نقّاد تو اکثر کہتے ہی رہتے ہیں کیوں کہ آج نقّادوں میں بعض ایسے نقّاد بھی پیدا ہو گئے ہیں جو مصرع موزوں نہیں پڑھ سکتے موزوں اور غیر موزوں مصرعے کا فرق نہیں جانتے، لیکن شاعری پر تنقیدی مضامین لکھنا ضروری سمجھتے ہیں، مگر اس بات کی توقع کسی شاعر سے اس لیے نہیں ہو سکتی کہ وہ علمی اعتبار سے نہ سہی وجدانی اعتبار سے شعر گوئی کے ہر پہلو سے واقف ہوتا ہے۔ دنیائے ادب میں اس کی تنقیدی حیثیت مشکوک ہو یا معدوم یہ الگ بات ہے لیکن جس بات کی اُس سے توقع کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ وہ رموزِ شعر گوئی سے آگاہ ہے اس لیے وہ پیشہ ور نقّادوں کی طرح غیر ذمّہ دارانہ بات نہیں کرے گا۔

اب یہ ایک انٹرویو ہے جو کراچی کے ایک مقتدر ماہنامے میں چھپا ہے۔ کوئی لکھا ہوا مضمون نہیں تھا جو ماہنامے نے شائع کیا ہو، اس لیے اس بات کا بھی امکان ہے کہ شاعر نے اپنے آپ کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے لیے اس طرح کی غیر ذمّہ دارانہ بات کہی ہو کیونکہ اس انٹرویو کا سارا STANT یہی ظاہر کرتا ہے کہ شاعر خود ستائی کے مرض میں مبتلا ہے اور اس نے اقبالؔ، جوشؔ، سردار جعفری، فراقؔ، میراجی، راشدؔ ساقی فاروقی ان سب کا ذکر اس طرح کیا ہے، جیسے یہ کوئی معمولی اور نظر انداز کر دینے کے قابل "موزوں طبع" لوگ ہیں، شاعری سے انھیں کوئی تعلق نہیں۔

ویسے ان سے انٹرویو لینے والے کراچی کے تین اہلِ قلم حضرات نے قدم قدم پر انھیں آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے لیکن ان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ انھوں نے سمجھا کہ شاید اپنے پروپیگنڈے کا اس سے بہتر موقع نہیں مل سکے گا۔

انٹرویو دینے والے نامور شاعر کے غور و فکر کی پہلی خامی یہ تھی کہ اُنھوں نے ساری اُردو شاعری کے بارے میں یہ کہہ کر ایک محاکمہ پیش کر دیا کہ "اُردو کی پوری شاعری کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ حصار کے باہر اور حصار کے اندر والی شاعری وہ ہے جو ہم مشاعروں میں سنتے ہیں۔ سوائے تھوڑی سی زبان کی تبدیلی کے اس شاعری اور ولی دکنی اور سراج اورنگ آبادی کی شاعری میں کوئی فرق نہیں۔ ..... اور حصار کے باہر والی شاعری وہ ہے جو نئے تجربات، نئے میلانات، نئے شعور کی ترجمانی اور نمائندگی کرتی ہے۔"

اسے کہتے ہیں مارو ں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ اگر حصار کے اندر والی شاعری وہ ہے جو ہم مشاعروں میں سنتے ہیں اور تھوڑی سی زبان کی تبدیلی کے سوا اس شاعری اور ولی دکنی اور سراج اورنگ آبادی کی شاعری میں کوئی فرق نہیں تو پھر اُن تمام شعرا کی شاعری کس کھاتے میں جائے گی جو مشاعروں میں اپنا کلام سناتے رہے ہیں اور سنا رہے ہیں مثلاً میر تقی میرؔ، غالبؔ، مومنؔ، جوشؔ ملیح آبادی، جگرؔ مرادآبادی، یاسؔ یگانہ، فراقؔ گورکھپوری، فیض احمد فیضؔ، اور دوسرے متعدد شعراء۔ اور پھر ولیؔ دکنی اور سراجؔ اورنگ آبادی کا ذکر ہمارے معروف شاعر نے یوں کیا ہے جیسے ولی اور سراج کوئی معمولی تیسرے درجے کے شاعر ہوں۔ کاش انٹرویو دینے والے شاعر نے ولیؔ اور سراجؔ کا کلام پڑھا ہوتا۔ اوّل تو ساری اُردو شاعری کو دو حصّوں میں تقسیم کرنا ہی اُردو شاعری سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ اُردو شاعری یا کسی بھی زبان کی شاعری دو حصّوں میں یا دو رنگوں میں منقسم نہیں ہے۔ یہ جلوۂ دو رنگ نہیں ہے بلکہ جلوۂ صد رنگ ہے، جلوۂ ہزار رنگ ہے۔ ایک رنگ جب دوسرے رنگ میں تحلیل ہونا شروع ہوتا ہے تو اُسے ہم کوئی نام نہیں دے سکتے۔ یہی بے نام سی کیفیت اُس کے وجود کی دلیل بھی ہے اور اس کے حُسن کی بھی۔ اور یہ جو حصار کے اندر اور حصار کے باہر کی بات معروف شاعر نے کی ہے اس کے متعلق یہ کہنا چاہوں گا کہ حصار کے باہر کی دنیا اُس وقت شاعری میں ڈھلتی ہے جب وہ حصار کے اندر آ کر اندرونی کیفیات سے لبریز

ہو جاتی ہے۔ حصار کے باہر اور حصار کے اندر کے درمیان ایک ایسا رشتہ ہے جو دونوں کو ملا کر اس طرح ایک اکائی میں تبدیل کر دیتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا دشوار ہو جاتا ہے۔

کیفی کی شاعری اسی حصار کے باہر اور حصار کے اندر کا امتزاج ہے۔ یہ آئیڈیالوجی اور آرٹ کا ایک مرقع ہے جس سے لذّت اندوز ہونے کے لیے صرف دروں بینی ہی کافی نہیں بلکہ گرد و پیش کے ماحول پر نظر رکھنا بھی ضروری ہے اور جب ہم اس تناظر میں کیفیؔ کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ ہمیں اپنے وقت کی آواز نظر آتی ہے۔

کیفی کی شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے اُن کے اوّلین مجموعۂ کلام "جھنکار" کی نظمیں دیکھیے۔ بانسری کا لہرا، کہرے کا کھیت، شام، منتیں، شباب، معذرت، پہلا سلام، تصادم ..... یہ شاعر کی شاعری کی ابتدا ہے اور اس میں رومانیت اور کلاسیکیت کا امتزاج ایک خوبصورت اکائی کی صورت میں نظر آتا ہے۔ جذبے کی فراوانی شاعر کے ایک سچے اور کھرے شاعر ہونے کا قدم قدم پر ثبوت مہیا کرتی ہے۔ ان میں سے اکثر نظمیں 'در ایام جوانی چنداں کہ افتد دانی' کی تصویر پیش کرتی ہیں، بالخصوص اُس دور کی ایک خاص نظم "پامسٹ" جس میں پامسٹ ایک الھڑ دوشیزہ کا ہاتھ دیکھ کے اُسے یہ بتاتا ہے کہ ؎

یہ جوانی تری بیدار ہوا چاہتی ہے
سُرخ ڈورے تری آنکھوں میں مچل جائیں گے

وغیرہ وغیرہ۔ یہ کیفی کی وہ شاعری ہے جسے اُس کی شاعری کا پہلا دور کہا جا سکتا ہے۔

اِسی دور میں کیفی نے طویل نظمیں بھی کہی ہیں مثلاً "سہلِ ممتنع" اور روانی۔ طویل نظم شاعر کے SUSTAINED EMOTION کا امتحان ہے اور اہم اور قابلِ ذکر شاعری کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ شاعر طویل نظم کہنے پر قادر ہے یا نہیں۔ گویا شروع ہی سے قدرت نے کیفی کو صرف شعر گوئی کی دولت ہی نہیں بخشی بلکہ طویل

نظم کہنے کی قدرت بھی اُسے عطا کی۔

دوسرے مجموعۂ کلام "آخرِ شب" کی شاعری ایک طرح سے "جھنکار" کا تسلسل بھی ہے اور اس سے مختلف بھی ہے۔ یہ مجموعۂ کلام اُس وقت کی شاعری کی نشاندہی کرتا ہے جب شاعر غمِ جاناں کے ساتھ ساتھ غمِ دوراں کا بھی اسیر ہوتا جا رہا ہے۔ یوں تو یہ ایک حقیقت ہے کہ

گر عشق نہ بودے و غمِ عشق نہ بودے
چندیں سخنِ نغز کہ گفتے کہ شنودے!

لیکن سچی اور کھری شاعری محض عشقِ محبوب یا غمِ عشقِ محبوب پر آکر ختم نہیں ہو جاتی۔ اقبال نے کیا عمدہ کہا ہے

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

تو حقیقتِ اشیاء کو دیکھنے کی آرزو کیفی کو اس مقام پر لے آئی جہاں اِس حقیقت کا اُس پر انکشاف ہوا کہ وہ ایک لمحہ جس پر معاشرے کی زندگی کا دار و مدار ہو یا دوسرے لفظوں میں وہ ایک لمحہ جو معاشرے کے لیے، سماج کے لیے اور ملک کے لیے زندگی اور موت کا سوال بن کر سامنے آئے بڑی اہمیت کا حامل ہے اور اُسے نظر انداز کرنا فن اور فن کار دونوں کے لیے مہلک ہے۔ اِسی لیے اس مجموعے میں "نرسوں کی محافظ"، "نغمگی تم"، "تصوّر"، "احتیاط اور فیصلہ" کے ساتھ ہی ساتھ "گاندھی جناح ملاقات" اور "سوویت یونین اور ہندوستان" ایسی نظمیں بھی شامل ہیں اور مثنویاں بھی جن کے عنوانات ہیں۔ "خانہ جنگی" اور "عوام"۔

آج ہماری نئی نسل کے سامنے آزادی سے قبل کے وہ واقعات نہیں ہیں جو آزادی کی راہ میں رکاوٹ بھی بنتے رہے اور آزادی کی منزل کو قریب تر بھی لاتے رہے۔ نئی نسل نے ان واقعات کی ایک جھلک تاریخ کی کتابوں میں دیکھی ہو گی لیکن شعراء کی جس پیڑھی کے سامنے یہ واقعات رونما ہوتے رہے اگر اس پیڑھی کے شعرا نے

ان واقعات کو یہ کہہ کے نظر انداز کیا کہ یہ غیر شاعرانہ موضوعات ہیں تو انھوں نے نہ فن کے ساتھ خلوص برتا نہ اپنی شاعری کے ساتھ۔ کیفیؔ کی انگلی ہمیشہ ملکی سیاست کی نبض پر بھی رہی اور غیر ملکی سیاست کی نبض پر بھی۔ دراصل کیفیؔ کی شاعری علامہ اقبالؔ کے اس سوال کا جواب ہے کہ

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاجِ نفس نَے
شاعر ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے؟

کیفیؔ نے اس کے جواب میں محض اپنے نفس کی موجودگی ہی کا نہیں بلکہ نفسِ آتشبار کی موجودگی کا ثبوت دیا۔ "طلوعِ آگہی" کے زیرِ عنوان کہی ہوئی نظمیں اسی دور کی نظمیں ہیں جو ہندوستان کی سیاسی آزادی کی نشاندہی بھی کرتی ہیں اور شاعر کی آزادیِ فکر کی بھی۔

ہر نظم اپنے نفسِ مضمون کے ساتھ اپنا پیرایۂ اظہار ساتھ لاتی ہے مثلاً "جیل کے در پر" زورِ بیان کی مثال ہے اور "آواز کی شکست" ایک کامیاب مکالماتی نظم ہے خواہ نظم کا عنوان "بیوہ کی خودکشی" ہے یا "تاج" ہے یا "لیڈر کی آمد" ہے یا "عورت" ہے، "حقیقتیں" ہے یا "سرخ جنت" ہے، ان میں سے کوئی نظم ایسی نہیں جس سے کیفیؔ کے نظریے کی نفی ہوتی ہو۔ "جوہر" ایک ایسی نظم ہے جو اپنے آپ کو پہچاننے کی ایک کوشش ہی نہیں ہے بلکہ اپنی پہچان کو قاری تک پہنچانے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔

مجموعۂ کلام "آوارہ سجدے" ایک محبِ وطن شاعر کی آواز ہے۔ ایک ایسے محبِ وطن شاعر کی جس کی نظیر مشکل سے مل سکے گی۔ نہرو کے بارے میں کیفیؔ کا یہ کہنا کہ

جب بھی دیکھا اُسے مجھ کو تنہا ملا

شاعر کے فکر و نظر کی گہرائی کی دلیل ہے۔ نہرو اپنے گرد و پیش کے فرقہ پرستی اور علاقہ پرستی کے ماحول سے بیزار تھے۔ لیکن اسی فرقہ پرستی اور علاقہ پرستی کے ماحول کے ساتھ اُنھیں اپنا وقت بسر کرنا پڑا۔ اس سے بڑی IRONY OF FATE

اور کیا ہو سکتی ہے۔ نہرو کی قصیدہ خوانی تو ہندوستان کے اکثر شعراء نے کی ہے لیکن اُن کی اس قید قفس سے ملتی جلتی تنہائی کی جانب صرف کیفی کی نظر گئی ہے۔

کیفی کی شاعری پر بعض پیشہ ور نقاد یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ کیفی کی شاعری براہِ راست شاعری ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ دنیا کی عظیم ترین شاعری مثلاً فردوسی کا شاہنامہ، رومی کی مثنوی، سعدی کی بوستان، دانتے کی ڈیوائن کامیڈی، تلسی داس کی رامائن، یہ سب براہِ راست شاعری کی مثالیں ہیں اور دنیا کی عظیم شاعری کے نمونے ہیں میں صرف یہ کہوں گا کہ کیفی اعظمی کے یہاں علامتی شاعری کی خوبصورت مثالیں موجود ہیں لیکن وہ اس وقت نظر آسکتی ہیں جب ہم اپنی خودساختہ تنقید کی عینک اُتار کر انھیں دیکھنے کی کوشش کریں۔ اُسی وقت کیفی کی شاعری میں علامتی شاعری کے کئی خوبصورت نمونے ہمیں نظر آئیں گے۔ جن میں "دائرے" "ابن مریم" اور "کھلونے" ایسی نظمیں ہیں جو خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔

کیفی کی شاعری کسی ایک فارمولے کی پابند نہیں ہے۔ اس کی نگاہ ماضی پر بھی ہے، حال پر بھی اور مستقبل پر بھی۔ غمِ جاناں بھی اُس کا موضوع ہے، غمِ ذات بھی اور غمِ دوراں بھی۔ اُس کی شاعری انسان کے امکانات سے لبریز ہے اور انسان کی ان مجبوریوں کے ذکر سے بھی جو خود انسان نے انسان کے لیے پیدا کی ہیں۔ آج اشتراکیت کے مخالف روس اور مشرقی یورپی ممالک میں سیاسی اور اقتصادی تبدیلیاں دیکھ کر اشتراکیت اور اشتمالیت کے خلاف ہر طرح کی بے سروپا باتیں کر رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اگر واقعی اشتراکیت اور اشتمالیت میں اور مارکسزم میں خرابیوں اور برائیوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا تو روس دنیا کی ایک سُپر پاور کیسے بن گیا۔ حقائق کو دیکھنے کی بات اور ہے اور الٹے سیدھے اعتراضات کی بات اور۔ یہ بات تو سمجھ میں آسکتی ہے کہ آج سے ستّر سال پہلے روس ایسے پس ماندہ ملک کو جس کمیونزم کی ضرورت تھی اُسے کام میں لاکر روس آج دنیا کا ایک انتہائی ترقی یافتہ ملک بن چکا ہے۔ اس لیے اب اُس سیاسی اور اقتصادی نظام کی اُسے ضرورت

نہیں رہی جس کی ضرورت اُس وقت تک تھی۔ اب ان تمام مسائل پر روس کو از سرِ نو غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے اور غور و خوض کا یہ سلسلہ صرف یہی نہیں کہ چار پانچ برس سے جاری ہے بلکہ اس کے نتائج پر عمل ہونا بھی شروع ہو گیا ہے، جن شعرا اور نام نہاد دانش وروں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی انھوں نے مُرغِ بادنما کی پیروی شروع کر دی لیکن گہرے فکر و نظر والے شعرا اور دانشوروں نے خواہ وہ کسی زبان اور کسی مُلک کے شاعر اور دانشور ہوں اس طرح ہوا کے رُخ پر اپنا رُخ بدلنا مناسب نہیں سمجھا۔ کیفی اعظمی کا تعلق شعرا اور دانشوروں کے ثانی الذکر طبقے سے ہے چنانچہ اُن کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی اور روس اور اس کے فلسفۂ حیات کی جانب اُن کا طرزِ عمل اُسی طرح مثبت اور ترقی پسندانہ رہا جیسے پہلے تھا۔ اپنی ایک نئی نظم میں جو انھوں نے اقبال کی "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" کے انداز پر کہی ہے۔ تیسرا مشیر یہ کہتا ہے۔

روس ایک کوہِ حقیقت ہے بساطِ ارض پر
ریزہ ریزہ ہو گیا ٹکرا کے جس سے تیرا خواب
اپنے پر چھتا ہے اپنی خوں چکاں منقار میں
تلملا کر روس پر جھپٹا تھا جو فاشی عقاب

اور جب ابلیس اپنے تیسرے مشیر کی بات سُن کر تلملا اٹھتا ہے اور کہتا ہے۔

روس سے دست و گریباں ماؤ وادی چین سے
دو لگے ہے بدگماں پولینڈ کی ہے آب جو
ہو رہا ہے آئے دن تازہ تضادوں کا ظہور
ہے زوال آمادہ لینن کا جہانِ آرزو

تو پانچواں مشیر اس سے کہتا ہے،

یہ تضادوں کا تصادم ہے ترقی کی دلیل
اپنی نافہمی سے سمجھا ہے جسے بحران تو
پہلے تنہا روس تھا اب اس کے ساتھی ہیں کئی
اور ہر ساتھی کو اپنی راہ کی ہے جستجو
کر رہے ہیں عصرِ حاضر کی وہی مشاطگی
جن کو تو کہتا تھا کل آشفتہ مغز آشفتہ مُو

چھین لی ساقی سے پیاسوں نے کلیدِ میکدہ
توڑ ڈالے نارواتقسیم کے جام و سبو
تیل کے چشموں میں خاکستر ہے اُن کی تہ نشیں
جن کی خاکستر میں چمکا تھا شرارِ آرزو
آج صہبائے تعیش میں ہیں وہ ڈوبے ہوئے
کرتے تھے اشکِ سحرگاہی سے جو ظالم وضو
دیکھ اپنی شکل یا جھلا کے اس کو توڑ ڈال
رکھ دیا آئینہ میں نے آج تیرے روبرو
کل جو نازی تھے وہ کمبخت آج اسرائیل ہیں
جن کے آگے سر بہ سجدہ وارثانِ نیل ہیں

عصری حسیت کے تقاضے کیفی اعظمی کی شاعری کا ایک نمایاں عنصر ہیں۔ اور اس کی مثالیں کیفی کے کلام میں اوّل سے آخر تک موجود ہیں لیکن ان کی ایک نظم "مقتلِ بیروت" میں عصری حسیت اس خوبصورتی سے نظم کے رگ و پے میں سما گئی ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا دشوار ہے۔ کیفی اس نظم میں کہتے ہیں۔

اے صبا لوٹ کے کس شہر سے تو آتی ہے
تری ہر لہر سے بارود کی بُو آتی ہے

کسی ہتھیار سے پوچھو وہ بتا دے گا تمھیں
کون وہ لوگ ہیں دشمن ہیں جو آزادی کے
ایک اک بوند کو جس وادی میں ترسے تھے حسین
تیل کے چشمے ہیں ناسور اسی وادی کے
بے ضمیری کا ہے یہ عہد خبر ہے کہ نہیں
کس توقع پہ کھلیں لب کسی فریادی کے

اور نظم "ہند اور فلسطین" کی دوستی پر ختم ہوتی ہے۔

اے صبا اب ہو جو بیروت کی گلیوں میں گزر | اور ترے سامنے آجائے کوئی تازہ کھنڈر

اس سے کہہ دینا کہ بھارت کا بھی سینہ ہے فگار | ہل گیا کوہِ ہمالہ جو سُنی تیری پکار

جتنے کانٹے بھی بچھانا ہو بچھائے کوئی | تری راہوں سے جُدا ہوں گی نہ راہیں اپنی

غم نہ کر ہاتھ اگر تیرے قلم ہو جائیں | جوڑ دیں آکے ترے بازو میں باہیں اپنی

سید حامد حسین

"آوارہ سجدے" کی تخلیقی تشکیل

"آخرِ شب" اور کیفی اعظمی کے تیسرے مجموعے "آوارہ سجدے" کی اشاعت کے درمیان تقریباً ۲۰ سال کا طویل عرصہ حائل ہے اور اس نئے مجموعے میں شامل ۳۷ شعری تخلیقات میں سے بھی بیشتر صرف ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۴ء تک کے ۱۲ سال کے عرصے کی نمائندگی کرتی ہیں۔ لہٰذا یہ ان کا اس دور کا سارا سرمایہ نہیں ہے۔ ان منظومات کے علاوہ بھی کیفی نے اس دوران بہت کچھ لکھا ہے اور وہ مختلف وسائلِ ابلاغ کے ذریعے اُن کے پرستاروں تک پہنچا ہے۔ لیکن "آوارہ سجدے" کی شعری تخلیقات اس لحاظ سے نمائندہ حیثیت رکھتی ہیں کہ اُن سے شاعر کے ذہنی سفر اور اُس کے تخلیقی کمال کی جہت متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ منظومات شاعر کی اس ذات کو بے حجابانہ پیش کرتی ہیں جس کے درمیان اب نہ تو رومانیت کی چلمن حائل نظر آتی ہے اور نہ الفاظ کا طلسم۔ "آوارہ سجدے" کے مرحلے تک پہنچنے میں کیفی نے بڑے کانٹے کوس کاٹے ہیں۔ وہ تجربے کی کڑی دھوپ اور وقت کی بے رحم آنچ سے ہو کر گزرے ہیں اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تلخی اور تندی۔ اُن کے لہجے کی کاٹ اور اُن کے اظہار کی گرفت بن کر ظاہر ہوتی ہے "آخرِ شب" کے شاعر نے ایک یقین، ایک عقیدے اور ایک اعتماد

کے ساتھ آغازِ سفر کیا تھا۔ اُس نے کسی کے حسن سے، اپنے جذبۂ عشق سے، فطرت کی شگفتگی اور لطافتوں سے، زندگی کی تلخیوں اور مجبوریوں سے ایک جہان تازہ اور ایک نظامِ نو کی تعمیر کے لئے حوصلہ و ولولہ حاصل کیا تھا۔ "آوارہ سجدے" میں بھی اُس کا سب سے بڑا سرمایہ اُس کے یقین کی دولت ہے۔ لیکن وقت کے پیچ و خم میں اُسے زیادہ محتاط اور تلخ کام بنا دیا ہے۔ وہ اب بھی انسانیت کے ساتھ وفا کا عہد رکھنے والی قدروں کا گرویدہ ہے، وہ اب بھی بے انصافی، سفاکی اور بے رحمی کے خلاف سینہ سپر ہے وہ اب بھی عظمتِ آدم اور امنِ عالم کا معترف ہے۔ لیکن ابھی اسی کی منزل نہیں آئی ہے۔ ابھی اس کا سفر ناتمام ہے اور سعی جاری۔ اس کے قدم گو تھکے نہیں لیکن نشیب و فراز نے اسے زیادہ محتاط بنا دیا ہے وہ کہتا ہے۔

اک یہی سوزِ نہاں کل مرا سرمایہ ہے
دوستو میں کسے یہ سوزِ نہاں نذر کروں
کوئی قاتل سرِ مقتل نظر آتا ہی نہیں
کس کو دل نذر کروں اور کسے جاں نذر کروں

اُس نے نذرِ دل کیلئے اپنی قربان گاہ چن لی اور اپنی سجدہ گاہ منتخب کر لی تھی۔ لیکن ایک موقع وہ بھی آیا کہ اُسے محسوس ہوا کہ اس کے سجدے آوارہ ہو چکے ہیں اور اُس نے زخم خوردہ لہجے میں کہا۔

راہ میں ٹوٹ گئے پاؤں تو معلوم ہوا
جز مرے اور مرا راہنما کوئی نہیں
ایک کے بعد خدا ایک چلا آتا تھا
کہہ دیا عقل نے تنگ آ کے خدا کوئی نہیں

"آوارہ سجدے" کا شاعر ایک طبعی ناشکیبائی سے دوچار ہے۔ وہ ناشکیبائی جو وقت کے بے رحم پست و بلند سے گذرنے پر پیدا ہوئی ہے۔ وہ ناشکیبائی جو شاعر کے لئے اندیشوں کی سوغات بھی لائی ہے اور رنے پر چیلنج

کا سامان بھی ۔ کہیں اُس پر اس بے بسی کی پرچھائیں پڑتی ہے :

روز بڑھتا ہوں جہاں سے آگے
پھر وہیں لوٹ کے آجاتا ہوں
بارہا توڑ چکا ہوں جن کو
انھیں دیواروں سے ٹکراتا ہوں
روز بستے ہیں کئی شہر نئے
روز دھرتی میں سما جاتے ہیں
زلزلوں میں تھی ذرا سی گرمی
وہ بھی اب روز ہی آجاتے ہیں

اور پھر یہ بھی پکار اٹھتا ہے

چند ریکھاؤں میں سیماؤں میں
زندگی قید ہے سیتا کی طرح
رام کب لوٹیں گے معلوم نہیں
کاش راون ہی کوئی آجاتا

انقلاب کی یہ خواہش ، حالات کو بدل ڈالنے کی یہ آرزو کتنی قوی ہے ، اس کا اندازہ ایک اور نظم "دھماکہ" سے ہوتا ہے جس کے ابتدائی حصے میں شاعر دھماکے کی بے معنویت کا معترف ہے

کوئی چوراہا ہو چاہے کوئی ناکہ دوستو
ہر گھڑی ہر دم کوئی تازہ دھماکہ دوستو

یہ دھماکہ بس دھماکہ ہے
دھماکے کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ روزی دے سکتا نہیں
یہ کچھ بھی دے سکتا نہیں

پھر نظم کے آخر تک پہنچتے پہنچتے وہ اسی بے معنی دھماکے کو تخلیق کائنات اور جوہری توانائی کا منبع تصور کرتے ہوئے قبول کر لیتا ہے۔

یہ دھماکہ بس دھماکہ ہے دھماکے کے سوا کچھ بھی نہیں
وہ بھی تو بس ایک دھماکہ تھا دھماکے کے سوا کچھ بھی نہ تھا
جس سے اُچھلیں کہکشائیں
جس سے اُبھری کائنات
گھر سے جب بھی نکلو باہر دوستو
کچھ دھماکے بھر لو اپنی جیب میں
ہر گھڑی ہر دم تازہ دھماکہ دوستو
کون جانے کوئی ذرہ ٹوٹ جائے

"آوارہ سجدے" کی شاعری میں کہیں کہیں ایک حیران، روزگار گزیدہ جہاں ترسیدہ خود کی آواز بازگشت سنائی دیتی ہے۔ "دائرہ"، "آخری رات" اور "عادت" جیسی نظموں میں ایک شدید بے بسی کا احساس فکر و شعور پر حاوی ہو گیا ہے۔ "آخری رات" میں خود سپردگی اور بے چارگی کا یہ عالم ملاحظہ ہو۔

کوئی کہتا تھا، ٹھیک کہتا تھا — سرکشی بن گئی ہے سب کا شعار
قتل پر جن کو اعتراض نہ تھا — دفن ہونے کو کیوں نہیں تیار

ہوش مندی ہے آج سو جانا
آج کی رات ہم کو سونے دو

اور "عادت" کی اس حسین نظم میں یہی بے چارگی، تاریخ کے پردوں اور وقت کی چھلنی سے چھن کر زہرناک تلخی میں تبدیل ہو گئی ہے۔

مدتوں میں اک اندھے کنویں میں اسیر — سر پٹکتا رہا، گڑگڑاتا رہا
روشنی چاہیے، چاندنی چاہیے، زندگی چاہیے — روشنی پیار کی، چاندنی یار کی، زندگی دار کی
اپنی آواز سنتا رہا رات دن — دھیرے دھیرے یقیں دل کو آتا رہا

سونے سنسار میں　　بے وفا یار میں
دامنِ دار میں
روشنی بھی نہیں　　چاندنی بھی نہیں
زندگی بھی نہیں
زندگی ایک رات　　واہمہ کائنات
آدمی بے ثبات
لوگ کوتاہ قد　　شہر شہر حسد
گاؤں ان سے بھی بد
ان اندھیروں نے جب پیس ڈالا مجھے　　پھر اچانک کنوئیں نے اچھالا مجھے
اپنے سینے سے باہر نکالا مجھے
سیکڑوں مصر تھے سامنے　　سیکڑوں اس کے بازار تھے
ایک بوڑھی زلیخا نہیں　　جانے کتنے خریدار تھے
بڑھتا جاتا تھا یوسف کا مول　　لوگ بکنے کو تیار تھے
کھل گئے مہ جبینوں کے سر　　ریشمی چادریں ہٹ گئیں
پلکیں جھپکیں نہ نظریں جھکیں　　مرمریں انگلیاں کٹ گئیں
میں نے ڈر کے لگا دی کنوئیں میں چھلانگ
سر پٹکنے لگا پھر اسی کرب سے
پھر اسی درد سے گڑگڑانے لگا
روشنی چاہیے، چاندنی چاہیے، زندگی چاہیے

ان نظموں میں کیفی کے مزاج کی دردمندی پوری طرح ابھر کر آتی ہے۔ ان کی نظم "چراغاں" کی طرح یہ کہیں آرزومندی کے مہین پردے سے ابھر کر آتی ہے اور دل میں ترازو ہو جاتی ہے۔ یوم جمہوریہ کے پس منظر میں وہ کہتے ہیں ۔

ایک دو نہیں، چھتیس دیئے
ایک اک کر کے جلائے میں نے

......

دور سے بیوی نے جھلا کے کہا
تیل مہنگا بھی ہے ملتا بھی نہیں
کیوں دیے اتنے جلا رکھے ہیں
اپنے گھر میں نہ جھروکہ نہ منڈیر

......

آیا غصے کا اک ایسا جھونکا
بجھ گئے سارے دیے
ہاں مگر ایک دیا نام ہے جس کا امید
جھلملاتا ہی چلا جاتا ہے۔

اس بے نام سی امید کے ساتھ ساتھ کیفی کی کئی منظومات اُن کے عزم محکم کی بھی حصہ دار ہیں۔ اور انقلاب میں اُن کا یقین ایک مضبوط آہنگ بن کر اُن کی منظومات کے رگ و ریشے میں پیوست ہو گیا ہے۔ نظم "مکان" کی ابتدا اور انتہا اس بند سے ہوتی ہے

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
سب اٹھو، میں بھی اٹھوں، تم بھی اٹھو، تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی

یہی بلند آہنگ حوصلہ مندی "بہرہ" میں ایک رجزیہ کڑک حاصل کر لیتی ہے۔

عزم کا کوہِ گراں درد کی دیوار ہیں ہم — زخم کا زخم ہیں تلوار کی تلوار ہیں ہم
جیسے جھپکی ہی نہیں صدیوں سے یہ بوجھل پلکیں — آج کی رات کچھ اس طرح سے بیدار ہیں ہم
جاں سرحد سے اٹھا جال بچھانے والے

کیفی نے اپنی کئی نظموں میں آنچل سے پرچم کا کام لیا ہے۔ لیکن اُن کی ساری شاعری شکوۂ زمانہ ہی نہیں اس میں حدیث دلبرانہ بھی شامل ہے اور ان کے تخلیقی تخئیل نے جہاں حسن و عشق میں بڑے لطیف و دلآویز نقوش ترتیب دیے ہیں کہیں (جیسے نظم "بوسہ" میں) جب شاعر ان حسین آنکھوں کو چوم لیتا ہے تو پھول، چاند، ستارے جیسے سب رقیب قدموں میں سر جھکانے لگتے ہیں، اجنتا کی مورتیں رقص کرنے لگتی ہیں اور صدیوں کے خاموش غار گنگنانے لگتے ہیں اور کہیں

زندگی نام ہے کچھ لمحوں کا
اور ان میں بھی وہی اک لمحہ
جس میں دو بولتی آنکھیں
چائے کی پیالی سے جب اٹھیں
تو دل میں ڈوبیں

. . . . . .

آج تم کچھ نہ کہو
آج میں کچھ نہ کہوں
بس یوں ہی بیٹھے رہو
ہاتھ میں ہاتھ لئے
غم کی سوغات لئے
کون جانے کہ اسی لمحے میں
دور پربت پہ کہیں
برف پگھلنے ہی لگے

لیکن غزل کی صنف جسے استادان سخن نے کاروبار عشق کے لئے وقف کر دیا تھا۔ "آوارہ سجدے" میں فکر و احساس کے نئے گوشوں کو اجاگر کرنے کا کام کرتی ہے ان غزلوں میں کیفی کا کھرا شعری کردار، بے رعایت بے تکلفی کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

پہلے ان غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ کر لیجئے پھر آگے بات ہوگی۔

دیواریں تو ہر طرف کھڑی ہیں کیا ہو گئے مہربان سائے
جنگل کی ہوائیں آ رہی ہیں کاغذ کا یہ شہر اُڑ نہ جائے

وہ تیغ مل گئی جس سے ہوا ہے قتل مرا کسی کے ہاتھ کا اس پر نشاں نہیں ملتا
کھڑا ہوں کب سے میں چہروں کے ایک جنگل میں تمہارے چہرے کا کچھ بھی نشاں نہیں ملتا

شاہنامے لکھے ہیں کھنڈرات کی ہر اینٹ پر ہر جگہ ہے دفن اک افسانہ تیرے شہر میں
ننگی سڑکوں پر بھٹک کر دیکھ جب مرتی ہے رات رینگتا ہے ہر طرف ویرانہ تیرے شہر میں

کیفی نے ان غزلوں کو غزل کی روایتی لفظیات، غزل کے روایتی ماحول اور روایتی چونچلوں سے بالکل آزاد کر لیا ہے۔ انہوں نے اپنی غزل کو نہ تو احساس کے نہاں خانوں میں اسیر کرنے کی کوشش کی ہے اور نہ تخیل کی طلسمی خیز گی سے اُسے آراستہ کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ کیفی کی یہ غزلیں ایک پختہ تخلیقی شعور کو ایک جامع ایمائی اظہار فراہم کرنے کا کام سرانجام دیتی ہیں۔

"آوارہ سجدے کی ۲۰ شعری تخلیقات میں نظریے اور احساس، فکر و تاثر کی جو رنگا رنگی دکھائی دیتی ہے وہ یہ ظاہر کرنے کیلئے کافی ہے کہ ہر زندہ اور بیدار فرد کی طرح شاعر بھی زندگی کو نئے نئے زاویوں اور نئے نئے پہلوؤں سے تجربہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ وہ زندگی کو الٹ پلٹ کر دیکھنے، اُس کے تلخ و ترش کو چکھنے اور اُس کے بلند و پست سے گزرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچ چکا ہے کہ زندگی نہ تو خط مستقیم میں حرکت کرتی ہے اور نہ ہی اُسے کسی ایک کلیے۔ کسی ایک طلسم یا کسی اسم اعظم میں قید کیا جا سکتا ہے۔ زندگی کی صد رنگ جلوہ سامانیاں شاعر و فنکار کے تخلیقی شعور سے نئے سے نئے انداز سے خراج طلب کرتی ہیں اور ہر اعلیٰ فنکار کی طرح کیفی نے اپنی متاعِ فکر و احساس سے یہ خراج پوری

عقیدت کے ساتھ ادا کیا ہے۔

موجودہ صدی کی پانچویں دہائی میں تحریک کے ساتھ ادب کی وابستگی ایک اہم رجحان بن کر آئی۔ اس کی وجہ سے جہاں ادیبوں کو نظریے سے وابستگی کی بنا پر ایک خاص قسم کا اعتماد حاصل ہوا وہیں انھوں نے اپنی فکر و نظر کے لئے ایک جہت کا تعین بھی کیا۔ کیفی اعظمی کا بھی ترقی پسند تحریک سے قریبی تعلق رہا اور اس تحریک کے بنیادی اصول و عقائد کی بازگشت۔ ان کی تخلیقات میں سنائی دیتی ہے۔ "آوارہ سجدے" میں بھی ان اثرات کی تلاش کے لئے کسی خصوصی کدو کاوش کی احتیاج نہیں۔ لیکن نظریے سے پرخلوص وابستگی کے باوجود اس مجموعے کی تخلیقات سے یہ اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں ہے کہ کیفی نے اپنے نظریاتی شعور کو اپنے تخلیقی شعور کے لئے مجبوری نہیں بننے دیا ہے۔ "آوارہ سجدے" کی شاعری ایک ایسے فنکار کی شاعری ہے جو ہر دوسری چیز سے زیادہ خود اپنی ذات سے مخلص ہے۔ اسی اخلاص کے نتیجے میں جہاں وہ اپنی آرزوؤں، اپنے اندیشوں، اپنی مایوسیوں۔ اپنی حیرانی اور دردمندی کا اظہار کرتا ہے، وہیں وہ اپنے عقائد اپنے نظریات۔ اپنی ترجیحات اور اپنے تصورات کے ساتھ بھی انصاف برتتا ہے۔

"آوارہ سجدے" کا شاعر اپنے ذہن میں ایک منصفانہ، غیر طبقاتی اور پرامن سماج کے خواب سجا کر رکھتا ہے۔ وہ لوٹ کھسوٹ۔ استحصال، بے انصافی، بے رحمی اور حیوانیت کی پوری شدت سے مخالفت کرتا ہے۔ یہ عقیدہ اُس کی فنی شخصیت کو محدود نہیں کرتا بلکہ اُس کو مزید فعال بناتا ہے۔ کیونکہ وہ بحیثیت فنکار ایک واضح تخیل اور ایک معیّن جہت رکھتا ہے۔ وہ گنجلک تصور۔ مبہم اظہار اور بے معنی اسلوب سے اپنی تخلیقی مجہولیت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا۔ ہر فنکار اپنے خوابوں سے ایک جہانِ معنی تیار کرنا چاہتا ہے اور اس کے تخلیقی شعور کا ارتقا اس جہانِ معنی کے نقوش کو واضح سے واضح تر بنانے کی سعی میں پوشیدہ ہے۔

"آوارہ سجدے" تک پہنچتے پہنچتے کیفی اعظمی نے فنی کمال کے اس

جوہر کو دریافت کر لیا ہے کہ کس طرح فنکار کا تخلیقی شعور، عام تجربے کی علامتوں سے ایک پورے نظام فکر و احساس کے لئے ایک علامت عظمیٰ کی تعمیر کر سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے یہ بھی محسوس کر لیا ہے کہ زندگی کی حقیقت ایک تہہ دار، پہلو دار اور پیچیدہ حقیقت ہے۔ اس کا جامع اور بھرپور اظہار، متنوع اور رنگا رنگ تجرباتی کیفیات اور تاثرات کی مدد سے ہی ممکن ہے
"آوارہ سجدے" کیفی اعظمی کی شاعری کا حرف آخر نہیں بلکہ وہ شاعری کے ساتھ اُن کے معاملات عشق کا ایک درمیانی مرحلہ ہے۔ لیکن یہ داستان عشق بھی ہے اور کسی بھی داستان کی معنویت اس کی انتہا پر نہیں بلکہ اس کی سچائی پر منحصر ہوتی ہے۔

کیفی اعظمی جس نے... سارے جہاں کے غم اپنے سینے میں سمیٹ لئے ہیں

"کرشن چندر"

تیلگو کے مشہور شاعر سری سری کی مثنوی "مہا پرستانم" کے مقدمے میں ایک اور نامور تلگو مزاح نگار چلم نے کہا تھا کہ کرشنا شاستری ایسا شاعر ہے جو اپنے سارے دکھ دنیا کے سر ڈال دیتا ہے۔ اور سری سری ایسا شاعر ہے جو سارے جہاں کا درد اپنے سر لے لیتا ہے۔ اور یہی بات کرشن چندر نے کیفی کے متعلق لکھی ہے

"وہی شخص ایسی شاعری کر سکتا ہے جس نے پتھروں سے سر
ٹکرایا ہو اور سارے جہاں کے غم اپنے سینے میں سمیٹ لئے ہیں"

کیفی کو تو میں اور میری قماش کے لوگ ۱۹۴۳ء کے آس پاس ہی سے جانتے ہیں۔ اس سے پہلے کیفی کیا کرتے تھے؛ کیا لکھتے تھے؛ اس سے میں ناواقف ہوں اور واقف ہوتا تو بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کیوں کہ آج جو کیفی ہیں وہ ۱۹۴۳ء کے آس پاس ہی کانپور سے آکر بمبئی میں "پیدا" ہوئے ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ بنے بھائی (سجاد ظہیر مرحوم) نے کیفی کو "ڈھونڈ نکالا" یا کیفی نے بنے بھائی کو دریافت کیا۔ لگتا تو یہ ہے کہ دونوں روزِ ازل سے ایک دوسرے کی تلاش میں تھے اور بھلا ہو ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے اخبار "قومی جنگ" کا کہ اس نے دونوں کو ڈھونڈ کر ملا دیا۔

کیفی غالباً کانپور رہتے تھے۔ "قومی جنگ" کا کوئی شمارہ دیکھ لیا۔ "قومی جنگ" کی خوبی یہ تھی کہ جو کمیونسٹ پارٹی سے سیاسی اختلاف بھی کرتے تھے، وہ بھی "قومی جنگ" کو اس کی صحافتی بلندی اور مواد کی صداقت کی وجہ سے پسند کرتے تھے۔ اسی وسیع گروہ میں اس وقت کیفی بھی تھے۔

چنانچہ کیفی نے اپنی ایک نظم "قومی جنگ" کو بھیجی لیکن بھروسہ نہیں تھا کہ چھپے گی اور حیرت ہوئی کہ وہ نظم "قومی جنگ" میں شائع ہو گئی۔ کیفی کو فطرتی طور پر بہت خوشی ہوئی ہو گی۔ لیکن بنے بھائی

کو بھی بڑی خوشی ہوئی کہ بالآخر انہوں نے اس نوجوان کو پا ہی لیا جس کی نادانستہ جستجو میں وہ سرگرداں تھے۔

اور پھر کیفی بمبئی آگئے۔ "قومی جنگ" اور کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ اور پیوستہ ہو گئے۔

اب کیفی میں ایک کیفیاتی تبدیلی آگئی تھی۔ وہ پہلے کے رومانی شاعر نہیں رہے۔ مگر عشق کی چاشنی اور رومانی آہنگ ان کی شاعری میں رچا بسا ضرور رہے۔

بمبئی آنے کے بعد کیفی مزدوروں میں رہنے لگے۔ انہیں شعر سناتے۔ ان کے دکھ درد کو سنتے۔ "قومی جنگ" میں لکھتے اور پھر بمبئی کی سڑکوں پر "قومی جنگ" بیچتے پھرتے۔

کیفی کے اس دور کے کلام کے دو مجموعے شایع ہوئے۔ ایک جھنکار اور دوسرا "آخرِ شب"۔ تیسرا مجموعہ بڑی تاخیر سے ابھی چند برس پہلے "آوارہ سجدے" کے نام سے شایع ہوا ہے۔ اور اسی مجموعہ پر کیفی کو ساہتیہ اکاڈیمی نے انعام سے بھی سرفراز کیا ہے۔

"جھنکار" اور "آخرِ شب" کے کیفی پر یہ الزام لگایا جاتا تھا اور یہ الزام سارے ترقی پسندوں پر لگایا جاتا تھا، کہ وہ "کمیونسٹ پارٹی" کا پروپگنڈہ کرتے ہیں۔ ان کی شاعری موقتی "ہا ہو ہو" کی شاعری ہے۔ مزدوروں سے تالیاں پٹوالیں۔ عام جلسوں میں لوگوں کو گرما دیا۔ اور بس دیوان خانوں میں آرام کرسیوں پر گدوں کے بیچ پڑھ کر محظوظ ہونے کی شاعری نہیں ہے۔

"ترقی پسند ادب پروپگنڈہ ہے"۔ جی ہاں! ہے' تو کیا؟ اور آج کے بڑے بڑے نقادوں نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ "پروپگنڈہ" بھی اگر ڈھنگ کا ہو تو ادبِ عالیہ کے زمرے میں آسکتا ہے۔ اور کرشن چندر کا کارنامہ ہی یہ ہے کہ اس نے پروپگنڈے کو ادب کا مقام عطا کر دیا۔ اور بڑے بڑے سقراطوں اور بقراطوں سے منوا لیا۔

کیفی نے "جھنکار" اور "آخرِ شب" کی کئی نظموں میں "پروپگنڈہ" کیا ہے۔ ایسے موضوعوں پر قلم اٹھایا ہے جو انتہائی عارضی نوعیت کے ہیں اور ادب کی تو "ابدی قدریں" ہوتی ہیں۔ صدیوں بعد بھی لوگ پڑھیں۔

اس کا جواب "آخرِ شب" کے کراچی سے اگست ۱۹۶۷ء میں شایع ہونے والے نسخے میں مل جائے گا۔ یہاں "پیش لفظ" کے عنوان ایلیا ابن برگ کا ایک جملہ نقل کر دیا گیا ہے۔

"ایک ادیب کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ ایسے ادب کی
تخلیق کرے جو مستقبل کی صدیوں کے لئے ہو ایسے ادب
کی تخلیق پر بھی قدرت ہونی چاہئے جو صرف ایک لمحے کیلئے ہو
اگر اس لمحے میں اس کی قوم کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔"

اب ذرا غور تو کیجئے۔ ۱۹۴۴ء میں اگست میں گاندھی جی اور مسٹر جناح کی ملاقات ہونے جا رہی ہے۔ ملک غلامی سے تنگ آچکا ہے۔ ایسی زوردار کروٹ کا متقاضی ہے کہ زنجیریں ٹوٹ کر رہ جائیں۔ لیکن کانگریس اور مسلم لیگ متحد ہونے میں تب ہی یہ ممکن ہے۔ ورنہ مایوسی گھیرے ہوئے ہے۔ ادھر استالن گراڈ پر نازیوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی اور اب سرخ فوج یلغار کر رہی ہے دنیا پر فاشزم کی تاریکی کے چھٹنے کے آثار پیدا ہیں۔ جمہوریت اور آزادی کی پو پھٹنے ہی والی ہے اور یہاں ہندستان میں مایوسی چھائی ہے۔ ایسے میں گاندھی جی اور مسٹر جناح کے ملنے کی ہمت افزا خبر آئی ہے۔ کیفی اسی "لمحے" کہتے ہیں۔

اِک دیا رات کی آغوش میں جلنے لگا
تیرگی یاس کی کافور ہوئی جاتی ہے
ناخدا جوڑ کے سر بیٹھنے والے ہیں اِدھر
اور ادھر سانس اکھڑنے لگی طوفانوں کی
موج کشتی کے تلے چور ہوئی جاتی ہے۔ ("کرن")

یا پھر۔

یہ گفتگو، گفتگو نہیں ہے بگڑنے بننے کا مرحلہ ہے
دھڑک رہا ہے فضا کا ~~~ کہ زندگی کا معاملہ ہے
یہ تیرگی کا ہجوم کب تک یہ یاس کا ازدہام کب تک
نفاق و غفلت کی آڑ لے کر جئے گا مردہ نظام کب تک
رہیں گے ہندی اسیر کب تک رہے گا بھارت غلام کب تک
گلے کا طوق اب ہے قدم بڑھیں گے اس طرح تملا کے اٹھا ("ٹنے خاکے")

وہ بھی ایک "لمحہ" ہی تو تھا جب کہ لارڈ ویول سے کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنما بات کر رہے تھے۔ دونوں بھی ایک "سپردگی" کے عالم میں تھے۔ کچھ ویول ہی پر ان دونوں کو "بھروسا" ہو گیا تھا۔ اسی "سپردگی" کے خلاف اس "لمحہ" کیفی احتجاج کرتا ہے۔

جاؤ چیٹ گاؤں کے جانباز گنہ گار سہی
ویر پنجاب کے، بنگال کے، بدکار سہی
تھا بھگت سنگھ خطاوار، خطاوار سہی
لال کپور کے غدار تھے، غدار سہی
مولوی سے تو کبھی شکوۂ بیداد سنو
سن بیالیس کے کشتوں کی تو فریاد سنو

یہی تو وہ گراں قدر "لمحے" ہیں جو قوموں کی زندگی میں بار بار نہیں آتے اور ایسے موقعوں پر شاعر کے دل کی دھڑکن وسیع عوام کے دلوں کی دھڑکن کی صدائے بازگشت بن جاتی ہے اور شاعر کے قلم سے انقلاب بولنے لگتا ہے تو وہ ادب پیدا ہوتا ہے جس کو کچھ نقاد ادب عالیہ نہ سمجھیں وہ عوام کے دلوں میں اور انقلابات کی تاریخ میں ثبت ہو جاتا ہے۔

کیفی کی اس دور کی شاعری ایسا ہی ادب ہے

ریاست ٹراونکور میں مہارانی اور ان کے وزیر اعلیٰ، انگریزوں کے زبردست وفادار مسٹر سی، پی، راما سوامی ایر نے آزادی کے مجاہدوں کے خون سے ہولی کھیلنی شروع کی ہے۔ ایسے میں کیفی کا دل مضطرب ہو اٹھتا ہے۔ وہ بھی ان مجاہدین کے ساتھ خون میں لت پت ہے، لکھتا ہے ۔

یہ راجا، یہ انگریز کے میزباں
ہیں بھارت میں انگلینڈ کے پاسباں
جہاں پائی ہے رہزنوں نے اماں
وہ دیوار، وہ در گراتے چلو
بغاوت کا پرچم اڑاتے چلو

"تلنگانہ" میں "فرزندانِ کوہ و دشت" نے انگریزوں کے "یار وفادار" کے خلاف بپا کر رکھی ہے۔

مخدوم نے کہا "چمک رہی ہے درانتی، اچھل رہے ہیں کدال اور پھر

پڑی ہے فرقِ مبارک پہ ضربت کاری
حضورِ آصف سابع پہ ہے غشی طاری

کیفی بھی وہیں کہیں مخدوم کے ساتھ تلنگانہ کے جنگلوں اور پہاڑوں میں ملے گا۔
کہتا ہے۔

یہ شہریاری یہ تاجداری وجود پہ بار ہو گئی ہے
جفا کی خوگر غریب دنیا جفا سے بیزار ہو گئی ہے
زمین بر چھا دنی بگلنے پہ آج تیار ہو گئی ہے
کہ بھوک بیدار ہو گئی ہے

("تلنگانہ")

۱۹۴۵ء کا طوفانی زمانہ یاد کیجئے ایک طرف ہندستان کے مزدور اور کسان آزادی کے لئے بے چین ہیں۔ ساری غلام دنیا میں آزادی کی لہریں اٹھ رہی ہیں۔ دوسری طرف کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات، ہندو مسلم تناؤ کا روپ اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ رہنما اپنے اپنے مسموم دائرے میں محصور ہیں۔ کیفی ایک راگ چھیڑتا ہے۔

غلامی کے سب گرم پیکار ہیں
یہاں خانہ جنگی کے آثار ہیں
ابھی اپنے دامن میں کچھ تار ہیں
ابھی طوق پر ہاتھ جاتے نہیں
تڑپتے ہیں اپنی حدوں میں جناب
بہم ہو کے طوفان اٹھاتے نہیں

یہ نہیں ہے کہ ہندستان کے پاس حصولِ آزادی کی جنگ کے لئے "اسلحہ" کی کمی ہے۔
کمی رہنماؤں میں جرأت کی ہے۔ ایسے میں عوام کیا کریں؟
کیفی کو سنئے۔

۱

نگاہوں میں درجن کا ہے تیر بھی
ہے قبضے میں ٹیپو کے شمشیر بھی
یہاں شان گردن میں زنجیر بھی
مرقع یہ اب دیکھے جاتے نہیں
قدم خود بڑھاتا ہے اب کارواں
اگر راہ بر راہ پاتے نہیں

(فیضؔ)

ہندستانی قومی فوج (آئی این اے) کے جانبازوں پر مقدمہ چل رہا ہے۔ رشید، سہگل، شاہنواز نوجوانوں کے خوابوں کے مجاہدِ آزادی ہیں۔ فرنگی بیداد کے خلاف احتجاج ایک طرف ہے اور دوسری طرف پھانسی کی سزا کو منسوخ کرنے کے لئے "رحم کی درخواست" ہے۔ مجنوں گورکھپوری۔

ہے تو بیداد مگر یہ نئی بیداد نہیں
اسی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں کتنے رشید
نام بھی جن کے ہمیں پوری طرح یاد نہیں
چڑھ کے پھانسی پر اتر آئے ہیں سہگل صد شکر
کتنے سہگل اسی پھانسی پہ مگر جھول گئے
ان شہیدوں کا ہر قطرۂ خوں نشتر ہنواز
رفتہ رفتہ جنہیں ارباب وطن بھول گئے

جانے ہم رحم کی درخواست کریں گے کبتک
کب تک آئین کی محتاط مذمت ہوگی
ایک اک نام پہ کہرام مچے گا کب تک
کب تک اس طرح بالاقساط بغاوت ہوگی

(کب تک)

نئی نئی ترکیبوں پر چونک جانے والا روایت آشنا دماغ "بالاقساط بغاوت" کی ترکیب

یہ ہجوم اٹھے تو تعجب کیا ہے؟ آزادی کی جدوجہد میں نو رزدہ اصلاح پسندی نے بھی تو کیا کو بغاوت کو اتنی قسطوں میں بانٹ دیا کر بانی تو کٹ چلے لیکن بغاوت رنگ نہ لیا پائی۔

اسی زمانے میں اپنی نظم "آخری مرحلہ" میں کیفی نے للکارا۔

ابھی کھلے نہ یہ پرچم ابھی پڑے کا نہ رن
کہ مشتعل ہے مگر متحد نہیں ہے وطن
پکارتا ہے اُفق سے لہو شہیدوں کا
کہ ایک ہاتھ سے نہیں کھلتی گلے کی رسن
یہ انتشار یہ ہلچل یہ مورچوں میں شگاف
مذاق اڑاتے ہیں عزم جہاد کے دشمن
یہ یاس کیوں؟ یہ تمنائے خودکشی کیسی؟
تو یہ فتح ہے قلبِ عوام کی دھڑکن

("آخری مرحلہ")

۱۹۴۵ء کے ابتدائی دن ہیں۔ عالمی جنگ کا نقشہ بدل رہا ہے۔ ہٹلر کو شکست پر شکست ہو رہی ہے۔ لینن گراڈ میں چائے پینے کے خواب دیکھنے والا خون خوار ڈکٹیٹر اب اپنے گھر میں پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ سرخ فوج جانب برلن یلغار کرتی بڑھ رہی ہے۔ یا لآخر مئی ۱۹۴۵ء میں برلن پر لال جھنڈا لہرانے لگا۔ کیفی ایسے ہی عالمی اہمیت کے "لمحے" کہتا ہے۔

ڈھل گئی شب صبحِ عشرت کا پیام آہی گیا
آفتابِ ماسکو بالائے بام آہی گیا
جن کو چڑھ تھی علم و حکمت سے ادب سے راگ سے
ہو گئے ٹھنڈے الجھ کر زندگی کی آگ سے
جشن یہ حوا کا ہے اور عید یہ آدم کی ہے
کارنامہ روس کا ہے فتح اک عالم کی ہے

("فتح برلن")

سنہ ۱۹۴۶ء اور سنہ ۱۹۴۷ء کے وہ ہولناک دن یاد کیجئے جب کہ انگلستان سے کابینی مشن کے آنے اور پھر لوٹ جانے کے بعد ہندو مسلم فسادات کی آگ بھڑکی ہوئی تھی وہی آگ جو سنہ ۱۹۲۳ء میں گاندھی جی اور علی برادران کی رہنمائی میں خلافت اور ترکِ موالات کی تحریک چلا چکے تھے جب کہ ہندو مسلم اتحاد کے روح پرور نعرے ملک میں عام تھے۔ آج وہی خون کی ہولی کھیل رہے تھے مسلم لیگ کا "راست اقدام" کانگریس کے "نعرۂ آزادی" سے "متصادم" تھا بنگال میں نواکھالی اور بہار کے فسادات نے ہندستان کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اور ادھر مزدور اور کسان "ریاستی عوام" آزادی کی نئی منزلوں کی طرف گامزن ہونا چاہتے تھے بے دور تھے۔ یہ تھا وہ لمحہ جب کہ کیفی نے اپنی مشہور مثنوی "خانہ جنگی" لکھی۔ عصری قومی حقیقتوں کو مثنوی کا روایتی لباس پہنایا ہے۔ میر حسن اور دیا شنکر نسیم بھی آج ہوتے تو اس "لمحہ" میں کچھ کہتے۔ کیوں کہ آج ان کی "بدر منیر" خون میں لتھڑی ہوئی اپنے ہی ہم وطنوں کی بہیمیت کا شکار ہے۔ کیفی کی یہ نظم بہت طویل ہے۔ اور سنانے میں کوئی ۴۰، ۴۵ منٹ لگ جاتے تھے لیکن مزدوروں اور عام لوگوں میں وہ جب سناتے تھے تو وہ ہمہ تن گوش اسے سنتے کیوں کہ یہ ان ہی کے ارمانوں کے خون اور آرزوؤں کی ناآسودگی کی کہانی ہے۔ کیفی کہتے ہیں۔

جب سے آ کر گئے ہیں اہل مشن
زندگی کا بگڑ گیا ہے چلن

خوں رو خون اے نواکھالی
ہو گئے دیکھ گھر کے گھر خالی

فطرتِ شرع میں فساد نہیں
رہزنی داخل جہاد نہیں

راست اقدام خون میں ڈوب گیا
آج اسلام خون میں ڈوب گیا

اے بہار ان کو کچھ تسلی دے
ہنس رہی ہیں بھائیوں کے لئے

تیسری روحانیت کا مجھنا
تونے بچوں کا خون چوس لیا

خون مذہب پہ، خون ریگاں پر
خون وید وں پہ، خون قرآن پر

لاش بھیمے سورما کی لاش
لاش نانک کی پیشوا کی لاش

لاش سوراج کی، خلافت کی
لاش ہر جہد، ہر بغاوت کی

تو محمد علی کی لاش ہے یہ
تو تلک سے بلی کی لاش ہے یہ

تو بھگت سنگھ سے جواں کی لاش
تو ہے موپلاگاس کی لاش

لاش ہے یہ علاحدیت کی
لاش ہے یہ اکھنڈ بھارت کی

لیکن کیفی اپنی مثنوی میں صرف اس منظر کو دکھانے ہی پر اکتفا نہیں کرتے۔ وہ مزدوروں اور کسانوں کی ان تمنائیوں پر بھی نظر رکھتے ہیں جو چنگاریوں کے روپ میں اب بھی نمایاں تھیں اور شعلہ بن کر بھڑکنے ہی کو تھیں۔ کوئی ہوا تو دے۔ پھر دیکھے۔

اب یہ طوفان بڑھتا جائے گا
اب یہ سیلاب چڑھتا جائے گا

کیفی اعظمی کے کلام کا تیسرا مجموعہ "آوارہ سجدے" ایک کیفیاتی تبدیلی کا مظہر ہے جہاں کیفی کی رومانیت؛ انقلابی حقیقت پسندی اور انسان دوستی اظہار کا نیا پہلو اختیار کر لیتی ہے اس منزل پر خیال کا خلوص فن کی پختگی سے مزید جلا پاتا ہے۔
کیفی نے خود کہا ہے کہ شاعر کا تخلیقی عمل اسی (انقلابی عوامی) جدوجہد کا ایک غیر محسوس حصہ

ہوتا ہے"۔ اور "رت جگا" ایک نظم کی تعمیر و تکمیل کے مرحلوں میں ہی کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے"۔ شاعری کا ایک مقصد شخصیت کی تکمیل بھی ہے"

"جھنکار" اور "آخر شب" کے تعمیر و تکمیل" کے مرحلوں سے گذر کر کیفی "کچھ سے کچھ" ہو گئے اور پھر "آوارہ سجدے" کے ایسے "مکمل مشاعر بن گئے" جواب بھی تعمیر میں ہیں۔

"آوارہ سجدے" کے کلام اور "آخر شب" اور "جھنکار" کے کلام میں جو فرق محسوس ہو گا وہ اگر ایک طرف کیفی کے شعری فن کے ارتقاء کی نشاندہی کرتا ہے تو دوسری طرف اس زبردست فرق کا بھی ایک فنکارانہ اظہار کرتا ہے جو "جھنکار" اور "آخر شب" کے زمانے اور بعد کے زمانے اور پھر آج کے دور کے درمیان ہے۔ عصر کے ساتھ عصری حاجتوں کی تبدیلی ناگزیر ہے اور یہ تبدیلی ادب کو متاثر کرے گی ہی اور یہی کچھ تاثر "آخر شب" کے کلام اور "آوارہ سجدے" کی اکثر نظموں کو پڑھ کر ہوتا ہے۔ پھر بھی کیفی یہ جب کہتے ہیں۔

کبھی آگے، کبھی پیچھے کوئی رفتار ہے یہ
ہم کو رفتار کا آہنگ بدلنا ہو گا
ذہن کے واسطے سانچے تو ڈھالے گی حیات
ذہن کو آپ ہی ہر سانچے میں ڈھلنا ہو گا

("دعوت")

تو صاف ظاہر ہے کہ وہ انقلابی قوتوں کے ٹیڑھے میڑھے راستوں پر آگے پیچھے چلنے کی ایک کربناک بیچارگی سے بے انتہا مضطرب ہیں۔

اور انہوں نے دیکھا کہ جس کمیونسٹ تحریک نے ان کی زندگی میں کشمکش کی بشارت دی تھی جس نے ان کو انقلابی قوتوں کی رہنمائی میں حیات افروز گیت گانے سکھائے تھے وہی کمیونسٹ تحریک پھوٹ کا شکار ہو رہی ہے۔ تب ان پر جو کرب و اضطراب طاری ہوا وہ کچھ ان کی نظم "آوارہ سجدے" سے ظاہر ہے۔

تم بھی محبوب میرے، تم بھی ہو دلدار میرے
آشنا مجھ سے مگر تم بھی نہیں، تم بھی نہیں

ختم ہے تم پہ مسیحا نفسی، چارہ گری
محرمِ دردِ جگر تم بھی نہیں، تم بھی نہیں
جن سے ہر دور میں چمکی ہے تمہاری دہلیز
آج سجدے وہی آوارہ ہوئے جاتے ہیں

مگر کیفی انقلاب اور ایک درخشاں مستقبل کی طرف سے کیفی مایوس نہیں ہوئے اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے ان کی شعری تخلیقات کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ کبھی کبھی حالات کی یلغار میں کیفی پر یہ موڈ بھی آیا تھا۔

چند ریکھاؤں میں سیماؤں میں
زندگی قید ہے، سیتا کی طرح
رام کب لوٹیں گے معلوم نہیں
کاش راون ہی کوئی آجاتا

پھر ۱۹۶۹ء کے آتے آتے کیفی یوں کہتے ہیں۔

ہم وہ راہی ہیں جو منزل کی خبر رکھتے ہیں
پاؤں کانٹوں پہ، شگوفوں پہ نظر رکھتے ہیں
کتنی راتوں سے نچوڑا ہے اجالا ہم نے
رات کی قبر پہ بنیادِ سحر رکھتے ہیں

او اندھیرے کے خدا، شمع بجھانے والے

(پہرہ)

۲۶ جنوری ۱۹۷۰ء کو یومِ جمہوریہ کے جشنِ چراغاں کے موقع پر کیفی نے بھی دیئے جلائے لیکن کچھ یہ بات تھی۔ ایک دیا نام کا، آزادی کے

اور آزادی کیسی؟

چاہے جس ملک سے گیہوں مانگو
ہاتھ پھیلانے کی آزادی ہے

ایک دیا نام کا خوش حالی کے
مگر
کتنی بدحالی ہے؟
پیٹ خالی ہے میرا جیب مری خالی ہے
ایک دیا نام کا، ایک جہتی کے
اور ایک جہتی کا خون ہو رہا ہے
قوم کو لڑتے، جھگڑتے دیکھا
ایسے میں بیوی نے چونکا دیا۔
دوسرے بیوی نے جھلّا کے کہا
تیل مہنگا بھی ہے، مفت بھی نہیں
کیوں دیئے اتنے جلا رکھے ہیں
آیا غصّے کا ایسا جھونکا
بجھ گئے سارے دیئے
ہاں مگر ایک دیا، نام ہے جس کا امید
جھلملاتا ہی چلا جاتا ہے
اسی امید کے دیئے کا دوسرا نام کیفی ہے۔

میری دانست میں "آوارہ سجدے" کی بہترین نظم، فنی اور معنوی ہر دو اعتبار سے "ابن مریم" ہے۔ کیفی عیسیٰ مسیح کے ایک بت کو دیکھتے ہیں جو راستے میں لگا ہے۔ اور پھر ان کے ذہن میں عیسیٰ مسیح ایک علامت کی طرح ابھرتے ہیں۔ علامت کی قربانی، قربانی ایمان اور انسان کے لئے۔ یہاں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غیر محسوس طور پر کیفی بھگوت گیتا کی اس تعلیم کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جب کبھی انسانیت بدی کے نرغے میں پھنسی ہوگی خدا خود اس کی نجات کے لئے پیدا ہوگا۔ عیسیٰ مسیح کے سولی پر چڑھ جانے کو کیفی نے اس رنگ میں دیکھا ہے۔
کہتے ہیں۔

اور خارش زدہ سے کچھ کتے
لیٹے رہتے ہیں بے نیازانہ
دم مروڑے کہ کوئی سر کچلے
کاٹنا کیا وہ بھونکتے بھی نہیں

یہ ہیں "جھنڈے کے خوگر غریب" جو کاٹتے تو کیا بھونکتے بھی نہیں۔

اور ادھر ویٹ نام کے جنگلوں میں "انجیل کے پڑھنے والوں" نے شہروں کو "مصلوب" اور دیہاتوں کو "زخمی" کیا اور روند ڈالا ہے۔ کیفی عیسیٰ مسیح کے بت سے مخاطب ہیں۔

تم یہاں سے ہٹو خدا کے لئے
جاؤ وہ ویٹ نام کے جنگل
اس کے مصلوب شہر، زخمی گاؤں
جن کو انجیل پڑھنے والوں نے
روند ڈالا ہے، پھونک ڈالا ہے
جانے کب سے پکارتے ہیں تمہیں
جاؤ ایک بار پھر ہمارے لئے
تم کو چڑھنا پڑے گا سولی پر

کیفی نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ اور غزلوں میں بھی یہی رومانی روایت اور عصری حقیقتوں اور سائل کی حیات افروز جہد حیات کا امتزاج ملتا ہے۔ اب غزل کا یہ شعر دیکھئے۔

مرے جنونِ پرستش سے تنگ آ گئے لوگ
سنا ہے بند کئے جا رہے ہیں بت خانے
جہاں سے پچھلے پہر کوئی تشنہ کام اٹھا
وہیں پہ توڑے ہیں یاروں نے پیمانے
پتھر کے خدا وہاں بھی پائے
ہم چاند سے آج لوٹ آئے

ہے آج زمیں کا غسلِ صحت
جس دل میں ہو جتنا خوں، لائے
صحرا صحرا ہوئے خیمے
پھر پیاسے لب فرات آئے

خار و خس تو اٹھیں، راستہ تو چلے
میں اگر تھک گیا، قافلہ تو چلے
بیلچے لاؤ، کھولو زمیں کی تہیں
میں کہاں دفن ہوں کچھ پتا تو چلے

آج ٹوٹیں گی تیرے گھر کی نازک کھڑکیاں
آج پھر دیکھا گیا دیوانہ تیرے شہر میں
جرم ہے تیری گلی سے سر جھکا کر لوٹنا
کفر ہے پتھراؤ سے گھبرانا تیرے شہر میں

میں ڈھونڈھتا ہوں جسے وہ جہاں نہیں ملتا
نئی زمیں، نیا آسماں، نہیں ملتا
نئی زمیں، نیا آسماں، مل بھی جائے
نئے بشر کا کہیں کچھ نشاں نہیں ملتا
وہ تیغ مل گئی جس سے ہوا ہے قتل مرا
کسی کے ہاتھ کا اس پر نشاں نہیں ملتا

کیفی نے عشق کیا ہے اور عشق کی شادی بھی کی ہے۔ ایک ہمہ وقتی انقلابی کارکن کے لئے شادی کا خیال ہی نئی الجھنیں پیدا کر دیتا ہے۔ عوامی زندگی اور گھریلو زندگی میں تصادم ہو

تو کیا ہوگا؟ شکیب جلالی نے جہدِ حیات کی طرف غلط اندازِ نگاہ سے دیکھا تو کیا ہوگا؟ یہ مسائل ایک نوجوان انقلابی پارٹی کے نوجوان کارکن کے دماغ میں ابھریں تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔ اور ان سوالوں کے لئے ایک ناپختہ دماغ کوئی بچکانی اندازِ فکر اختیار کرے تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔
جب ساحر نے کہا۔

ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر دو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو

تو میدانِ ادب کے پہلوان جنہوں نے کئی محبوباؤں کو مارِ سہ کھا تھا ساحر کی لے دے کرنے لگے۔ کیفی نے عشق کے ان تاروں کو پھر اس انداز سے چھیڑا ہے۔

تو کیا تم مجھ کو جلا ہی لوگی، گلے سے اپنے لگا ہی لوگی
جو پھول جوڑے سے گر پڑا ہے تڑپ کے اس کو اٹھا ہی لوگی
بھڑکتے شعلوں کو، کوندتی بجلی سے میرا خرمن بچا ہی لوگی
گھنیری زلفوں کی چھاؤں میں مسکرا کے مجھ کو چھپا ہی لوگی

کہ آج تک آزما رہی ہو
یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو

نہیں محبت کی کوئی قیمت جو کوئی قیمت ادا کرو گی
وفا کی فرصت نہ دے گی دنیا ہزار عزمِ وفا کرو گی
مجھے جینے دو رنج و غم سے سہارے کب تک دیا کرو گی
جنوں کو نہ آنا گدا اور بکھر لوں دامن تو کیا کرو گی

قریب بڑھتی ہی آ رہی ہو
یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو

(تصوّر)

ان شاعروں کا عشق بھی کتنا پاکیزہ، کتنا مقدس اور مطہر ہے۔ مخدوم جب پیار کرتے ہیں تو خدا بھی اس منظر کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے کہ یہ شب کی تاریکی میں کئے جانے والا گناہ نہیں ہے۔

اور کیفی کہتے ہیں۔

یا نکھر رہی ہوں جھٹپٹے میں معذوروں کی گھنٹیاں
یا منہ اندھیرے دور سے آتی ہو آواز اذاں
یا بند کر دے جھینپ کر خلوت کی کوئی کھڑکیاں

اور بج رہی ہوں چوڑیاں
اے بنتِ مریم گنگنا
اے روحِ نغمہ گائے جا

کیفی سخت بیمار بھی ہوئے فالج کا حملہ بھی ہوا۔ گوشت پوست کا کوئی انسان ایسے میں یاس والم کا شکار ہو جائے، مایوسیوں کی یلغار میں زندگی سے بیزار ہو جائے، تعجب کی بات نہیں لیکن کیفی کی بناوٹ اور ہی ہے ان کے یہاں "امید" کا دیا ہمیشہ جلتا رہتا ہے۔ اور کوئی بھی تیز ہوا کا جھونکا آج تک اسے بجھا نہ سکا۔ کہتے ہیں۔

رات جو موت کا پیغام لئے آئی تھی
بیوی بچوں نے مرے
اس کو کھڑکی سے پرے پھینک دیا
اور جو وہ زہر کا ایک جام لے آئی تھی
اس نے وہ خود ہی پیا
صبح اتری جو سمندر میں نہانے کے لئے
رات کی لاش ملی پانی میں

(زندگی)

یہاں بیوی علامت ہے ان اعلا اقدار کی جو کیفی کی زندگی کا اثاثہ ہیں اور اس کے "شریک حیات" ہیں۔ اور بچے خوش آیند مستقبل کی علامت ہیں۔ کھڑکی "امید" ہے رات "بیماری" ہے تو صبح "صحت" کی بشارت۔

یہ ہیں کیفی اعظمی اور ان کی شاعری، یہ وہ "راہی" ہے جو "منزل" کی خبر رکھتا ہے۔ اور حوصلہ یہ کہ "رات کی قبر" پر "سحر" کی بنیاد رکھے۔ کیفی اردو کی انقلابی شاعری کی مشعل لیے ہوئے ترقی پسندوں کے روزافزوں کارواں میں آگے چلنے والی "حقیقت" ہیں۔

اصغر علی انجینئر

کیفی اعظمی۔ شخصیت اور شاعری

۱۹۶۶ء میں فرانس کی کمیونسٹ پارٹی کے نظریاتی اور تہذیبی مسائل سے متعلق سہ روزہ اجلاس کے آخر میں ایک اہم قرارداد منظور کی گئی تھی۔ اس قرارداد میں کہا گیا تھا کہ:

"تہذیبی ورثہ ہر روز تخلیق کیا جا رہا ہے۔ یہ ہمیشہ حال میں تخلیق ہوتا ہے اور حال ہی ماضی میں تبدیل ہو جاتا ہے یعنی کہ حال کا یہ تہذیبی ورثہ ماضی کا ورثہ قرار پاتا ہے۔ اس لئے کسی حالت میں، کسی شخص کو بھی خالق کی تفتیشی اور تحقیقی آزادی پر پابندی عائد کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ ادب اور فن میں تجربے کی آزادی میں رکاوٹ پیدا نہیں کرنی چاہئے کیونکہ ایسی کوئی بھی کوشش تہذیبی ارتقا اور ذہنی آزادی کو سخت نقصان پہنچاتی ہے"۔

یہی نہیں اس سے بہت پہلے اینگلس نے اپنی کتاب ANTI- DIIHRING میں DIIHRING کے آرٹ اور کلچر کے متعلق خیالات کی سخت تنقید کرتے ہوئے صاف لفظوں میں اس بات کی وضاحت کر دی تھی کہ ہم ماضی کے ورثے کو نہ ہی یک قلم حذف کرنا چاہتے ہیں نہ ہی اس کی مذمت کرنا روا ہے DIIHRING تو گوئٹے کی شاعری کو بھی 'POETIC MYSTICISM' کہہ کر رد کرنے کا قائل تھا۔ اینگلس نے اس کے رویے سے سخت اختلاف کیا۔

مضمون کی ابتدا میں ان باتوں کا ذکر کرنا اس لئے ضروری سمجھا کہ جب بھی ترقی

پسند شاعروں یا ادیبوں کا ذکر آتا ہے یہ بحث چھڑ جاتی ہے کہ پارٹی لائن سے ان کا کمٹ منٹ ضروری ہے یا نہیں اور عام طور پران پر یہ الزام عائد ہوتا ہے کہ یہ اپنی تخلیقات کو پارٹی پروپگنڈہ کا ذریعہ سمجھتے ہیں میں یہ نہیں کہتا کہ یہ الزام سرے سے بالکل بے جا ہے۔ اردو میں کئی ترقی پسند ادیبوں کی تخلیقات میں ہمیں اس کا ثبوت بھی مل جاتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس مسئلے کو نظریاتی تعصبات کی وجہ سے صحیح تناظر میں سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ کیفی کی شاعری میں بھی ہمیں ایسے نمونے مل جاتے ہیں جن کی سطح پروپگنڈہ لٹریچر سے زیادہ بلند نہیں ہے۔ لیکن اس بنا پر کسی ادیب کے تخلیقی رول کی مکمل نفی بڑی غلط بات ہوگی۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں اس مسئلے پر کچھ اور روشنی ڈالنا ضروری ہے تاکہ ہم اسے صحیح تناظر میں سمجھ سکیں۔

مارکس اور اینگلس فکری اور تخلیقی آزادی کی مکمل حمایت کرتے تھے۔ مارکس نے جرمن اور یوروپی کلاسیکی ادب کا طالب علمی کے زمانے سے گہرا مطالعہ کیا تھا اور بار بار اپنی تحریروں اور خطوط میں اس بات پر زور دیا ہے کہ فنکار سماجی مسائل کا نہ حل پیش کر سکتا ہے نہ ہی اسے اس بات پر مجبور سمجھنا چاہئے۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مارکس اور مارکسزم کی اتنی واضح پوزیشن ہونے کے باوجود سوویت یونین میں خاص طور سے اسٹالن کے دور میں ژدانوف کی تہذیبی علمبرداری کے تحت اس سے بالکل الٹ رویہ کیوں اختیار کیا گیا؟ نہ صرف یہ بلکہ دوسرے ممالک میں بھی جن میں ہندوستان بھی شامل ہے ادیبوں کو پارٹی لائن سے تحریک حاصل کر کے تخلیق کرنے پر کیوں مجبور سمجھا گیا؟ یہ مضمون چونکہ کیفی سے متعلق ہے اور براہِ راست اس موضوع سے تعلق نہیں رکھتا ہم اس کا مختصر جائزہ لیں گے۔

دراصل ادب اور سماجیات کا گہرا رشتہ ہے۔ ہمارے ذہنی رویے آس پاس کے سماجی حالات اور قومی امنگوں سے طے ہوتے ہیں۔ نظریہ، ایک آئیڈیل کو پیش کرتا ہے اور موجودہ حالات عام طور پر اس سے بے حد مختلف ہوتے ہیں۔ روس انقلاب کے وقت بے حد پچھڑا ہوا ملک تھا اور اسے جاگیردارانہ یا نیم جاگیردارانہ دور سے نکال کر صنعتی اور سماج وادی دور میں لانا بے حد مشکل اور پیچیدہ عمل کا متقاضی تھا۔ ظاہر ہے

اس کام کے لئے قوم کی ساری قوت درکار تھی۔ فرائڈ کی اصطلاح میں ایسے حالات میں تفریحی اُصول پر (PLEASURE PRINCIPLE) کام کا اصول (WORK PRINCIPLE) حاوی ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی دور میں بھی فنی تخلیقات کے سلسلے میں ایسا ہی رویہ اختیار کیا گیا تھا۔ اقبال کی زبان میں ؏

"شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر"

قومی مصلحت کا تقاضہ ہوتا ہے کہ ایسے حالات میں مجموعی قوا‌ء ترقیاتی عمل پر صرف ہوں اور ہر ذریعہ اس مقصد کے لئے وقف کر دیا جائے۔ ظاہر ہے ادبی تخلیقات بھی اس زمرے میں آجاتی ہیں اور ایسے بحرانی دور میں تفریحی مشاغل اور محض رومانی جذبات کے اظہار کیلئے شاعری یا ادبی تخلیقات کو وقف کر دینا یا مبہم، گنجلک اور علامتی اظہار پر زور دینا محض ذہنی عیاشی قرار پائے گی بلکہ ــ اور عام طور پر یہی ہوا بھی ہے۔ مایوسی اور فرسٹریشن کے اظہار کو بھی ناروا قرار دے دیا جاتا ہے۔

اسٹالن اقتدار میں آنے کے بعد "ایک ملک میں سماج واد" کا نعرہ دے چکا تھا اور کسی بھی قیمت پر روس کو مادی ترقی کے پیچیدہ اور دشوار گذار مراحل سے ایک لمبی جست کے ذریعے گذار کر سماج واد کی طرف لے جانے پر تلا ہوا تھا۔ ایسے حالات میں پارٹی نے اسٹالن کے اشارے پر کلچرل ذرائع کو بھی اسی مقصد کے لئے استعمال کرنے پر زور دیا اور پارٹی لائن سے انحراف زبردست جرم قرار دیا گیا۔ اس پر اسٹالنی ڈکٹیٹرشپ نے اپنے گل کھلائے اور سوال محض آرٹ یا ادب کی مقصدیت کا ہی نہیں رہا بلکہ مکمل ذہنی کنٹرول کا بن گیا۔ اگر اصرار مقصدیت کا ہوتا تو کوئی برائی نہیں تھی کیونکہ عالمی عظیم ادب مقصدیت کا حامل رہا ہے۔ یہاں تو سوال مکمل ذہنی کنٹرول کا تھا۔

جب ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کی شروعات ہوئی تو ہم آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھے اور ظاہر ہے ترقی پسند ادب کو اس قومی اُمنگ کی عکاسی اس دور میں کرنا تھی۔ زیادہ تر ترقی پسند ادیبوں کا تعلق جاگیردارانہ یا نیم جاگیردارانہ گھرانوں اور ماحول سے تھا اور وہی اقدار ان کے مزاجوں میں رچی بسی ہوئی۔

تھیں۔ ملک میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کا سیلاب اُمڈ رہا تھا اور اس دور میں ایسی شاعری اور تخلیقات کو قطعاً قابلِ اعتراض نہیں سمجھا گیا۔ جس میں ہماری آزادی کی اُمنگوں اور مبنی بر انصاف معاشرے کی آرزوؤں کی عکاسی کی گئی تھی۔ وہ کمیٹیڈ شاعری تھی اور ظاہر ہے معمولی استعداد کے شاعروں نے محض نعرہ بازی بھی کی اور محض گھن گرج سے بھی کام لینا چاہا۔ ساتھ ساتھ اُسی دور میں روایتی شاعری کے خلاف بغاوت نے ایک اور رُخ اختیار کیا تھا اور حلقۂ اربابِ ذوق کی شاعری بھی ہو رہی تھی جو دراصل PLEASURE FRINCIPLE کی شاعری تھی۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا جب قوم جدوجہد میں مصروف ہو طاؤس و رباب پر شمشیر و سناں کی اوّلیت زیادہ قابلِ قبول ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اپنی کوتاہیوں کے باوجود ترقی پسند شاعری حلقۂ اربابِ ذوق کی شاعری پر چھا گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جمالیاتی عناصر شاعری کا بہت اہم جزو ہوتے ہیں اور اس کے بغیر شاعری صحیح معنیٰ میں شاعری نہیں ہو سکتی لیکن اگر ہم عالمی ادب کو سامنے رکھیں تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ محض جمالیاتی عناصر (یا دوسرے لفظوں میں ادب برائے ادب) کے بل بوتے پر بھی بڑی شاعری نہیں ہو سکتی حالاں کہ اسے اچھی شاعری ضرور کہا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندستان جیسے پچھڑے ہوئے ملک میں جہاں عوام ابھی اقتصادی بہتات (AFFLUENCE) کے دور میں داخل نہیں ہوئے ہیں بلکہ اپنی ضروریات کے لئے جدوجہد میں مصروف ہیں، حلقۂ اربابِ ذوق کی شاعری کو اپنے اہم ورثے کے طور پر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ایسی شاعری کی اپیل ایک خاص حلقے تک ہی محدود رہتی ہے۔ مارکس نے اپنی تحریروں میں ہمیشہ جمالیات کے انسانی اور سماجی کردار پر زور دیا ہے۔ مارکس کے قبل جرمن کلاسیکی ادب اور فلسفے میں (جن میں کانٹ، ہیگل وغیرہ بھی شامل ہیں) جمالیات کا مجرّد (ABSTRACT) تصوّر تھا اور اس میں سماجی سمت شامل نہیں تھی۔ مارکس پہلا مفکّر تھا جس نے جمالیات کو تجرّد کے دائرے سے خارج کیا، اس کو تاریخی عمل کے میدان میں داخل کیا اور اس کا رشتہ سماج اور پیداواری طاقتوں سے جوڑا۔

ہمیں کیفی جیسے ترقی پسند شاعر کے فن اور مزاج کو سمجھنے کے لئے اس پس منظر کو سامنے رکھنا ہوگا۔ ابتدا میں کیفی کی شاعری کا آہنگ رومانوی تھا اور اس رنگ میں ان کے یہاں ہمیں کئی اچھے اشعار ملتے ہیں۔ ان کے ابھی تک تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جھنکار، آخرِ شب اور آوارہ سجدے۔ اول الذکر مجموعے میں ان کے ابتدائی دور کا کلام ہے (یہ مجموعہ اس وقت میرے سامنے نہیں ہے) ثانی الذکر مجموعے میں ۱۹۴۷ء تک کا کلام شائع ہوا تھا اور اس کے بعد کا انتخاب کردہ کلام "آوارہ سجدے" میں چھپا ہے۔

آخرِ شب کی ابتدائی نظمیں خالص رومانی انداز کی ہیں۔ مثلاً ان کی نظم تصور

یہ کس طرح یاد آ رہی ہو یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو
کہ جیسے سچ مچ نگاہ کے سامنے کھڑی مسکرا رہی ہو
یہ جسم نازک، یہ نرم باہیں، حسین گردن سڈول بازو
شگفتہ چہرہ، سلونی رنگت، گھنیرا جوڑا سیاہ گیسو
نشیلی آنکھیں، رسیلی چتون، دراز پلکیں، مہین ابرو
تمام شوخی، تمام بجلی، تمام مستی، تمام جادو
ہزاروں جادو جگا رہی ہو
یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو

یا ان کی نظم ملاقات:

کلی کا روپ، پھول کا نکھار لے کے آئی تھی
وہ آج کُل خزانہ بہار لے کے آئی تھی
جبین تابناک میں کھلی ہوئی تھی چاندنی
وہ چاندنی میں عکسِ لالہ زار لے کے آئی تھی

. . . .

گلابی انکھڑیوں کی سحر کاریوں میں خندہ زن
غرورِ فتح و رنگِ اعتبار لے کے آئی تھی

وہ سادہ سادہ عارضوں کی شکریں ملاحتیں
ملاحتوں میں سرخی انار لے کے آئی تھی

اسی طرح ان کی دوسری نظمیں پشیمانی، مجبوری، نقش و نگار، اندیشے، احتیاط وغیرہ یہی آہنگ لئے ہوئے ہیں۔ ان نظموں میں ہمیں رومانی شاعری کے بہترین نمونے مل جاتے ہیں۔ ان میں موسیقیت بھی ہے اور رچاؤ بھی، رنگینی بھی ہے اور حسن و عشق کی چاشنی بھی غرضیکہ فارسی اور اردو کی کلاسیکی روایات، اور جمالیاتی عناصر ان کی اس شاعری میں پائے جاتے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں ایک اچھے اور روایتی اعتبار سے مقبول شاعر ہونے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ "ملاقات" کے ہی یہ اشعار دیکھئے!

لب شگفتہ جیسے ہیں گدگدی شراب کی
شراب میں گھلے ہوئے شرارے کے آئی تھی
دراز زلف میں گندھی ہوئی تھی مالوے کی رات
سیہ لٹوں میں شام بادہ خوار لے کے آئی تھی
وہ قامتِ بلند جیسے بھیرویں کی مت تان
وہ لوچ جیسے موج جوئے بار لے کے آئی تھی

. . . .

چٹک رہی تھی قہقہوں میں ہر سنگھار کی کلی
ہنسی میں نور و رنگ کی پھوار لے کے آئی تھی

یہ اور اس سے بہتر اشعار ان کی اس قبیل کی نظموں میں موجود ہیں۔ ان کی یہ شاعری فیوڈل ماحول کی غماز ہیں اور جاگیردار طبقے کے PLEASURE PRINCIPLE کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کی اس قبیل کی شاعری میں الفاظ کا بانکپن، رعنائی خیال اور وفورِ جذب و شوق سبھی کچھ مل جاتا ہے اور کسی بھی شاعر کا ادب میں مقام پیدا کرنے کے لئے یہ صفات کم نہیں ہیں۔

لیکن کیفی نے اپنے سماجی شعور کی بالیدگی کے ساتھ اپنی شاعری کے رنگ و

آہنگ کو بدلنا ضروری سمجھا حالانکہ ان کی شاعری کا سماجی آہنگ ان کے بنیادی طور پر رومانی اور عاشقانہ مزاج سے میل نہیں کھاتا اور ان کی شاعرانہ لوچ، گھلاوٹ اور غنائی خیال بڑی حد تک اس سے متاثر ہوئی ہے۔ لیکن کیفی۔ اور باشعور نقادوں کو اس بات کی داد دینی چاہیئے۔ اپنے مزاج کے بنیادی تقاضوں کے خلاف ایک دوسرا راستہ اختیار کرتے ہیں جو رومان کی خیالی دنیا سے کہیں زیادہ دشوار تر سماجی ذمے داریوں کا راستہ ہے۔ ان کی شاعری کا کیف و سرور کم ہوا لیکن سماجی شعور کی آنچ تیز ہو گئی۔ آخر شب میں شامل ان کی نظم "منظر خلوت" پہلی نظم ہے (یہ نظم ۱۹۴۳ء میں لکھی گئی تھی) جو کیفی کی شاعری کے نئے موڑ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس میں ایک بیوہ کی ایک ملا کے ہاتھ عصمت دری کا واقعہ نظم کیا گیا ہے اور اس طرح مذہب کے نام پر اکسپلائٹیشن کی مذمت کی گئی ہے لیکن اس نظم کا آہنگ رومانیت لئے ہوئے ہے اور اس میں ان کی رومانی شاعری کے سارے عناصر موجود ہیں۔ اسی طرح ان کی نظمیں فیصلہ، تلاش، کب تک، آخری مرحلہ جو ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء کے درمیان لکھی گئیں، اس دور کے سیاسی حالات کے کسی نہ کسی پہلو کو تھیم بنا کر لکھی گئی ہیں اور کیفی کے نئے موڑ اور نئے شعور کی عکاسی کرتی ہیں۔ لیکن ان نظموں میں بھی ہمیں ان کی شاعری کے لہجے میں خاص تبدیلی محسوس نہیں ہوتی، اس میں اب بھی وہ نرمی اور گھلاوٹ پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی نظم "آخری مرحلہ" جس کی تھیم سیاسی ہے کے یہ اشعار دیکھیئے۔

خمار بادۂ اقبال کا نگاہوں میں
لبوں پہ نغمۂ شگور مسکرائے ہوئے
جبیں پہ دھان کے کھیتوں کی نرم ہریالی
نظر میں قحط کی پرچھائیاں چھپائے ہوئے

لیکن آگے چل کر ہمیں ان کے یہاں ایسی بھی نظمیں ملتی ہیں جن میں براہ راست سیاسی تھیمس کو نظم کر دیا گیا ہے یا سیاسی سیچویشن کو، ایسا لگتا ہے، منظوم طریقے سے پیش کر دیا ہے۔ ان کی نظم "تربیت" کے یہ اشعار اس کی گواہی دیتے ہیں۔

لٹنے ہی والا ہے دم بھر میں حکومت کا سہاگ
لگنے ہی والی ہے جیلوں، دفتروں تھانوں میں آگ
مٹنے ہی والا ہے خوں آشام دیوِ زر کا راج
آنے ہی والا ہے ٹھوکر میں الٹ کر سر سے تاج
چھٹنے ہی والی ہے ظلمت پھٹنے ہی والا ہے نور
ہلنے ہی والی ہیں قبریں پھنکنے ہی والا ہے صُور

یا ان کی نظم "یلغار" کے یہ اشعار!

مٹ رہا ہے ظلم کا نام و نشاں
اُڑ رہی ہیں نازیت کی دھجیاں
اُٹھ رہا ہے قلبِ وحشت سے دھواں

بجلیاں برسا رہی ہے سُرخ فوج
سوئے برلن جا رہی ہے سُرخ فوج

ان کی نظمیں "فتح برلن"، "ہم آگے بڑھتے ہی جا رہے ہیں" وغیرہ اسی قبیل کی نظمیں ہیں حالانکہ ان میں کچھ اشعار ایسے ہیں جن میں اچھی شاعری اور موسیقیت کے سارے لوازم موجود ہیں۔ آخرِ شب کی میرے خیال سے سب سے کمزور نظم "لال جھنڈا ہے"۔ اسی مجموعے میں ان کی ایک طویل مثنوی "خانہ جنگی" بھی شامل ہے جو تقسیم وطن کے المیے سے متعلق ہے اور اس کے کئی اشعار دل میں اتر جانے والے ہیں۔

کیفی کی ان نظموں کی طرف میں نے خصوصاً اس لئے اشارہ کیا ہے کہ یہ ہماری ترقی پسند شاعری کے اہم دور کی نمائندگی کرتی ہیں۔ شاعری بہت ہی پیچیدہ تخلیقی عمل کا نام ہے اور ظاہر ہے اس کے کئی پہلو ہیں۔ بعض نقاد ابہام اور علامتوں کو شاعری کا اہم جزو قرار دیتے ہیں اس لئے کہ اس سے شاعری کی تہ داری میں اضافہ ہوتا ہے اور اس میں کاشناتی ڈائمنشن پیدا ہو جاتا ہے ظاہر ہے جو ابہام اور علامتی زبان کو اتنی اہمیت دیتے ہیں وہ ایسی شاعری جس میں براہِ راست اور بیانیہ

طرز سے جذبات کو پیش کیا جاتا ہے، کو قابلِ اعتناء نہیں سمجھتے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شاعروں کا یہ نظریہ تمام حالات میں قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ ابہام اور علامت شاعری میں تہ داری پیدا کرتی ہیں مگر بعض حالات میں اور خصوصاً جب ملک و قوم کسی زبردست بحرانی دور سے گذر رہے ہوں، ابہام اور علامت کے مقابلے میں ایک کمیٹیڈ شاعر اپنے جذبات کو براہِ راست طریقے سے ہی پیش کرنا پسند کرے گا۔ اور ہو سکتا ہے وہ عوام کا جذبہ بیدار کرنے کے لئے زورِ بیان اور خطابت سے بھی کام لے۔ اقبالؔ کے یہاں بھی ہمیں "اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو" قسم کے اشعار ملتے ہیں۔ ترقی پسند شاعروں نے اپنے اُس دور کے مخصوص حالات میں ایسی ہی شاعری کو ترجیح دی جو عوام سے براہِ راست خطاب کرتی ہو۔ مارکس نے ادب کی خود مختاری کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ یوروپ کے کلاسیکی ادب کو اپنے سامنے رکھ کر اس کے اعلیٰ معیار مقرر کئے۔ مگر روس انقلاب سے پہلے اور فوراً بعد اور ہندوستان اپنی جدوجہدِ آزادی کے دوران جن بحرانی حالات سے دوچار تھا، اُن حالات میں فن کے مقابلے میں مقصدیت کی اہمیت کچھ بڑھ جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ لینن نے مایاکوفسکی کی فیوچرسٹ شاعری پر ناک بھوں چڑھایا کیونکہ اُسے اُس کی شاعری میں عوام کی انقلابی اُمنگوں کی براہِ راست کوئی عکاسی نظر نہیں آتی تھی۔ یہ ضرور ہے کہ مقصدی شاعری اکثر ہنگامی ہو کر رہ جاتی ہے اور آنے والے دور میں اس اہمیت یا تو کم ہو جاتی ہے یا کوئی اہمیت ہی نہیں رہ جاتی۔ بہر حال فنی تقاضوں اور مقصدیت کی بڑی طویل بحث ہے اور اس کی تفصیل میں جانا یہاں ہمارا مقصد نہیں ہے۔ ہم صرف یہ سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ شاعری میں ایک خاص رجحان کیوں اور کیسے پیدا ہوا۔ اگر کوئی خاص رجحان چند مخصوص حالات میں پیدا ہوتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ شاعری کے فنی تقاضوں کی اہمیت نظر انداز کر دینا چاہئے۔ البتہ حالات کے دباؤ کے تحت شاعر کسی ایک پہلو کو نظر انداز کر کے دوسرے پہلو پر زور دے سکتا ہے۔ ترقی پسندوں نے ابلاغ کے پہلو پر زیادہ زور دینا مناسب سمجھا اور اُس دور میں یہ ضروری بھی تھا۔

آزادی کے بعد ایک نیا دور شروع ہوا اور چھٹے دہے کے شروع ہوتے ہوتے ہمارے سماج میں کافی تبدیلیاں آئیں۔ کمیونسٹ پارٹی کو بھی ایک بحرانی دور سے گذرنا پڑا اور آخر ۱۹۶۴ء میں اس کے بھی دو ٹکڑے ہو گئے۔ ہمارے ترقی پسند ادیب اور شعراء بھی اپنے "نو مسلمی" کے دور سے گذر کر نئے تجربوں سے دوچار ہوئے اور ان کے شعور میں نئی بالیدگی پیدا ہوئی۔ اِدھر صنعتی ترقی نے نئے شہروں کی اہمیت میں اضافہ کیا اور ہم فیوڈل ماحول سے نکل کر صنعتی اور شہری کلچر کے دور میں داخل ہوئے اس عمل میں پرانے رشتے (میری مراد انسانی رشتوں سے ہے) ٹوٹتے بکھرتے گئے اور سرمایہ دارانہ سماج کے نئے رشتے اُبھرنے لگے۔ ان نئے رشتوں میں پرانی تہذیب کی نرمیاں نہیں تھی اور سارا زور مارکس کے الفاظ میں "CASH NEXUS" پر تھا۔ ہم اب تک نیم جاگیردارانہ ماحول اور اس کی پیدا کردہ قدروں کے دلدادہ تھے اور صنعتی اور تجارتی سماج کی نئی قدروں، اور صنعتی شہروں کی انسان کش تیز رفتار زندگی سے بالکل آشنا نہ تھے۔ اس نئے ماحول نے ادبی تقاضوں کو بھی بڑا متاثر کیا اور ترقی پسندی کی مقبولیت ان نئے حالات میں کم ہوتی چلی گئی۔ جدیدیت کی تحریک نے "شاک تھیراپی" کا کام کیا اور ادبی دنیا میں ایک نئی ہلچل پیدا ہو گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جدیدیت کی تحریک نے نئی حسیت پر زور دیا اور ترقی پسندی کے جمود کو توڑا۔

کیفی بھی خاموشی سے نئے حالات کا مشاہدہ کر رہے تھے اور ان میں بھی داخلی طور پر ایک خاموش انقلاب آ رہا تھا۔ پھر بمبئی جیسے شہر میں جینے کی حوصلہ شکن جد و جہد حساس شاعر کو کیسے متاثر کئے بغیر رہ سکتی ہے۔ شہری زندگی میں پرانی اقدار کی یہی شکست و ریخت تھی جس نے جاں نثار اختر سے اُن کے آخری دور میں اتنی خوبصورت غزلیں کہلوائیں۔ کیفی کی شاعری میں بھی بنیادی تبدیلی آئی اور اس کا ثبوت ان کا مجموعہ کلام "آوارہ سجدے" ہے۔ اس میں ۱۹۴۷ء کے بعد پچھلے ۲۵ برس کا کلام شامل ہے۔ کیفی اس تبدیلی کا نہ صرف شعور رکھتے ہیں بلکہ اس پر اصرار بھی کرتے ہیں۔ آوارہ سجدے کے دیباچے میں کیفی لکھتے

ہیں ؟ انسان ہمیشہ اپنے ماحول اور ماحول کے ساتھ اپنے آپ کو بدلتے رہنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ میری شاعری کا موضوع یہی عظیم جدوجہد ہے " اور بڑی حد تک ان کی یہ جدوجہد کامیاب بھی ہے۔ ان کی شاعری کا نیا آہنگ نہ صرف عصری حسیت لئے ہوئے ہے ایہ کمٹ منٹ کے تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ ان کا کمٹ منٹ کا تصور بھی بدلا ہے۔ پہلے کمٹ منٹ کا تصور بڑی حد تک پارٹی لائن تک محدود تھا اور کمٹ منٹ کی نوعیت بھی عقیدت مندی کی تھی۔ اب نہ کمٹ منٹ پارٹی لائن تک محدود ہے نہ ہی اس کی نوعیت عقیدت مندی کی رہ گئی ہے۔ اب نہ صرف اس کا دائرہ وسیع ہوا ہے بلکہ عقیدت نے تشکیک کو راہ دی ہے۔ کمیونسٹ اکائی ٹوٹنے نے بھی ان کی عقیدت کو مجروح کیا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں " اس دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ کمیونسٹ اکائی ٹوٹ گئی، سب کے سجدے آوارہ ہو گئے "۔ یہ بات بے معنی نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے مجموعے کا نام بھی " آوارہ سجدے " رکھا جو دراصل اس نظم کا عنوان ہے جو انہوں نے ۱۹۶۲ء میں کمیونسٹ اکائی کے ٹوٹنے پر لکھی تھی۔ عقیدتمندی سے جینا آسان ہے کیونکہ عقیدہ نہ صرف ہماری تمام امیدوں کا مرکز ہوتا ہے بلکہ ہمارے اعمال کا مطلوب اور ہماری آرزوؤں کا مسجود بھی۔ لیکن اگر یہ عقیدہ پارہ پارہ ہو جائے تو جینا اپنی روح کی لاش آپ اٹھانا ہے:

اپنی لاش آپ اٹھانا کوئی آسان نہیں
دست و بازو مرے ناکارہ ہوئے جاتے ہیں
جن سے ہر دور میں چمکی ہے تمہاری دہلیز
آج سجدے وہی آوارہ ہوئے جاتے ہیں

(آوارہ سجدے)

یہ پارٹی سے DISILLUSIONMENT ہی ہے جو ایسے شعر کہلواتا ہے:

راہ میں ٹوٹ گئے پاؤں تو معلوم ہوا
جز مرے اور مرا راہ نما کوئی نہیں

ایک کے بعد خدا ایک چلا آتا تھا
کہہ دیا عقل نے تنگ آکے خدا کوئی نہیں

کیفی کی پہلے دور کی شاعری (یعنی "آخرِ شب" تک کی شاعری) پارٹی پر ایمان کی شاعری تھی جس میں کہیں کہیں ایمان فن پر حاوی ہو جاتا ہے۔ دوسرے دور کی شاعری ("آوارہ سجدے" والے مجموعے) تشکیک کی شاعری ہے اور سچ بات تو یہ ہے کہ تشکیک کے عذاب سے گذر کر ہی شاعر کے تجربے میں صداقت اور جذبات میں تڑپ پیدا ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "آوارہ سجدے" کی نظمیں زیادہ جاندار اور تجربات کی صداقت پر پوری اترنے والی ہیں۔ ان میں ایمان کی حرارت کے ساتھ ساتھ تشکیک کی جہنم بھی شامل ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار اسی تشکیک کے غماز ہیں اور چوٹ کرنے والا تیکھا پن لئے ہوئے ہیں:

وہ تیغ مل گئی جس سے ہوا تھا قتل مرا
کسی کے ہاتھ کا اس پر نشاں نہیں ملتا

یا ایسا اک شور بپا کر دو ـــــ کوئی بات بھی واضح نہ رہے

یا اندھیرے کنوئیں سے نکل کر بھی شاعر کو مصر کے بازار کی روشنی مایوس کرتی ہے اور پھر

میں نے ڈر کے لگا دی کنوئیں میں چھلانگ
سر پٹکنے لگا پھر اُسی کرب سے
پھر اُسی درد سے گڑگڑانے لگا
روشنی چاہئے، چاندنی چاہئے، زندگی چاہئے

اب کیفی حیات کا دامن بھی جن لوگوں سے باندھتے ہیں، اُن کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

یہ لوگ جن کو خدا بننے کی نہیں خواہش ❊ یہ لوگ جن کی شب ماہ ہے نہ صبحِ وطن
یہ لوگ جن کی کوئی شکل ہے نہ نام نگیں ❊ ہنسی میں ڈھال کے جیتے ہیں یہ ہی رنج و محن
خدائے حاضر و غائب کی ہیں یہ وہ بھیڑیں ❊ جنھیں چراتے ہیں صدیوں سے رہبرانِ وطن
یہ لوگ جو ہیں ہر اک فن کا خام سرمایہ ❊ انھیں سے باندھا ہے میں نے حیات کا دامن

"آوارہ سجدے" میں شامل ابنِ مریم، اگر بھوتی، پیر تسمہ پا، چراغاں، عادت، دائرہ، دوسرا طوفان،

ڈھاکہ اور بنگلہ دیش اچھی نظمیں ہیں جن پر عصری حسیت کی گہری چھاپ ملتی ہے اور جو شاعر کے کرب کا بڑی خوبصورتی سے اظہار کرتی ہیں۔

ان کی نظم "آثارِ قدیمہ" کا یہ منظر بھی کتنا قہر آلود مگر کتنی سچائی لئے ہوئے ہے:

شاہسواروں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے اٹھنے والی گرد تو کب کی بیٹھ گئی ہے
کلچر کا پرچم لے کر چلنے والے شاعر اور مورخ اپنی اپنی گور میں چپ لیٹے ہیں
ریشم اور کتان معیاروں کی آرائش کے سامان کی اب چاہ نہیں کچھ
سوداگر اپنے اپنے ملکوں کی یہ مصنوعات نہیں لے جاتے
مہلک انسان کش ہتھیاروں کا سودا کرتے ہیں۔۔۔۔
عشق کی سب راہیں ویران ہوئیں اب ہر جا خاک اڑتی ہے
جابر شاہوں کے تابوت ان کی قبروں میں گل کر خاک ہو گئے سب
لیکن ان کی روحیں دوسرے جسموں میں در آئی ہیں
کوچہ کوچہ قاتل مشعل لے کر گھوم رہے ہیں

اسی پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو چارو مجمدار کی یاد میں لکھی گئی نظم ڈھاکہ کی یہ لائنیں کتنی بامعنی لگتی ہیں:

یہ ڈھاکہ بس ڈھاکہ ہے ڈھاکے کے سوا کچھ بھی نہیں
وہ بھی تو بس اک ڈھاکہ تھا ڈھاکے کے سوا کچھ بھی نہیں
جس سے اچھلیں کہکشائیں
جس سے ابھری کائنات
گھر سے جب بھی نکلو باہر دوستو!
کچھ ڈھاکے بھر لو اپنی جیب میں

ہر گھڑی ہر دم کوئی تازہ ڈھاکہ دوستو
کون جانے کوئی ذرہ لوٹ جائے

حالات کے تقاضے کے ساتھ اپنی شاعری کے آہنگ کو بدل لینا اتنا

آسان نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ کلاسیکی روایت اور ترقی پسند روایت کے شاعر آج اپنے آپ کو ٹھہرا ہوا پاتے ہیں۔ لیکن کیفی نے بمبئی کی زندگی کے جہنم میں جل کر واقعی اپنی شاعری کو اپنے کرب و بے بسی اور تشکیک کے بڑی حد تک کامیاب اظہار کا ذریعہ بنایا۔ کیفی کے داخلی انقلاب نے ان کی شاعری کے آہنگ میں انقلاب پیدا کیا اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

آغا رشید مرزا

گھاٹ کے پتھر کو بھی ہے انساں کی تلاش

کیفی گھاٹ کا پتھر ہے۔ وقت کی تند و تیز موجیں اس سے ٹکراتی ہیں اور واپس ہو جاتی ہیں۔ وہ انھیں اپنا احساس دے دیتا ہے اور زندگی کے بحرِ بیکراں میں پھر واپس کر دیتا ہے۔ لیکن یہ پتھر میں احساس کیسا، پتھر تو پھر پتھر ہی ہے۔ نہیں قدرت نے احساس ہر شے کو عطا کیا ہے۔ اگر پتھر میں احساس نہ ہوتا تو اس پر چوٹ پڑتے سے آواز کیوں نکلتی، بلندی سے پھینک دینے پر وہ ٹکڑے ٹکڑے کیوں ہو جاتا۔ فن کار ایک سنگ گراں ہی ہوتا ہے جو مظالم کی بارشِ سنگ کا ہر طرح مقابلہ کرتا ہے اور جب پتھر سے پتھر آپس میں ٹکراتے ہیں تو شعلہ ضرور پیدا ہوتا ہے جو کبھی آتش فشاں، کبھی طوفان بن جاتا ہے۔ سطح کتنی ہی پُر سکون ہو، روشنیاں کتنی ہی تیز ہوں۔ دیئے کتنے ہی روشن ہوں۔ لیکن یہ طوفان تہہ میں مچلتی ہوئی لہروں کو سطحِ آب پر پہنچا ہی دیتا ہے۔ روشنیوں کے پیچھے چھپے ہوئے اندھیروں کو اجالے میں لے ہی آتا ہے۔

اک دیا نام ہے خوش حالی کا
اس کے جلتے ہی یہ معلوم ہوا
کتنی بد حالی ہے
پیٹ خالی ہے مرا، جیب مری خالی ہے۔ (کیفی)

گھاٹ کے اس پتھر پر میری نظر نومبر ۵ ۷ء کے آخر میں پڑی اور کچھ دیر کے لئے جمی کی جمی رہ گئی۔ کلکتہ میں اردو ایڈیٹرز کانفرنس کی رونق لگی ہوئی ہے۔ ادبی حلقہ میں گہما گہمی ہے۔ آل انڈیا مشاعرہ کا اہتمام بھی ہے۔ شعرا گریٹ ایسٹرن ہوٹل میں قیام پذیر ہیں۔ اعجاز صدیقی مرحوم کا قیام بھی وہیں ہے۔ میں ان سے دن میں کئی مرتبہ ملنے جاتا ہوں۔ میرا زیادہ وقت ان ہی کے ساتھ گذرتا ہے۔ وہ بھی مجھے ایک لمحہ چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اعجاز کے کمرہ کے قریب آتے جاتے دیکھتا ہوں۔ ایک کمرہ پر تختی آویزاں ہے۔ "ڈونٹ ڈسٹرب پلیز" (DO NOT DISTURB PLEASE) میں سوچتا ہوں کوئی آدم بیزار ہوں گے یا ملاقاتوں کے لئے حضرت آدم کی یورش نے ہی انھیں اس درجہ بیزار کر دیا ہوگا۔

کانفرنس کا آخری دن ہے۔ رات کو مشاعرہ ہے۔ دن کو دس بجے کے قریب اعجاز کے کمرہ میں بیٹھا ہوں۔ بیگم پرویز شاہدی اور ان کی صاحبزادی تشریف لاتی ہیں۔ لیڈی برابورن کالج میں پہلی مرتبہ لڑکیوں نے مشاعرہ کیا ہے۔ بیگم پرویز نے دعوت نامے دیئے شرکت کے لئے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ آپ لوگ ضرور آئیں کیفی بھی آرہے ہیں انھوں نے وعدہ کر لیا ہے۔ ہم ابھی ان ہی سے ملاقات کر کے آرہے ہیں۔ میں نے دریافت کیا "وہ بھی یہیں ہیں کس کمرے میں قیام ہے ان کا" اعجاز نے کہا۔ یہی دو کمرے چھوڑ کر تیسرا ہے۔ میں نے حیرت سے کہا۔ اچھا وہی تو نہیں جس پر "ڈونٹ ڈسٹرب پلیز" (DO NOT DISTURB PLEASE) کی تختی ہر وقت آویزاں رہتی ہے۔ جی ہاں کسی نے کہا۔ اور مجھے خیال آیا۔ ڈونٹ ڈسٹرب پلیز کی تختی باہر آویزاں کرنے کے باوجود کیفی ڈسٹرب ہوتا ہے اور اپنے آرام کو بے کیف کرتا ہے۔ اس کا ظاہر دکھاوا اور باطن آراستہ معلوم ہوتا ہے۔

دوسرے روز صبح اعجاز ہوٹل سے میرے یہاں منتقل ہو گئے۔ یہاں سے ناشتہ کے بعد ہم دونوں لیڈی برابورن کالج پہنچے۔ کیفی وہاں موجود تھے اور سامعین کی پہلی صف میں بیٹھے تھے جب شمع محفل ان کے سامنے آئی انھیں بمشکل ڈائس پر پہنچایا گیا اس وقت انھوں نے "آوارہ سجدے" کے کچھ بند سنائے۔ کلکتہ میں اس تقریب کے بعد میں نے انھیں دوسری مرتبہ اردو اکیڈمی کے افتتاح میں دیکھا۔ یہ تقریب ۲۷ نومبر ۹ ۷ء کو راج بھون میں منعقد ہوئی۔ تقاریر کے بعد

مختصر مشاعرہ بھی تھا۔ چار سال کے اس عرصے میں کیفی کے آوارہ سجدے یکسو ہوئے یا نہیں اور انھیں کوئی آستاں ملا یا نہیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ ایک قیمتی شے زندگی کا ماحصل جو انھیں ملا اور ان کے پاس ہے وہ ان کا جذبہ، حوصلہ، قوت ارادی اور عزم ہے ایک گھاٹ کے پتھر کی طرح جامد، جو انھیں صحت کی اتنی معذوری کے باوجود دور دراز کے سفر کے لئے آمادہ کرتا ہے اور جگہ جگہ لئے پھرتا ہے۔

مغربی بنگال اردو اکیڈیمی کا افتتاح بنگال کے گورنر جناب ٹی۔ این۔ سنگھ کر رہے ہیں جو خود بھی کسی زمانے میں شاعری کرتے تھے۔ کیفی کے لئے خاص طور پر کرسی منگائی گئی کیونکہ وہ فرش پر نہیں بیٹھ سکتے۔ مائک بھی وہیں ان کے پاس پہنچا دیا جاتا ہے اور وہ جوش کے سے پُرجوش انداز میں پڑھتے ہیں۔ ؎

نئی زمیں نیا آسماں بھی مل جائے

نئے بشر کا مگر کچھ نشاں نہیں ملتا (کیفی)

میں سوچتا ہوں ہر دور ہر زمانہ میں انسان کو انسان کی تلاش رہی ہے کیونکہ یہ انسان ہی ہے جو انسان کو مصائب میں مبتلا کرتا ہے، اس پر مظالم ڈھاتا ہے، اسے اپنا غلام بناتا ہے، اس پر اپنی برتری قائم کرتا ہے، کبھی رنگ و نسل سے، کبھی اونچ نیچ ذات پات سے، کبھی طاقت سے اپنے ظلم کا شکار کرتا ہے۔ ؎

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے

قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے (اقبال)

اور جب یہ مظالم اپنی انتہا، اپنے عروج پر پہنچ جاتے ہیں، انسانیت تڑپنے لگتی ہے۔ تو پھر یہ انسان ہی ہے جو انسان کو نجات دلاتا ہے اور کمال تو یہ ہے کہ جب وہ نجات دلانے کی کوشش کرتا ہے تو یہی انسان اُسے سُولی پر لٹکا دیتا ہے، طرح طرح سے اذیت پہنچاتا ہے اور اسے نجات دہندہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ لیکن مشیّتِ ایزدی کی طرف سے بھیجا ہوا نامزد کیا ہوا یہ انسان عام انسانوں سے بلند ہوتا ہے۔ وہ خدا ترس، خدا رسیدہ، خدا کا فرستادہ اور اس کا مقرب بندہ ہوتا ہے جو اپنے تجدیدی مشن کو جس کے لئے وہ بھیجا گیا ہے پورا کر کے

ہی رہتا ہے۔ دنیا کی نجات کے لئے انسان کی تلاش ہمارے شعراء، اُدبار، مفکرین اور فلاسفر کو بھی ہر دور میں رہی ہے۔

حکمائے یونان میں سے مشہور دیوانہ حکیم دیوجانس کلبی دن دہاڑے ہاتھ میں چراغ لے کر گھومتا پھرتا تھا۔ دیکھنے والے اسے دیوانہ ہی سمجھتے تھے۔ اس سے دریافت کیا گیا دن میں چراغ لے کر کیا تلاش کرتے ہو۔ اس نے جواب دیا انسان کی تلاش کرتا ہوں۔ اس سے کہا گیا خدا کی اتنی مخلوق جو تمہارے سامنے ہے کیا اس میں تمھیں کوئی انسان نہیں ملتا۔ اُس نے جواب دیا یہ تو سب ادنیٰ درجے کی مخلوق ہے ان میں مکمل انسان کوئی نہیں۔ مولانا رومی نے اس واقعہ کو بعینہٖ یوں قلمبند کیا ہے۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر　　　کز دام دو د ملول و انسانم آرزو است
از ہمرہاں سست عناصر دلم گرفت　　　شیرِ خدا و رستم دستانم آرزو است

(رومی)

اقبالؔ کو بھی انسان کی تلاش ہے اور وہ اسے خدا کی جستجو کے ماحصل کا رتبہ دے کر اپنے اس خیال کو یوں ادا کرتے ہیں۔ ؎

قدم در جستجوئے آدمے زن
خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست　　　(اقبالؔ)

اقبالؔ کو جس انسان کی تلاش ہے وہ اُس کے اوصاف بھی اسرارِ خودی میں بیان کرتے ہیں اُس کی جامع تعریف ہے "انسانِ کامل" اور وہ انھیں مل بھی جاتا ہے۔ وہ غارِ حرا کا خلوت نشیں، عالمی اخوت و محبت کا پیغامبر ہے۔ اقبالؔ ایک بار پھر دنیا کی نجات کے لئے اُسے دعوت دیتے ہیں اور اس کا خیر مقدم اس طرح کرتے ہیں۔

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا　　　اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو　　　در سوادِ دیدہ ہا آباد شو
شورشِ اقوام را خاموش کُن　　　نغمۂ خود را بہشتِ گوش کُن
خیز و قانونِ اخوت ساز دہ　　　جام صہبائے محبت باز دہ

باز در عالم بیار ایامِ صلح   جنگجویاں را بدہ پیغامِ صُلح
نوعِ انساں مزرع و تو حاصلی   کاروانِ زندگی را منزلی

حافظ شیرازی کو بھی انسان کی تلاش تھی اور وہ انھیں اس دنیا میں ہاتھ نہیں آتا۔

آدمِ خاکی دریں عالم نمی آید بدست
عالمِ دیگر بباید ساخت ازنو آدمے   (حافظ)

کیفی کو بھی انسان کی تلاش ہے لیکن انھیں جس انسان کی تلاش ہے وہ اُس کے اوصاف تفصیل سے بیان نہیں کرتے وہ اُس کی تعریف حرف نئے بشر سے کرتے ہیں۔ ان کی تلاش اور حافظ کی تلاش میں بڑی حد تک مماثلت ہے۔

نئی زمیں نیا آسماں بھی مل جائے
نئے بشر کا مگر کچھ نشاں نہیں ملتا   (کیفی)

لیکن معلوم ہوتا ہے وہ اس تلاش سے تھک سے گئے ہیں۔ دور دور تک اُنھیں بشر کا نشان کہیں نظر نہیں آتا تاہم اُنھیں مایوسی بھی نہیں ہے۔ وہ اپنی امیدوں کا دیا اپنے کارواں میں روشن رکھنا چاہتے ہیں اور اپنا عزم راہ گذارِ منزل اور اُس کے ذرّہ ذرّہ میں سمو دینا چاہتے ہیں۔ ؎

خار و خس تو اٹھے راستہ تو چلے
میں اگر تھک گیا قافلہ تو چلے   (کیفی)

زندگی کی ہر جہت میں وہ امید کا دیا بجھنے نہیں دیتے۔ چاہے وہ جھلملاتا ہی رہے لیکن جلتا رہے۔

دُور سے بیوی نے جھلا کے کہا
تیل مہنگا بھی ہے ملتا بھی نہیں
کیوں دیئے اتنے جلا رکھے ہیں
طاق سینوں کے سجا رکھے ہیں
آیا غصہ کا ایک ایسا جھونکا

بجھ گئے سارے دیئے
ہاں مگر ایک دیا نام ہے جس کا امید
جھلملاتا ہی چلا جاتا ہے (کیفی)

وہ ایک بار پھر پُر امید ہو کر جوشِ عمل اشتراکِ عمل کے لئے آواز دیتے ہیں۔

یہ بھی چلنا کوئی چلنا ہے نہ شعلہ نہ دھواں
اب جلادیں گے زمانے کو جو جلنا ہوگا
راستے گھوم کے جاتے سبھی منزل کی طرف
ہم کسی رُخ سے چلیں ساتھ ہی چلنا ہوگا (کیفی)

لیکن انھیں اپنی آواز صدا بصحرا اور اپنی للکار بیکار نظر آتی ہے۔

ایک دیا نام کے یکجہتی کے
روشنی اس کی جہاں تک پہنچی
قوم کو لڑتے جھگڑتے دیکھا
ماں کے آنچل میں ہیں جتنے پیوند
سب کو ایک ساتھ اُدھڑتے دیکھا (کیفی)

کیونکہ یکجہتی اور اشتراکِ عمل کے بجائے باہمی نزاع ہے جس نے قوم کو دم نزع تک پہنچادیا ہے لیکن ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ خلوصِ عمل نہیں ہے، نیک نیتی نہیں ہے، اخلاق و کردار کی بلندی نہیں ہے، راست بازی، پاک باطنی نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا تعلق کسی خاص نظریۂ انقلاب سے نہیں بلکہ یہ ایک کلیہ ہے جس کا اطلاق زندگی کی ہر جہت میں خصوصاً ہر تجدیدی کام اور اس کی بنیادی ضرورتوں کے لئے ضروری ہے۔ خواہ وہ سیاسی ہو یا مذہبی معاشرتی ہو یا تہذیبی، معاشی ہو یا اقتصادی اور انفرادی ہو یا اجتماعی۔ یہی وجہ ہماری تنظیموں میں انتشار کی ہے اور عوام میں ان پر عدم اعتماد کی ہے۔ ہماری انقلابی شاعری میں بھی اس کا فقدان ہے۔ وہ ظاہری انقلاب کی تُند و تیز آواز تو ضرور ہے لیکن باطنی انقلاب کا پیغام نہیں۔ وہ جسم کو گرماتی ہے لیکن قلب و روح کو نہیں برماتی۔

کیفی خود کو پانے کے لئے زمین کی تہیں کھودتے ہیں۔ وقت کی ضرورت اور اس کا تقاضہ یہی ہے۔

بیلچے لاؤ کھودو زمیں کی تہیں
میں کہاں دفن ہوں ذرا دیکھوں تو سہی

لیکن زمین کی تہیں کھودنے کے ساتھ ساتھ ویرانہ دل بھی کھودا جائے تو وہ گنج گراں مایہ ہاتھ آجائے جس کی تلاش ہے۔

حسن کا گنج گراں مایہ تجھے مل جاتا
تو نے فرہاد نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل

اور عقل و عشق، جسم و روح، ظاہر و باطن ایک ہوں ایک ساتھ چلیں تو اس وقت وہ قیس پیدا ہو جائے گا جس کی تلاش کیفی کو ہے۔

لیلیٰ نے نیا جنم لیا ہے
ہے قیس کوئی جو دل لگائے (کیفی)

اور وہ قیس کروڑوں ایسے قیس پیدا کر دے گا جو ہر صحرا میں ایک لیلیٰ جلوہ گر کر دے گا اور ایسے فرہاد پیدا کر دے گا جو ہر پہاڑ سے ایک جوئے شیر نکال لائے گا۔ یہ شاعری نہیں افسانہ بھی نہیں ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہم آپ سب جنگِ آزادی میں دیکھ چکے ہیں۔ کتنے قیس کتنے فرہاد تھے جنھوں نے بے تیر و تفنگ بے سامانِ حرب اسی طاقت کے بل پر اسی سوزِ یقیں کے ساتھ اپنی جانیں دے کر آزادی کی جوئے شیر نکالی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ جوئے شیر امیدوں کی جوئے خوں بن کر رہ گئی اور ایک سراب کی طرح نظروں کا دھوکہ ثابت ہوئی تھی۔

کیفی پھر جگر لخت لخت جمع کرتے ہیں اور دعوت مژگاں نہیں دعوت عمل دیتے ہیں۔

ذرا پکار دو بے چین نوجوانوں کو
ذرا جھنجوڑ دو کچلے ہوئے کسانوں کو
ادھر سے قافلۂ انقلاب گذرے گا

بچھا دو سینۂ گیتی پہ آسمانوں کو
جلا دو قصرِ حکومت کے سب مکینوں کو
ترستے رہتے ہیں جو ہاتھ آستیں کے لئے
جلال میں وہ الٹ دیتے ہیں زمینوں کو
(کیفیؔ)

لیکن اس جلال کے ساتھ قلندرانہ جمال بھی ہو۔ یقین محکم کے ساتھ عمل پیہم اور خلوص عمل بھی ہو، خلوص پیہم بھی ہو تو منزل آسان ہو جاتی ہے۔

قلندرانہ ادائیں سکندرانہ جمال — یہ امتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں
(اقبال)

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
(اقبالؔ)

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے — کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
(اقبالؔ)

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم — جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
اقبالؔ

انقلاب کے لئے یقین محکم، عمل پیہم کیفیؔ کے یہاں بھی ہے لیکن اس کا انداز جداگانہ ہے۔

میں کوئی ملک نہیں ہوں کہ جلا دو گے مجھے
کوئی دیوانہ نہیں ہوں کہ گرا دو گے مجھے
کوئی سرحد بھی نہیں ہوں کہ مٹا دو گے مجھے
(کیفیؔ)

اور وہ کبھی دوسرا رُخ اختیار کر لیتا ہے۔

عوام کا اضطراب ہے یہ عوام کا پیچ و تاب ہے یہ
ستم سے دبنا ہے غیر ممکن کہ ہر ستم کا جواب ہے یہ

کہتے ہیں ستیہ گرہ اس کو، زندگی کا عتاب ہے یہ
جھکا دو سر انقلاب ہے یہ (کیفی)

ہر مفکر، ادیب اور شاعر اپنی فکر رسا، تصور اور نظریۂ حیات کے مطابق غم ہائے روزگار کا علاج تجویز کرتا ہے، انقلاب کی راہیں معین کرتا ہے اور انقلاب آفریں انسان کی تلاش کرتا ہے۔ اسی کلیہ کے پیش نظر۔

گھاٹ کے اس پتھر کو بھی ہے انسان کی تلاش

کیفی اعظمی شخصیت و فن

غالباً مارچ ۱۹۷۶ء کی بات ہے۔ بمبئی کا المالطیفی ہال رنگ و نور کا مرکز اور ادب و فن کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ رونق اور چہل پہل، کیف و سرور نشاط و انبساط، فخر و ناز سے فضا معمور تھی۔ معینہ پروگرام کی ابتدا ہوئی۔ اور لوگوں کے علاوہ مجھے بھی سیماب کی نظمیہ شاعری پر مقالہ پڑھنا تھا لہذا اسٹیج پر میں بھی تھی۔ میرے ایک بازو قبلہ اعجاز صدیقی اور دوسرے بازو مقبول و مشہور زمانہ ادیب کرشن چندر تھے میرے چہرے پر فخر تھا سامنے کیفی اعظمی سفید لباس میں ملبوس کوہ وقار بنے بیٹھے تھے۔ مقالات اور تقاریر کا سلسلہ ختم ہوا اور محفل میں شعر و سخن کی شمع جلی۔ مجروحؔ سلطان پوری اسٹیج پر آئے اور اس کے بعد کیفی اعظمی اپنے عصا کا سہارا لیتے ہوئے بڑے اعتماد سے اسٹیج کے زینوں سے اوپر آئے۔ کسی نے مجھ سے سرگوشی کی کیفیؔ صاحب اب بھی کسی کا سہارا لینا پسند نہیں کرتے یہ ان کے کردار کی فولادی قوت اور اعتماد و عزم کی شہادت ہے۔ کیفیؔ صاحب نے اپنے باوقار آہنگ میں اپنی نظم سنائی اور وہ سامعین کے دلوں میں اترتی چلی گئی ہر طرف سے داد و تحسین کے پھول برسائے گئے۔ شعری نشست کے بعد جب وہ اسٹیج سے نیچے آئے تو ان سے گفتگو کرنے کی خواہش کو زیادہ دیر تک نہ دبا سکی اور مجھے بھر گفتگو تقریب مل گئی "آوارہ سجدے" پر میں نے تبصرہ کیا ہے" میں نے کہا۔ انہوں نے مجھے مسکراتی آنکھوں سے دلچسپی سے دیکھا۔ "سنا ہے کتاب جلائی گئی تھی وجہ نظم بہیر تسمہ پا ہو سکتی ہے" اس پر انہوں نے فرمایا کہ

لوگوں کو غلط فہمی ہوئی۔ لوگ مقدس کتابوں کی تلاوت معنی و مفہوم سے بیگانہ ہو کر کرتے ہیں، دنیاوی تفکرات ذہن و دماغ پر حاوی ہوتے ہیں اور میری مراد تھی کہ لوگ بطن معنی میں اتریں" انہوں نے کہا۔ اور میں بھی اس سے متفق تھی۔

رات میں قبلہ اعجاز صدیقی صاحب کے ساتھ گھر آ گئی دوسرے دن اُن کا فون آیا انہوں نے مجھے بلوایا تھا۔ بعد میں بمبئی میں جوہو کے قریب اُن کے کاٹیج پر گئی وہ لان میں تشریف فرما تھے۔ شفقت کے ساتھ بٹھایا۔ ہر طرف ہریالی پا کر میں نے کہا "یہاں تو باغ و بہار ہے" وہ مسکرائے شفیق مسکراہٹ جیسے کوئی اپنا بالکل اپنا ہو۔ چائے کی ٹرے آئی۔ میں نے اور آمنہ (میرے ساتھ میری بھتیجی تھی) نے "دست شوق" کو مصروف کار کیا کیفی صاحب نے "میں لیمو کی چائے لوں گا" انہوں نے سیاہ چائے نہیں کہا۔ میں نے بغیر دودھ کی چائے تیار کی لیموں نے اس سیاہ چائے کی رنگت میں خفیف سا تغیر کیا اور میں نے پیالی کیفی صاحب کو تھما دی۔ چائے کی رنگت کو دیکھ کر مجھے مولانا ابوالکلام کا وہ خط یاد آیا جس میں انہوں نے چائے میں دودھ ڈالنے کو بدعت سیہ کہا ہے اور بتایا ہے کہ یہ انگریزوں کی آوردہ بدعت سیہ ہندوستان میں پھیل گئی ہے، ورنہ چینی چائے پینے والے سیاہ چائے پیتے ہیں اور بغیر دودھ ملائے یا لیمو کی ایک قاش کے ساتھ جو چائے کی لطافت کو نقصان نہیں پہنچاتی بلکہ اور نکھار دیتی ہے۔ اور میں سوچنے لگی کیفی صاحب کو بھی چائے میں ایک کیف و سرور مل رہا ہوگا، کاش میں بھی اس کیف میں شریک ہو سکتی مگر میں نے تکلفاً چائے پینے ہی سے انکار کر دیا تھا اب خود کردہ را علاجے نیست والا معاملہ تھا، بہر حال جب وہاں سے اٹھی تو ایک خوشگوار تاثر ذہن پر مرتسم ہو چکا تھا اور کیفی کی شاعری سے میری دلچسپی بڑھ گئی۔ جب میں نے راجندر مہتہ کی آواز میں یہ گیت سنا۔

تم پریشان نہ ہو بابِ کرم وا نہ کرو
اور کچھ دیر پکاروں گا چلا جاؤں گا

اسی کوچے میں جہاں چاند اگا کرتے ہیں
شب تاریک گزاروں کا چلا جاؤں گا

تو بے حد متاثر ہوئی- الفاظ کی نشست، آہنگ کا بہاؤ، جذبے کا اتار چڑھاؤ، شاعرانہ امیجری، جذبات کی حدت و شدت کسی بھی سننے والے پر ایسا ہی تاثر طاری کر سکتی ہے۔

ترقی پسند تحریک کے علمبرداروں میں فیض، جوش، سردار جعفری، فراق، کیفی اعظمی ساحر، مخدوم، قاسمی وغیرہ سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن میں کیفی اور ساحر کا نام اردو کے باذوق حضرات کے ساتھ ساتھ عوام میں بھی جانا پہچانا ہے۔ اس کی وجہ ان کے فلمی نغمے ہیں۔ مگران شاعروں نے اپنے فلمی نغموں میں بھی اپنے معیار کو ملحوظ رکھنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے اور بعض نغمے اہل ذوق کے لئے بھی کشش رکھتے ہیں۔

شاعری کی مقبولیت لب و لہجہ کی مرہون منت ہوا کرتی ہے اور یہ شاعر کی شخصیت سے ربط رکھتا ہے اور شاعر کی شخصیت کی تشکیل، ماحول، سماجی رشتے، تہذیب و تربیت پر مبنی ہوتی ہے۔ کیفی شخصیت کا عکس ان کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ ان کا لہجہ بھاری بھرکم اور علمیت سے مزین تو نہیں مگر ٹھہراؤ، وقار اور ذہانت کی جھلکیاں ضرور پیش کرتا ہے۔ کیفی نے سماجی رشتوں کا پاس رکھا ہے۔ ان کا سماجی اور تاریخی شعور گہرا اور وسیع ہے، یہ شعور اکثر و بیشتر، کسی درس گاہ یا کسی یونیورسٹی کی ڈگری کا مرہون منت نہیں ہوتا بلکہ بصیرت و بصارت، ادراک و ذہن کی دین بھی ہوا کرتا ہے۔ یہی شعور ہمیں آوارہ سجدے کی نظموں میں بھی ملتا ہے۔ آوارہ سجدے کے متعلق جب سے "ہنگامہ گیر و دار" کی داستان سنی تو مجھے تعجب ہوا۔ اس کی صحیح وجہ شعر فہمی کی صلاحیت کا فقدان ہے۔ ورنہ ہم اس تاریخی حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے۔ کہ مقدس کتابوں کی باشعور قرات کی محویت انسان کو جہان دیگر میں پہنچا دیتی ہے بلکہ جہان دیگر کا مالک بنا دیتی ہے نماز اور تلاوت کے انہماک میں بندگان خاص اپنے دکھ درد کو فراموش کر دیتے ہیں اور تیر تک اسی انہماک میں نکالے گئے ہیں۔ مگر آج کا دور جہاں سود و زیاں کا سوال ہے خود غرضی لالچ اور سیاسی کرتب بازی کا بول بالا ہے، دنیاوی فریب کاری نے ہمیں کہیں

کہیں پہنچا دیا ہے۔ وہاں زبان سے الفاظ ادا کئے جائیں اور مفہوم سے ذہن و وجدان بیگانہ رہتے ہیں تو تعجب کا مقام نہیں۔ پیر تسمہ پا میں اسی تلخ حقیقت کا انکشاف کیا گیا ہے۔

چونکہ کیفی اعظمی کی شاعری بے جہت اور بے مقصد نہیں وہ ترقی پسند شعراء کے قافلے کے معزز رکن ہیں انہوں نے اپنی شاعری میں اپنے نظریات کی تبلیغ بھی کی ہے۔ بعض لوگوں کو اعتراض ہو سکتا ہے کہ مقصدی شاعری کامیاب اور بلند شاعری کا نمونہ پیش نہیں کر سکتی۔ یا اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ بعض مقصد وقتی اور عمومی رجحان کو پیش کرتے ہیں اور وقت گزر جانے پر وہ رجحان بے معنی ہو جاتے ہیں اور شاعری کو بھی لاحاصل بنا دیتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ورجل کی وہ نظم جس میں اس نے کاشتکاری کی معلومات بہم پہنچائی ہے آج بھی اعلیٰ شاعری کا نمونہ مانی جاتی ہے۔ ماضی کی وہ نظمیں جن میں جادو ٹونے، رسم و رواج کا ذکر ہے، آج بھی عمدہ شاعری میں شمار ہوتی ہیں۔ اقبال ہی کو لے لیجئے اقبال کی مقصدی شاعری سے کیسے انکار ہو سکتا ہے ان کے یہاں وقت کے رجحانات اور تقاضوں کی شمولیت بھی مسلّم ہے۔ لیکن ان کی شاعرانہ عظمت و آب و تاب آج بھی نظروں کو خیرہ کر رہی اور کرتی رہے گی۔

کیفی اعظمی نے اندھیروں میں شمعیں جلائیں، مایوسی میں رجائیت کا دامن نہیں چھوڑا، کرب و الم میں بھی کہیں نہ کہیں سے کوئی چمکیلی شفاف کرن ضرور نظر آجاتی ہے۔ دردمندی دلسوزی ان کی خصوصیت ہے، یہی دردمندی اور خلوص ان کی مستقبل کی درخشندگی کی ضمانت ہے، کیفی اعظمی نے نظم چراغاں ۷۳ء۱۹ میں آزادی کی چھبیسویں ۲۶ سالگرہ پر لکھی ہے۔ نظم کی ابتدا کسی بھی پرمسرت جشن کی ابتدا معلوم ہوتی ہے جس میں چراغاں کیا جا رہا ہے اور چونکہ یہ جشن ہمارا چھبیسواں ۲۶ جشن آزادی ہے اس لئے اس میں چھبیس ۲۶ دیئے جلانے کا ذکر ہے ایک لمحہ کے لئے مسرت و انبساط کا نشہ ہم پر چھا جاتا ہے مگر جیسے ہی آگے بڑھتے ہیں عجیب کرب سے دوچار ہوتے ہیں۔ ملک کی خستہ حالی، تباہ کاری اور تخریبی رجحانات ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ ہم آزاد ملک کی فضا میں سانس لیتے ہوئے بھی غیروں کے دست نگر بنے

ہوئے ہیں، ہم مہذب دنیا کے باشندے کہلاتے ہیں لیکن تہذیب وشائستگی سے کوسوں
دور بے روزگاری، مہنگائی، غلے کی کمی، فسادات کی تاریکی ہمارا مقدر ہے۔ مگر تابہ کے؟
شاعر اس جنجال میں گرفتار ہے مہیب تاریکی سے ہمکنار ہے، اس کے سپنے
بکھرنے کے قریب ہیں لیکن پھر بھی امید کا دیا بجھا نہیں ہے۔ یہی امید تو ہے
غازۂ رخسارِ سحر۔ اسی امید کے سہارے ہم بیدار ہو کر ملک کو ان نعمتوں سے نجات
دلا سکتے ہیں سوال ہے مسلسل جدوجہد کا، ضمیر کی آزادی کا، خلوص وایثار کا، لگن اور
محنت کا ـــــ شاعر نے اس کی تبلیغ نہیں کی ہے۔ مگر پھر بھی اس
اندھیرے میں یہ شعاعیں جھلمل کرتی ضرور نظر آتی ہیں اور وطنی محبت، وطنی ترقی
کی تمنا مسکراتی ہے اس طرح گربھ وتی نظم آج کے دور کا المیہ نہیں بلکہ ماضی سے
لے کر مستقبل تک یہ سلسلہ پھیلا ہوا ہے آج جہاں بھی شیطانی رقص ہوگا یہ
المیہ اپنی تمام ترہیبت ناکی اور سفاکی کے ساتھ نظر آئے گا اور نتیجہ ایسا ہی انسانیت
کُش اور انسانیت سوز نکلے گا ورنہ بچے کی پیدائش نسل انسانی کے بقا کی ضامن ہے۔

کیفی اعظمی کے سماجی اور تاریخی شعور کا ذکر کیا گیا ان کا ملکی سیاسی شعور
اور بیرون ملک کی سیاست کا شعور بھی ان کی نظموں میں جھلکتا ہے۔ اس قبیل کی
نظمیں تلنگانہ۔ ماسکو۔ آوارہ سجدے۔ تاشقند۔ بنگلہ دیش، فرغانہ وغیرہ ہیں۔

نظم تلنگانہ میں ظلم وستم کے خلاف عوامی جدوجہد کی داستان ہے۔ جس
میں بوڑھے، بچے، جوان مرد عورتیں سب شریک ہیں۔ اس نظم کا اتار چڑھاؤ مجاہدین
کے جوش وخروش کا مظاہرہ کرتا ہے کیفی نے اس کے لئے ایک جداگانہ
آہنگ تراشا ہے اور مختلف بحر کا استعمال کیا ہے، جس سے عجیب سا تاثر
ابھرتا ہے۔ ظلم واستبداد کے خلاف احتجاجی جذبہ پوری طرح ابھر کر سامنے
آتا ہے، عوامی جوش وخروش، جرأت رندانہ اور ہمت مردانہ کا نظارہ آنکھوں میں
پھر جاتا ہے، آہنگ کی تیزی اور کاٹ نے رجزیہ انداز پیدا کر دیا ہے اور دوران خون
تیز ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے ملاحظہ ہو ۔۔

کہاں جہاد، کہاں جدّ و جہد کی منزل
مفاہمت نہیں پاتی جہاد کا حاصل
ہوائے تند نے گوندھی ہے زلف آزادی
بغاوتوں نے نکھارا ہے حسن مستقبل

حیات انگڑائی لے کے اپنا نظام اب خود سنبھالتی ہے
جلی ہوئی بستیوں پہ تعمیر عکس شہروں کا ڈالتی ہے
روش روش کو شگوفہ کاری چمن کے سانچے میں ڈھالتی ہے
کلی کلی رنگ اچھالتی ہے

لہو سے سینۂ گیتی کے داغ دھوئے ہیں
جگا کے خاک کی قسمت شہید سوئے ہیں
کہیں کی فوج سہی اس طرف کا رخ نہ کرے
یہاں زمین میں بم من چلوں نے بوئے ہیں

ابھرتی انسانیت کی توہین ہے تشدد کی حکمرانی
جبین تاریخ پر ہے اک داغ آج کی مطلق العنانی
تمہارے ہمراہ فتح و نصرت تمہارے قدموں میں کامرانی
مجاہدو! وہ ہے راج دھانی

کرشن چندر نے کہا ہے (کیفی کے) "لہجے میں گھن گرج ہے جو چٹان کے سینے کو بھی لرزا دے۔" کیفی نے جہاں بھی ظلم ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ احتجاجی انداز اختیار کیا ہے اور اپنی شاعری میں اس ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ اور ایسی شاعری کے لئے کٹیلا، نوکیلا اور تیکھا لہجہ اور آہنگ اختیار کیا ہے لیکن زندگی سیل تندرو کے ساتھ ساتھ جو نے نغمہ خواں بھی ہے۔ رزم و بزم دونوں کی ملی جلی کیفیت سے زندگی عبارت ہے، ظلم و ستم کے اندھیروں کے ساتھ ساتھ، محبت کی پُراسرار روشنی بھی انسانی زندگی میں ملتی ہے اور کیفی نے اس

روشنی سے استفادہ کیا ہے۔ ان کی شاعری شبستان محبت کا نظارہ بھی پیش کرتی ہے اور محبت کی ہلکی ہلکی مدہوش کن موسیقی شاعری کے پردے میں محسوس کی جا سکتی ہے جیسے۔

کتنی رنگیں ہے فضا کتنی حسیں ہے دنیا
کتنا سرشار ہے ذوق چمن آرائی آج
اس سلیقے سے سجائی گئی بزم گیتی
تو بھی دیوار اجنتا سے اتر آئی آج

کب سے تخئیل میں لرزاں تھا یہ نازک پیکر
کب سے خوابوں میں مچلتی تھی جوانی تیری
میرے افسانے کا عنوان بنی جاتی ہے
ڈھل کے سانچے میں حقیقت کے کہانی تیری

تیرے قامت میں ہے انساں کی بلندی کا وقار
دختر شہر ہے تہذیب کا شہکار ہے تو
اب نہ جھپکے گی پلک، اب نہ ہٹیں گی نظریں
حسن کا میرے لئے آخری معیار ہے تو

یہ لطافت، یہ نزاکت، یہ حیا، یہ شوخی
سو دیئے جلتے ہیں امڈی ہوئی ظلمت کے خلاف
لب شاداب پہ چھلکی ہوئی گلنار ہنسی
اک بغاوت ہے یہ آئین جراحت کے خلاف

بقول فیض احمد فیض ـ "غنائیہ شاعری کے سطحی تکلفات اور معنوی زیبائشوں سے کیفی نے کم سروکار رکھا ہے۔" مگر غنائیت کی اصلی روح کیفی کی شاعری میں جلوہ گر ہے ان کی اس قبیل کی شاعری کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ غنائیت اور موسیقی ہماری روح کی گہرائیوں میں اتر رہی ہے اوپر کے پیش کردہ بند میری بات کا ثبوت دیتے ہیں۔

کیفی کا مزاج غزل کا مزاج نہیں بلکہ اختر الایمان کی طرح ان کا مزاج بھی نظم نگار کا مزاج ہے ۔ اس لئے ان کی غزلوں میں بھی نظمیہ کے اثرات در آئے ہیں ۔ بحیثیت نظم نگار انہوں نے زندگی کے انگنت پہلوؤں کو موضوع سخن بنایا ہے اور زندگی کی سچائیوں کو پیش کیا ہے زندگی کے جدوجہد مسلسل کے کرب کو الفاظ کا پیکر دے کر نظم میں ڈھالا ہے ۔ سچائی کی جستجو اور اس کی حقیقت ایسی نظموں میں زیادہ وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہیں جو کرب کی لہروں کے تحت لکھی گئی ہیں ۔ نظم " زندگی " ایسی ہی ایک نظم ہے ۔ جس میں سچائی اور سکون کی تلاش کا ذکر ہے اور زندگی کو پامردی سے گذارنے کا سلیقہ بھی ۔ یہی زندگی سے محبت کا ثبوت ہے ۔ وہ مر مر کے زندہ رہنے کے قائل نہیں بلکہ زندگی کو نعمت سمجھ کر گلے لگانے کے معتقد ہیں ۔ گویا انھیں زندگی کا صحیح شعور اور سلیقہ ہے اور یہی انداز اور شعور ان کی شاعری میں بھی ملتا ہے ۔

کیفی اعظمی کی شاعری پر مارکسزم کے اثرات نظر آتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ کسی تحریک سے وابستگی سے اس کے بنیادی اصول شخصیت پر اثر انداز ضرور ہوتے ہیں ۔ لیکن کیفی کے مزاج اور شاعری کی نرمی اور ملائمت نے ان کی ایسی نظموں کو سپاٹ اور کھردرے پن سے بچا لیا ہے ۔ ایسی نظموں میں بھی تغزل کی لطافت پائی جاتی ہے ۔ ملاحظہ ہو ۔

خیر ہو بازوئے قاتل کی مگر خیر نہیں
آج مقتل میں بہت بھیڑ نظر آتی ہے
کر دیا تھا کبھی ہلکا سا اشارہ جس سمت
ساری دنیا اسی جانب کو مڑی جاتی ہے
حادثہ کتنا کڑا ہے کہ سرِ منزلِ شوق
قافلہ چند گروہوں میں بٹا جاتا ہے

ایک پتھر سے تراشی تھی جو تم نے دیوار
اک خطرناک شگاف اس میں نظر آتا ہے

مارکسزم کی بات چلی تو وزیر آغا کا ایک پر لطف جملہ یاد آرہا ہے جو انہوں نے ترقی پسند شعرا کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے "اپنی محبوبہ کو بڑی محبوبہ" یعنی مارکسزم کے تابع کر دیا ہے" مگر میرا خیال ہے کہ کیفی اعظمی اس سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کے یہاں کوئی کسی کے تابع نہیں بلکہ ہر کوئی اپنے مخصوص مقام پر ہے اور اس کی وجہ ان کی شاعری کا خلوص وانہماک ہے، یہی خلوص وانہماک اور نظمیہ کی نفاست اور نزاکت ان کے فلمی نغموں میں بھی در آئی ہے، ورنہ جس دنیا میں "چنانچہ گویا کہ" قسم کے فلمی گانے مقبول ہوں وہاں شعری نزاکتوں اور نفاستوں کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ لیکن اس قسم کی دھول دھپا والی شاعری میں بھی بعض شاعروں نے فنی اور ادبی تقاضوں کا خیال رکھا ہے ان میں کیفی اعظمی بھی ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ذیل میں کچھ فلمی نغمے ہیں۔ اگر یہ فلمی نغمے موسیقی میں ضم نہ بھی کئے جاتے تو مقبول ہو جاتے ؎

یونہی کوئی مل گیا تھا سر راہ چلتے چلتے
وہیں تھم کے رہ گئی ہے مری رات ڈھلتے ڈھلتے
شب انتظار آخر کبھی ہو گی مختصر بھی
یہ چراغ بجھ گئے ہیں مرے ساتھ جلتے جلتے

جانے کیا ڈھونڈھتی رہتی ہیں یہ آنکھیں مجھ میں
راکھ کے ڈھیر میں شعلہ ہے نہ چنگاری ہے

زندگی ہنس کے گزرتی تو بہت اچھا تھا
خیر ہنس کے نہ سہی رو کے گزر جائے گی
راکھ برباد محبت کی بچا رکھی ہے
بار بار اس کو جو چھوڑا تو بکھر جائے گی
جانے کیا ....

جسم کا رنگ فضاؤں میں بکھر جائے گا
مہرباں حسن ترا اور نکھر جائے گا
لاکھ ظالم ہے زمانہ مگر اتنا بھی نہیں
تو جو باہوں میں رہے وقت ٹھہر جائے گا

تمہاری زلف کے سائے میں شام کرلوں گا
سفر اس عمر کا پل میں تمام کرلوں گا
جہان دل پہ حکومت تمہیں مبارک ہو
رہی شکست تو وہ اپنے نام کرلوں گا

ہم ان کی شاعری کے مطالعے کے بعد کہہ سکتے ہیں کہ ان کے یہاں
چٹانوں سے ٹکرانے کا عزم ملتا ہے۔ سماجی جدوجہد میں خون کی روانی تیز
ہوتی ہے۔ ظلم واستبداد کے خلاف احتجاجی لب ولہجہ ملتا ہے، ساتھ ہی ساتھ
محبت کا سوز و گداز دل کی کسک اور چبھن، عشق کی شیرینی اور گھلاوٹ بھی
ان کی شاعری کے جزء ہیں۔ اس طرح مختلف رنگ وروپ سے ان کی
شاعری کی آواز حسین بن جاتی ہے جسے ہم ان کی انفرادی آواز سے موسوم
کر سکتے ہیں۔

مظفر حنفی

کیفی اعظمی

مثلث کا تیسرا زاویہ

کیفی اعظمی کے کلام کو اگر تین ادوار میں تقسیم کر لیا جائے تو اس کی افہام و تفہیم اور تجزیے میں بڑی معاونت ملتی ہے۔ ان کے تخلیقی سفر میں ۱۹۴۵ء اور ۱۹۶۲ء دو امتیازی سنگ میلوں کی سی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی روشنی میں کیفی کی شاعری کے مندرجہ ذیل ادوار قرار پاتے ہیں:

۱ — از ابتداء تا ۱۹۴۵ء : پہلا دور

۲ — ۱۹۴۵ء تا ۱۹۶۲ء : دوسرا دور

۳ — ۱۹۶۲ء تا حال : تیسرا دور

یہاں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت بھی کرتا چلوں، دراصل میں تخلیق کار پہلے ہوں، نقاد بعد میں، اس لئے تنقیدی ضروریات اور نظریاتی مطالبات کو تخلیق اور فن پر فوقیت دینے کے خلاف ہوں۔ بیشتر ناقدین کیفی کی شاعری کے ادوار متعین کرتے تو پہلا دور ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک قرار پاتا کہ یہ ترقی پسند تحریک کے نقطۂ آغاز سے آزادیٔ ہند تک پہنچتا ہے لیکن میں نے فنکار کے قول اور فن کی باطنی شہادت کو زیادہ لائق اعتنا سمجھتے ہوئے کیفی اعظمی کی شاعری کے سنِ آغاز کا تعین خود کرنا یوں مناسب نہیں سمجھا کہ لکھنؤ ٹیلی ویژن کے انٹرویو میں غالباً انہوں نے کہا تھا کہ وہ نو دس سال کی عمر سے شعر کہہ رہے ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۹۱۸ء کی ہے

اس اعتبار سے ان کی شعر گوئی کا آغاز ۱۹۲۸ء کے آس پاس ہوتا ہے ظاہر ہے ان میں دو چار سال مبتدیانہ کاوشوں کی نذر ہوئے۔ دوسرے اس کے باوجود ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے قیام کے وقت تک، جب کیفی کی عمر ۱۸ سال کی ہو چکی تھی، ان کی شاعری بھی طفولیت کا دور پورا کر چکی ہو گی لیکن "جھنکار" (پہلا مجموعۂ کلام) اور "آخرِ شب" (دوسرا مجموعۂ کلام) کی ۱۹۴۵ء تک کی نظموں پر رومانیت کا غلبہ صاف نظر آتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جب اردو شاعری میں اختر شیرانی اور جوش کی رومانی نظموں کا ڈنکا بج رہا تھا، ہر چند کہ مجاز کی شاعری کی ابتدا بھی کیفی اعظمی کے ساتھ ساتھ ۱۹۲۸ء کے آس پاس ہی ہوئی تھی لیکن باعتبارِ عمر وہ کیفی سے تقریباً چھ سات سال بڑے تھے دوسرے ان کے کلام کا مجموعہ "آہنگ" ۱۹۳۸ء میں شائع ہو کر مقبولیت کے ریکارڈ توڑ چکا تھا اس لئے عجب نہیں کہ کیفی اعظمی نے اپنی ابتدائی رومانی نظموں میں ان تینوں شعراء کے اثرات قبول کیے ہوں۔ اس پہلو سے ان کے پہلے شعری مجموعے "جھنکار" کی نظموں میں سے بطورِ خاص "ٹرنک کال" اور "یاسمٹ" نیز "آخرِ شب" میں شامل ۱۹۴۵ء تک کی نظموں "تجدید"، "حوصلہ"، "تبسم"، "زسوں کی محافظ"، "نغمگی"، "تم"، "تصور"، "دو راتیں" "ملاقات"، "پشیمانی"، "مجبوری"، "نقش و نگار"، "اندیشے"، "نصیحت"، "احتیاط"، "منتظرِ خلوت" وغیرہ کا مطالعہ میرے اس خیال کی تصدیق کرے گا۔ یہ نظمیں کیفی اعظمی کے عنفوانِ شباب اور نوجوانی کے دور کی تخلیق ہیں ان میں سے آخری نظم کی تخلیق کے وقت ان کی عمر ۲۵ سال کی تھی ظاہر ہے ۱۹۳۵ء میں جب وہ بمشکل ۱۶ سال کے رہے ہوں گے، کیفی سے ترقی پسندی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے آٹھ سال بعد تک ان کی تخلیقات پر رومانیت کی گہری چھاپ رہی یہ نظمیں اس دور کے حسن پرست نوجوان کے جذبات کی بڑی سچی اور اچھی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کا تجزیہ آگے چل کر کیا جائے گا، فی الحال مجھے ادوار کی تقسیم کے تعلق سے اپنی بات ختم کر لینے دیجئے۔

کیفی اعظمی کے دوسرے مجموعۂ کلام "آخرِ شب" میں شامل ۱۹۴۳ء کی نظم "تربیت" اس اعتبار سے فیصلہ کن ہے کہ یہاں سے اُن کا فن اپنی باگیں ترقی پسندی کی طرف موڑتا ہے یہ مجموعے کی پہلی نظم ہے جس میں تھانیدار کے تحت جگو غداری کا رویہ ترک

کر کے غلامی سے گرم بیکار ہونے کی تلقین کی گئی ہے اس موقع پر میں اس کتاب کے انتساب اور پیش لفظ کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ کتاب کا انتساب "شش" کے نام کرتے ہوئے کیفی اعظمی نے لکھا ہے "میں اپنے فن کو تنہا آخرِ شب تک لا چکا ہوں تم آجاؤ تو صبح ہو جائے" ("آخرِ شب" ص ۷) ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر اپنے رومانی دور کو عدم آگہی کی شب سے تعبیر کرتے ہوئے آٹھ سال تک غور و فکر کرنے کے بعد ترقی پسندی کی صبح کو لبیک کہنے پر آمادہ ہو رہا ہے۔ اس خیال کی تائید اسی مجموعے کے پیش لفظ سے بھی ہوتی ہے جس میں کیفی اعظمی نے خود کچھ نہ کہہ کر ایلیا اہرن برگ کا یہ قول درج کیا ہے :

"ایک ادیب کے لئے یہی ضروری نہیں کہ وہ ایسے ادب کی تخلیق کرے جو مستقبل کی صدیوں کے لیے ہو۔ اُسے ایسے ادب کی تخلیق بھی کرنی چاہیے جو صرف ایک لمحے کے لیے ہو، اگر اس ایک لمحے میں اس کی قوم کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے" ("آخرِ شب" ص ۵)

مذکورہ بالا مجموعہ مئی ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا تھا اور اس کی ترقی پسندانہ نظم "فیصلہ" ۱۹۴۳ء کی تخلیق ہے ظاہر ہے یہ چار پانچ سال ہندوستانی قوم کی تاریخ میں بے حد اہمیت کے حامل رہے ہیں اور اسی دور میں ہماری قوم کی قسمت کے اہم فیصلے ہوئے ہیں ان حالات میں کیفی اعظمی نے دیدۂ بینائے قوم کی حیثیت سے وقت کی نبض پہچان کر اپنے قلم کا رخ وقتی اور ہنگامی مسائل اور موضوعاتی نظموں کی طرف موڑ دیا اور ہر اس اہم سیاسی اور تاریخی واقعے کو اپنی نظم میں ڈھالا جو اس دور میں اُن کے تئیں اہم نظر آیا۔ کانگریسی رہنمایان قوم کی قلعہ احمد نگر میں نظر بندی پر انہوں نے "تلاش" لکھی۔ بھگت سنگھ کے گلوئے حق تک دار و رسن نہ پہنچ سکے تو "کب تک" وجود میں آئی "آخری مرحلہ"، "مژدہ"، "تربیت"، "نئے خاکے" (گاندھی جناح ملاقات کے موقع پر) "کرن" (گاندھی جناح ملاقات) "نئی جنت"، "ہم"، "آزادی"، "سوویت یونین اور ہندوستان"، "یلغار"، "فتح برلن"، "سلام"، "ہم آگے بڑھتے ہی جا رہے ہیں"، "نئے مہربان"، "لال جھنڈا"، "سپردگی"، "قومی حکمران"، "سروجنی نائیڈو"، "حملہ" (ریاست ٹراونکور کے مجاہدوں کا ترانہ) "قومی اخبار"، "تاریکی میں" (الکشن کے دنوں میں مولانا آزاد اور خضر حیات کی ایک ملاقات) "ناقص بھرتی" اور مثنوی "خانہ جنگی" تک مجموعے کی تمام نظمیں ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۷ء تک ملک کے

سیاسی حالات پر ایک جذباتی نوجوان کا وقتی ردِ عمل ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ کیفی اعظمی کی جذباتیت بتدریج ایک گمبھیرے میں بدلتی نظر آتی ہے لیکن موضوعاتی اور ہنگامی موضوعات پر لکھنے کا سلسلہ "آخرِ شب" تک ہی محدود نہیں ہے۔ ملک کی آزادی کے بعد بھی وہ "تلنگانہ تحریک پر نظم "تلنگانہ" تخلیق کرتے ہیں (۱۹۴۸ء) اور وقتاً فوقتاً معاشرے اور قوم کی ناہمواریوں پر وار کرتی ہوئی ان کی جوشیلی ترقی پسندانہ نظمیں رسائل کی زینت بنتی رہیں لیکن "آخرِ شب" کے تقریباً ۱۴ سال بعد ۱۹۶۲ء میں جب ان کا تیسرا مجموعۂ کلام منظرِ عام پر آیا تو کیفی اعظمی نے انتخاب کے دوران بیشتر ایسی نظمیں جزوقتی موضوعات کی حامل تھیں، رد کر دیں۔

۱۹۶۲ء ہندوستان کی تاریخ میں اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اسی سال ہمارا ملک "ہندی چینی بھائی بھائی" کا نعرہ لگانے والی چینی جارحیت کی یلغار کا شکار ہوا اور یہی وہ سنہ ہے جب عالمی کمیونسٹ اکائی منقسم ہو کر لینینیت اور لیساویت میں منتشر ہو گئی۔ حالات کے اس موڑ پر بہت سے ترقی پسندوں کے عقائد متزلزل ہو گئے۔ اس المیے کے زیرِ اثر کیفی اعظمی کے سجدے بھی آوارہ ہو گئے اور انھیں کہنا پڑا ؎

راہ میں ٹوٹ گئے پاؤں تو معلوم ہوا
جز مرے اور مرا راہنما کوئی نہیں
ایک کے بعد خدا ایک چلا آتا ہے
کہہ دیا عقل نے تنگ آ کے خدا کوئی نہیں

(آوارہ سجدے: ۱۹۶۲ء)

یہاں سے کیفی اعظمی کے تخلیقی سفر نے تیسرا موڑ لیا ہے اور غالباً نظریاتی عقیدت مندی کے انہدام کا ہی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد وقتی اور ہنگامی موضوعات پر کیفی اعظمی نے جو نظمیں لکھی تھیں ان میں سے بہت کم "آوارہ سجدے" میں شمولیت کے لائق سمجھی گئیں۔ اس کے باوجود ایسا نہیں ہے کہ کیفی اعظمی کُلّیتاً ترقی پسندی سے منحرف ہو گئے ہوں البتہ اب ان کی تخلیقات میں اکثر رومانیت کی طرف مراجعت کا رویہ جھلک مارتا نظر آتا ہے۔ یہ رومانیت "جھنکار" اور "آخرِ شب" کی ابتدائی نظموں سے بڑی حد تک مختلف ہے کیونکہ اب کیفی کی جذباتیت

میں گمبھیرتا، نگاہ میں بالیدگی اور فکر میں گہرائی کے عناصر شامل ہو گئے ہیں اور ان کے پرتو "دعوت"، "نیا حسن"، "ایک بوسہ"، "نذرانہ"، "پیار کا جشن"، "اجنبی"، "ایک لمحہ" میں نظر آتے ہیں اور ان رومانی تخلیقات کے دوش بدوش کچھ ایسی نظمیں بھی دکھائی دیتی ہیں جو اشتراکیت پر زخم خوردہ اعتقاد کے باوجود ترقی پسند تحریک سے اپنا رابطہ برقرار رکھنے کے لئے تخلیق کی گئی ہیں۔ میری مراد "نہرو"، "دوسرا طوفان"، "بہرہ"، "تاشقند"، "فرغانہ"، "ماسکو"، "لینن"، "بنگلہ دیش"، "ڈھاکہ"، (چارو مجمدار کی یاد میں) سے ہے جو ہر چند کہ وقتی موضوعات پر لکھی گئی ہیں لیکن یہاں کیفی اعظمی کے لہجے میں ویسی بلند آہنگی اور جذباتیت نہیں ہے جیسی کہ "آخرِ شب" کی موضوعاتی نظموں میں نظر آتی ہے اس کے برعکس یہ نظمیں ایک تھمے تھمے طوفان کی سی کیفیت رکھتی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ موضوع فنکار کے خون میں تحلیل ہو کر جذبے میں آمیز ہو کر نظموں میں قالب میں ڈھل رہا ہے۔ لیکن "آوارہ سجدے" میں چند اور نظمیں بھی ہیں جنھیں نہ رومانی کہا جا سکتا ہے نہ خالص موضوعاتی یا ترقی پسندانہ۔ بے شک ان نظموں میں حقیقت پسندی کی زیریں لہریں مرتعش ہیں لیکن ان کے ساتھ ضبط و تحمل اور گہری فکر بھی کار فرما ہیں یہ ایک سرد و گرم چشیدہ، حساس دل اور کشادہ ذہن رکھنے والے شاعر کے وہ احساسات اور تاثرات ہیں جن پر اس کی اپنی انفرادیت کی مہریں ثبت ہیں میری بات کا یقین نہ ہو تو آپ خود ان نظموں کا مطالعہ کریں — "مکان"، "آخری رات"، "عادت"، "دائرہ"، "ابن مریم"، "دوپہر"، "بہروپنی"، "پیار کا جشن"، "اگر بہ وتی"، "پیر تسمہ پا"، "کھلونے"، "انتشار"، "ایک لمحہ"، "زندگی" اور "چراغاں" غالباً آپ کو بھی اسی نتیجے پر پہنچائیں گی جس تک میں پہنچا ہوں۔ مجموعے میں شامل غزلوں کو بھی میں نظموں کے اسی قبیلے میں جگہ دوں گا کہ ان کی اساس بھی انھیں عناصر پر ہے جو زیر بحث نظموں کے اساس ہیں

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، کیفی اعظمی کے دورِ اول کی نظمیں رومانی تخلیقات ہیں ان میں عنفوان شباب کے جذبات و احساسات کار فرما ہیں اور جمالیاتی کیف و نشاط کے ساتھ ندرتِ ادا بھی ان نظموں کا امتیازی وصف ہے نظموں سے اقتباسات پیش کر کے ان کے مرکزی خیال کی وضاحت نہیں کی جا سکتی کیونکہ ہر اچھی نظم بذاتِ خود

ایک اکائی ہوتی ہے اور غزل کے شعر کی طرح حشو و زوائد سے پاک ہوتی ہے البتہ ان نظموں کے چند ایسے اجزاء ضرور ملاحظہ فرمایئے جن میں ان کی ندرتِ ادا اور خلاقی کے شرارے جھلملا رہے ہیں۔

کسی نے آج اک انگڑائی لے کر
نظر میں ریشمی گرہیں لگا دیں

(تجدید)

یہ تتلیاں جنھیں مٹھی میں بھینچ رکھا ہے
جو اڑنے پائیں تو الجھیں کبھی نظاروں سے
تری طرح کہیں یہ بھی نہ بجھ کے رہ جائیں
تپش نچوڑ نہ ان ناچتے شراروں سے

(نرسوں کی محافظ)

اے بنتِ مریم گنگنا، اے روحِ نغمہ گائے جا
جیسے شگوفوں میں سما کر گنگناتی ہے ہوا
جیسے خلا میں رات کو گھنگرو بجاتی ہے گھٹا

(نغمگی)

تمہارے جسم میں خوابیدہ ہیں ہزاروں راگ
نگاہ چھیڑتی ہے جس کو وہ ستار ہو تم

(تم)

چشمِ بد دور یہ قدِ بالا
جیسے مشرق سے صبحِ نو کا ابھار
بیل جاتی ہوئی منڈیروں پر
دھوپ چڑھتی ہوئی سرِ دیوار

(نقش و نگار)

بند کمرے میں جو خط میرے جلائے ہوں گے
ایک اک حرف جبیں پر ابھر آیا ہوگا
میز سے جب مری تصویر ہٹائی ہوگی
ہر طرف مجھ کو تڑپتا ہوا پایا ہوگا

(اندیشے)

یہ ترا پیکرِ سیمیں یہ گلابی ساری
دستِ محنت نے شفق بن کے اڑھا دی تجھکو

(نیا حسن)

آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اس طرح محبوب کی انگڑائیوں سے منظر میں ریشمی گرہیں لگانا، ناچتے شراروں سے بی‌تشں پھوڑنا، شگوفوں میں سما کر ہوا کا گنگنانا، گھٹا کا رات کو خلا میں گھنگرو بجانا، محبوب کے جسم کو ستار قرار دے کر نگاہ سے اُسے چھیڑنا اور ہزاروں خوابیدہ راگوں کو جگانا؛ اس کے قدِ بالا کو صبح نو کا ابھار قرار دینا اور منڈیروں پر چڑھتی ہوئی بیل اور دیواروں پر چڑھتی ہوئی دھوپ سے اس کی مماثلت، معشوق ہاتھوں عاشق کے خط جلائے جانے پر ان کے تمام حروف کا جبیں پر ابھرنا اور میز سے تصویر ہٹائے جانے پر عاشق کا ہر طرف تڑپتا ہوا دکھائی دینا، گلابی ساری کو محنت کے ہاتھوں شفق بن کر اڑھا دینے سے تعبیر کرنا از خود شاعرانہ عمل ہیں جب یہ متعلقہ نظموں میں اپنی مناسب جگہوں پر وقوع پذیر ہوتے ہیں تو ان کی ندرت اور تازگی لفظوں میں جان ڈال دیتی ہیں۔ ایسی مثالیں کیفی اعظمی کی رومانی نظموں میں بڑی کثرت سے ملتی ہیں۔ کیفی اعظمی کی ان نظموں کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ ان میں موجودہ دور کے نوجوان عاشق اور محبوب کی بڑی سچی ترجمانی نظر آتی ہے یہ نظمیں بڑے لطیف جذبات اور نازک احساسات کی ترجمانی اس سادگی سے کرتی ہیں کہ شاعر کی مہارت اور چابکدستی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے نرم و سبک الفاظ، جگمگ جگمگ کرتی ہوئی تشبیہات و استعارات اور خوشگوار صوتی آہنگ رکھنے والی تراکیب استعمال کرنے کا جیسا سلیقہ کیفی اعظمی کو آتا ہے، اُن کے معاصرین میں فیض اور مخدوم کے علاوہ بہت کم کے حصے میں آیا ہے۔ عام طور پر رومانی شاعروں

کے ہاں عاشق کی قلبی کیفیات کے مرقعے تو نظر آتے ہیں لیکن محبوب کی وارداتِ قلب اور نفسیاتی پہلو کو بہت کم شعراء نے موضوعِ شعر بنایا ہے اس ضمن میں کیفی اعظمی کی بہت سی نظمیں انھیں اپنے معاصرین سے ممتاز بناتی ہیں مثلاً ان کی نظم "اندیشے" میں حالات کے جبر نے محبوبہ کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ عاشق کو بھول جائے لیکن اس بھلانے کے عمل میں محبوبہ کے دل پر کیا کچھ بیت گئی اس کی نہایت خوبصورت عکاسی کیفی اعظمی کی اس تخلیق میں ملتی ہے۔ نظم "تصوّر" بھی محبوبہ کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔ "نرسوں کی محافظ" میں ایک بوڑھی زخم خوردہ نرس انتقاماً نوجوان نرسوں سے سخت گیری کا جو برتاؤ روا رکھتی ہے اس کا نفسیاتی تجزیہ پیش کیا گیا ہے "احتیاط" بھی اسی قبیل کی تخلیق ہے جس میں سماج سے خوفزدہ محبوبہ کی معذوریوں کے پیشِ نظر اس کی بے التفاتی کو معاف کر دیا گیا ہے "منظرِ خلوت" میں ایک مجبور و بیکس حسین بیوہ کے دلی احساسات اور جذبات کو شعری زبان مل گئی ہے۔ "نیا حسن" میں عصرِ حاضر کی شوخ و شنگ اور فیشن ایبل محبوبہ کا سراپا کھینچا گیا ہے اور نئے زمانے کے مطابق حسن کے بدلتے ہوئے انداز کا خیر مقدم کیا گیا ہے "نذرانہ" میں ایک دلنواز معشوق کی بے التفاتی پر عاشق کے دل میں پیدا ہونے والے وسوسوں نے نظم کا قالب اختیار کر لیا ہے۔ "پیار کا جشن" بھی اسی سلسلے سے تعلق رکھتی ہے اور مدت کے بعد ملنے والی معشوقہ اور اسے چاہنے والے کے جذبات کی ترجمان ہے ۔

دوسرے دور کی نظموں پر اشتراکی نظریات اور ترقی پسندانہ رجحانات کی واضح چھاپ ہے اپنی ان نظموں کے بارے میں کیفی اعظمی نے لکھا ہے۔

"میری شاعری نے جو فاصلہ طے کیا ہے اس میں وہ مسلسل بدلتی اور نئی ہوتی رہی ہے (بہت آہستہ سہی) آج وہ جس موڑ پر ہے اس کا نیا پن بہت واضح ہے یہ رومانیت سے حقیقت پسندی کی طرف کوچ کا موڑ ہے ۔ حقیقت پسندی کا یہ رجحان کسی خارجی اثر کا نتیجہ نہیں، اس کے آثار "جھنکار" اور "آخرِ شب" کی کچھ نظموں میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں ۔ (آوارہ سجدے ص ۱۰)

مندرجہ بالا اقتباس میں قوسین کی عبارت (بہت آہستہ سہی) غالباً میرے اس خیال کی تائید کرتی ہے کہ کیفی اعظمی ترقی پسند دور کے قافلے میں کافی غور و فکر کے بعد

انجمن کے قیام کے تقریباً آٹھ سال بعد شامل ہوئے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس فقرے سے انہوں نے اپنی کم گوئی کے لیے معذرت چاہی ہو بہر حال ان کے اس قول کی تردید ممکن نہیں کہ حقیقت پسندی کا یہ رجحان ان کے ہاں کسی خارجی اثر یا فیشن زدگی کے تحت نہیں آیا بلکہ شاعر کے بطن سے برآمد ہوا ہے۔ اس بات کی شہادت خود ان نظموں سے ملتی ہے جنھیں کیفی اعظمی نے حقیقت پسندانہ کہا ہے۔ یہ نظمیں اپنے بلند آہنگ اور براہِ راست مخاطبت کے انداز کے باوجود شعری جمالیات کی کسوٹی پر اکثر کھری اُترتی ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ وہ چند نظمیں بھی، جن میں کیفی اعظمی کا طرز بیان نعرہ زنی کا سا لگتا ہے۔ جا بجا ایسے بند اور مصرعے چھپائے ہیں کہ نظموں میں سپاٹ پن پیدا نہیں ہو سکا۔ یہ نظمیں زبان کی سلاست اور فصاحت اور زورِ بیان کے اعتبار سے انیسؔ اور جوشؔ کی یاد دلاتی ہیں۔ کہیں کہیں ان نظموں کے خطیبانہ لہجے سے گمان گزرتا ہے کہ صحافتی شاعری جیسی کوئی چیز زیر مطالعہ تو نہیں آگئی لیکن چند مصرعوں کے بعد ہی کیفی اعظمی کے اسلوب کی نرمی اور لطافت پھریلے موضوعات میں بھی اپنی خلاقی سے ایسے شعری گل بوٹے کھلاتی ہے کہ بے ساختہ منہ سے واہ نکل جاتی ہے، زیادہ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے، ایسی دو ایک مثالیں ملاحظہ ہوں۔

گاندھی جناح ملاقات جیسے خشک ہنگامی موضوع کے تحت لکھتے ہیں۔

خار کیا چیز ہیں، دو دوست جو ملنا چاہیں
سوزِ رفتار سے لو دینے لگی تھیں راہیں
وقت نے سینۂ احساس میں لے لی چٹکی
ڈال دیں گرم تقاضوں نے گلے میں باہیں
آخری شرط بھی منظور ہوئی جاتی ہے (کرن)

راہوں کا سوزِ رفتار سے لو دینا، وقت کے سینۂ احساس میں چٹکی لینا، گرم تقاضوں کا گلے میں باہیں ڈال دینا جیسے شعری پیکر اس لیے تراشے گئے ہیں کہ گاندھی اور جناح کے درمیان مصالحت کی آخری شرط بھی پوری ہونے جا رہی ہے۔

اسی طرح ریاست ٹراونکور کے مجاہدوں کا ترانہ لکھا تو ملک کے مختلف حصوں

میں رہنے بسنے والوں اور مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو بغاوت کا پرچم اُڑانے کا پرجوش پیغام دیتے ہوئے کس طنطنے اور روانی کے ساتھ کہے گئے ہیں :

چلو وادیو، ساحلو، دلدلو

چلو معدنو، کھیتیو، جنگلو

چلو بجلیو ، آندھیو زلزلو

پہاڑوں کا سینہ ہلاتے چلو

بغاوت کا پرچم اڑاتے چلو (حلف)

اس بند میں وادیوں، ساحلوں، دلدلوں، معدنوں، کھیتیوں، جنگلوں، بجلیوں، آندھیوں، اور زلزلوں نے جس خوبصورت انداز میں رہنے بسنے والوں اور ان کے دلوں میں پلنے والے بغاوت کے طوفانوں کی علامات کا کام دیا ہے اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ ایسی جوشیلی نظم میں بھی کیفی کا لہجہ کہیں سے کرخت یا دُرشت نہیں ہوتا نہ لہجے کی بلند آہنگی ان کی آواز کو ناگوار بناتی ہے۔ یہ شعریت آمیز توانا آواز خلاقی کے جوہر سے متصف ہو کر جس موضوع کو چھوتی ہے وہ ہنگامی اور وقتی ہونے کے باوجود شعر کا موضوع بن جاتا ہے بات یہ ہے کہ نظریات محض ذہن پر غالب آگئے ہوں اور شاعر انھیں شعر میں منقلب کرنے کی کوشش کرے تو محض منظوم بیانات سامنے آتے ہیں لیکن جب کوئی نظریہ ذہن کی راہ سے دل میں اتر جائے اور وہاں سے فنکار کے پور پور میں رچ بس جائے تو پھر وہ نظریہ نہیں عقیدہ بن جاتا ہے اور عقیدے اکثر شاعروں، عظیم شاعروں کے ہاں ریڑھ کی ہڈی کا کام دیتا رہا ہے خواہ وہ ملٹن ہوں یا علامہ اقبالؔ۔ کیفیؔ اعظمی کے ہاں بھی اشتراکی تصورات اور نظریات نے عقیدے کا درجہ حاصل کر لیا ہے اور اسی لیے ان کی نظموں میں فکر، جذبہ، شدتِ احساس اور زورِ بیان کے عناصر نے مل کر ہنگامی موضوعات کو بھی شعری قالب عطا کر دیا ہے۔ اسی شدتِ احساس اور جذبے کی کارفرمائی نے کیفی اعظمی کی ترقی پسندانہ شاعری میں طنزیہ اسلوب کا جادو بھی جگایا ہے جیسا کہ اقبالؔ کی بیشتر نظموں میں

طنزیہ لہجہ اختیار کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ ایسی طنزیہ نظموں میں "نئے مہربان" "لال جھنڈا" "سپردگی" "قومی حکمران" "تاریکی میں" "ناقص بھرتی" "خانہ جنگی" "دوسرا طوفان" "دھماکہ" وغیرہ بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

باقی رہیں کیفی اعظمی کے تیسرے دور کی وہ نظمیں اور کچھ غزلیں، جنھیں میں نے اوپر کہیں کیفی اعظمی کا اصل رنگ قرار دیا ہے اور جن میں "مکان" "ابن مریم" "بہروپنی" "گربھ وتی" "زندگی" اور "چراغاں" جیسی بلند پایہ طنزیہ نظمیں شامل ہیں۔ اس کے بارے میں میرا خیال ہے کہ یہاں کیفی اعظمی کا اسلوب قطعی منفرد ہے۔ تقریباً پچاس سالہ مشقِ سخن، ایک خاص نظامِ فکر سے وابستگی، اس سے حاصل ہونے والی محرومی، مسلسل غور و فکر کی عادت، فطری اخلاق اور شدتِ احساس نے مل جل کر ان نظموں میں ایسی ایسی تخلیقی پرتیں پیدا کی ہیں کہ ان پہلو دار تخلیقات کو پڑھتے ہوئے بار بار نئے امکانات کے در وا ہوتے ہیں اور نئی جہتوں کے دروازے کھلتے ہیں۔ کیفی کی دورِ اوّل کی نظمیں غنائیہ اور رومانی ہیں۔ دوسرے دور کی نظمیں بیانیہ اور خارجی شاعری کے اچھے نمونے ہیں اور دورِ سوم کی زیرِ بحث نظمیں غنائیہ اور بیانیہ کا حسین امتزاج، داخلیت اور خارجیت کا خوبصورت آمیزہ ہیں اور یہ چیزیں اس طرح پیچ در پیچ دائرہ در دائرہ کیفیات کے ساتھ اپنے مختلف شیڈیں shades لے کر نظموں میں منعکس ہوتی ہیں جن کی مثالیں ترقی پسند شاعری میں کمیاب ہیں۔ ایک اور دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ "جھنکار" اور "آخرِ شب" کی تمام نظمیں پابند ہیں لیکن ان میں ہیئت کے گوناگوں تجربات سے ندرت پیدا کی گئی ہے۔ "آوارہ سجدے" میں بھی بمشکل

بس آٹھ نو آزاد نظمیں نظر آتی ہیں ان میں سے پہلی آزاد نظم ۱۹۶۵ء کے آس پاس لکھی گئی تھی یعنی آزاد نظم بھی کیفی اعظمی نے کافی غور و تامل کے بعد قبول کی ہے۔ فیض احمد فیض نے سچ کہا ہے:

"جیسی سفاک اور بے رحم زندگی ہمارے گرد و پیش موجود ہے اس کی بے کم و کاست منظر کشی کیفی کا مسلکِ شعر ہے، نہ تلخیِ مضمون سے گھبراتے ہیں نہ تلخیِ کلام سے گریز کرتے ہیں نہ زہر کو قند بنا کر پیش کرنے کے قائل ہیں نہ قند کی حقیقت سے انکاری اور اس کے باوجود کیفی کی شاعری زہر اور قند کا ملغوبہ نہیں ہے بلکہ ایک متوازن ٹھہرے

ہوئے دردمند، فکرانگیز اور حساس نظریۂ حیات وفن کا بلیغ اظہار ہے

(پیش لفظ : آوارہ سجدے ص ۷-۸)

میں جب بھی کیفی اعظمی کے کلام کا موازنہ ان کے دیگر معاصرین سے کرتا ہوں تو ہمیشہ اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ وہ اردو شاعری میں ترقی پسند تحریک کی اہم ترین آوازوں میں سے فیض اور مخدوم کے بعد تیسری بڑی آواز ہیں

شمس اختر

”نوید فتح ہے قلب عوام کی دھڑکن“

۱۹۳۶ء سے ۶۰ء تک کی ترقی پسند شاعری میں انقلاب کا تصور رومانی رہا ہے۔ حالانکہ اقبال نے ان سے پہلے انقلاب کو وسیع ترین سیاسی اور سماجی تغیر و تبدل کے جن معنوں میں استعمال کیا تھا ان میں بڑی معنویت تھی۔ فکری تہہ داری کی اس صحت مند روایت سے عرصۂ دراز تک ترقی پسند شعراء غافل رہے اور جوش کی آواز بازگشت ہی ان کی رہنمائی کرتی رہی۔ جوش کی وطن پرستی، سامراج دشمنی اور نئے آفاقی نظام حیات کی پوری عمارت ان کے رومانی تصورات پر کھڑی تھی۔ اس میں طبقاتی شعور، انقلابی لائحہ عمل بر سر اقتدار طبقہ کی حکمت عملی تضادات کی نوعیت سے آگاہی کا احساس نہیں۔ یہ کام ترقی پسند شعراء کر سکتے تھے کیوں کہ انھوں نے ان تضادات کو دیکھا تھا۔ استحصال کو محسوس کیا تھا اور اس فلسفۂ حیات سے اپنا رشتہ استوار کیا تھا جس میں طبقاتی استحصال کی گنجائش نہ تھی مگر اس کے لئے فکری بصیرت اور عوامی زندگی سے گہری قربت کی ضرورت تھی کیونکہ یہیں سے انقلاب کا چشمہ پھوٹتا ہے۔ لیکن کھلیانوں اور کارخانوں میں ان کے قدم نہیں جمے۔ ہاں ان کی آواز فضا میں ضرور اُبھری۔ لیکن یہ بھی اتنی جذباتی اور بکھری ہوئی تھی کہ سماعت کے پردوں کو نہ چاک کر پائی۔ گرچہ ایک ہیجانی کیفیت دیر

تک طاری رہی۔ میں ان ترقی پسند شعراء کے خلوص اور ان کے عہد رفاقت کی قدر کرتا ہوں لیکن یہ احساس بھی رکھتا ہوں کہ شاعری وقتی موضوعات کی ہو یا ایک لمحے کی محض چیخ پکار نہیں ہو سکتی۔ کوئی آفاقی نقطۂ نظر کسی بڑی اور اچھی شاعری کی تخلیق نہیں کرتا۔ اگر یہی حقیقت ہوتی تو ترقی پسندوں کی صف کا ہر شاعر بڑا ہو گیا ہوتا۔ مگر نہ تو ہر شاعر کی شاعری کتاب معرفت بن سکی اور اس میں وہ نمایاں وصف توازن قائم ہو سکا جو اچھی شاعری کی پہچان ہے۔

اچھی شاعری اپنی شناخت ریت کے تودوں پر نہیں چھوڑتی۔ یہ ایسا سراب نہیں جس پر آب کا گمان ہو بلکہ یہ ہماری دھڑکنوں میں مدغم ہو جاتی ہے۔ ہمارے جذبات کا ایک ایسا حصہ ہوتی ہے جو ہمیں مہذب بھی بناتی ہے اور اس روشن نقطہ کو مزید روشن کرتی ہے جسے ہم شعور کہتے ہیں۔ انھیں معنوں میں شاعر باشعور اہل نظر سمجھا جاتا ہے۔

ترقی پسند شعراء میں ایسے اہل نظر کی تلاش سعئ بے سود نہیں۔ فیضؔ، جذبیؔ، اخترالایمان کیفیؔ اعظمی، مجروحؔ سب اچھے شعراء ہیں۔ ان کی شاعری کا ایک حصہ ایسا ضرور ہے جس نے نہ صرف اردو شاعری کو فکر و فن کے نئے تجربوں سے مالا مال کیا بلکہ جن کی صوتی خوش گواری سے بھی آنے والی نسلیں محفوظ ہوتی رہیں گی۔ یہ سب صاحب طرز شاعر ہیں۔ ان سبھوں کا مقصد ایک ہے۔ سبھی ایک ہی منزل کے راہی ہیں۔ لیکن ان کی آوازیں الگ ہیں۔ ان کے جذبات کی دنیا مختلف ہے۔ ان کے شعور کی سطحیں ایک نہیں۔ مشترک عصری حسیت کے باوجود ان کی پہچان کے نقوش میں یکسانیت نہیں۔ یہ ہماہمی اور نیرنگیاں اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ ہر دور میں اچھا فن کار اپنے اظہار کے مختلف ذرائع تلاش کرتا ہے۔ اسالیب کی تلاش محض اظہار ذات کی خاطر نہیں کی جاتی بلکہ موضوعات کی نوعیت، نئے اسلوب، نئی آواز، نئے لب و لہجہ کی تلاش کرتی ہے۔ اس لئے یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ ایک ہی موضوع پر لکھی گئیں۔ مختلف نظمیں اپنی ہیئت، زبان اور تجربوں کے اعتبار سے ایک دوسرے کے بالکل برعکس ہیں۔ انقلاب چین پر لکھی گئیں اردو نظموں کا مطالعہ اسلوب اور اظہار بیان کے اس فرق کو بیان کرے گا۔ یہی فرق نمایاں ترقی پسند شعراء میں بھی ملتا ہے۔ ایک دھیمی موسیقیت سے بھری آواز روایت کا احترام، جذبات پر شدید گرفت اور انقلاب کا گہرا رچا ہوا شعور فیضؔ کی شاعری کی خصوصیات ہیں لیکن

کیفی اعظمی کی شناخت "خطاب آمیز" لب و لہجہ سے ہوتی ہے۔ کیفی کی شاعری کا مطالعہ گزشتہ چالیس سال کی اردو شاعری کا مطالعہ بھی ہے۔ آخر شب سے آوارہ سجدے تک تبدیلیوں اور تجربوں کی بہت سی منزلیں انھوں نے طے کی ہیں۔ شاعری کی یہ منزلیں PAUL VALERY کی زبان میں تہذیب یافتہ حیوانی جبلت کے ذریعے طے ہوتی ہیں۔ کیفی کی شاعری کی ابتدا ہر نوجوان شاعر کی طرح رومان سے ہوتی ہے۔ یہ رومان ایک نئی دنیا کی جستجو سے نہ ابھرا تھا بلکہ ان مجبوریوں سے ہوتا تھا جس نے ہر دور میں چاہنے والوں کے لئے زندگی تنگ کر دی تھی۔ رومانی شاعری میں جذباتی آرزومندی کا جو سرمایہ ہوتا ہے وہ صرف ایک فرد کی داخلی دنیا سے ربط نہیں رکھتا بلکہ اپنے عہد کے تمام انسانوں کی دھڑکنیں بن جاتا ہے۔ کیفی کی ابتدائی نظموں میں دردمندی و مجبوری کی ایک ایسی فضا ملتی ہے جس میں تجربوں کی صداقت ہی تخلیقی محرک نظر آتی ہے۔ "اندیشے" میں ایک بے چین روح کی کیفیت کیفی نے جس انداز میں پیش کی ہے وہ دکھی دل کی ترجمانی ہے۔ کیونکہ شاعر کو اس کا یقین ہے کہ ؎

وہ مجھے بھول گئی اس کی شکایت کیا ہے\
رنج تو یہ ہے کہ رو رو کے بھلایا ہوگا

نام پر میرے جب آنسو نکل آئے ہوں گے\
سر نہ کاندھے سے سہیلی کے اٹھایا ہوگا

اس طرح کی نظمیں اس رومانی حقیقت نگاری کی توسیع ہیں جس کی ابتدائی مؤثر شکلیں حسرت کے یہاں ملتی ہیں۔ حسرت و یاس اور رنج و مجبوری کے ساتھ ساتھ کیفی اعظمی نے بھی اس وضع داری کو نبھانے کی کوشش کی ہے جو اردو شاعری میں میر تقی میر اور پھر اپنی نئی شکل میں مومن کے یہاں عام ہے۔ اپنی نظم "احتیاط" میں "رشتہ دل توڑنے" کے سانحہ کو غم انگیز لہجہ میں بیان کرتے ہیں ؎

اب تم آغوش تصور میں بھی آیا نہ کرو\
چھوٹ جانے دو جو دامان وفا چھوٹ گیا

کیوں یہ لغزیدہ خرامی یہ پشیماں نظری
تم نے توڑا تو نہیں رشتہ دل ٹوٹ گیا

یہ بھی ایک بڑا المیہ ہے کہ انسان جس چیز کو بھولنا چاہے نہیں بھول پاتا۔ کبھی کبھی یادداشت ناسور بن جاتی ہے۔ تخلیقی فن کار کے یہاں یہ ناسور گاہے گاہے کسی بڑی اور اچھی تخلیق کا سبب بن جاتا ہے۔ کیفی نے محبت کی اس مجبوری کو ایک باشعور انسان کی طرح محسوس کیا اور ایک فرد کے المیہ کو ایک عہد کے المیہ سے ملا دیا۔ جب وہ اپنی داخلی دنیا کے حصار سے آزاد ہو کر ارد گرد کی بکھری ہوئی حقیقتوں پر نظر ڈالتے ہیں تو اچانک سماجی حقائق کی اندوہناک تصویریں ان کے سامنے آجاتی ہیں۔ وہ خلوت جہاں وہ اپنے آغوشِ تصور میں بھی محبوب کو بھلانے سے پرہیز کرتے ہیں یک بیک ایسی خلوت میں تبدیل ہو جاتی ہے جس میں ایک بیوہ کی عصمت لوٹ لی جاتی ہے۔ اس نظم کا مطالعہ محض CANTENT ANALYSIS کے نقطۂ نظر سے اہم نہیں ہے بلکہ شاعرانہ محاسن کے اعتبار سے بھی اہم ہے۔ کیفی، جوش ہی کی طرح الفاظ کے جادوگر نظر آتے ہیں۔ دونوں میں ایک نمایاں فرق البتہ یہ ہے کہ کیفی برابر الفاظ سے نہیں کھیلتے بلکہ الفاظ کو جذبات کے اظہار کا ایک مؤثر ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اگر شاعری بقول آئی۔ اے۔ رچرڈز جذبات کی زبان ہے تو کیفی اس معیار پر پورے اُترتے ہیں۔ ایک بیوہ کی جو تصویر کیفی نے اپنی نظم "منظر خلوت" میں پیش کی ہے وہ بے حد خوبصورت ہے۔ یہ بیوہ سر بہ سر تصویرِ درد، دل شکستہ، مضمحل سوگ میں ڈوبی ہوئی ملتی ہے بلکہ بقول شاعر ایک ع

"پیکرِ گل میں خزاں اترتی ہوئی"

ہے۔ اس 'پیکرِ گل' نے جوانی کی بجلیوں کو برف میں روپوش کر رکھا ہے۔ اپنے تیرِ نظر کو سست رو اور بے کار بنا دیا ہے۔ کیونکہ بیوگی اور غربت کی زخم خوردہ اپنے معصوم چشم و چراغ کو لئے آسرا کی تلاش میں ایک مولانا کے پاس پہنچتی ہے۔ اس مولانا کی صورت اور سیرت کا جو مرقع شاعر نے کھینچا ہے وہ اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ پڑھنے والا آج بھی اس کردار سے بخوبی آشنا ہے۔ اور شاید آنے والے عہد میں بھی یہ شناسائی باقی رہے گی۔ ایک نوجوان بیوہ کو دیکھ کر بوڑھے مولانا کے اعصاب پر جو اثرات ہوئے وہ ملاحظہ ہوں ؎

سرمہ گوں آنکھوں میں لالی آگئی — روئے زیبا پر بحالی آگئی
زید کا لبریز پیمانہ ہوا — انگلیوں سے ریش ہی شانہ ہوا
عارضی عصمت کو لے ڈوبی ہوس — خود بخود تپنے لگے تارِ نفس
تھرتھرا کر ہونٹ نیلے ہو گئے — پیچ عمامہ کے ڈھیلے ہو گئے
پھول کر سینہ سوا ہونے لگا — تنگ ہر بند قبا ہونے لگا
تیوریوں میں سر ریا دھننے لگی — آستینوں کو دغا چننے لگی

تقدس مآب شخصیتوں کی یہ نقاب کشائی کوئی نیا موضوع نہیں ہے۔ اردو و فارسی شاعری کا سرمایہ ان سے بھرا ہے۔ لیکن ۱۹۴۳ء کی یہ نظم اس تحریک کے شباب کی یادگار ہے جس نے ریاکاری، اندھی مذہب پرستی اور مکر و فریب پر بڑی کاری ضرب لگائی تھی۔ ویسے اس نظم کا استعاراتی نظام خصوصیت سے محلِ نظر ہے۔

کیفی کی اس طرح کی رومانی شاعری کا دور بہت مختصر رہا جس کا ذکر مقالہ کی ابتدا میں کیا گیا۔ انھوں نے بہت جلد یہ محسوس کر لیا کہ ان کے عہد کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ چنانچہ تحریک سے ان کی دلچسپی جتنی بڑھتی گئی ان کے موضوعات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ انھوں نے "رسم عاشقی" کے مطالبات کو بھی وسیع تناظر میں دیکھنے کی ضرورت محسوس کی۔ ان کا یہ احساس زندگی پر اُن کے قوی ایمان اور ایک نئے نظام حیات کی تشکیل کی آرزو سے پیدا ہوا۔ "آخر شب" کی اکثر نظمیں اپنے موضوع کے اعتبار سے سیاسی نوعیت کی ہیں۔ فیصلہ، تلاش کب تک، آخری مرحلہ، فرزدہ، تربت، آن، نئی جنت، ہم، آزادی، سوویت یونین اور ہندوستان، فتح پرستی، ہم آگے بڑھتے ہی جا رہے ہیں، لال جھنڈا، سپردگی، قومی حکمران، حملہ، قومی اخبار، تاریکی میں، خانہ جنگی کا تعلق اپنے زمانے کے اہم واقعات سے ہے۔ "آخر شب" کی ابتدائی رومانی نظموں کے بعد جب ہم ان مذکورہ نظموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو اچانک یہ احساس ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنی نغمگی میں ایک پراسرار "خطابت" کو داخل کر دیا ہے لیکن مداخلت کا یہ عمل "فرمائش" کے تصور سے کوئی تعلق نہیں رکھتا جس کا ذکر خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنی کتاب "ترقی پسند تحریک" صفحہ ۔ ۱ میں کیا ہے۔ خلیل الرحمٰن نے کیفی کی شاعری پر دو بنیادی اعتراضات کئے ہیں۔

(۱) انھوں نے فرمائشی نظم لکھنی شروع کردیں۔ (فرمائش سے مراد کمیونسٹ پارٹی کے رہبروں کی فرمائش)۔

(۲) انھوں نے ظفر علی خاں اور شبلی کی نظموں کا طرز اختیار کیا۔

پہلے اعتراض میں صداقت صرف اس حد تک ہے کہ اپنی انتہاپسندیوں کی وجہ سے بعض شعراء نے شاعری کو ترک کر کے صحافت اور پروپیگنڈہ کو راہ دینی شروع کر دی تھی جس کی سب سے اچھی مثال نیاز حیدر کی شاعری ہے۔ کیفی اعظمی کی مجموعی شاعری کو سامنے رکھیے تو خلیل صاحب کا یہ اعتراض سند کا محتاج نظر آئے گا۔ اس میں شک نہیں کہ نظم کے وہ فارم جو شبلی، ظفر علی خاں اور اقبال نے استعمال کئے تھے نظم معرا اور آزاد نظم کی بہ نسبت غیر پسندیدہ ہونے لگے تھے لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ عوام و خواص میں اس وقت تک بے حد مقبول تھی۔ اور آج بھی ان میں اعلیٰ شاعری کے امکانات ختم نہیں ہوئے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ کیفی نے نظم معرا اور آزاد نظمیں بھی لکھی ہیں "آخر شب" کے بعد ان کی کئی نظمیں مثال کے لئے پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان باتوں سے میں صرف شاعر کی قادر الکلامی کی طرف قارئین کی توجہ منعطف کرنا چاہتا ہوں یہ بات نہیں کہ کیفی کو یہ شعور نہیں تھا کہ ہر دور میں اظہار و ابلاغ کے ذرائع الگ ہوتے ہیں اور ہر دور کے لئے ترسیل کا مسئلہ بھی نیا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر حامدی کاشمیری نے اپنی کتاب "جدید اردو نظم اور یورپی اثرات" صفحہ ۲۲۹ میں کیفی اعظمی پر اختر شیرانی کی رومانویت تلاش کی ہے۔ یہ درست نہیں۔ کیفی اپنی شاعری کے کسی موڑ پر اختر شیرانی سے متاثر نہیں ہوئے۔ کیفی کی رومانی شاعری میں برابر ہی ایک طرح کی رجائیت طاری رہی۔ اگر غموں کی کیفیت بھی ملتی ہے تو حزن معصوم کی شکل میں۔ اختر شیرانی اس حقیقت کے باوجود کہ انھوں نے اردو شاعری میں ایک طرح کی رومانی حقیقت پسندی کی روایت کی توسیع کی کیفی کے مرشد نہیں بن سکے۔ یہ لکھنا بھی مناسب نہیں کہ وقتی اور ہنگامی واقعات کو کس طرح اپنی فکر کے دائرہ میں اسیر کرتا ہے اور فکر و اظہار کے درمیان ہم آہنگی قائم رکھتا ہے یا نہیں۔ اقبال کی شاعری کا بڑا حصہ اپنے دور کے اہم واقعات سے بے نیاز نہیں۔ اختر شیرانی کی سلمیٰ اور عذرا ان کی تخلیق کا محرک بنی، خواہ یہ خام خیالی ہوں یا حقیقی لیکن شاعر نے اپنے واہمہ

میں انھیں مقید رکھا اور ان کے گرد تانے بانے بنتا رہا۔ اقبال نے مرد کامل کے تصورات کو اپنی فکر کا محور بنایا۔ ترقی پسند شاعروں نے انقلاب اور استحصال سے عاری سماج کی تشکیل کا خواب دیکھا گرچہ ان کی فکر کا یہ پہلو بہت زمانے تک رومانی رہا لیکن اس کے باوجود بھی وہ مقصد کے تئیں برابر پُرخلوص اور دیانت دار رہے۔ اس دیانت داری نے ان کے فنی حسن کو مجروح کیا کیفی کی شاعری کا کمزور پہلو بھی وہی ہے لیکن کیفی کی مجموعی شاعری جو رومان سے حقیقت اور حقیقت سے اشتراکی رومانی حقیقت کی طرف ایک طویل سفر طے کرتی ہوئی نظر آتی ہے اپنے دور کی بے حد منفرد آواز لگتی ہے ـــــ اس سلسلے کی سب سے خوبصورت نظم ہے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جب بھی چوم لیتا ہوں ان حسین آنکھوں کو
سو چراغ اندھیرے میں جھلملانے لگتے ہیں

خشک خشک ہونٹوں میں جیسے دل کھینچ آتا ہے
دل میں کتنے آئینے تھرتھرانے لگتے ہیں

پھول کیا شگوفے کیا چاند کیا ستارے کیا
سب رقیب قدموں میں سر جھکانے لگتے ہیں

ذہن جاگ اٹھتا ہے روح جاگ اٹھتی ہے
نقش آدمیت کے جگمگانے لگتے ہیں

لو نکلنے لگتی ہے مندروں کے سینے سے
دیوتا فضاؤں میں مسکرانے لگتے ہیں

رقص کرنے لگتی ہیں مورتیں اجنتا کی
مدتوں کے لب بستہ غار گانے لگتے ہیں

لمحہ بھر کو یہ دنیا ظلم چھوڑ دیتی ہے
لمحہ بھر کو سب پتھر مسکرانے لگتے ہیں

وقتی اور ہنگامی موضوعات پر لکھی گئی نظموں میں کیفی کا تخلیقی رویہ قدرے جارحانہ اور طنزیہ رہا ہے "نئے مہربان" کو پڑھیے اور ہر مصرع میں چبھتے ہوئے نشتر کو محسوس کیجیے۔ اسی طرح ان کی ایک نظم "قومی اخبار" ہے۔

"قومی حکمراں" کیفی اعظمی کے سیاسی شعور کی بہت اچھی ترجمانی ہے۔ کیفی کی شاعری گزشتہ ۵۰ سال کے اہم سیاسی اور سماجی حادثات کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ ایسی آنکھ کی شاعری ہے جو مناظر فطرت میں صرف حسن نہیں دیکھتی بلکہ آس پاس کے مظالم اور استحصال سے خوں چکاں بھی ہے۔ کیفی اس بیڑی کو کاٹ ڈالنا چاہتے ہیں جو مظلوم انسانوں کے پیروں میں ڈال دی گئی ہیں۔ یہ تلنگانہ

کی سرزمین ہو یا بنگال کی۔ کیفی اپنی وقتی نظموں میں انقلاب کے نشے میں سرشار نظر آتے ہیں۔ یہ سرشاری عوام سے گہری محبت اور شناسائی سے پیدا ہوئی ہے "فرمائش سے نہیں"۔ ان نظموں میں بھی استعاروں کی جادوگری شاعر کے جذبات کا ساتھ دیتی ہے اور یہ رفاقت کسی کاوش کے سہارے آگے نہیں بڑھتی بلکہ فطری طور پر ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔

کیفی نے انقلابی رجحانات کی آئینہ داری میں آزادیٔ نسواں کا بھی ایک صحت مند تصور دیا۔ یہ وہی تصور ہے جو مجاز کے یہاں "آنچل سے پرچم" بن جاتا ہے۔ کیفی نے اقبال کے اس نقطۂ نظر کو بڑی تقویت پہنچائی جس نے حرکت و تغیر کو انسانوں کی بہتری کے لئے ضروری بتایا۔ ان کے یہاں انقلابی محاکات اور تشبیہات میں ایک ایسی ندرت ہے جو انھیں ان کے ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے۔ کیفی نے مظلوم انسانوں کی وسیع آبادی کو اس طرح اپنی شاعری میں نمایاں کیا ہے جس سے ان کی پہچان ہوئی۔ یہ بے چہرہ افراد اپنی تمام آرزوؤں کے ساتھ برسوں سے کیڑوں مکوڑوں کی طرح جی رہے ہیں۔ کیفی کی شاعری کی بے چہرگی اس بے چہرگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتی جس کا ذکر جدید نسل اکثر و بیشتر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محمد حسن نے ان کی شاعری کو ترقی پسند تحریک سے اپنی نفرت کا اظہار ہے۔ کسی شاعر کا کلام اگر اس کے دور کا آلہ بن جائے تو باعث فخر ہے لائق سرزنش نہیں۔

"آوارہ سجدہ" ایک بہت مختصر مجموعۂ کلام ہے جس میں نظمیں اور غزلیں دونوں شامل ہیں۔ فیض نے جب یہ کہا کہ کیفی وہی کیفی ہیں جنھیں ہم پچیس برس سے جانتے ہیں تو اس سے ان کی مراد کیفی کی نظریاتی وابستگی اور ان کی استقامت ہے۔ یہ وابستگی اور نظریاتی استحکام کیفی کی شاعری کے بنیادی تخلیقی محرکات میں شامل ہیں۔ غالب نے زندگی سے جتنی محبت کی تھی کیفی نے عام انسانوں سے اسی قدر پیار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ بار بار ان کے یہاں اقتصادی جبر کے خلاف آواز سنائی دیتی ہے۔ "ابن مریم" "زندگی اور کھلونے" میں یہ احساس جا بجا موجود ہے۔

کیفی کی انسان دوستی نے ان کے سماجی اور سیاسی شعور کو جلا بخشی چنانچہ دوسرا طوفان اور تسمہ پا، میں اس کا عکس بہت واضح ہے۔ آوارہ سجدہ، کا مطالعہ ان کے لئے شاید تسکین کا باعث ہو جو کیفی کو نرا ٹریڈ یونین لیڈر سمجھتے ہیں کیونکہ اس کتاب کی کئی نظموں میں انھیں شدت

ملے گی جو رومانی ہونے کے باوجود نیا پن رکھتی ہے۔ "آخر شب" میں بھی رومانیت ہر جگہ نظر آتی ہے لیکن 'آوارہ سجدہ' کی نظموں میں یہ رومانیت اپنے جلو میں زندگی کی اثباتی قدروں کو ساتھ لے کر آگے بڑھتی ہے۔ یہ انقلاب اور رومان کا ایک امتزاج ہے جو "آخر شب" کے یہاں صرف جذباتی نوعیت کی شکل میں تھی لیکن بعد کی شاعری میں اس کا تعلق حسن کے معصوم تصور اور انقلاب کے مبہم نظریات سے ہٹ کر ایک بہتر صورت میں نمودار ہوئی ہے۔ یہاں اس کے کردار کا رومانی انقلابی پہلو متوسط طبقہ کی آئیڈیلزم سے گہری مطابقت رکھتا ہے۔ اور یہ متوسط طبقہ گزشتہ دہائی کا ہے آزادی کے فوری بعد کا نہیں۔ اس طرح وہ سوال جو ایک انقلابی نے بھی کیا تھا "کیا یہ شاعری ہماری زندگی کا حصہ معلوم ہوتی ہے"؟ اہم نہیں رہا۔ "آوارہ سجدہ" کی نظموں میں سب سے اہم نظم 'ابن مریم'، 'آوارہ سجدہ'، 'زندگی اور دائرہ' ہے۔ کیفی نے ان نظموں میں جو علامت پیش کی ہے وہ علامت نگاری کی اس روایت سے کوئی تعلق نہیں رکھتی جو یورپی علامت نگاری کے اثر سے جدید اُردو شاعری میں پروان چڑھی ہے۔ یہ اُردو شاعری کی قدیم علامتوں سے قریب تر ہے لیکن اتنی قریب بھی نہیں کہ کہنہ روایت کی ایک جزو بن جائے۔ یہ نظم سحر کاری سے نزدیک ہے۔ اس کی بے ساختگی میں حسن اور دلکشی ہے۔ یہ نظم اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ کیفی کی شاعری میں شعریت کے اعلیٰ ترین عناصر ہیں۔ یہ کہنا کہ کیفی نے بعد کی شاعری میں خطابیہ لہجہ ترک کر دیا، صحیح نہیں ہے۔ میں نے مقالہ کی ابتدا میں کیفی کی شناخت کے لئے "خطاب آمیز" کے الفاظ استعمال کئے تھے۔ 'آوارہ سجدہ' کی نظموں میں بھی یہ لب و لہجہ موجود ہے لیکن اظہار کے حسن اور انداز بیان کی جادوگری نے اس خطابی لب و لہجہ کو ریشم کی طرح نرم جھرنوں کی طرح ترنم بنا دیا ہے۔ "آوارہ سجدہ" کا شاعرانہ فکر اور شاعرانہ آہنگ کے اعتبار سے بہت کامیاب ہے۔ یہ درست ہے کہ ان سے ابہام اور علامت کو تمثیل کی شکل نہیں دی گئی ہے بلکہ وضاحت سے کام لینے کی کوشش کی گئی ہے اور ان کی علامتیں عام فہم ہیں۔ لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ دانستہ شعر کو مبہم بنانا یا شعوری طور پر ابہام کی گنجائش پیدا کرنا اور علامتوں کو اختراع کرنے کے شاعرانہ عمل سے یہ فطری حسن زیادہ بہتر ہے اور حسن کاری کی اچھی مثال پیش کرتی ہے۔

اردو کے ترقی پسند شعرا میں بہتوں نے کچھ دور چل کر اپنے لئے نئی پناہ گاہیں تراش لیں۔ کچھ لوگوں نے اسلامیات کا سہارا لیا، کچھ نے جدیدیت کی توسیع میں ہاتھ بٹایا، کچھ تھک ہار کر خاموش ہو رہے لیکن کیفی نے تحریک کے کرب کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔ اگر وہ صرف ٹریڈ یونین لیڈر ہوتے تو اپنی جیبیں گرم کر کے بیرونی ملکوں کی سیر کرتے رہتے اور اس کرب کا اظہار کبھی نہ کرتے جو نظم 'دائرہ' میں ہے۔ یہ کرب صرف ایک شاعر کی کسی تحریک سے وابستگی کا کرب نہیں ہے بلکہ آفاقی تحریک کے انتشار کا المیہ ہے۔ کیفی زندگی میں برابر ہی انقلابی قوتوں کا ساتھ دیتے رہے اسی لئے ان کی نظمیں تاریخ کے اہم واقعات کی مسلسل کڑیاں بھی معلوم ہوتی ہیں۔ میں تاریخ گوئی کو شاعری نہیں کہتا لیکن تاریخ سے منھ موڑ کر جو شاعری کی جاتی ہے وہ بھی میرے نزدیک امر مستحسن نہیں۔ میں نے برابر ہی کیفی کے یہاں تر و تازگی، ایک حوصلہ مندی اور عام انسانوں کی بہتری کی جذباتی آرزومندی محسوس کی ہے۔ مجھے یہ آواز برابر سنائی دیتی ہے۔

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
تم پریشان نہ ہو باب کرم وا نہ کرو
اور کچھ دیر پکاروں گا چلا جاؤں گا

شاعری کو فرائیڈ نے خوابوں کی زبان کہا۔ اگر اس تعریف کو تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیا جائے تو کیفی اعظمی کی پوری شاعری خوابوں کی زبان ہے۔ وہ صحیح معنوں میں خوابوں کے سوداگر ہیں۔ یہ خواب الفاظ کی جذباتی کیفیت کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں۔ دراصل خواب اور واہمہ کے درمیان ایک اٹوٹ رشتہ ہوتا ہے۔ ہم اس سے کتنا ہی انکار کیوں نہ کریں لیکن اس رشتہ کی صداقت تخلیقی عمل کے دوران برابر ہی ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ کیفی کی شاعری میں کلیدی الفاظ کی تلاش سے زیادہ بہتر کام ان خوابوں کی تعبیر ہے جو شاعر نے برسوں سے اپنی پلکوں میں چھپا رکھا ہے۔ کیونکہ کیفی کے یہاں الفاظ اپنی جامد شکلوں میں موجود نہیں ہیں۔ الفاظ کی دراصل جامد شکلیں ہوتی بھی نہیں ہیں۔ ہر لفظ جہاں ہستی رکھتا ہے اور ہر لفظ میں تاریخ کی دھڑکن چھپی ہوتی ہیں۔ کیفی کے یہاں الفاظ محض شوکت بیان کے لئے نہیں آتے بلکہ ان کا رشتہ تلازمات کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ یہ تلازمات آزادی سے پہلے اور آزادی کے تیس برسوں بعد ایک نہیں رہے۔ اس لئے

ان کی پہچان میں دقت نظر سے کام لینا ہوگا۔ کیفی کے یہاں شعریت، الفاظ اور اشیاء کو ایک مربوط کرنے والے عناصر سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے ان کا خطابی لہجہ بھی داخلی رجحان سے سو فیصدی آزاد ہیں۔ دراصل نظم میں بیرونی اور داخلی عناصر کا نکتہ انضمام کیفی کے یہاں گھلے ملے ہوئے ملتے ہیں۔ خاص کر 'آوارہ سجدہ' کی نظموں میں۔ انھیں اپنے آپ میں سمٹنے کا رومانوی داخلی عمل کبھی فیصلہ کن عنصر کی حیثیت سے ان کے سامنے نہیں آیا۔ وزیر آغا تقسیم ہند کے بعد جس نئی رومانوی تحریک کی بات کرتے ہیں وہ بھی کیفی کے یہاں لاشعور کا حصہ نہیں بنی بلکہ کیفی نے تسلسل کے ساتھ تحریک سے اپنے رشتہ کی بنیاد پر شاعری کی اساس رکھی۔ اسی لئے ان کے یہاں فرار، بیزاری، زخم خوردگی نہیں ملتی اور نہ تنہائی کا وہ سانپ انھیں ڈستا ہے جسے ہمارے عہد کے دانش وروں نے اپنی آستینوں میں چھپا رکھا ہے۔

ان کے کان ہمیشہ اُن دھڑکنوں کو سنتے رہے جو نوید فتح بن کر دنیا میں ابھرتی رہی۔ اسی لئے انھوں نے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ جراًت مندانہ لہجہ میں کہا۔

پکارتا ہے افق سے لہو شہیدوں کا
کہ ایک ہاتھ سے کھلتی نہیں گلے کی رسن
یہ یاس کیوں یہ تمنائے خود کشی کیسی
نوید فتح ہے قلب عوام کی دھڑکن

افصح ظفر

کیفیؔ اعظمی کی نظم نگاری

شعر و ادب کی تفہیم میں ہزار گوشے پیدا کئے گئے ہیں ہزار نقطے اور دائرے بنائے گئے ہیں مگر یہ تفہیم اسی وقت قابلِ قبول ہوتی ہے جب اس کی شناخت ہی تعصب سے کم اور تفکر سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ تفہیم کا کام سر انجام دینے والا کھلا ذہن ہے متن اور بطن کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اردو شاعری کی تفہیم میں یہ کھلا ذہن عام طور پر دیکھنے کو کم ملتا ہے۔ اردو شاعری کے ہر دور میں اسی لئے تحفظات سے بھرے ہوئے لوگ زیادہ ملتے رہے ہیں۔ یہ روایت جاری ہے۔ فرق صرف اتنا ہوا ہے کہ ہمارے ابتدائی صاحبِ نظر زبان و بیان کے تعصبات میں ڈوب کر شعر اور شاعری کی جانچ اور پرکھ کرتے تھے مگر اب ہمارے تفہیم کار نظریاتی تعصبات کے گنبد میں اسیر ہو کر اپنی شناخت کا جواز پیش کرتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ شاعری کی تفہیم کے ہزار گوشے ہزار زاویے نظر کے غماز تو بن جاتے ہیں لیکن شعر اور شاعر کو کہیں گم کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی لفظ ہاتھ لگتا ہے اور کبھی معنی۔ حالانکہ ہر شاعر چاہے وہ کسی عہد کا ہو لفظ و معنی کو جب تک خوب اچھی طرح گوندھ نہیں لیتا شعر نہیں کہہ سکتا۔ کیوں کہ لفظ و معنی کی بنیادی اجارہ داری عوام کے قبضہ میں ہوتی ہے۔ کوئی لفظ اور کوئی معنی بغیر انسانی ہجوم کے بے معنی ہو جاتا ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت یہ ہے کہ الفاظ کی تعمیر و تشکیل میں پورا سماج حصہ لیتا ہے اور جب شاعر لفظوں کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا ہے تو اس کا تخلیقی جوان لفظوں کی اکہری صورت سے بے زار ہو جاتا ہے اور یہ بے زاری اُسے آواز کے ابہام سے قریب کر دیتی ہے۔ اسی لئے شاعری کا رشتہ موسیقی سے بڑا گہرا ہو جاتا ہے۔ جب جب شاعر کے یہاں موسیقی سے گہرا رشتہ پیدا ہوا ہے شعر و ادب کی دنیا غنائیہ سے اس وقت بہت قریب ہوتی رہی ہے۔ چونکہ موسیقی کی یہ قربت شاعر کو لفظ اکہرے پن کی اکتاہٹ سے دور رکھتی ہے اسی لئے

شاعر آہنگ کا رسیا بن جاتا ہے۔ گویا آہنگ کی تلاش شاعری ہے۔ اور آہنگ کا جب ہم تجزیہ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ شاعری اسی لئے ایک مہذب فعل بن جاتی ہے اور توازن پیدا کرنے کا یہ عمل اُن فی شعور کے بانکپن کی نشاندہی کرتا ہے۔ لہٰذا ہر شاعر اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اس آہنگ سے پورے نظام حیات میں حلول کر کے رکھ دے اور نتیجہ کے طور پر وہ اپنے اپنے عہد کی روشنی اور اندھیرے کا نمائندہ بن جاتا ہے۔

کیفی اعظمی کی شاعری کو میں اسی لحاظ سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیفی "آخرِ شب" کی اشاعت تک اکہرے سماج کا شاعر ہے۔ اور یہ اکہرا سماج انیسویں صدی کے آخری دہوں سے لے کر تقسیم ہند تک برقرار رہتا ہے۔ اسی پورے عہد میں اقبال کی شاعری کا پودا تناور درخت میں تبدیل ہوتا ہے۔ اس عہد میں برصغیر کا ضمیر اپنے مقدّر کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ ضمیر کی یہ تلاش معنی کی تفہیم ہی چاہے کتنی ہی مختلف ہو مگر لے اور آہنگ میں ایک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی آواز کثرت میں وحدت کا نمونہ پیش کرتی ہے اور شاعری کے اظہار میں ذہن کے سارے پیچ و خم اپنے تمام استعارے اور اپنے تمام پیکر میں رنگوں کی بوقلمونی کے باوجود یکساں اور اکہرے نظر آ رہے ہیں۔ اظہار کے لئے ہیئت صرف سہارے کا کام کرتی ہے۔ اقبال کے بعد ابھرنے والے جوشؔ اور فیضؔ یہاں تک کہ ماورا کے ن م راشد بھی اس اثر سے دور نہیں ہوئے۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ فکری نہج کے مخصوص راستے پر سر پٹخنے والے کیفی جیسے نوجوان شاعر آخری شب میں اس روش سے ہٹ کر سوچتے۔

آخرِ شب میں کیفی اسی اکہرے پن سے متاثر ہیں۔ اس مجموعہ میں کیفی عشق بھی کرتے ہیں اور انقلابی بن کر سماج، سیاست اور فرد کو حیات و کائنات کے مخصوص انقلابی طرز فکر سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سرورق پر ایلیا اہرن برگ کی یہ مشہور عبارت لکھ کر اپنے شعری رویے کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔

"ایک ادیب کے لئے یہی ضروری نہیں کہ وہ ایسے ادب کی تخلیق کرے جو مستقبل کی صدیوں کے لئے ہو، اُسے ایسے ادب کی تخلیق پر بھی قدرت ہونی چاہیے جو صرف ایک لمحے کے لئے ہو، اگر اس ایک لمحے میں اس کی قوم کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔"

یہ عبارت اپنے عہد کی کشمکش کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ کیفی نے اس عبارت کو اپنی اس شاعری کی پیشانی پر سجا دی ہے جو سنہ ۱۹۴۷ء میں طباعت پذیر ہوئی۔ اگر ہم دل و دماغ کو اپنی اس

شاعری کی پیشانی پر جگہ دی ہے جو مئی سنہ ۱۹۴۷ء میں طباعت پذیر ہوئی۔ اگر ہم دل و دماغ کو اپنے تحفظات سے پرے کر کے ذرا بھی غور کر دیکھیں تو محسوس ہوگا کہ یہ زمانہ اکہرے پن کو توڑ کر انجام تک پہنچنا چاہتا ہے۔ "داغ داغ اجالے" کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔ انقلاب ہو یا رومان، فرد ہو یا جماعت، مواد ہو یا ہیئت نظریہ ہو یا عمل، آزادی ہو یا غلامی، ہندستان ہو یا پاکستان غرض خوشی ہو یا غم امن ہو یا جنگ کچھ بھی ہو یہ زمانہ کسی نہ کسی طرح آخری ہچکی لے رہا ہے۔ انجام کار کا یہ مقام نفسیاتی طور پر شعری لحاظ سے تھمے تھمے اظہار کے لئے مجبور کرتا ہے۔ آخرِ شب کی رومانی نظموں میں اسی لئے ہمیں ہیجانی کیفیت نہیں ملتی۔ بلکہ معشوق کے نقش و نگار جوش کی لفظیات اور استعارے اور تشبیہ کے نظام کو چمکارتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں مثال کے طور پر نظم "نقش و نگار" کے یہ اشعار پڑھئے۔

چشم بد دور یہ قد بالا
جیسے مشرق سے صبح نو کا دیدار
بیل جاتی ہوئی منڈیروں پر
دھوپ چڑھتی ہوئی سرِ دیوار
وقت کی گرم چٹکیوں میں تیز
حُسن کے دستِ صندلیں میں ستار

—

یہ جواں جسم یہ لطیف بدن
جیسے سانچے میں ڈھل گئی ہے پھوار

—

بھینچ کے کھلنے کی حسرتِ زندہ
کھل کے بھینچنے کی لذتِ جاندار

—

پھول سے جسم پر سفید لباس
چاندنی اوڑھ کر کھڑی ہے بہار

تیری ٹھوکر میں سینکڑوں عہدیں

تیری مٹھی میں سینکڑوں تیوہار

کیفی کے مندرجہ بالا اشعار نئے نوجوان ذہن کے عشقیہ انداز و اظہار کا نمونہ پیش کرتے ہیں جو ہمیں جوشؔ کے والہانہ پن کو نئی اردو شعریات کی آنے والی شناخت کا پیش خیمہ معلوم ہوتا ہے۔ ان اشعار میں محبوب کے سراپا کا تصور خارج سے باطن کی طرف گریزاں معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کے استعاراتی طرز میں نظری لمس کے ساتھ طبیعی لمس کا بھی احساس ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت جوشؔ میں نہ تھی۔ جوشؔ کے کچھ اس قسم کے اشعار یا تو ہماری باصرہ نوازی کر کے رہ جاتے ہیں یا فیوڈل پسندذہنیت کا نمونہ معلوم ہوتے ہیں۔

گل بیز و گہر ریز و گہر بار و جگر تاب — کلیوں نے جسے رنگ دیا گل نے سنوارا

نوخاستہ و نورس و نو طلعت و نو خیز — وہ نقش جسے خود یدِ قدرت نے ابھارا

خوش چشم و خوش اطوار و خوش آواز و خوش اندام — اک خال پہ قربان سمرقند و بخارا

گل پیرہن و گل بدن و گلرخ و گل رنگ — ایماں شکن آئینہ جبیں انجمن آرا

کچھ اسی طرح کے لفظی پیکروں میں خاص تکراری انداز سے پلتی بڑھتی نقش و نگار کے مجموعہ کی یا پری چہرہ والی جوشؔ کی یہ نظم جاگیردارانہ ذہن کا نتیجہ بن کر ابھرتی ہے کہ اس نظم کا آخری شعر ہے۔

اللہ کرے وہ صنم دشمنِ ایماں

مچلے کسی شب جوشؔ کے پہلو میں دوبارہ

اور اس کے برخلاف کیفی کی متذکرہ نظم حسرت دیدار کی تشنگی کے ساتھ یوں آ اصلیت سے دوچار ہوتی ہے۔

جا ترے ساتھ ساتھ جائے گی

یہ فضا یہ ہوا یہ رت یہ بہار

اس نظم کا یہ آخری شعر نہ طعنہ ہے اور نہ بیزاری بلکہ کچھ انوکھی سی معنویت کی لذت لئے ہوئے ہے یہ معنویت ہمیں اصلی بھی معلوم ہوتی ہے اور پر جوش بھی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پوری نظم اس شعر کی کلیدی حیثیت بن کر تا ثر پیوست ہو جاتی ہے۔ جوشؔ کا یا پری چہرہ جہاں بے نمک ہو گیا ہے وہاں کیفی کے محبوب کے نقش و نگار میں کائنات کے مظاہر کی آمیزش سے سات رنگ پیدا ہو گئے ہیں۔

اور اس نظم کو پڑھتے ہوئے ہمارے حواس خیرہ جاگ جاتے ہیں۔

آخری شب کی رومانی نظموں میں عام طور پر خوبصورت کیفیت اس لئے پیدا ہوگئی ہے کہ کیفی اپنی ان نظموں کی تعمیر میں آہستہ آہستہ اپنی مٹھی کو بند کرتے ہیں۔ نظم و ضبط کا یہ عمل دائرہ تہ دائرہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ تجدید، حوصلہ، تبسم جیسی مختصر نظمیں تو روشنی کے جھماکے جیسے انداز میں سامنے آتی ہیں۔ اس لئے ان نظموں میں فنی گرفت کا آپ ہی آپ مضبوط ہو جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں مگر جہاں کیفی موضوعات کو دائرے بناتے ہیں، وہاں ان کی گرفت آہستہ آہستہ مستحکم ہوتی ہے۔ نذر سوں کی محافظ میں جنریشن گیپ سے نا بن کر قدروں کی روایت کو زندگی کے نمو پذیر جدلیاتی امور کی شاعرانہ توجیہ سے وہ آہنگ پیدا کیا گیا ہے جو شاعر کے مخصوص طرزِ فکر کو بہت دھیمے طرز سے روشن کرتا ہے۔ اس نظم میں نئی نسل کی پیروی روائتی روشن خیال کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ نئی نسل کی پرہمدردی دراصل اس مثبت اندازِ فکر کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ جس پر کیفی کو بے حد اعتماد ہے اسی لئے کیفی ان کی آزادی کی خواہش کو منفی نہیں مثبت سمجھتا ہے۔

یہ تتلیاں جنہیں مٹھی میں بھینچ رکھا ہے ۔ جو اڑنے پائیں تو انھیں کبھی نہ خار ملے
تری طرح انھیں یہ بھی کھلے رہ جائیں ۔ تپش بجھو نہ ان ناچتے شراروں سے

اس تذکرہ سے کیفی کی رومانی شاعری کا جو مزاج بنتا نظر آتا ہے وہ ہمیں نئے عہد کے حساس نوجوانوں کی مہذب اور شرافت کا تو نمونہ پیش کرتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس میں ہمیں جاگیری عہد کے نوجوان ذہن کی تکثیر بھی نظر آتی ہے۔ یہاں پر کیفی کا ارضی تصورِ عشق حالات و کوائف کے مسائل میں الجھ کر جب عشقیہ رشتے کا وزن معلوم کرنا چاہتا ہے تو اسے بنی بنائی سماجی قدروں سے شکوہ ضرور ہوتا ہے لیکن وہ اس کے برملا اظہار سے کسی قسم کی تلخی نہیں پیدا کرنا چاہتا۔ لہٰذا وہ جان بہار کو اپنے آغوش تصور میں بھی لانے سے احتراز کرتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ حالات کے جبر میں کیوں ایسی صورت حال پیدا کی جائے کہ عاشق و معشوق بغاوت کر کے اپنے لئے بدنامی کا داغ مول لے لیں۔ یہ تصور کیفی نے اپنی نظم "احتیاط" میں پیش کیا ہے اور اس طرح روائتی پیروگی اور سماجی جبر میں ایک نیا گوشہ پیدا کیا ہے جو بے حد منشرح ہوا ہے ؎ اب تم آغوش تصور میں بھی آیا نہ کرو ۔ تم کو یہ رسم بھی دنیا نہ نبھانے دے گی
بڑھ کر دامن سے لپٹ جائے گی یوں تازہ بہار ۔ میری آغوش تصور میں نہ آنے دے گی

اس طرح کیفی اپنی رومانی نظموں میں ایک سلیقے کی لہر پیدا کرتے ہیں کہ اظہار کے سارے روایتی تلازمے کا احترام کرتے ہوئے اپنی ایک الگ راہ نکالیں۔ اس لحاظ سے کیفی کی اپنی راہ اسی مہذب ترنگ سے آگے بڑھتی ہے۔ نظم ملاقات اس روایتی اظہار اور اسی ترنگ کا بہتر نمونہ بن کر سامنے آتی ہے اس نظم کا پہلا شعر ہی میرے تجزیہ کی مثال ہے۔

کلی کا روپ پھول کا نکھار لے کے آئی تھی
وہ آج گل خزانۂ بہار لے کے آئی تھی

"گل خزانۂ بہار" کے مکھڑے میں نظم کی صورت حال اس ترنگ آمیز کیفیت کو ارتفاعی بنا کر ہمارے سامنے تفصیلات کے دروازے کھول دیتی ہے اور ہم فلیش بیک کی مانند آہستہ آہستہ پورے سراپا سے روشناس ہوتے چلے جاتے ہیں۔ الفاظ اور ان کی ترکیب کا مزاج روایتی ہے مگر تشبیہ کے بعض نئے تخلیقی رجحان کی وجہ سے نظم روایتی کینڈے میں محصور ہونے کے باوجود نئے طرزِ احساس کا نمونہ بن جاتی ہے۔ جیسے نظم کے یہ مصرعے

ع یقین کا رس امید کا خمار لے کے آئی تھی

ع دراز زلف میں گندھی ہوئی تھی مالوے کی رات

ع وہ قامت بلند جیسے بھیرویں کی مست تان

ع قیام جیسے دولتِ قرار لے کے آئی تھی

ع مری اجاڑ زندگی کی چلچلاتی دھوپ میں

آخر شب کی رومانی نظموں کے پس منظر میں اب اسی طرح جو باتیں سامنے آتی ہیں وہ یہ کہ کیفی رومانی موضوعات کی لطافت کو اپنے مہذب رویے اور سبک بنا دیتے ہیں، مگر ساتھ ہی ساتھ اس کا پورا خیال رکھتے ہیں کہ ان کی سبک روی انہیں لطافتوں میں تحلیل کر کے فضاؤں میں تحلیل نہ کر دے اس لئے وہ دھرتی کو بہت مضبوطی سے اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی کوشش کا نتیجہ ہے کہ کیفی کی اس قسم کی نظموں میں موسیقی کا دباؤ کہیں زیادہ محسوس ہوتا ہے اور ہم معنی کے اس بھرم میں نہیں پھنستے جس سے نظم کی تفہیم دراز کار ہو جاتی ہے اور ہم خوابیہ سے بھی کافی دور ہو جاتے ہیں۔ کیفی کا یہ شعور ان کی نظم کو آہنگ کا نیا انداز عطا کرتا ہے اور وہ زیر و بم کے عمل میں تسلسل پیدا

کرنے کو غنیمت جانتے ہیں۔

کیفی یا اس قبیل کے دوسرے شعراء سے لوگوں کو سب سے بڑی شکایت یہ رہی ہے کہ یہ شعراء اپنے سیاسی خیالات کے اظہار میں براہ راست نظر آتے ہیں۔ جب میں آخرِ شب کی اس قسم کی نظموں پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے کچھ دوسری دنیا نظر آتی ہے۔ میں بنیادی طور پر موضوعات کے انتخاب سے زیادہ اس کے سلوک کو اہم سمجھتا ہوں اور موضوعات کے انتخاب کے مسئلے کو شاعر کا انفرادی مسئلہ مانتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر سیاسی شاعری میں نعرہ بازی غیر محترم ہے تو مذہبی شاعری میں پند و وعظ بھی کوئی محترم شے نہیں۔ عام طور پر ہم اپنے پچھلے میں بند ہو کر سوچنے کے عادی ہیں۔ اگر ہم اقبالؔ، انیسؔ یا بعض فنی شعراء کو بخش دیتے ہیں تو کسی کیفی، کسی مخدوم، کسی فیض یا سردار کو اس کے اشتراکی ہونے پر کیوں ناک بھوں چڑھا دیتے ہیں۔ کیفی اشتراکی ہیں انہیں ان کے موضوعات کو ایک خاص نہج سے سوچنے پر اشتراکیت مجبور کرتی ہے۔ ہم اس پر قدغن نہیں لگا سکتے بلکہ ہم ایک ادب نواز کی مانند بس اتنا تقاضہ کریں گے کہ کیفی نے انہیں شعری اصولوں پر کس طرح ڈھالا ہے اور انہیں کہاں تک کامیابی ملی ہے۔ میں یہاں پھر صرف اس پہلو سے دیکھتا ہوں کہ ہمیں شعریات کا جو پیمانہ ملا ہے وہ کیفی کے یہاں کہاں تک شعری سانچے میں ڈھل سکا ہے۔

آخرِ شب کی سیاسی نظمیں دوسری جنگ عظیم کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں یا پھر ہندوستانی سیاست کے گھٹتے بڑھتے سائے کو اپنے دائرہ اظہار میں لاتی ہیں۔ میں یہاں پر کیفی کی صرف ان دو نظموں کا ذکر کروں گا جو برلن کی فتح سے پہلے اور برلن کی فتح کے بعد لکھی گئی ہیں۔ ایک نظم یلغار ہے۔ اس میں روس کی سرخ فوج کی برلن کی طرف پیش قدمی کی خبر پر شاعر کے خیالات منظوم ہوئے ہیں۔ شاعر چونکہ جذباتی طور پر سرخ فوج سے گہری وابستگی رکھتا ہے اس لئے اسے اس خبر سے بے پناہ خوشی معلوم ہوتی ہے اور وہ یلغار کے پس منظر میں اپنے خیالات کو ایسے اظہار سے وابستہ کرتا ہے کہ رجز کی شان بھی برقرار رہتی ہے اور نظم نعرے کا بھی شکار نہیں ہوتی۔ ایک بند دیکھئے۔

جست کرتے کہ جیسے برقِ کوہسار
غیظ گرجے شب میں جیسے آبشار
جوش اٹھے جس طرح ابرِ بہار

بل کے طوفاں کا کلیجہ رہ گیا
سر ٹیک کر تند دھارا رہ گیا
ہانپ کر رستے میں دریا رہ گیا

شہر میں جا بل گھاری ہے سرخ فوج
سوئے برلن جا رہی ہے شہ رخ فوج

یہ بند بڑھتی ہوئی فتح پر فتح حاصل کرتی ہوئی فوج کا نقشہ کھینچ رہا ہے۔ اسی نقشے میں خارجی اثرات کم سے کم ابھرتے ہیں۔ شاعر کا سارا زورِ بیان کی چستی کے ضبط اور طوفانی اظہار کو نرم کرنے میں صرف ہو گیا ہے جس نے غیظ اور جوش کی ساری ہنگامہ خیزی کو سرشار تشبیہ کے انوکھے انداز سے اس طرح سجا دیتا ہے کہ یلغار کی صورت اپنی تمام غلغلہ انگیزی کے باوجود موہنی ہو جاتی ہے۔ یہاں شاعر کی سرخ فوج سے والہانہ وابستگی اُسے ہنگامے اور شور میں ڈوب جانے کے بجائے سرخوشی بخشتی ہے۔ اس بند میں گھن گرج ہے مگر نعرہ نہیں، طوفانی رنگ ہے مگر جذباتی طغیانی نہیں۔ ایسا اس لئے ہے کہ شاعر نے الفاظ کو موضوع میں اس طرح پیوست کر دیا ہے کہ اس سے شاید بہتر صورتِ بیان ممکن نہیں۔ جب برلن پر سرخ فوج فتح حاصل کر لیتی ہے جب نازی جرمنی ہار جاتا ہے اور جب اس کی اشتراکی فوج برلن میں داخل ہو جاتی ہے تو سرشار جھوم اٹھتا ہے۔ اُسے اس خبر سے روحانی خوشی ملتی ہے کیوں کہ وہ سرخ فوج کا حلیف ہے اور جو اس فتح کو اپنے نقطۂ نظر اور اپنے اصول کی فتح سمجھتا ہے۔ نظم فتحِ برلن ایسی خوشی کا نتیجہ ہے لیکن یہاں شاعر کے اظہار میں یلغار کی کیفیت نہیں پیدا ہوتی بلکہ ایک رومان پرور سکون کا احساس ہوتا ہے۔ شاعر کا پرسکون اسی نظم کو رومانی عشقیہ انداز میں ڈھال کر دیتا ہے۔ اب یہاں الفاظ و تراکیب رومان روایت کے سہارے سر اٹھاتے ہیں۔ بحر کے نظام میں بھی سکون ملتا ہے۔ یہاں سرخوشی معصومیت اختیار کر لیتی ہے کیوں کہ اب پوری فضا کو کسی نہ کسی پہلو سے قرار مل گیا ہے۔ اس نظم کے سارے بند میں یہی کیفیت ہے۔

آخری بند دیکھئے۔

کچھ دو چھلکے کچھ دو برسے مست آنکھوں سے شراب
لہلہائیں عارضوں کے پھول ہاتھوں کے گلاب

آج سے آتش نوا کیفی اٹھائے گا رباب
مسکرائے حسن، اٹھے عشق، جاگ اٹھے شباب
مضطرب شاعر بھی عنوانِ طرب پا ہی گیا
کم سے کم آج ایک پہلو کو قرار آ ہی گیا

یلغار والی نظم کے پیشِ نظر یہ نظم سارے ہیجان کو برآمد کر دیتی ہے۔ اسی نظم کے ہر بند کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ شاعر اپنی تھکن دور کرنا چاہتا ہے اور جنگ کی یلغار سے انحراف کرنا چاہتا ہے۔ کیفی کی بعد کی شاعری میں سکون کی خواہش اور بھی تیز ہو جاتی ہے اور آگے چل کر ان کے اظہار کو کئی ایک جگہ طاق بنا دیتی ہے اور ان کے اسلوب میں طنز کے نقوش ابھرنے لگتے ہیں۔ طنز کے یہ نقوش آخرِ شب میں بھی ملتے ہیں۔ جیسے ان کی نظم میں بھی وہی سلیقہ وہی مہذب طرزِ فکر ملتا ہے جس کی جھلک ان کی رومانی اور سیاسی نظموں میں عام طور پر پائی جاتی ہے۔

میں نے کہا تھا کہ کیفی کی شاعری سماجی اکیلے پن کے آغوش میں پرورش پاتی ہے۔ یہ اکیلا پن تقسیمِ ہند کے بعد اپنے نت نئے کی وجہ سے کمپلکس ہوتا چلا جاتا ہے۔ فرد اور سماج روز بروز خانے تہ خانے میں بٹتے چلے جاتے ہیں۔ روشنی اگر بڑھتی ہے تو اتنا ہی اندھیرا پھیلتا ہے۔ کیفی جو قدرِ حیات کے شاعر ہیں، اس شکست و ریخت سے متاثر ہوتے ہیں۔ اپنے مثبت رویے کے تحت اس صورتِ حال سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ یہاں پر کیفی کی جنگ ہر جگہ ہوئی ہے نظریے میں بھی اور عمل میں بھی۔ ہیئت میں بھی اور مواد میں بھی۔ اکیلے پن کی لکیر معدوم ہونے لگتی ہے تو کیفی شعریات کے مفہوم کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتے ہیں یہ تلاش انہیں نظامِ شعر میں موسیقی کی طرف پہونچا دیتی ہے۔ آوارہ سجدے کے مقدمے میں کیفی کہتے ہیں۔

"...... میں سمجھتا ہوں کہ موسیقی شاعری کا بہت اہم عنصر ہے۔ جب آپ چپ چاپ لیٹ کر شعر پڑھتے ہیں تو اس کی موسیقی آپ کے دل و دماغ تک پہونچ ہی نہیں پاتی صرف الفاظ ہاتھ لگتے ہیں اور صرف الفاظ کا نام شاعری نہیں ہے۔"

آوارہ سجدے کی نظمیں آخرِ شب کی توسیعی شکل ہیں۔ کیفی موسیقی سے اب ہم کنار ہیں لیکن لمحے کے تصور میں یہاں زیادہ پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے نقطے دائروں میں تبدیل

ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ تبدیلی ان کے اظہار کی روایت کو برقرار رکھتی ہے مگر اب رومانی جذبۂ ذات سے نکل کر پورے سماج کا حصہ بن گیا ہے۔ یہاں شاعر کا عشق اس کے نظریات میں پناہ گیر ہو جاتا ہے۔ اب ارکسی تصور محنت کی جدلیات میں نیا حسن تلاش کرتا ہے۔ مارکسی تصور پر مبنی ان کی نظم نیا حسن اسی قسم کی نظم ہے لیکن اشارتی زبان شاعر کے ریاض فن سے اور نکھری ہو گئی ہے۔ نئے سوشلسٹ تصورات میں ابھرتی ہوئی یہ نظم اپنی آب و ہوا میں پھلنا پھولنا چاہتی ہے۔ شاعر کی اس خواہش میں روائتی شاعری کے لفظیات فن تعاون دیتے ہیں اور نظم کے دقیق موضوع کو لطیف بنانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان کی نظم 'مکان' 'عمران' تہذیبی اور سماجی علامت ہے۔ مکان انسانی شوق کی غماز بھی ہے اور طبقاتی فرق کی پیداوار بھی۔ خاص شعری پیکر میں ڈھلتی ہوئی یہ نظم موضوع کی کثافت کو پیکر تراشی اور آواز کی صدا بندی سے ایک شعری جھنکار کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ کیفی اس نظم میں آواز کی لے مخصوص قرات سے اسی طرح اٹھاتے ہیں کہ آواز کے لہجہ سے پیکر تراشی کا کام سر انجام دیا جاتا ہے۔

ہاتھ ڈھلتے گئے سانچے میں تو تھکتے کیسے
نقش کے بعد نئے نقش نکھارے ہم نے
کی یہ دیوار بلند اور بلند اور بلند
بام و در اور ذرا اور سنوارے ہم نے

اسی قبیل کی ایک نظم 'آوارہ سجدے' ہے۔ اشتراکی اکائی کے ٹوٹنے پر شاعر کے وہ خواب ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں جو شعوری کاوش سے جذبے کا حصہ بن سکے تھے۔ یہاں اس نظم میں نقطۂ نظر کی شکست کو شعری شناخت کے لئے غزل کا پیٹرن ناگزیر تھا۔ کیفی غنائیت کی خاطر اس انداز کو نظم میں برتتے ہوئے کنائے اور اشارے کی روایت سے سہارا لے کر سوز کو پگھلا کر رکھ دیتے ہیں۔ اشتراکی وحدت میں جب رخنے پڑنے لگتے ہیں تو شاعر اپنے کل سرمایۂ حیات کے بکھراؤ کو دیکھ کر سوز اندروں میں طرح طرح کے پیچ و تاب کھاتا ہے اور استفہامیہ انداز سے گویا ہوتا ہے۔

اک یہی سوز نہاں کل مرا سرمایہ ہے
دوستو میں کسے یہ سوز نہاں نذر کروں

تم بھی محبوب مرے تم بھی ہو دلدار مرے
آشنا مجھ سے مگر تم بھی نہیں، تم بھی نہیں

جن سے ہر دور میں چمکی ہے تمہاری دہلیز
آج سجدے سے وہی آوارہ ہوئے جاتے ہیں

اس نظم کی شدت کے مطابق ہی ادا نظم کے اثر کو بھرپور بنا سکتی ہے لیکن ہر جگہ یہ صورت حال نہیں، آوارہ سجدے کی نظمیں کیفی کی نظم نگاری کی نئی تلاش کرتی ہیں، آخری رات عادت، بہروپنی، اگر بھوتی، کھلونا، دائرہ اور پیر تسمہ پا ہی شعری اظہار کے لئے علامت اور استعارے کے ساتھ طنز کے لطیف پیرائے سے کام لے کر نئی سمت پیدا کی جاتی ہے۔

نظم آخری رات نئے عہد کی بے بسی کا استعارہ ہے یہ استعارہ نظم کے ہر بند میں پیوند سازی کی تکنیک کے سہارے رنگ برنگی کیفیت لئے ہوئے اپنا اثر مرتب کرتا ہے۔ یہاں غنائیت روایتِ غزل سے نہیں بلکہ فن کے جدید فکری عمل سے پیدا کی جاتی ہے۔ خیال و فکر کے یہ ٹکڑے بندوں کی تشکیل تہہ نشیں طنزیہ اسلوب اور اشارے کے نظام سے قائم کرتے ہیں۔ گرچہ دیکھنے میں یہاں فرد کا منتشر مزاج کا بھرم پیدا کرتا ہے، مگر صحیح معنی میں طنز کے عنصر کی وجہ سے نظم مثبت رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ عادت' کہانی تلمیح میں فرد کے فکر و شعور کو ماضی اور حال کے رشتے میں منسلک کر کے ڈوبنے اور ابھارنے والی نظم ہے۔ کنویں سے لے کر بازار مصر کے لمبے استعارے میں پھیلتی ہوئی یہ نظم عہد جدید کے انسان کے کرب احساس کی غمازی کرتا ہے۔ بحر کی تبدیلی سے نظم کے حزن کی کیفیت کو یہاں بھی آواز کے تعاون سے متشکل کیا گیا ہے، اور اس طرح انسانی احساس کا کرب نئی زلیخا کے روپ میں ابھر کر شعری معنویت کو گہرا کر دیتا ہے۔ اسی قبیل کی نظم 'اگر بھوتی' ہے۔ بدہیئت بدصورت اور بدقماش الفاظ کی نئی شعری لغت سے مرصع یہ نظم اپنے علامتی روپ کو تخلیق کے مثبت اور منفی پہلوؤں سے آراستہ کر کے خیر و شر کے پس منظر میں ابھارنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ اگر بھوتی جو شدت تخلیق کی علامت ہے اور جو شاعر میں بھی پائی جا سکتی ہے اور کائنات کے دوسرے مظاہر میں بھی، اپنے جوشِ تخلیق کو شور و فساد کے باوجود قائم رکھنے پر مجبور ہے۔

یہ نظم جدید نظم کی علامت پسندی کے لحاظ سے بڑی اہم نظم ہے اور کیفی کے اس مزاج کی غماز ہے جو آدمی اور طوفان میں نہیں ڈگمگاتا۔ کیفی کی ایک اور نظم کھلونا ہے۔ یہ نظم مثبت ابہام کا ایک بے حد خوبصورت نمونہ ہے۔ ابہام کے دائرہ میں ناقابلِ قبول عناصر سے معنویت پیدا کرنا کیفی کی شاعری میں ایک نئی سمت پیدا کرتا ہے۔ مجھے اردو شاعری میں اس تکنیک پر معنویت سے بھرپور اس قسم کی نظم یا تو کھلونا میں مل سکتی ہے یا پھر ندا فاضلی کے مور ناچ میں۔ ابہام سے معنویت پیدا کرنے کا فن کیفی کو طنز کے آرٹ کے تخلیقی جوشش نے نصیب ہوا ہے اور مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کیفی اس رنگ میں بہت کچھ تخلیق کر سکتے ہیں۔

خورشید نعمانی

کیفی اعظمی کی شاعری

سنہ ۱۹۳۶ء کا سال اردو ادب کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ وہی سال ہے جس نے ترقی پسند تحریک کو جنم دیا۔ پریم چند نے اپریل سنہ ۱۹۳۶ء میں اس کی پہلی کانفرنس کی صدارت کی۔ جوش ملیح آبادی، مجنوں گورکھپوری، قاضی عبدالغفار اور فراق گورکھپوری نے اس کی سرپرستی کی۔ اقبال کی نیک خواہشات اس کے ساتھ تھیں۔ اس تحریک کے روح رواں مجاز، کرشن چندر، فیض، سجاد ظہیر، ملک راج آنند، جذبی، راجندر سنگھ بیدی، عصمت، رشید جہاں اور مخدوم محی الدین وغیرہ تھے۔ اس گروہ میں جو سنہ ۱۹۳۶ء ہی سے اس تحریک سے وابستہ رہا شاعر بھی تھے اور ادیب بھی نقاد بھی تھے اور افسانہ نگار بھی۔ اس تحریک کا اثر سب سے زیادہ ملک کے نوجوانوں نے قبول کیا اس کی وجہ غالباً اس دور کے نوجوانوں کا ذہنی اضطراب اور نئی اقدار کی جستجو کا کرب تھا۔ ترقی پسند تحریک نے جب ادب میں روایت سے بغاوت اور نئی دنیا کا خواب دیکھنے اور فرسودہ اقدار کو بدلنے کا نعرہ لگایا تو وہ پوری فضا پر چھا گیا اور ترقی پسند ادب اور زبان میں تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔

ترقی پسند تحریک کے شروع کے پہلے پانچ سات سال ادبی اہمیت سے زیادہ تبلیغی اہمیت کے حامل تھے اس زمانے پر ادب پر کم اور ترقی پسندی پر زیادہ زور رہا۔ ہر وہ شخص اس رجحان یا تحریک سے وابستہ ہو جاتا تھا جو کسی نہ کسی حیثیت سے باغی ہونے کا مدعی یا آرزومند ہو اور نئی راہوں کی تلاش اس کا مدعا ہو۔ بعض سیاسی و سماجی نظام سے باغی تھے۔ بعض اخلاقی قدروں سے بیزار تھے اور ان کو شکست و ریخت کے عمل سے اظہار بیان کے نئے سانچے وضع کرنا چاہتے تھے۔ ابتدا میں یہ سب خلافات کبھی ایک ادیب یا شاعر کے یہاں یکجا طور پر کیفی الگ الگ اور کبھی ایک

دوسرے کو کاٹتے ہوئے اور گڈمڈ ہوتے ہوئے دکھائی دیتے تھے لیکن بہت جلد ترقی پسند تحریک نے سماجی بغاوت اور اشتراکی دعویٰ انقلاب کو اپنا بنیادی مسلک قرار دیا اور اجتماعی فکر اور اجتماعی مسائل کو انفرادی فکر اور انفرادی تجربوں پر فوقیت دی ۱۹۴۱-۴۲ء تک ادیبوں کے ایک نئے گروہ نے تخلیق کے میدان میں قدم رکھا جس میں احمد ندیم قاسمی، عزیز احمد، کیفی اعظمی ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری، اختر الایمان وغیرہ تھے، اس گروہ میں جنہوں نے اپنے لئے وہی راہ اختیار کی جواب تک ترقی پسند تحریک نے اپنائی تھی۔ پھر ان لوگوں نے اس راہ کو ہموار کیا اور ترقی پسند ادب کو آگے بڑھایا۔

نظم نگاری میں اس تحریک کی ابتدا کے وقت اقبال اور جوش کا سکہ چل رہا تھا، اقبال اپنی شاعری سے درسِ حیات دے رہے تھے لیکن ترقی پسند شاعروں نے اقبال کے مقابلے میں جوش کی نظم نگاری کو زیادہ پسند کیا، تبلیغ کے لئے خطابت، لفاظی، بلند بانگ الفاظ کا استعمال، جذباتی ابال ضروری تھا اور کم و بیش یہی عناصر جوش کی شاعری میں پائے جاتے تھے۔ ان کی اس قسم کی نظمیں مجمعوں اور مشاعروں میں بہت مقبول ہوتی تھیں مگر یہ نظمیں نہ تو گہرائی رکھتی تھیں اور نہ ان کی اپیل دیرپا ہوتی تھی، ترقی پسند شاعروں میں مجاز، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی اور دوسرے بہت سے شعرا نے جوش کا تتبع کیا، اس کا منفی اثر زیادہ ہوا اور ان شعرا کی نظمیہ شاعری کے جوہر کو پنپنے کا کم موقع مل سکا۔

کیفی ترقی پسند شاعروں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں، وہ ایک شاعرانہ شخصیت کے مالک ہیں ان کے مزاج میں شاعرانہ بے ساختگی اور تغزل کے عناصر شروع ہی سے ملتے ہیں، ان کی ابتدائی نظموں میں جمالیاتی کیف اور انداز بیان کی قدرت بدرجہ اتم موجود ہے۔ اسی سلسلے کی ایک خوبصورت نظم اندیشہ ہے جس کے چند بند ذیل میں درج کئے جاتے ہیں ؎

روح بے چین ہے اک دل کی اذیت کیا ہے

دل ہی شعلہ ہے تو یہ سوزِ محبت کیا ہے

وہ مجھے بھول گئی اس کی شکایت کیا ہے

رنج تو یہ ہے کہ رو رو کے بھلایا ہوگا۔

دل نے ایسے بھی کچھ افسانے سنائے ہوں گے
اشک آنکھوں نے پئے اور نہ بہائے ہوں گے
بند کمرے میں مرے خط جو جلائے ہوں گے
ایک اک حرف جبیں پر ابھر آیا ہوگا

ضبط کی سعی میں جذبات ابل آئے ہوں گے
غم پشیماں تبسم میں ڈھل آئے ہوں گے
اشک یوں نام پہ مرے نکل آئے ہوں گے
سر نہ کاندھے سے سہیلی کے اٹھایا ہوگا

عورت" "پشیمانی" "جبین یاسمٹ" "حوصلۂ تبسم" اور "ٹرنک کال" کیفی کی اس قسم کی رومان پرور خوبصورت اور ترشی ہوئی نظمیں ہیں جن کو پڑھ کر آج بھی ان کی طبیعت کی نوروئی، مدت اور ندرت کا احساس ہوتا ہے یہ وہی نظمیں ہیں جن کے متعلق سردار جعفری رقمطراز ہیں۔

"تیسرا رویہ ہے کہ حقیقت میں مداخلت کرنا اس سے دست وگریباں ہونا۔۔ اس رویہ کی بنیاد یہ ہے کہ ہم آرٹ اور ادب میں حقیقت کی از سر نو تخلیق کرتے ہیں اور اس کی ترقی اور تغیر کے امکانات کو مستقبل کے حسن کے ساتھ اسیر کر لیتے ہیں اس طرح ایک ایسا جذبہ پیدا کرتے ہیں جو حقیقت کو تبدیل کرنے اور مستقبل کو تعمیر کرنے میں مدد دیتا ہے۔۔۔

۔۔تیسرا رویہ جو صحیح ہے جس کے ابتدائی نقوش مجاز، سجاد ظہیر اور رشید جہاں کے یہاں موجود تھے اور جسے بہت کھل کر کرشن چندر، جاں نثار اختر، مخدوم اور کیفی وغیرہ نے اپنا "بڑی سمجھ بوجھ گہرے سماجی شعور اور تاریخی بصیرت کا مطالبہ کرتا ہے۔۔ جہاں کیفی نے اس رویہ کو برتا ہے وہاں وہ بے پناہ ہو جاتے ہیں مثلاً ان کی نظمیں "عورت" "حقیقتیں" "فتح برلن" "تلنگانہ" اور "چین" ترقی پسند شاعری کے بہترین نمونوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں۔"

لیکن افسوس کا مقام ہے کہ کیفی کے یہاں شاعری کی یہ کیفیت وقتی اور سرسری رہی۔

بعد میں کیفی ہنگامی واقعات پر فوری نظمیں لکھنے کی طرف مائل ہو گئے "آخرِ شب" کی تین چوتھائی سے زیادہ نظمیں ہنگامی موضوعات کو صحافتی انداز میں منظوم کرنے کی نذر ہو کر رہ گئیں ان ہنگامی واقعات کو بیان کرنے میں کیفی سادگی، سلاست اور راست گوئی سے دور چلے گئے۔ انہوں نے سیدھی سادھی باتوں کو پرپیچ انداز میں کہنے کی کوشش کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہی بیان پھیل کر بہت طویل ہو گیا اور نظم سے ضبط و اختصار ختم ہو گیا۔ اس طرح ان کے کلام میں لفاظی خطابت اور غیر ضروری طوالت پیدا ہو گئی اور ان کی نظموں سے وحدتِ تعمیر اور وحدتِ تاثر کا اہم احساس جاتا رہا۔

کیفی ہنگامی واقعات سے انسانی زندگی کی عام حقیقتوں تک پہنچنے کے بجائے صرف ان کی ہنگامی نوعیت ہی پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ موضوع کا ہنگامی ہونا کوئی ضروری بات نہیں لیکن اگر موضوع کے سہارے شاعر عظیم تر اور عام انسانی سچائیوں تک نہ پہونچ سکے تو یہ ہنگامی موضوع ادبی ہونے کے بجائے سطحی و صحافتی ہو جاتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں کیفی کی شاعری ہنگامی موضوعات کا آئینہ خانہ تو بن گئی لیکن فکر و فلسفہ سے عاری ہو گئی، کیفی کی شاعری میں کائناتی مسائل اور آفاقی عنصر کو تلاش کیا جائے تو اس کے نشانات مفقود نظر آئیں گے۔

کیفی اپنی شاعری میں مختلف اوقات میں مختلف شاعروں سے متاثر نظر آتے ہیں۔ جوش کے علاوہ ان کے اسلوبِ بیان میں میر کے مرثیوں کے بہت سے عناصر جذب ہوتے نظر آتے ہیں جن کی وجہ ان کے کلام میں وضاحت اور روانی پائی جاتی ہے، یہ شعر ملاحظہ ہو۔

منجمد خون میں شعلے سے تپاں ہے دیکھو افق دار سے لاشیں نگراں ہیں دیکھو

ہنگامی شاعری کے بعد کیفی کے یہاں وقتی شاعری کا عمل دخل نظر آتا ہے، وقتی نظموں میں وہ شبلی اور ظفر علی خاں کے سیاسی نظریات سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی نظمیں "گاندھی جناح ملاقات پر"، "سوویت یونین اور ہندستان"، "سوئے برلن جاری ہے سرخ فوج"، "میں کلکتہ میں آج پہلی بار آرہا ہوں"، "سلام اے روس تیرے شعلے عجب شگوفے کھلا رہے ہیں"، "لال جھنڈے پھینک دو"، "اے برٹش بھگتو کیا کہا"، "قومی حکمراں" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان نظموں میں وقتی تاثر ضرور ہے لیکن یہ زندہ رہنے والی شاعری نہیں، البتہ ان نظموں میں کہیں کہیں جگہ پر خوبصورت بند یا مصرعے بھی آجاتے ہیں جن سے شاعر کی تخلیقی قوت کا پتہ چلتا ہے بشرطیکہ وہ ٹھیک طور سے استعمال ہوتی۔

کیفی کی نظم "مژدہ" شبلی کی نظم "ہنگامۂ بلقان" کو سامنے رکھ کر لکھی گئی اور انہیں کے شعر سے شروع ہوئی (حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک) "سپردگی" میں اقبال کے "شکوہ" کا طرز اختیار کیا ہے ۔

آ گیا عین لڑائی میں جو لندن سے مشن　　شعلہ رو ہو کے جھکا دی گئی آخر گردن

درِ ویول پہ ہری اور غنی ایک ہوگئے　　اُس کے دربار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوگئے

اس نظم میں ایک بند اکبر کے طرز کا ہے ۔

لے کے تم دورِ غلامی کی ردا بھول گئے　　کھا کے دل کی ہوا عہدِ وفا بھول گئے

"مولانا آزاد اور خضر حیات کی ملاقات" پر جو نظم ہے وہ اسمٰعیل میرٹھی کی ایک نظم کے طرز پر ہے اس سلسلے کی ایک نظم غیری "خانہ جنگی" ہے جس کا موضوع فرقہ وارانہ فسادات کو بنایا گیا ہے اور حالی کے "شکوۂ ہند" کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ نظم "قومی اخبار" ان کے طنزیہ اسلوبِ نگارش کی ایک اچھی مثال پیش کرتی ہے۔ عالمی امن پر کیفی نے بہت سی نظمیں لکھیں "امن" پر ان کی ایک چھوٹی سی نظم بہت خوبصورت ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے ۔

شکریہ امن کا پرچم مجھے دینے والی　　میں ترے ساتھ ہمیشہ اسے لہراؤں گا

کیفی کی شاعری کا ایک بڑا حصہ اس ہنگامی شاعری اور وقتی موضوعات کی نذر ہو گیا۔ اس کا احساس انہیں ہوا لیکن تاخیر سے جس کے نتیجے پر انہوں نے کچھ عرصہ کے لئے خاموشی اختیار کر لی۔ اس دور میں ان کی ایک رومانی نظم "ایک لمحہ" شائع ہوئی جو کہ یقیناً ایک اچھی لائقِ ستائش کوشش ہے یہ نظم نذرِ ناظرین کی جاتی ہے ۔

جب بھی چوم لیتا ہوں ان حسین آنکھوں کو　　سو چراغ اندھیرے میں جھلملانے لگتے ہیں

پھول کیا شگوفے کیا چاند کیا ستارے کیا　　سب رقیب قدموں پر سر جھکانے لگتے ہیں

خشک خشک ہونٹوں میں جیسے دل کھنچ آتا ہے　　دل میں کتنے آئینے تھرتھرانے لگتے ہیں

ذہن جاگ اٹھتا ہے روح جاگ اٹھتی ہے　　نقش آدمیت کے جگمگانے لگتے ہیں

لو نکلنے لگتی ہے مندروں کے سینے سے　　دیوتا فضاؤں میں مسکرانے لگتے ہیں

رقص کرنے لگتی ہیں مورتیں اجنتا کی　　مدتوں کے لب بستہ غار گانے لگتے ہیں

لمحہ بھر کو سب پتھر مسکرانے لگتے ہیں لمحہ بھر کو یہ دنیا ظلم چھوڑ دیتی ہے

ادھر پچھلے چند سالوں سے ان کے یہاں موضوع کے برتاؤ میں کچھ تبدیلی ضرور ہوئی ہے موضوعات تو اب بھی ان کی نظموں میں سیدھے اور پہلے سے سوچے ہوئے ہوتے ہیں مگر اب ان کو براہِ راست بیان کرنے کے بجائے وہ نئے پیکر اور علامات کے ایمائی حسن سے بھی کام لینے لگتے ہیں۔ "بہروپ" "عادت" "نیا حسن" اور "ابن مریم" ان کی اسی قسم کی نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں نئی شعری زبان کی تلاش کی گئی ہے جو ان کی تخلیقی جرأت مندیوں کا ثبوت ہے۔

ناؔمی انصاری

"آخرِ شب کا ہمسفر"

کیفی اعظمی کا پہلا مجموعہ کلام "آخرِ شب" اعلان آزادی سے چند ماہ قبل، مئی ۱۹۴۷ء میں منظر عام پر آیا۔ اس وقت ترقی پسند تحریک اپنی عمر کے بارہ سال پورے کر چکی تھی۔ جو شعراء اس تحریک سے وابستہ تھے انھوں نے بیشتر ہنگامی واقعات کو موضوعِ سخن بنانے کی کوشش کی تھی۔ جوشؔ ملیح آبادی ترقی پسندوں کے سالار کارواں تھے اور شاعری میں ان کی "ہنگامہ گرم کن" خطابت کا اثر اس دور کے شاعروں پر نمایاں طور سے نظر آتا تھا۔ فیضؔ، جذبیؔ، اور مجازؔ کے علاوہ دیگر ترقی پسند شعراء کے یہاں فکر کی گہرائی اور رمزیت وایمائیت سے پہلو تہی کا رجحان واضح تھا۔ اور علامہ اقبالؔ کے اس حکیمانہ خیال کو شعراء نے بالکل نظر انداز کر دیا تھا کہ ؎

برہنہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائیست
حدیثِ خلوتیاں، جز بہ رمز و ایمائیست

چونکہ اس دور کے شعراء حدیثِ خلوتیاں کے بجائے داستانِ بے ستون و کوہکن سنانے پر آمادہ تھے اس لئے انھوں نے رمز و ایما کو از کار رفتہ سمجھ کر اس سے صرفِ نظر کر لیا تھا۔ ترقی پسند شعراء کے جو کارنامے سامنے آئے تھے ان کو نئی تحریک کے زیر اثر داد و تحسین تو خوب ملی تھی مگر ان میں زیادہ تر تخلیقات میں سطحیت اور اکھرا پن نمایاں تھا۔ شاعری کے موضوعات تو بدل گئے تھے مگر ان موضوعات کو ہضم کر کے اور انھیں اپنے ذہن و شعور کا حصہ بنا کر فنی اور جمالیاتی خوبیوں کے ساتھ پیش کرنے کی منزل بہت دور تھی۔

دوسری جانب ہندوستان کے سیاسی اور اقتصادی حالات میں، جو اس صدی کی چوتھی دہائی میں ایک سطح پر جم سے گئے تھے، دوسری جنگِ عظیم شروع ہونے کے ساتھ ساتھ ہلچل پیدا ہو گئی تھی۔ ہندوستان گو براہِ راست جنگ میں شامل نہ تھا مگر سلطنتِ برطانیہ کے زیرِ نگیں ہونے کی وجہ سے گردن تک جنگ کے پانیوں میں ڈوب چکا تھا۔ سنگاپور اور برما کے گولوں کی دھمک کلکتہ تک سنائی دیتی تھی۔ گاندھی جی، "ہندوستان چھوڑو" تحریک شروع کر کے قوم کو جھنجھوڑ چکے تھے اور نیتاجی سبھاش چندر بوس کی فعال انقلابی قوت کا اثر نوجوانوں کے جوش اور حوصلے کو ابھار رہا تھا۔ کانپور اور دوسری جگہوں پر سامانِ جنگ کی تیاری اور فراہمی کے لئے نئے نئے کارخانوں کے کھل جانے سے دیہات کے بیروزگار نوجوان، جو فوجی بھرتے سے بچ گئے تھے شہروں کی طرف روز افزوں تعداد میں رخ کرنے لگے تھے۔ متوسط طبقے کے کاروباری لوگوں کو فوجی سپلائی کے چھوٹے موٹے ٹھیکے ملنے کی وجہ سے بہت سے لوگ جلد جلد دولتمند بنکر ابھرنے لگے تھے۔ جنگ کی وجہ سے گویا معاشی سطح پر ایک عارضی اتھل پتھل پیدا ہو چکی تھی اور زندگی کے مظاہر میں روز بروز تبدیلیاں ہونے لگیں تھیں۔ سماج کے عام افراد کی طرح شاعر اور ادیب بھی ان حالات سے متاثر ہوئے تھے جن کا اثر ان کی تخلیقات پر پڑنا بھی لازمی تھا۔ خود کیفی اعظمی برسوں تک کانپور میں مزدور تحریک سے ذاتی طور پر منسلک رہے تھے۔ ان کی شاعری کے محرکات اور اس کے اندرونی اجزائے ترکیبی کو سمجھنے کے لئے اس پس منظر کو بھی دھیان میں رکھنا ضروری ہے۔

کیفی اعظمی کی شاعری میں آگے پیچھے دو تین رجحانات ملتے ہیں۔ ان کی ابتدائی غنائیہ نظمیں، نوجوانی کے عاشقانہ اور رومانی جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اس دور کی نظموں میں جذبے کی صداقت اور گرمی پوری طرح موجود ہے۔ نوجوانی کے یہ جذبات ہر دور میں مشترک ہوتے ہیں اور ایک عالمگیر صداقت رکھتے ہیں، اس لئے ان کو صرف سطحی رومانیت کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیفی اعظمی کی اس دور کی نظموں میں جو نرمی اور گھلاوٹ ہے اس کا کچھ اندازہ مندرجہ ذیل مثالوں سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

چشم بد دور یہ قدِ بالا ؛ جیسے مشرق سے صبحِ نو کا ابھار
بیل جاتی ہوئی منڈیروں پر ؛ دھوپ چڑھتی ہوئی سرِ دیوار
"نقش و نگار"

یہ جسم نازک، یہ نرم باہیں، حسین گردن، سڈول بازو
شگفتہ چہرہ، سلونی رنگت، گھنیرا جوڑا، سیاہ گیسو
نشیلی آنکھیں، رسیلی چتون، دراز پلکیں، مہین ابرو
تمام شوخی، تمام بجلی، تمام مستی، تمام جادو
ہزاروں جادو جگا رہی ہو، یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو
"تصور"

دل نے ایسے بھی کچھ افسانے سنائے ہوں گے
اشک آنکھوں نے پئے اور نہ بہائے ہوں گے
بند کمرے میں جو خط میرے جلائے ہوں گے
ایک اک حرف جبیں پر ابھر آیا ہوگا

ان اشعار میں جذبات کا جو ترفع ہے، جو سراپا نگاری ہے، لہجے کی جو نرمی اور شیرینی ہے اس کی تروتازگی اور شادابی میں امتدادِ زمانہ سے کوئی فرق نہیں آیا اور وہ اب بھی جمالیاتی احساس کو بیدار اور جذبے کو متحرک کرتی ہے۔

اس دور کے بعد کیفی اعظمی نے ہنگامی واقعات کو موضوعِ سخن بنانے کو ترجیح دی ہے۔ کرن، نئے خاکے، قومی اخبار، وغیرہ نظمیں اُس زمانے کے سیاسی واقعات کی ترجمانی کرتی ہیں مگر ان میں کوئی فکری گہرائی نہیں ہے، انداز بیان سپاٹ اور بے لطف ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعات شاعر کے ذہن و شعور میں جذب نہیں ہو سکے ہیں اور ان کو محض وقتی ہیجان کے تحت نظم کا جامہ پہنا دیا گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ "آخرِ شب" کے پہلے صفحے پر مشہور روسی ادیب، ایلیا اہرن برگ کا جو قول درج ہے، کیفی اعظمی اس کی تہہ تک نہیں پہونچ

پاتے ہیں۔ ایلیا اہرن برگ نے لکھا ہے کہ "ایک ادیب کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ایسے ادب کی تخلیق کرے جو مستقبل کی صدیوں کے لئے ہو۔ اسے ایسے ادب کی کی تخلیق پر بھی قدرت ہونی ضروری ہے، جو ایک لمحے کے لئے ہو اگر اس ایک لمحے میں اس کی قوم کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہو"۔ روسی مصنف نے جو ہنگامی ادب کی تخلیق پر قادر ہونے کی بات کہی ہے وہ ایک "اگر" کے ساتھ مشروط ہے اور یہ "اگر" بہت بڑا "اگر" ہے گاندھی۔ جناح ملاقات یا خضر خان اور مولانا ابوالکلام آزاد کا راز دارانہ اختلاط ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں یقیناً اتنی اہمیت کا حامل نہیں تھا کہ ایک قوم کی قسمت کا فیصلہ کر دیتا۔ کیفی اعظمی کی یہ نظمیں، مولانا ظفر علی خاں کی صحافتی قسم کی ہنگامی نظموں کی بازگشت معلوم ہوتی ہیں مگر ان میں وہ جوش اور طنطنہ بھی نہیں ہے جو مولانا ظفر علیخاں کی نظموں میں ملتا ہے اس لئے ان نظموں کی تخلیقی حیثیت مشتبہ ہے۔

اسی زمانے میں کیفی اعظمی کے یہاں ایک تیسرا رجحان بھی ملتا ہے جس میں عوامی جذبات و احساسات کی کی ترجمانی بھی ہے، رجائیت کا پیغام بھی ہے اور عزم وعمل کا جذبہ بھی ہے۔ ان نظموں میں تلاش، آخری مرحلہ، کب تک، مژدہ، اور فیصلہ بھی ہیں اور سوویت یونین، یلغار، آزادی، اور فتح برلن جیسی نظمیں بھی ہیں جن میں کھوکھلی نعرے بازی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اول الذکر نظموں میں فکری بصیرت اور گہرائی تو بہت کم ہے، تاہم اس دور کے عوامی احساسات اور جوشِ عمل کا اثباتی پہلو ان میں بڑی حد تک عکس ریز ہے۔ "فیصلہ" جو ۱۹۴۶ء کی تخلیق ہے، خاص طور سے قابلِ ذکر ہے اور اس کے یہ بند شاعر کے جذباتی تموّج کی ترجمانی کرتے ہیں۔

نگاہوں میں پیچیدہ ہے اضطراب ؛ جھلکتا ہے چہروں سے سوزِ عتاب
تڑپتے ہیں اپنی حدوں میں جناب ؛ بہم ہو کے طوفاں اٹھاتے نہیں

———

نگاہوں میں ارجن کا ہے تیر بھی ؛ ہے قبضے میں ٹیپو کی شمشیر بھی
بایں شان گردن میں زنجیر بھی ؛ مرقعے یہ اب دیکھے جاتے نہیں

ان نظموں میں شاعر کے سامنے ایک خاص مقصد نیز اشتراکی مسلک سے ایک خاص لگاؤ ہے، اس کے عقیدے اور عمل کا ایک خاص دائرہ کار ہے جس کو وہ اپنی شاعری میں منعکس کرنا چاہتا ہے مگر چونکہ یہ مقصد اور یہ لگن اس کے ذہن و شعور میں پوری طرح جذب نہیں ہوا ہے اس لئے اس کا شاعرانہ اظہار بھی ناقص ہے۔ اختر انصاری نے کامیاب مقصدی ادب کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"وہ ادیب کے جذباتی، جمالیاتی، اور تخیلی تجربات کا اظہار ہو، یعنی خارجی حقیقتوں کی بے جان عکاسی اور عقلی یا فلسفیانہ عقیدوں کی بے جان توضیح و تشریح کے بجائے ان حقیقتوں اور عقیدوں کے جذباتی اور وجدانی تصورات کو صداقت شعارانہ انداز میں پیش کرے۔ اس کی صداقت علمی یا حسابی صداقت نہیں، فنی و شعری صداقت ہو۔ اس میں مقصد کو براہ راست پیش کرنے کے بجائے، اشارات و کنایات سے کام لیا گیا ہو اور ایک حسن کارانہ طریقے سے قاری کے ذہن و شعور پر اثر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہو" (افادی ادب از اختر انصاری ص ۹۲)

اختر انصاری نے مقصدی ادب کی کامیابی کے لئے جن شرائط کا ذکر کیا ہے ان سے اختلاف کی گنجائش محال ہے مگر جب ہم اس کسوٹی پر ترقی پسند شعراء بشمول کیفی اعظمی کی ۱۹۴۲ء سے پہلے کی نظموں کو پرکھتے ہیں تو یہ افسوس ناک حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کے یہاں جمالیاتی اور فنی اقدار سے صرفِ نظر کر کے، خارجی حقائق کی بے جان عکاسی کرنے کا رجحان غالب ہے۔ مگر کرشن چندر اس کا جواز ایک دوسری ہی طرح پیش کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ۔

"کیفی کی شاعری دراصل پتھر کی شاعری ہے یعنی جب شاعر اپنا سینہ پتھر کا کر لیتا ہے اور ظلم کی دیوار سے ٹکرا کر شاعری کا شرر پیدا کرتا ہے اس شاعری کے دور کا آہنگ بلند ہوتا ہے۔ الفاظ میں وہ سہ طرفی مکعبیت ہوتی ہے جس کے بغیر چٹان سے ٹکرایا نہیں جا سکتا..... شاعر جس مقصد سے شعر کہتا ہے وہی مقصد اس کا لہجہ متعین کرتا ہے۔"
کیفی کی شاعری از کرشن چندر، ادب ایوارڈ سوینیر ۱۹۷۳ء

بےشک بلند آہنگی شعریت کی منافی نہیں ہے مگر شعر اور غیر شعر میں فرق کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی معیار

تو سامنے رکھنا ہی پڑے گا۔ اور وہ معیار ادبی اور فنی پہلے ہوگا۔ اشتراکی بعد میں۔
بہر حال یہ بات خوش آیند ہے کہ کیفی اعظمی کی شاعری میں وقت کے ساتھ ٹھہراؤ
اور ضبط پیدا ہوا ہے اور ان کے لب و لہجے میں سنجیدگی اور متانت نے راہ پائی ہے
فرقہ پرستی پر ان کی ایک مثنوی "خانہ جنگی" "آخرِ شب" میں شامل ہے اس کا مقابلہ
اسی موضوع پر ان کی ایک نئی نظم "بہروپنی" سے کیا جائے تو ان کے اندازِ فکر
کے ارتقاء کا رخ واضح ہو جاتا ہے۔ "بہروپنی" میں جو رمزیت اور ایمائیت ہے۔ جو
پیکر تراشی، علامت نگاری اور فنی رکھ رکھاؤ ہے، وہ مثنوی "خانہ جنگی" میں تقریباً
مفقود ہے ؎

چاہتا ہوں کہ قتل کر دوں اُسے
وار لیکن جب اُس پہ کرتا ہوں
میرے سینے پہ زخم ابھرتے ہیں
میرے ماتھے سے خوں ٹپکتا ہے
جانے کیا اس کا میرا رشتا ہے "بہروپنی"

ان اشعار کے مقابلے میں مثنوی "خانہ جنگی" کے یہ اشعار بھی دیکھئے جن میں
جوشؔ کی خطابت اور ہیجانی اندازِ فکر کا اثر صاف نمایاں ہے ؎

علم و فن کا جلا دیا دامن ؞ صنعتوں کی مروڑ دی گردن
بزدلی، بے حیائی، جہل، فرار ؞ زندگی کو دیے آزار

ان کی جدید ترین نظموں میں فکر کی صلابت اور پختگی برابر نمایاں ہوتی جا رہی ہے۔ ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ کیفی نے بڑی اور حقیقی شاعری کے اسرار و رموز کو پا لیا
ہے۔ ان کے موضوعات اب بھی اشتراکی نقطۂ نظر کو ظاہر کرتے ہیں مگر ان کے
شاعرانہ اظہار میں ضبط و نظم، توازن اور فنی بصیرت نے قدرِ اول کی حیثیت حاصل
کر لی ہے۔ ان کی ایک نئی نظم کا یہ آخری بند دیکھئے ؎

بن گیا قصر تو پہرے پہ کوئی بیٹھ گیا
سو رہے خاک پہ ہم شورشِ تعمیر لئے
دن پگھلتا ہے اسی طرح سروں پر اب تک
رات آنکھوں میں کھٹکتی ہے سیہ تیر لئے
آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
سب اٹھو، میں بھی اٹھوں، تم بھی اٹھو، تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی

ان کے نئے مجموعۂ کلام "آوارہ سجدے" میں جذبات کے ترفع اور تہذیب، نے واضح شکل اختیار کرلی ہے مگر چونکہ اس کتاب پر پابندی عائد ہوچکی ہے اس لئے اس سے اقتباس پیش کرنا ممکن نہ ہوگا۔ اس سلسلے میں یہ کہے بغیر بھی نہیں رہا جاتا کہ حکومت کا احتسابی عمل، آزادیٔ خیال اور آزادیٔ رائے کی راہ میں، جو سویلائزیشن یا تہذیب کی ترقی میں خشتِ اوّل کی حیثیت رکھتی ہے، ایک زبردست رکاوٹ بن جاتا ہے۔ دورِ حاضرہ کے مشہور فلاسفر سی۔ای۔ایم جوڈ نے تہذیب کی ترقی میں FREE THINKING یا آزادیٔ خیال کو بڑی اہمیت دی ہے مگر ہمارا معاشرہ ایسے عناصر سے مرکب ہے، اور اس کا اندازِ فکر اتنا جامد اور تقلیدی ہے کہ کسی ادیب یا شاعر کا آزادانہ اظہارِ خیال خواہ وہ کیسے ہی فنی سانچے میں کیوں نہ ہو، فوراً کسی نہ کسی طبقے، عقیدے یا مسلک کے لئے خطرے کا نشان بن جاتا ہے اور حکومت کا احتسابی عمل بڑی تیزی سے حرکت میں آجاتا ہے۔ آزادیٔ خیال کی راہ میں جب تک یہ رکاوٹیں باقی رہیں گی اس وقت تک ہمارا ذہنی افلاس بھی باقی رہے گا۔ اس پر خوب غور کرلینا چاہئے۔

سہیل احمد خان

آفاقی شعور کا شاعر

کیفی اعظمی اتفاق سے اس دور کے شاعر ہیں جس کو "برزخ" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ آج کی کائنات جس باریک تار پر کھڑی ہوئی نظر آتی ہے وہاں کے محسوسات اور جذبات اتنے اچھوتے اور عجیب و غریب ہوتے ہیں کہ فنکار کہنا کچھ چاہتا ہے اور کر کچھ جاتا ہے۔ اس سے مراد یہ نہ لی جائے کہ فنکار کو اپنے فن پر دسترس حاصل نہیں ہے بلکہ خیالات کی لہریں اٹھتی ہیں کہ ہم انھیں تحریر کرنے سے پہلے ہی جو چند لمحے پہلے لکھنا چاہ رہے تھے وہ تو ذہن سے غائب ہو جاتی ہے اور ایک نئی چیز سامنے آجاتی ہے۔ بعض دفعہ تو وہ صورت حال سامنے آتی ہے جو خود شاعر بھی نہیں سوچ پاتا۔ خیالات کے ان اتار چڑھاؤ کو کچھ بھی نام دے لیجئے، مگر معاشرتی ادراک کا جو ایک سایہ ہماری آج کی شاعری میں نمایاں ہے۔ اس سے ہم نگاہیں نہیں چرا سکتے۔

ایسا ہی کچھ عمل کیفی اعظمی کی شاعری کے ساتھ ہوا۔ انھوں نے جب شاعری شروع کی تو ہمارے یہاں کا ادب نئی کروٹ لے رہا تھا، اور انہوں نے وہی کیا جو ایک سچا فنکار کرتا ہے، گو آج کی اور اُس دور کی شعری فضا میں زمین آسمان کا فرق آگیا ہے، گو کیفی کی شاعری میں وہ عنصر باقی نہیں مگر اس کا جوہر آج کے معاشرے کے احساسات کو سمجھنے اور پرکھنے کا نام ہے، آج کے سکہ بند معاشرے میں رہتے ہوئے وہ اس شعور کا انکشاف کرنے والوں کے لئے سرگرداں ہیں، اس شعور کو "آفاقی شعور" بھی کہا

جا سکتا ہے۔

میں نے جب بھی کیفی اعظمی کو پڑھا تو مجھے ان کی شاعری میں جمالیات کے ساتھ خالص "سماجی شعور" نظر آیا۔ جو آج کے ماحول کا ہو بہو ہے۔ گذرے ہوئے برسوں کا ہر لمحہ کیفی کو ازبر یاد ہے، اس کی وارداتیں، ناانصافیاں، محرومیاں سب کچھ وہ اس طرح بیان کرتے ہیں جیسے تاریخ کا تمام شعور ان کے ذہن میں موجود رہتا ہے۔ ان کی نظم "چراغاں" سے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

ایک دو بھی نہیں چھبیس [۲۶] سال
ایک اک کر کے جلائے میں نے
اک دیا نام کا آزادی کا
اس نے جلتے ہوئے ہونٹوں سے کہا
چاہے جس ملک سے گیہوں مانگو
ہاتھ پھیلانے کی آزادی ہے ....
....اپنے گھر میں بھی دکھ منڈیر
طاق سینوں کے سجائے رکھے ہیں

ان اشعار سے کیفی کے ترقی پسند رجحانات سے منسلک رہنے کا ثبوت ملتا ہے انھوں نے جب شاعری شروع کی تھی وہ اسی قسم کے شعر کہا کرتے تھے یعنی وہ اس نظام کے خلاف تھے جو برسوں سے انسانی تعلقات کو دیمک کی طرح چاٹے جا رہا ہے، اس میں کیفی کے نہ جانے کتنے سال جلائے گئے۔ مگر وہ اتنا طویل عرصہ گذر جانے کے بعد بھی وہ دیکھ رہے ہیں، جو انھوں نے غلامی کے دنوں میں محسوس کیا تھا۔ کہنے کو تو ان کے ماحول میں بہت "حرکت" ہوئی سکوت وجمود ٹوٹا۔ مگر ہوا کیا، نظام وہی رہا، بس چہرے بدلتے رہے۔ معاشی استحصال کی صورت کی تیزی سے تبدیل ہو کر اتنی شدت سے سامنے آئی کہ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

تصادم کی کیفیت سے تقریباً ہر معاشرہ دوچار ہوتا ہے اور وقت کے ساتھ

رخصت بھی ہو جاتا ہے۔ مگر کیفی کی شاعری سے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ انسان کا سفر جاری ہے، منزل اس کو ابھی ملی نہیں معاشرہ عبوری دور سے گذر رہا ہے، مختلف سطح پر "خلیج" دکھائی دیتی ہے، مگر ابھی وہ مثبت تصادم کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ جس کے خواب شاعر گذشتہ تیس چالیس برسوں سے دیکھ رہا ہے۔

خارجیت کی یہ کیفیت شاعر کی ابتدائی شعری کاوشوں سے لیکر آج تک دکھائی دیتی ہے مگر وہ اپنے داخل کے حوالے سے یہ خارجیت تشکیل دیتا ہے۔ مگر وہ ان شعری و روایتی جمالیات سے بھی منہ نہیں موڑتا۔ جو ہماری شاعری کی اساس ہیں وہ کرب جو آج کا انسان بھرپور طریقے سے محسوس کر رہا ہے۔ عمر کا ایک طویل عرصہ گذر جانے کے باوجود اس پر وہ "خوف" دکھائی دیتا ہے جو آج کی تازہ نسل میں تو دکھائی دیتا ہے، مگر پرانی نسل اس سے کم ہی متاثر ہے۔ اگر آج کی تازہ شاعری پڑھی جائے تو اس میں پتے کے کھڑکنے سے جو ایک خوف کی فضا انسانی احساسات میں ابھرتی ہے وہی خوف کی فضا کیفی کی نظموں میں دکھائی دیتی ہے۔ اپنے آپ سے گھبرانے کا عمل نیا نہیں۔ اپنا ہی سایہ کبھی کبھی انسانوں کو گھبرا دیتا ہے۔ مگر کیفی کے یہاں دوسرے کے احساسات سے اپنی ذات کی تشکیل کے لئے جو رویہ ملتا ہے، اس کو شاعر "دعوت" میں یوں بیان کرتا ہے ــــ

کوئی دیتا ہے درِ دل پر مسلسل آواز
اور پھر اپنی ہی آواز سے گھبراتا ہے
اپنے بدلے ہوئے انداز کا احساس نہیں
میرے بہکے ہوئے انداز سے گھبراتا ہے

یہاں "بہکنا" بڑا معنی خیز ہے سرور کی کیفیت میں بہکنا عیاشی ہے، مگر سماجی رد عمل اور منفی تبدیلیوں نے "اس کو" اور "اس کو" وہ کچھ بنا رکھا ہے کہ بیان کرپائے ہوئے بھی گونگے ہیں۔ خواہشات کی یہ کیفیت ہے کہ خواہش دل میں آتی ہے سلنے خواہشات کو پورا کرنے کا سامان بکھرا پڑا ہے مگر وہ کون سا آلہ استعمال کیا جائے جس سے

سامنے بکھری ہوئی چیزوں میں سے کوئی شے اٹھائی جائے، جو چیز کو اٹھانا چاہو وہی چیز عمل بن کر فوراً ہی ردعمل کی طرف تحریک کرتی ہے اور بنتا ہوا کام وسوسوں اور شکوک کی نذر ہو کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔ مگر بے یقینی کا یہ عالم ہے کہ شاعر پھر بھی نئی رفتار کی تلاش میں سرگرداں ہے کہ شاید کہیں منزل مل جائے۔ کیفیؔ اعظمی ایک طرف تو رفتار وقت سے پریشان ہیں مگر چند ہی دیر بعد وہ اس رفتار کے قائل ہو جاتے کہ شاید ان کے اپنے خوابوں کی تعبیر مل جائے (یہ ردو قبول کا کھیل بھی خوب ہے)۔ یہ کیفیت ان کے شعری احساسات کے ان پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے۔ جسکو "آزاد خیالی" کہا جاتا ہے۔

کبھی آگے کبھی پیچھے کوئی رفتار ہے یہ
ہم کو رفتار کا آہنگ بدلنا ہوگا
ذہن کے واسطے سانچے تو ڈھالے گی حیات
ذہن کو آپ ہی سانچے میں ڈھلنا ہوگا

بعض دفعہ یوں بھی محسوس ہوتا ہے کیفیؔ ہاتھ کے سائز کا دستانہ ڈھونڈنے کے بجائے دستانے کے سائز کا ہاتھ تلاش کرتے نظر آتے ہیں، ان کا یہ شعری احساس نیا نہیں۔ کیونکہ کبھی کبھی گاڑی الٹی چلتی ہے اور منزل پر پہنچ جاتی ہے مگر ابھی ہیں لال اشارے کا خدشہ زیادہ ہوتا ہے۔ جو آزاد خیال شاعر کو زیب نہیں دیتا۔ اور جب الٹے سفر کی خواہش سے کچھ حاصل نہیں ہوتا تو تھکا ہوا بیزار ذہن منفی تصادم کی طرف شاعر کو آمادہ کرتا ہے۔ وہ ہوا کے رخ پر صحیح سمت جاتے ہوئے بھی باغیانہ رجحانات کے سبب ہوا کی مخالفت میں چل کر زمانے کو ساتھ لیکر چلنا چاہتے ہیں۔ یہ وہی رویّہ ہے جو مخدوم محی الدین کی شاعری میں نظر آتا ہے وہ اپنے رجحانات میں "منفیت" کو کچھ دیر ہی محسوس کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو کچھ اس طرح جلانا چاہتے ہیں کہ دور دور سے ان کے جلتے ہوئے جسم کو دیکھنے کے لئے آئیں اور موقعہ ملے تو تماش بینوں کو بھی جلا دیں۔

یہ بھی جلنا کوئی جلنا ہے کہ شعلہ نہ دھواں
اب جلا دیں گے زمانے کو جو جلنا ہوگا
راستے گھوم کے سب جاتے ہیں منزل کی طرف
ہم کسی رخ سے چلیں ساتھ ہی چلنا ہوگا
(نظم "دعوت")

یہ کون سی منزل ہے جو ابھی تک شاعر کو بلا رہی ہے، راستہ بھی انھی کے گیت گا رہا ہے، وہی انگلیاں پھر سے بالوں میں پھرنا چاہتی ہیں وہ کسی کی چوریاں ہیں جو کسی کے آنے سے پھر بجنے لگیں گی۔ وہ راتیں جو زمانہ ہوا کہیں کھو گئیں تھی، وہ راستے جو منزل کی طرف جاتے ہوئے کہیں انگلی چھڑا کر بھاگ گئے۔ یوں لگتا ہے جیسے کہ "طلسمی محل" ہے، جس میں قید شہزادی کے لئے ایک شہزادہ نہ جانے کتنی چڑیلیوں، بھوت اور بلاؤں سے مقابلہ کرتا ہے اور "طلسمی محل" کے دروازے پر پنجرہ کھول کر اس "طوطے" کا گلا دبا کر موت کی نیند سلا دیتا ہے۔ جس میں اس دیو کی جان ہوتی ہے۔ جس نے شہزادے کی شہزادی کو قید کر رکھا ہوتا ہے۔ مگر دیو کو موت کے گھاٹ اتار کے ہی کیا ہوا؟ ... وہاں نہ محل ہوتا ہے نہ دیو کا مردہ جسم اور نہ شہزادی، بس دور تک تپتا ہوا ریگستان دکھائی دیتا ہے جہاں میلوں کوئی نخلستان نہیں ــــ شاعر ان "طلسمی" خیالات سے اپنے قارئین کو کیا دینا چاہتا اور شاعر کو اس سے کیا حاصل ہوگا؟ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لمحوں کو قید کرنے کا رویہ سائنسدانوں کا ہی نہیں شاعروں کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ بھاگتے ہوئے وقت کے ساتھ شاعر اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنا چاہتا ہے۔ اور یہ وہ سب کچھ حاصل کرنے کی سعی کرتا ہے جس کو آج کے معاشرے میں ایک "آئیڈیل فرد" کی زندگی کے لئے لازمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور ذہن میں نہ پگھلنے والے برف کی طرح جما ہوا ہے۔ جس کا احساس برسوں سے ہمارے ذہنوں میں سلگ رہا ہے، زندگی کی دوڑتی ہوئی ساعتوں میں چند پل بہت اہمیت رکھتے ہیں، وہی زندگی کے چند لمحے ہیں جن کو شاعر "زندگی کا نام دے کر سب سے منہ موڑنا چاہتا ہے" زندگی اور انسانی تعلقات کے لئے یہ رویہ کتنا عجیب ہے!) یہ احساس اس کو انسان نہیں محض احساسات کا "پیرہن" بنا دیتے ہیں ــــ

زندگی نام ہے کچھ لمحوں کا
جس میں دو بولتی آنکھیں
..... بس یوں ہی بیٹھے رہو
گرمیٔ جذبات لئے
دور پربت پہ کہیں

اور ان میں بھی وہی اک لمحہ
جانے کی پیالی سے جب اٹھیں.....
ہاتھ میں ہاتھ لئے
کون جانے کہ اسی لمحے میں
برف پگھلنے والی ہے
(نظم "ایک لمحہ")

کیفی اعظمی کی شاعری سرخ سورج کی طرح آج بھی دمک رہی ہے۔ جس میں انسانی تعلقات کی دو مختلف صورتیں طاپ اور تصادم کی صورت میں سامنے آتی ہیں۔ جن کا زندگی سے ایسا رشتہ ہے جو ایک دوسرے کو متاثر کرتی ہیں کیونکہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ تاریخ کا سماجی ارتقاء ان کی شاعری میں جا بجا ملتا ہے۔ جس میں انسانی قوت معاشرتی زندگی کے تضادات کی کشمکش کے علاوہ نئے نئے مقاصد، افعال، نصب العین، اور انھیں حل کرنے کے نئے سانچے ملتے ہیں۔ کیفی کی شاعری میں یہ احساس سب سے زیادہ حاوی ہے کہ افراد کے منفی تصادم سے کائنات ان پر حاوی ہوتی جا رہی ہے شاید اندر کے انسان کے ٹوٹ کر بکھر جانے کی وجہ بھی یہی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ انسان ایک مکمل انسان بن کے کب سامنے آتا ہے جس کی خواہش برسوں سے بڑی شدت کے ساتھ کیفی اعظمی کے اندر لگی ہوئی ہے!!

سیّد محمّد مہدی

میں کیفی پر مضمون لکھنا کیوں نہیں چاہتا

کیفی کے متعلق مضمون لکھنا میرے لئے ذرا مشکل ہے۔ اشخاص اور واقعات سے ایک حد تک دوری یا وقفہ صحیح تناظر پیدا کرتا ہے جو مضمون لکھنے کے لئے ضروری ہے چالیس سال سے بھی زیادہ مدت ہونے کو آئی جب سے ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے اور پہچانتے ہیں اور ایک دوسرے سے قریب ہیں۔ اپنی سخن فہمی کے متعلق مجھے کوئی غلط فہمی نہیں لیکن غالب کے طرفداروں میں تو ہوں ہی۔ اور طرف داری میں ایک خطرہ تو ہے ہی کہ لوگ ابتدا ہی سے شبہ کرنے لگتے ہیں کہ اس شخص نے جو لکھا ہے وہ دوستی کی بنا پر لکھا ہے معلوم نہیں سچ کتنا ہے، لیکن ایک دوسری بات بھی ہے۔ چند برس کی بات ہے کہ ایک صاحب سے کیفی کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں اور اس سلسلے میں میں نے ایک واقعہ کا ذکر کر دیا۔ کچھ دن بعد کیفی کا خط آیا کہ بھائی یہ سب چیزیں میرے مرنے تک اُٹھا رکھو۔ اب یہ کون کہہ سکتا ہے کہ مرنے میں سبقت کون کرے گا لیکن بہر حال کیفی کے طرف دار ہونے کی حیثیت سے مجھ پر یہ فرض بھی اب عائد ہو گیا کہ میں کچھ ایسی باتیں نہ کہوں جن کا اظہار کیفی پسند نہیں کرتے۔ تو گویا اب ہم دونوں میں ایک اَن کہا معاہدہ سا ہے کہ کچھ باتیں اُن کی میں نہ بتاؤں اور کچھ باتیں میری وہ نہ بتائیں۔

لیکن آپ کا اصرار بڑھتا جاتا ہے کہ میں کچھ ضرور لکھوں تو کچھ "خام مال" میں آپ کے سپرد کرتا ہوں کہ کبھی فرصت ہو تو ان پہلوؤں کو لے کر کیفی کے متعلق مضمون لکھئے اور لکھوائیے۔ اس سے آپ کو شاید یہ بھی اندازہ ہو جائے کہ میں کیفی کے متعلق مضمون لکھنے سے کیوں جھجکتا رہا ہوں۔

کیفی سے کانپور میں ۴۶ء کے لگ بھگ جب میری ملاقات ہوئی تو اس وقت تک ایک محدود حلقے میں ایک انقلابی شاعر کی حیثیت سے متعارف ہو چکے تھے۔ پہلی نظم جو انھوں نے مجھے سنائی تھی وہ فوجی بھرتی کے خلاف تھی۔ اس زمانے میں وہ اپنے شعر ترنّم سے سنایا کرتے تھے۔ انیس نے ترنم یا موسیقی کے بارے میں کہا ہے ع

صوتیں صدائیں پنکھڑیاں جیسے پھول میں

یہاں صدائیں صوتیں تو تھیں لیکن ایسی جیسے کوئی ڈھیلے مار رہا ہو۔ ہاتھ میں رعشے کے ساتھ ساتھ آواز میں بھی رعشہ تھا۔ رات رات بھر اسی تھرتھراتی آواز میں شعر سنایا کرتے تھے۔ کیفی تو خیر بغیر شکر اور بغیر دودھ کی چائے اور بیڑی کے سہارے ساری رات شعر سنایا کرتے تھے لیکن قابلِ تعریف تھے وہ لوگ جو ان کے اس "ترنم" کو جھیل کر شعر سننے کے لئے رات رات بھر جاگتے رہتے تھے۔ خدا کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے مرحومہ سروجنی نائڈو کو کہ انھوں نے ایک دن کیفی کے اس ہولناک ترنم کو ٹیپ کر کے خود انھیں سنا دیا۔ تب کیفی کو یاد آیا کہ ایک زمانے میں سید رضی الدین صاحب سے مرثیہ پڑھنا سیکھا تھا۔ کیوں نہ مرثیہ خوانی کا انداز اختیار کیا جائے!

میر انیس اور ان کے بعد ان کے پوتے دولھا صاحب عروجؔ نے مرثیہ خوانی کو ایک آرٹ بنا دیا تھا۔ یہ آرٹ ڈرامے کا آرٹ تھا اور خالص ہندوستانی ناٹک کی روایتوں کا علم بردار تھا۔ اگر آپ نے کبھی کسی اچھے فن کار جیسے پی ایل دیش پانڈے یا محترمہ ترپتی مترا کا وَن مین شو دیکھا ہو تو شاید آپ کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مرثیہ خواں کس طرح کربلا کے کسی ایک واقعے کو اس کی تمام ڈرامائی کیفیت اور واقعات کے ساتھ منبر سے پیش کیا کرتے تھے۔

میں نے دولھا صاحب کو تو نہیں سُنا لیکن اُن کے شاگرد رضی صاحب کو بارہا سننے کا

اتفاق ہوا۔ بڑی وجیہ شخصیت کے مالک تھے۔ پاٹ دار آواز تھی جو ٹریننگ سے حاصل ہوئی تھی رضی صاحب ہمیشہ میر انیس کے مرثیہ پڑھتے حالانکہ خود ان کے والد مرثیہ کہا کرتے تھے اور واقعہ یہ ہے مرثیہ پڑھنے کا حق ادا کرتے تھے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے تک مجمع ان کی مٹھی میں رہتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار انھوں نے ایک مصرع کو ایسے ڈرامائی انداز میں ادا کیا کہ پورا مجمع فرطِ جوش سے کھڑا ہو گیا اور اسی مصرع پر مجلس ختم بھی ہو گئی۔ مصرع تھا: ؏

یوں فوج کو گھونگھٹ کبھی کھاتے نہیں دیکھا

اور بارہا میں نے کیفی کو ہزاروں کے مجمعے میں فرقہ وارانہ فسادات کے خلاف اپنی مثنوی پڑھتے سنا تو اکثر اسی قسم کا واقعہ وہاں بھی پیش آیا۔ خاص طور پر جب وہ اس قسم کے مصرعے پڑھتے تھے ؏

لو محمد علی کی لاش ہے یہ

یا

یہ بھگت سنگھ سے جوان کی لاش

تو مجمع پر وہی کیفیت طاری ہوتی تھی جو میں نے رضی صاحب کے مرثیے میں دیکھی تھی۔ یہ سیدھے سادے سے مصرعے کیفی کی پاٹ دار آواز ڈرامائی ادائیگی کے ساتھ ایک نئی کیفیت اختیار کر لیتے تھے جس میں تاریخی سیاق و سباق اور واقعات سے جذباتی اور روحانی وابستگی کچھ اس انداز سے مدغم ہو جاتے تھے کہ کلیجہ منھ کو آجاتا تھا اور آنکھوں میں شرم اور غصّے کے آنسو اور زبان پر انقلابی نعرے ہوتے تھے۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کیفی نے لکھنؤ میں جو ایک مرثیہ رضی صاحب سے پڑھنا سیکھا تھا وہ ان کے کام آیا اور چونکہ وہ خود تخلیقی فن کار ہیں اور ایکٹنگ سے لگاؤ رکھتے ہیں اس لئے اس میں بھی انھوں نے نئے نئے پہلو نکالے اور تحت خوانی کے فن کو کچھ اور آگے بڑھایا۔

مرثیہ پر ایک بات یاد آئی جو میں صرف آپ کو بتا رہا ہوں۔ کیفی کا پہلا مجموعۂ کلام ہے 'جھنکار'۔ لیکن 'جھنکار' سے پہلے ان کی ایک طویل نظم کتابی شکل میں کانپور سے شائع ہو چکی تھی جس کا عنوان غالباً "منارۂ ہدایت" تھا۔ یہ ایک مسدس تھا جو حضرت علیؓ کی شان میں تھا اور

اس میں اس قسم کے مصرعے تھے۔ ؎

یہ پہلا اشتراکی ہے یہ پہلا انقلابی ہے

شیعہ مجمع میں یہ نظم بڑے خضوع و خشوع کے ساتھ سنی جاتی تھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ نظم شعری اعتبار سے اچھی نہیں تھی۔ یہ نظم اگر کیفی کے کسی مجموعہ میں شامل ہوتی تو آپ اندازہ لگا سکتے تھے کہ یہ کیسی شعری خوبیوں کی حامل تھی اور کیفی کس حد تک انیس سے متاثر تھے اور کس حد تک خیالات کی دنیا میں وہ سوشلزم کے تصورات کو اپنانے لگے تھے۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ کیفی کے والد کی دلی خواہش تھی کہ کیفی دینی تعلیم حاصل کر کے کچھ دین کی خدمت کریں اور ممکن ہو تو مجتہد کا درجہ حاصل کریں۔ دینی مجتہد تو وہ بن نہ سکے لیکن اجتہاد کا مادہ ضرور پیدا ہو گیا جو ان کے شعر اور زندگی میں نظر آتا ہے۔ بڑے بھائی یوسف حسین نے ایل ایل بی کر کے وکالت شروع کر دی، دوسرے بھائی شبیر حسین نے بی اے کر کے سرکاری نوکری کر لی۔ اب باری اطہر حسین کی تھی سو انھیں لکھنؤ کے ایک دینی مدرسے میں داخل کر دیا گیا جہاں اجتہاد سے کام لے کر انھوں نے ہڑتال کروائی اور مدرسے سے نکال دیئے گئے، لیکن اس وقت تک اسلامی سوشلسٹ ہو چکے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شہری نوجوانوں کا سوشلزم کے خیالات سے بچنا مشکل تھا۔ جواہر لال نوجوانوں کے ہیرو تھے۔ اچاریہ نریندر دیو اور ان کے ساتھی سوشلزم کا پرچار کر رہے تھے۔ قومی تحریک آزادی میں سوشلزم کا ذکر ہونے لگا تھا۔ مسلمان نوجوانوں کے سامنے ڈاکٹر نور محمد اشرف، ڈاکٹر رشید جہاں، سجاد ظہیر وغیرہ کی مثالیں تھیں اور ان کے مضامین اور افسانے تھے۔

اکثر مسلمان نوجوان اسلامی سوشلزم کی منزل سے ہو کر گزر چکے ہیں۔ شیعہ نوجوانوں کے لئے حضرت علیؓ کا کردار اور واقعۂ کربلا سوشلزم کی طرف آنے کا نقطۂ آغاز تھا۔ ایک مہتم بالشان ٹریجڈی لوگوں کو غور و فکر پر مائل کرتی ہے۔ ہر سال محرم کے مہینے میں اس ٹریجڈی کا ذکر اور پھر ذکر بھی ہزار رنگ سے۔ سوز، نوحہ، مرثیہ، ماتم۔ اگر آپ کو موسیقی سے لگاؤ ہے تو سوز پڑھئے نوحے پڑھئے اور سنئے۔ بڑے بڑے استادوں کی بندشیں آج تک لوگ مجلسوں میں سناتے ہیں۔ استاد فیاض خاں مرحوم کے بہت سے بندش کے سوز ہیں جو آج بھی سنے جاتے

ہیں۔ تحت پڑھنے کا شوق ہے تو منبر پر تشریف لے جائیے اور مرثیہ پڑھئے۔ چلئے آپ صاحب بیاض نہ سہی لیکن آواز ایسی تو ضرور ہوگی کہ نوحہ خوانی میں ساتھ دے سکتے ہیں۔ یہ بھی نہیں تو ماتم کے ذریعے تال تو دے ہی سکتے ہیں۔ غرض کہ محرم کی مجلسیں وہ مجلسی ادارے تھے، جہاں نوعمروں کی تربیت بھی ہوتی تھی اور جہاں انھیں اپنی صلاحیت کے مطابق اپنے جوہر دکھانے کے مواقع بھی ملتے تھے۔

یہ تو ہوئی ایک بات۔ دوسری بات ہے بار بار اس کا ذکر کہ حضرت علیؓ خود ایک یہودی کے باغ میں مزدوری کرتے تھے۔ نان جویں پر گزارا کرتے تھے۔ گھر میں تین تین دن فاقے سے گزر جاتے تھے۔ ان کی بیوی اپنے ہاتھ سے چکی پیس کر بچوں کو کھلاتی تھیں وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح حضرت علیؓ حضرت سیدہ فاطمہ زہراؓ اور امام حسینؓ نوخیز اور حساس شخصیتوں کے لئے ایک ہیرو بن گئے جو اسلام کی تعلیم مساوات کے نہ صرف عامل تھے بلکہ مجاہد اور شہید بھی تھے۔ یہی اس مبہم اسلامی سوشلزم کے تصور کی بنیاد ہے جسے حسرت موہانی جوش ملیح آبادی سردار جعفری، کیفی وغیرہ نے ابتدا میں اپنایا تھا۔ مجھے ایرانی مفکر علی شریعتی کی تصانیف کا مطالعہ کرنے کا کچھ موقع ملا جو موجودہ انقلاب ایران کے مفکر تھے۔ ان کے یہاں اسلامی سوشلزم کے خیالات واضح طور پر ابھر کر آئے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت علیؓ، امام حسینؓ وغیرہ کے مثالی کرداروں اور مساوات اور عدل پر مبنی معاشرے کے متعلق ان کی تعلیمات نے مسلمان نوجوانوں کے ذہنوں کو جس طرح تقریباً ہر بحرانی اور عبوری دور میں متاثر کیا ہے اور انھیں ایک بہتر اور منصفانہ معاشرے کے خواب دکھائے ہیں اس پر ہم نے ذرا کم غور کیا ہے۔ ایران اور وسطی اور لاطینی امریکہ میں مجتہدین اور کیتھولک پادریوں نے جس مقامی اور بیرونی جبر و استبداد کے خلاف عملی جدوجہد میں حصہ لینا شروع کیا اور انقلابیوں کی صف میں شریک ہوئے تو یہ بات آہستہ آہستہ روشن ہونا شروع ہوئی کہ ابھی مذہب کی ایک نئی تاویل باقی ہے۔

حسرت موہانی نے اپنے مسلک کے متعلق کہا تھا ؎

درویشی و انقلاب ہے مسلک میرا ـــــ صوفی مومن ہوں اشتراکی مسلم

یہ سب میں نے یوں لکھا کہ کیفی اور دوسرے بہت سے شعراء کے ذہنی سفر کو سمجھنے میں شاید یہ پس منظر مفید ثابت ہو۔ لیکن مجھے یقین نہیں ہے کہ اس کا اظہار خود کیفی کو پسند آئے گا اور وہ اس سے متفق ہوں گے۔ تو مضمون لکھنے میں میری جھجک کی ایک وجہ یہ ہے۔

کیفی شاعری تو کرتے ہی ہیں اور آپ نے ان کی شاعری کے متعلق ماہرین و مجتہدین فنِ تنقید سے مضامین حاصل بھی کر لئے ہوں گے۔ شادی سے قبل وہ شوکت کو جواب ان کی بیوی ہیں روز ایک اور اکثر ایک سے زیادہ منظوم خط لکھا کرتے تھے۔ شوکت نے غالباً وہ خط محفوظ نہیں کئے ورنہ تنقید نگاروں کو ان کی شاعرانہ صلاحیتوں پر لکھنے کے لئے خاصا مواد ہاتھ آجاتا اور ساتھ ہی ساتھ خطوط نگاری میں ایک دلچسپ باب کا اضافہ بھی ہوتا۔

لیکن شاعری کے علاوہ بھی کیفی نے بہت سے اہم کام کئے ہیں اور کر رہے ہیں مثلاً وہ آج کل بمبئی کے انڈین پیوپلز تھیٹر اپٹا کے صدر ہیں اور اس وقت جب سارے ہندوستان میں اپٹا تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ صرف بمبئی ایک ایسا شہر ہے جہاں کیفی نے ان تھک کوششوں سے اس ادارے کو بمبئی کی تہذیبی زندگی کا بہت ہی اہم رکن بنا دیا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ہندی اردو میں اس وقت بمبئی میں صرف اپٹا ہی کے ڈرامے مقبول ہوتے ہیں اور فن کار اس کوشش میں رہتے ہیں کہ انھیں بھی اپٹا کے اسٹیج پر آنے کا موقع ملے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ اپٹا کے ذریعے کیفی نے کالجوں کے طلباء اور طالبات کو بین کالج مقابلوں کے ذریعے اس تحریک میں شامل کر لیا ہے اور اس طرح اپٹا کو فن کاروں اور لکھنے والوں کی کمی محسوس نہیں ہو سکتی۔

لیکن اس کا ایک پہلو اور بھی ہے جس پر اپٹا سے تعلق رکھنے والوں کو کچھ اعتراض ہے۔ وہ اعتراض یہ ہے کہ موجودہ بمبئی اپٹا نے محنت کشوں سے اپنا رشتہ توڑ لیا اور اب اس کے ڈرامے صرف پیسے والے ہی دیکھ سکتے ہیں۔ اپٹا ایک عوامی تحریک تھی جس نے لوک ناٹک کی مختلف شکلوں کو ایک مقصد کے لئے استعمال کیا تھا اور اپنے کو مزدوروں اور دوسرے محنت کشوں کا حصہ سمجھا تھا۔ اب ایسا کیوں نہیں ہے؟

اس سلسلے میں ایک بات آپ کو بتاؤں۔ یہ کوئی ۱۹۴۶ء، ۴۷ء کی بات ہے بمبئی میں

ہم میں سے کئی نے چھوٹے چھوٹے ناٹک لکھے تھے جن کا موضوع فرقہ وارانہ فسادات، مکانوں کا مسئلہ، مہنگائی، آزادی کے معنی وغیرہ تھے۔ ان ناٹکوں میں ہم لوگ خود بھی ایکٹنگ کرتے تھے۔ ڈائرکشن بھی ہم خود کرتے تھے۔ کیفی نے بھی ان دنوں ایک سیاسی طنزیہ لکھا تھا "چنا جور گرم بابو" وہ اسے خود ہی سوانگ بنا کے اسٹیج پر پیش بھی کیا کرتے تھے۔ یہاں "اسٹیج" کے لفظ سے دھوکا نہ کھائیے گا۔ ہوتا یہ تھا کہ مختلف محلوں اور بستیوں میں جلسے ہوتے تھے اور جلسے سے پہلے یا بعد میں ہم لوگوں سے کہا جاتا تھا کہ آپ لوگ ناٹک دکھائیے۔ اس طرح ہم لوگ گلی گلی صدا دیتے پھرا کرتے تھے۔ آج "نکڑ ناٹک" بالکل وہی چیز کر رہا ہے۔ معترضوں کا کہنا یہ ہے کہ اپٹا نے جو کارنامہ کیفی کی رہنمائی میں انجام دیا ہے وہ اپنی جگہ بہت اہم ہے لیکن اس دوسرے ورثے کو کیوں مسترد کر دیا گیا ہے؟ "جادو کی کرسی" نے، جس میں بلراج ساہنی مرحوم اداکاری کیا کرتے تھے، ابتدائی اسٹریٹ تھیئٹر کو ایک بہتر شکل دے کر آگے بڑھایا تھا۔ اپٹا اس روایت کو کیوں نظر انداز کرتا ہے؟

معترضین اگر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اسٹیج پر ہونے والا یعنی پروسینیم تھیئٹر اب تھیئٹر کی تحریک میں کسی قسم کا پارٹ ادا نہیں کر سکتا اور صرف اسٹریٹ تھیئٹر یا نکڑ ناٹک ہی کے ذریعے ہم نئے تماش بین پیدا کر سکتے ہیں تو میرا خیال ہے کہ وہ غلطی پر ہیں۔ اسٹیج پر ہونے والے ڈراموں میں طرح طرح کے تجربے کئے جا رہے ہیں اور معنی اور مقصد کے لحاظ سے ایک جاندار بامعنی اور بامقصد تھیئٹر موجود ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے ملک اور ہمارے شہروں کے مخصوص حالات کی وجہ سے تھیئٹر دیکھنے کا موقع صرف درمیانی طبقے کے لوگوں ہی کو ملتا ہے۔ لیکن ہم یہ کیوں بھول جائیں کہ ملک کی قسمت بدلنے اور اسے صحت مند راستے پر لے جانے میں درمیانی طبقے کو بھی ایک پارٹ ادا کرنا ہے۔

دوسری طرف یہ بھی صحیح ہے کہ ہال میں تھیئٹر کرنے والوں کو اس بات کا احساس شدت سے ہوتا جا رہا ہے کہ تماش بینوں کا حلقہ بڑھ نہیں رہا اور یہ کہ صرف وہی لوگ تھیئٹر آتے ہیں جن کو ہم پیسے والا کہتے ہیں۔ اگر عام انسان، خاص طور پر مزدور اور کسان اور نچلے درمیانی طبقے کے لوگ ہمارے تھیئٹر تک نہیں آ سکتے تو ہم کوشش کر کے ان تک کیوں نہ پہنچیں

اسٹریٹ تھیٹر کا تجربہ خود ہال کے تھیٹر کے لئے مفید اور دلچسپ ہو سکتا ہے اور تماش بینوں کا حلقہ وسیع کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ اپٹا کی کچھ اچھی روایتوں میں سے یہ روایت ہمارے کام آسکتی ہے۔ بمبئی اپٹا کو اس مسئلے پر غور کرنا ہوگا۔ لیکن اس کی ذمہ داری کیفی سے زیادہ اپٹا کے منتظمین اور ڈائرکٹروں پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اپٹا کو کس قسم کا ادارہ بنانا چاہتے ہیں اور اس کے مستقبل کا ان کے ذہن میں کیا خاکہ ہے۔

بہت ممکن ہے کیفی میرے ان خیالات سے متفق نہ ہوں۔ اور یہ بھی ایک وجہ تھی کہ میں مضمون لکھتے ہوئے جھجک کیوں رہا تھا۔

تھیٹر کے ساتھ ساتھ کیفی کا صحافت سے بھی پرانا تعلق رہا ہے اور اس میدان میں بھی کیفی نے بہت بڑے بڑے کام کئے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ان کی صحافتی زندگی کا صحیح معنی میں آغاز ایسے دور میں ہوا جسے عام طور پر کمیونسٹ اصطلاح میں سیاسی اور ادبی تنگ نظری کا دور کہتے ہیں اور لوگ عام طور پر اس دور کے متعلق بات کرنا یا سننا زیادہ پسند نہیں کرتے۔

یوں تو ترقی پسند مصنفین کا ایک ترجمان تھا نیا ادب، جو ہچکیاں لے کر نکلتا رہتا تھا لیکن ایسا کوئی پرچہ نہیں تھا جو صرف ادیبوں ہی کو نہیں تمام فن کاروں ـــــ فلم، تھیٹر، صحافت، مصوری وغیرہ سے تعلق رکھنے والوں کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کر سکے اور ان کے مسائل کو ملک کے محنت کشوں کے مسائل کے پس منظر میں سامنے لا سکے۔ کیفی نے اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے محاذ شروع کیا، یہ بڑا جاندار، بڑا نڈر، بہت جرأت مند اور بانکپن رکھنے والا پرچہ تھا۔ وہ مردہ اور لنگڑاتے ہوئے ادب کو ترقی پسند ادب کہنے کا قائل نہیں تھا چاہے روایتی طور پر ان کے لکھنے والوں کو ترقی پسند کیوں نہ سمجھا جاتا رہا ہوں۔ اس نے دوسرے ملکوں کے جاندار ادب سے رشتہ جوڑا اور ان کے تراجم شائع کئے، ان لوگوں سے لوہا لیا جو ہر قسم کی ذاتی یا طبقاتی مصلحت پر نظریات کا پردہ ڈالنا ضروری سمجھتے تھے۔ مختصراً یہ کہ اس نے ایک ملی ٹنٹ ادب کی طرف داری اور وکالت کی۔ ظاہر ہے اس پر حکومت کا عتاب لازمی تھا۔ پرچے سے ضمانت طلب کی گئی۔ پریس پر اسے

شائع کرنے کی پابندی عائد کی گئی۔ محاذ بند ہوا تو تحریک نکل آیا۔ وہ 'تحریک' نہیں جو امریکی مہربانیوں کے ذریعے نکلتا ہے۔ وہ 'تحریک' محاذ ہی کا جانشین تھا اور انھیں روایتوں کو لے کر آگے بڑھا تھا۔ اس زمانے میں کیفی کو گرفتاری سے بچنے کے لئے روپوش بھی ہونا پڑا لیکن پرچہ نکلتا رہا۔ روپوش بھی تو اسی لئے ہوئے تھے کہ کام میں خلل نہ پڑنے پائے۔

پرچوں کی مقبولیت کا حال یہ تھا کہ سارے ہندوستان میں اس کی ایجنسیاں قائم ہو گئی تھیں۔ لیکن یہ ایجنسیاں عام ایجنسیوں سے ذرا مختلف تھیں۔ محاذ اور تحریک کے ایجنٹ زیادہ تر ادیب تھے جو پرچے منگا کر ذاتی طور پر اسے بیچا کرتے تھے۔ مثلاً کرشن چندر باقاعدگی سے اس کے پندرہ بیس پرچے لے کر جاتے اور انھیں بیچ کر پیسے ادا کیا کرتے تھے۔ مہندر ناتھ بہت جوش و خروش کے ساتھ اس کی اشاعت بڑھانے میں مصروف رہتے تھے۔ محاذ اور تحریک کے مضامین پر ادیبوں کے جلسوں میں بحثیں ہوتی تھیں اور ان کی روئداد شائع ہوتی تھی۔ اور کچھ نہیں تو ان پرچوں نے نوجوانوں میں لکھنے پڑھنے اور غور و فکر کرنے کا مادہ پیدا کیا۔ دفتر میں کہانیوں، نظموں، مضمونوں کا ایک انبار سا لگ جاتا تھا۔

ان پرچوں میں ایسے مضامین بھی شائع ہوئے جن پر آپ تنگ نظری کا الزام رکھ سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ مارکسزم کو ہضم کے بغیر مارکسزم کا نام ان مضامین میں لیا گیا ہے۔ مجھے اس کا احساس ہے کیونکہ کیفی کے ساتھ میں بھی ان پرچوں کی ادارت میں شریک تھا اور ان میں میرے کچھ ایسے مضامین بھی شائع ہوئے جو شاید افراط و تفریط کا شکار ہو گئے۔ لیکن ایک دلچسپ بات آپ کو بتاؤں۔ ابھی حال ہی میں محاذ کے دو ایک پرچے نظر سے گزرے تو احساس ہوا کہ ہم بلا وجہ ان مضامین سے شرمندہ تھے۔ ان پرچوں کو دیکھ کر جی چاہا کہ کاش آج پھر اسی قسم کے پرچے نکل سکتے جو بے لاگ بات کہنے کا دم خم رکھتے۔ میں نے کیفی سے اکثر اس کا ذکر کیا انھیں خود بھی اس کا احساس ہے لیکن شاید ان کی صحت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ ہمارے ساتھ کے ادیبوں میں کیفی ہی واحد ادیب تھے جنھیں ترقی پسند ادب کی تحریک کے لئے ایک ترجمان رسالے کی ضرورت کا شدت سے احساس تھا اور اس احساس کو انھوں نے "محاذ" اور "تحریک" کے ذریعے عملی جامہ پہنایا۔ جب یہ پرچے بند ہو گئے تب بھی کیفی صحافت

سے وابستہ رہے۔ اردو بلٹز میں مدتوں تک ایک کالم لکھتے رہے۔ ان کی کچھ طنزیہ نظمیں اسی دور کی یادگار اور اسی کالم کی مرہونِ منت ہیں۔

آپ بجا طور پر پوچھ سکتے ہیں کہ یہ تو کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر آپ لکھتے ہوئے جھجکیں تو عرض ہے کہ میں کیا مجھ سے بہت بلند قد والے ادیب اس دور کے متعلق لکھتے ہوئے جھجکتے ہیں کیونکہ اس دور کو دورِ جاہلیت قرار دیا گیا ہے۔ کون جانے اس دور کے ذکر سے کن کن لوگوں کے لطیف جذبات کو ٹھیس پہنچے، اُس دور میں بہت غلطیاں سرزد ہوئیں، لیکن صرف غلطیاں ہی نہیں ہوئیں۔ کچھ بہت اچھے کام بھی ہوئے۔ کچھ اچھے مضامین، نظمیں افسانے وغیرہ بھی لکھے گئے اور ادب میں کیفی کے پرچوں نے ایک نیا آہنگ متعارف کرایا 'محاذ' اور 'تحریک' ادبی جرنلزم کے بہترین ترجمان تھے۔ اس کے بعد ایسے پرچے پھر کبھی نہ نکلے۔

کیفی بے اُستادے شاعر ہیں لیکن عشق بازی میں داغ کی پیروی کرتے ہیں۔ دیکھیے میں ایسی بات لکھ گیا جو مجھے آپ کو بھی نہیں لکھنی چاہیئے تھی۔ بہر حال اس کے آگے کچھ نہ لکھوں گا آپ کے بس میں ہو تو تحقیق کیجیئے کہ عشق بازی کا ان کی شاعری پر کیا اثر پڑا۔ اب تو شاید آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں کیفی کے متعلق مضمون کیوں لکھنا نہیں چاہتا۔

اختر راهی

کیفی صاحب

جنہیں میں جانتا ہوں

۱۹۴۷ء کے ۱۵ ر اگست کو لال قلعہ پر قومی پرچم لہراتے ہی انسانوں کے جنگل میں وہ "گرم ہوا" چل پڑی کہ درندے بھی مارے خوف کے غاروں میں چھپ گئے۔ انسان، انسان نہ رہا اور شیطان مارے شرم کے منہ چھپائے پھرنے لگا۔ مجھے بھی عین جوانی سے قبل ہی یہ درندگی دیکھنا پڑی تھی۔ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے پروردہ معاشرے نے بچپن میں ہی کھیل کود سے بیگانہ کر دیا تھا۔ افلاس زدہ یتیمی نے قبل از وقت ہی سنجیدہ اور ذمہ دار بنا دیا تھا۔ اس پس منظر کے ساتھ گاؤں سے شہر آیا تو طبقاتی تضاد و کشمکش اور زیادہ کھل کر سامنے آگئے۔ فلک بوس عمارات کے دامن میں فٹ پاتھ پر صنعتی مزدوروں کے جھونپڑوں کی قطاریں دیکھ ایسا لگا۔

سماجی نابرابری اور سرمایہ داری سے لوہا لینے کا جذبہ اور شدید ہو گیا۔ لیکن جنگ کا کوئی میدان یا راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

شاید ۱۹۵۳ء کی بات ہے ہوسٹل کے ساتھیوں کے ساتھ مشاعرہ سننے کی غرض سے ہستان باغ کی طرف میں بھی نکل پڑا تھا۔ گیٹ اور اسٹیج پر سرخ پرچم لہرا رہے تھے۔ میدان انسانوں کا سمندر معلوم ہو رہا تھا۔ میں جب گیٹ سے اندر

داخل ہونے لگا تو کسی شاعر کی نظم کا یہ بند اس سمندر کو چیرتا ہوا فضا میں تحلیل ہو گیا

آج کی رات بڑی گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
تم اٹھو، تم بھی اٹھو، تم بھی اٹھو، تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائیگی

ایک بھرپور مردانہ آواز نے میرے بھی بدن کے رونگٹے کھڑے کر دئے اور میں گیٹ پر ہی ٹھٹھک کر رہ گیا۔ میدان میں نشست لینے کا یارا بھی باقی نہ رہا تھا۔ شاعر نے اپنی نظم مکمل کی اور وہ داد و تحسین کا خزانہ سمیٹ کر بڑے سکون کے ساتھ اسٹیج پر بیٹھ گیا۔ مجھے شاعر کا نام تو نہیں معلوم ہو سکا لیکن اس کی نظم کی دستک سے جسم کی دیوار میں ایک کھڑکی کھل چکی تھی۔ میں نے اپنے اندر جھانک کر دیکھا تو سماجی نابرابری اور سرمایہ داری کے خلاف جنگ کا ایک بہتا ہوا لہو رنگ راستہ دکھائی دیا۔ مستان باغ کے موجیں مارتے ہوئے انسانی سمندر نے میرے اندر بھی کبھی نہ تھمنے والا ایک طوفان سا برپا کر دیا۔ میں گیٹ سے نکل کر سامنے مسجد کی فٹ پاتھ پر آیا۔ ہزاروں انسانوں کے حصار میں رہنے کے باوجود مسجد کے مینار کی طرح خاموش اور تنہا سوچتا رہا۔ سوچ کے ان چند لمحات نے برسوں کی مسافت کا راستہ متعیّن کر دیا۔ سیاسی آزادی کے بعد معاشی آزادی کا راستہ۔

جذبات کی ہیجانی کیفیت مشاعرہ کی سماعت کے بیچ حائل تھی۔ بے اختیار فٹ پاتھ سے اُٹھ کر ہوسٹل کی راہ لی ــــ اس واقعہ کو کم و بیش پچیس برس گذر چکے ہیں لیکن دشت و صحرا کے اس سفر میں دم لینے کی مہلت آج تک نصیب نہیں ہوئی ہے۔ نیند جیسے تمام وجود کی حریف بن چکی ہے۔ اندر کا شاعر اور آرٹسٹ بے سایہ درختوں کی راہوں سے گذرتے گذرتے سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے پھر بھی وہ اپنی انا پر آج بھی اسی طرح قائم ہے ــــ نیند فٹ پاتھ بھی سے نہیں نرم بستر سے بھی بیگانہ ہے۔ گرم ہوا اس رات بھی چل رہی تھی ــــ

۔ گرم ہوا آج کی رات بھی چل رہی ہے ۔

وہ رات اُس شاعر کی نظم آخر ینی میں گذر گئی۔ صبح ہوئی تو سورج کی کرنوں نے اس شاعر سے ملاقات کی آرزو کو اور بھڑکا دیا۔ جس کی ایک ہی نظم نے اس کا ایسج دل کی گہرائیوں تک اتار دیا تھا۔ لیکن دشواری یہ تھی کہ شاعر تک رسائی کا کوئی راستہ سامنے نہیں تھا۔ ہوسٹل میں کیفؔ بھوپالی میرے ساتھ رہتے تھے جوان دنوں کمال امروہی کی پاکیزہ اور دائرہ کے گانے لکھ رہے تھے ان سے اسی آرزو کے ساتھ رجوع ہوا ۔

"کیفؔ صاحب! رات ایک شاعر کو سنا۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ لیکن مجھے اس کا نام تک معلوم نہیں۔ البتہ حلیہ بتا سکتا ہوں، کیا آپ مجھے اس شاعر تک پہنچا سکتے ہیں؟ وہ شاعر دراز قد، سفید کرتہ پاجامے سے جامہ زیب تھا کرتے پر شرمئی اون کا جاکیٹ بھی تھا۔ اس کی نظم کا پہلا مصرع کچھ اس طرح تھا"

آج کی رات بڑی گرم ہوا چلتی ہے

کیفؔ صاحب پہلے تو بہت ہنسے پھر سنجیدہ ہو کر بولے

"اختر میاں! کیا تم مجھے اس ہوسٹل سے نکلوانا چاہتے ہو؟ پورے ایک سال کا کرایہ باقی ہے۔ کہاں سے لاؤں گا۔ تمہارے چاچا جو اس ہوسٹل کے ایک پارٹنر اور مینیجر ہیں، کٹر مُلا اور مدرس، جس دن انہیں پتہ لگا کہ تم نے میری رہنمائی میں ایک کمیونسٹ شاعر سے رسم و راہ استوار کر لی ہے تو اسی روز میرے سر پہ بستر اور ہاتھ میں اٹیچی ہو گی اور میں ہوسٹل کی سیڑھیاں گنتا نظر آؤنگا میاں اس کار خیر سے مجھ غریب کو معاف رکھو تو بہتر ہے"

"ایسی کوئی بات نہ ہو گی۔ منشی صاحب میرے چاچا صرف اتنے ہیں کہ وہ مجھ سے ہوسٹل کا کرایہ نہیں لیتے۔ میں اگر دوں تو وہ لینے سے گریز بھی نہیں کرینگے۔ وہ میرے باغیانہ ذہن سے حد درجہ خائف ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ملک میں کمیونسٹ راج قائم ہوا تو ہوسٹل نیشنلائز ہو جائے گا اور گاؤں کی چودھراہٹ بھی ان

کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ کیف صاحب! آپ مجھے اس شاعر تک پہنچا دیجئے ورنہ میں کوئی اور ذریعہ تلاش کروں گا"

یہ سن کر کیف صاحب بے بس ہو گئے اور انہوں نے شاعر سے ملانے کی حامی بھر لی۔ کہنے لگے۔

"میاں! تمہیں اس شاعر کی تلاش نہیں بلکہ اپنے مستقبل کی جستجو ہے وہ ایک سچے اور ایماندار انقلابی شاعر ہیں تمہاری طرح سیکڑوں نوجوان اس شاعر سے متاثر ہیں وہ دراصل نوجوانوں کے شاعر ہیں تمہیں اُن سے ملانے میں مجھے خوشی ہوگی"

"لیکن اس شاعر کا کچھ اتا پتہ بھی بتایئے"

"باتوں میں اصل بات تو میں بھول ہی گیا۔ وہ شاعر ہیں کیفی اعظمی۔ ریڈ فلیگ ہاؤس میں رہتے ہیں اتوار کی شام کو شاہد لائبریری میں ملیں گے۔"

"کیف صاحب! کیا ان کے کلام کا کوئی مجموعہ بھی چھپا ہے؟ میں ملنے سے پہلے انھیں جاننا چاہتا ہوں۔"

"آخرِ شب" ان کا شعری مجموعہ ہے۔ بازار میں اب شاید مل سکے۔ پھر بھی مکتبہ جامعہ میں تلاش کرو۔"

میں نے اسی دم مکتبہ جامعہ کا رخ کیا۔ معلوم ہوا آخرِ شب کا آخری نسخہ اس لئے بچا ہے کہ خستہ حالت میں ہے۔ میں نے تبرک سمجھ کر اسے حاصل کیا اور ہوسٹل آکر ایک نشست میں پڑھ ڈالا۔ پڑھنے کے بعد ملاقات کی آرزو بچوں کے کھلونوں کی ضد بن گئی۔ کیف صاحب سے ایک تعارفی خط جو کامریڈ جبار کے نام تھا لکھوا کر جیب میں ڈال لیا اور آخرِ شب ہاتھ میں لے کر مدنپورہ کی سمت چل پڑا۔ وہ اتوار کی شام تھی۔ شاہد لائبریری کے مقابل فٹ پاتھ پر کامریڈ جبار اور کیفی صاحب معروف گفتگو تھے اور لائبریری کے اندر نوجوان مصنفین کے میٹنگ کی تیاری ہو رہی تھی۔ میں نے خط جبار کے ہاتھ میں دیا اور ایک اضطرابی کیفیت میں دونوں کے قریب کھڑا ہو گیا۔ کامریڈ جبار نے خط پڑھا اور مخاطب ہوئے۔

"راہی صاحب! آپ ہی ہیں کیفی اعظمی صاحب۔"

میں نے سلام کیا اور مصافحہ کو ہاتھ بڑھایا۔ کیفی صاحب ایسی گرم جوشی سے ملے تھے کہ اس کی گرمی آج بھی ان ہاتھوں میں محسوس کر رہا ہوں۔ میں نے بلا تامل آخرِ شب کا نسخہ کیفی صاحب کی خدمت میں پیش کیا اور آٹوگراف کی التجا کی۔

"اختر کو میرا ماضی پسند ہے اور مجھے اختر کا مستقبل عزیز ہے۔"

اس ایک جملے نے برسوں کی رفاقت کا رشتہ ہمارے درمیان قائم کر دیا۔ پندرہ بیس سال کی قربت ادبی، سیاسی اور سماجی خدمات میں ڈھل گئی ایک لمبے عرصہ کی سرگرمیوں کا احاطہ کر لینا آسان کام نہیں اور اس رسالے کے صفحات اس بات کی اجازت بھی نہیں دیں گے۔ میں صرف ان حالات کا ذکر کروں گا وہ بھی اختصار سے، جن کا تعلق نوجوانوں کی رہنمائی اور عوامی جذبات سے رہا ہے تاکہ کیفی صاحب کی شخصیت کے کچھ پہلو سامنے آجائیں۔ میں ان کے فن پر کچھ نہ کہوں گا اس لئے کہ یہ بات اس تحریر کی زد سے باہر ہے۔

میں کیفی صاحب کے قرب کی بات اس کی دوری سے شروع کرتا ہوں۔

اس صدی کی پانچویں اور چھٹی دہائی میں کانگریس کے بعد ملک کی سب سے بڑی پارٹی، کمیونسٹ پارٹی تھی۔ کانگریس سوشیلزم کے بلند بانگ نعروں کے باوجود سرمایہ داروں کی حلیف تھی جس کے ہاتھ سیاسی اقتدار تھا۔ سیاسی آزادی کے بعد معاشی انقلاب کی ذمہ داری کمیونسٹ پارٹی پر تھی اور وہ، اس ذمہ داری کو حتی الامکان نبھا بھی رہی تھی۔ کیرلا اور بنگال میں اس کی حکومتیں قائم ہو چکی تھیں اور نئی صبح کی کرنیں سیکڑوں برس کی مظلوم و تاریک دھرتی پر رفتہ رفتہ پھیل رہی تھیں۔ اس زمانے میں کیفی صاحب کی سیاسی، ادبی اور سماجی سرگرمیاں پورے شباب پر تھیں۔ بمبئی میں مدنپورہ، ناگپاڑہ، ڈونگری اور مجگاؤں ان کا میدانِ عمل تھا۔ ان علاقوں میں نوجوان کارکنوں کے یونٹ قائم ہو چکے تھے اور ہر یونٹ کیفی صاحب کی رہنمائی اور سرپرستی میں اپنے اپنے حلقہ میں سرگرم ہو چکا تھا۔ ان حلقوں میں پندرہ بیس برس کی سیاسی جدوجہد

کے عوض میں جو کامیابیاں حاصل ہوئی تھیں ان میں کیفی صاحب کا زبردست حصّہ تھا۔ کارپوریشن سے پارلیمنٹ تک انتخابی فتوحات کیفی صاحب کے بغیر ممکن نہیں تھیں۔ کارپوریشن کے الکشن میں کامریڈ ہومی برن کی فتح کو ان تمام فتوحات پر فوقیت حاصل ہے۔ اس لئے کہ ان کی شخصیت ایسی نہیں تھی جو عوام پر اثر انداز ہوتی۔ انھیں فتح سے ہمکنار کرانا اور کارپوریشن میں پہونچا دینا کیفی صاحب ہی کا کرشمہ تھا۔ الغرض کمیونسٹ پارٹی کا رسوخ و اثر دن بدن بڑھتا جا رہا تھا گو کہ حکمراں جماعت اور اس کی حلیف پارٹیاں اس پیش قدمی کو روکنے میں پیش پیش تھیں۔ کیرلا اور بنگال میں عوام کی منتخب کمیونسٹ حکومتوں کو منظم سازشوں کے تحت اکھاڑ کر پھینک دیا گیا اس غیر جمہوری طریقۂ کار سے عوام کا جمہوری اعتقاد متزلزل ہو گیا اور کیفی صاحب اپنی تحریر و تقریر سے آگ اُگلنے لگے۔ ان دنوں اس انقلابی شاعر کا مزاج اتنا گرم رہا کہ وہ انتہا پسندوں سے بھی دو چار قدم آگے نظر آنے لگے تھے۔ پھر وہ منحوس دور شروع ہوا جب چینی مسلح مداخلت نے ملک کی سب سے بڑی عوامی پارٹی کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا۔ جو ملکی سیاست کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ پھوٹ سے قبل کمیونسٹ اپنے طاقتور حریف کا آخری مورچہ بھی چند مزاحمتوں کی بات محسوس کرنے لگے تھے لیکن اب پھوٹ کے بعد معاشی آزادی کی جنگ برسوں کا معرکہ معلوم ہونے لگا ہے۔

کمیونسٹ پارٹی کی تقسیم کا سب سے بڑا شرمناک پہلو یہ ہے کہ سی۔ پی۔ آئی نے حکمراں جماعت سے مل کر سی۔ پی۔ ایم کو موت کے گھاٹ اتارنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور سی۔ پی۔ ایم نے بھی انتہا پسندوں کو تباہ کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی کیفی صاحب اس صورت حال سے بیحد کبیدہ خاطر ہے۔ اب حالات بدل چکے ہیں۔ سی۔ پی۔ آئی کانگریس کا ہاتھ مضبوط کر کے اپنے ہاتھ کٹوا چکی ہے۔ کانگریس کے دونوں بازوؤں پر فالج کا حملہ ہو چکا ہے اور سی۔ پی۔ ایم پھر ایک بار ایک قابل لحاظ پارٹی کی حیثیت سے ابھر رہی ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کی پھوٹ نے کیفی صاحب کو ایک عجیب تذبذب اور کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

اس لئے کہ کیفی صاحب کے اکثر سینئر ادبی اور سیاسی رفقاء سی۔پی۔آئی کے ساتھ چلے گئے اور نوجوان مصنفین سی۔پی۔ایم کی طرف آگئے تھے۔ کیفی صاحب کو نوجوانوں کا حلقہ زیادہ عزیز تھا لیکن وہ اپنے ترقی پسند ساتھیوں کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس مثبت اور منفی اثرات نے نوجوانوں کو ان سے متنفر کر دیا۔ کیفی صاحب کو اس بات کا شدید احساس اور دکھ بھی ہے۔ وہ اگرچہ مارکسسٹوں کے ساتھ نہیں ہیں لیکن وہ بنیادی طور پر مارکسسٹ ہیں اسی باعث انہوں نے آج تک سی۔پی۔آئی کی رکنیت کی تجدید نہیں کی ہے۔ وہ اگر سی۔پی۔آئی کی سرگرمیوں میں کبھی کبھار حصہ بھی لیتے ہیں تو اس میں دوستوں اور بزرگوں کا لحاظ شامل رہتا ہے۔ ورنہ یہ بات ان کے مزاج کے یکسر منافی ہے اسی لئے میں نے ان کے قربت کی بات ان کی دوری سے شروع کی ہے۔

سیاسی تذبذب اور کشمکش کے ایام میں کیفی صاحب ریڈ فلیگ ہاؤس سے نکل کر جوہو کے کنارے آباد ہو گئے اور انہوں نے سیاسی میدان سے ہٹ کر اپنا رخ مکمل طور پر فلم کی طرف موڑ لیا ہے اور یہاں بھی انہوں نے ادب اور سیاست کی طرح جمے ہوئے نغمہ نگاروں کی بے پناہ مقبولیت کے باوجود اپنے قدم جمالئے۔

دہر میں مجروح کوئی جاوداں عنواں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

بعض ترقی پسند فلم رائٹروں کی بد دماغی اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی۔ کار اور بنگلوں میں گم شدگی کے قصے بھی نئے نہیں ہیں۔ ان پر اپنے مسلک سے انحراف کا الزام بھی بے حد پرانا ہے۔ لیکن کیفی صاحب پر یہ تہمت ہرگز نہیں لگائی جا سکتی وہ بنگلے میں رہنے اور کار میں گھومنے کے باوجود (فالج کے حملے سے قبل) ناگپاڑہ اور مدنپورہ کی فٹ پاتھ پر اپنے پرانے دوستوں کے ساتھ چائے پیتے ہوئے

نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے پرانے رفقاء سے آج بھی اسی محبت اور پیار سے گھنٹوں گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ فلموں سے کمایا ہوا روپیہ ادبی سرگرمیوں اور اپنے دوستوں پر بے دریغ خرچ کرتے ہیں۔ میں نے کیفی صاحب جیسا شاہ خرچ شاعر کوئی نہیں پایا۔ دوسرے فلمی شعراء کی طرح ان کی فکر و تخلیق کے سوتے خشک نہیں ہوئے ہیں وہ اب بھی شعر کہتے ہیں اور ان کی شاعری میں پہلے سے زیادہ کرب محسوس ہوتا ہے البتہ اظہار کا لہجہ بدل چکا ہے اور یہ تبدیلی انھیں عصری ادب سے قریب کر دیتی ہے۔ کیفی صاحب کا تازہ مجموعہ کلام "آوارہ سجدے" اس بات کا ثبوت ہے۔ اس مجموعہ کی تقسیم پر پابندی عاید ہو چکی ہے۔ پھر بھی اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ ان کے سیاسی، ادبی اور سماجی میدانِ عمل کی تنگ و تاریک راہیں ان کے قدموں کے لمس کو ترسی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ مزدوروں اور محنت کش عوام کا وہ بانکپن جاتا رہا ہے جو ان کی آواز اور اشاروں پر قائم تھا۔ نوجوان ادیبوں اور شاعروں کا وہ غرور بھی ٹوٹ چکا ہے جو اس سچے انقلابی شاعر کا پروردہ تھا۔ مدنپورہ، ناگپاڑہ، ڈونگری اور مجگاؤں کی ادبی اور سیاسی سرگرمیاں چند بے تعبیر خوابوں کے دھندلکے میں گم ہو چکی ہیں۔ معاشی جہاد کا کارواں بکھر چکا ہے اور تنہا روی ہر مجاہد کا مقدر بن چکی ہے۔

یہ تو سچ ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کی تقسیم کے بعد کیفی صاحب نے اپنی عملی زندگی کا رُخ فلمی دنیا کی طرف موڑ لیا۔ اس لئے کہ شاید انہوں نے محسوس کیا ہو کہ معاشی انقلاب کی جنگ پورے ملک میں جاری رکھنا اب تنہا مارکسسٹوں کے بس کی بات نہیں رہی۔ ان حالات میں کیفی صاحب پر اپنے مسلک اور عقیدہ سے انحراف کا الزام سراسر زیادتی ہے۔ عوامی زندگی سے دوری کی وجوہات چاہے جو بھی رہی ہوں لیکن ان کی جسمانی کمزوری اور معذوری ایک بنیادی وجہ معلوم ہوتی ہے پھر بھی وہ اپنے مفلوج جسم کے ساتھ ادبی اسٹیج پر تقریر کرتے اور نظمیں سناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ان کی اس دوری نے انھیں عوام کے اور نزدیک

کر دیا ہے۔ پہلے وہ عوام کے قریب تھے اور اب عوام ان کے نزدیک ہیں۔ آج انھیں پہلے سے کہیں زیادہ محبت و احترام کے دلوں سے یاد کیا جاتا ہے۔ نوجوان مصنفین کا فعال گروہ آج بھی انھیں اپنا نظریاتی اور ادبی رہنما مانتا ہے اور بڑے فخر سے کہتا ہے کہ ہم نے کیفی صاحب سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ وہ ہمیں آج بھی اتنے عزیز ہیں جتنے کہ نوجوان مصنفین کے متحرک دور میں تھے۔

کیفی صاحب نے نوجوان مصنفین کو نہ صرف ادبی، سیاسی اور سماجی شعور عطا کیا بلکہ وہ پیار بھی دیا جو اس عہد کے سگے بھائی سے بھی حاصل نہیں ہوتا۔ وہ کسی بات پر زیادہ دیر ناراض نہیں رہ سکتے۔ کیفی صاحب کو سب سے بڑا رنج اس بات کا ہے کہ نوجوان مصنفین میں سے دو چار کے سوا کوئی اپنا ادبی امیج قائم نہ رکھ سکا۔ ساگر سرحدی، ابراھیم رنگلا، مرزا عزیز جاوید، عنایت اختر اور افتخار اعظمی کے سوا باقی لوگوں نے لکھنا پڑھنا تک چھوڑ دیا ہے۔ لیکن یہ تو ہونا ہی تھا۔ امیدوں کے باغ میں کچھ پھول فردوسِ نظر رہے تو کچھ مشامِ روح۔ کچھ سیج کی زینت بنے تو کچھ قبر پر چڑھے، کچھ گلے کا ہار بنے تو کچھ قدموں تلے روندے گئے ___ سبھی درخت سایہ دار نہیں ہوتے۔ پیپل اور برگد کے علاوہ کچھ درخت ساگر کے بھی ہوتے ہیں تو کچھ ببول کے، ساگر کے درختوں کے تنے عمارت سازی اور فرنیچر بنانے کے کام آتے ہیں تو ببول کے درخت بھی چولھے کی آگ بن کر پیٹ کی دوزخ کو سرد رکھتے ہیں بہر حال سبھی درخت کام کے ہوتے ہیں۔ جو لوگ ادیب و شاعر نہ رہ سکے وہ کم از کم مارکسی شعور کے ساتھ اپنی زندگی گذار تو رہے ہوں گے اور اسی ادراک سے اپنے اپنے حلقہ میں کام بھی کر رہے ہوں گے۔ کیفی صاحب کا یہ دکھ ایسا ہی ہے جیسے کسی باپ کے کچھ بیٹے سعادت مند تو کچھ نافرمان نکل جائیں لہذا ان کا یہ رنج شعوری کم اور جذباتی زیادہ ہے۔

کیفی صاحب خود کہا کرتے تھے کہ تعلیمی اور تربیتی مراکز سے میل محبت، بھائی چارگی، تبادلۂ خیالات و تخلیقات سے INSPISATION حاصل

کرنا اور مطالعہ میں جوش و خروش پیدا کرنا۔ ہمارا بنیادی مقصد ہے اور کیفی صاحب نے اسی ایک عظیم مقصد کے تحت، عوام کے تعاون سے کئی سماجی، ادبی، تعلیمی اور تربیتی ادارے قائم کئے۔

(۱) عوامی ادارہ ــــ مومن پورہ
(۲) نوجوان پارٹی ــــ گھیلا بائی اسٹریٹ
(۳) شاہد لائبریری ــــ مدن پورہ
(۴) مجلسِ تعلیمی کمیٹی ــــ مدن پورہ
(۵) عوام سنٹر ــــ یعقوب اسٹریٹ
(۶) عوامی مجلس ــــ ڈونگری چھاچھ محلہ

ان اداروں کے قیام کی جگہیں، فری ریڈنگ روم کیلئے کتابیں اور فرنیچر کی فراہمی کوئی آسان اور معمولی کام نہ تھا۔ مدن پورہ، ناگپاڑہ، یعقوب اسٹریٹ، ڈونگری اور مجگاؤں کے با اثر لوگوں نے بھی یقیناً اس کارِ عظیم کیلئے سرمایہ اکٹھا کیا ہوگا لیکن اس سرمایہ کا بیشتر حصّہ کیفی صاحب نے اپنے حلقۂ اثر سے فراہم کیا تھا۔ بعض اوقات انھیں اس کارِ خیر کی ادائیگی میں روحانی اذیت ناکی سے بھی گذرنا پڑا ہے۔ بہر حال یہ عظیم کام اس مردِ کار کے ہی زورِ بازو سے ممکن تھا۔ کسی اور ترقی پسند ادیب یا شاعر کے بس کا روگ نہ تھا ــ ادارے قائم کرنا سہل نہیں اور انھیں کامیابی کے ساتھ متحرک رکھنا بھی آسان نہیں۔ جب تک کیفی صاحب ان علاقوں میں متحرک تھے تو یہ ادارے بھی فعال تھے لیکن اب سوائے عوامی ادارہ کے اور کوئی مرکز متحرک نہیں ہے۔

ان مراکز کے علاوہ انجمن نوجوان مصنفین کا قیام بھی کیفی صاحب ہی کی افتادِ طبع کا نتیجہ ہے۔ یہ انجمن انھیں اپنی اولاد سے بھی زیادہ عزیز تھی اس کیلئے روپیہ فراہم کرنا صرف کیفی صاحب کی ذمہ داری تھی اس باب میں کبھی کسی ممبر کو زیرِ بار نہیں کیا گیا۔ انجمن کی سرگرمیوں میں چند قابلِ ذکر سرگرمیاں اس طرح ہیں۔

(۱) انجمن کی ہفتہ وار میٹنگیں

(۲) ترقی پسند اور نوجوان مصنفین کے مشترکہ اجلاس
(۳) نوجوان مصنفین کی دو روزہ کانفرنس
(۴) حالی پر تقریروں کا چھ روزہ سلسلہ
(۵) نظموں، غزلوں اور افسانوں کا انعامی مقابلہ
(۶) مڈ آئی لینڈ، یوائی لیک اور لوناولہ مصنفین کی پکنکیں
(۷) بے شمار مشاعرے اور جلسے

ایسی بے پناہ اور عظیم ادبی، سیاسی اور سماجی خدمات ایک سچا انقلابی شاعر ہی پیش کر سکتا تھا جس میں بے پناہ تنظیمی صلاحیتیں موجود ہوں۔ ورنہ بمبئی میں بہت سے "انقلابی شاعر" موجود تھے اور ہیں بھی —— ہم کیفی صاحب کی ان عظیم خدمات کا اعتراف کرتے ہیں اور انھیں اپنا خراج عقیدت پیش کرتے ہیں ۔

آخر میں ایک بات جو مجھے ہمیشہ چبھتی رہی ہے بطور جملۂ معترضہ سہی کہے بغیر نہ رہ سکوں گا۔ وہ یہ کہ کیفی صاحب ترقی پسند تحریک کے ایک سچے انقلابی شاعر ہونے کے باوجود اس تحریک کے نقادوں نے ان کی شاعری کو اتنا نہیں سراہا جتنا کہ ان کا حق تھا۔ ایکبار یہی بات ڈرتے ڈرتے کیفی صاحب سے میں نے بھی پوچھی تھی تو جواب ملا تھا۔

"اختر! اگر کسی فنکار کی صرف ایک تخلیق سے قوم و ملک کی قسمت بدل سکتی ہے تو وہ فنکار عظیم ہے اُسے زندہ رکھنے کو اس کی یہی ایک تخلیق کافی ہے اب نقاد ایسے فنکار کے بارے میں چاہے کچھ کہیں ۔"

اس لحاظ سے کیفی صاحب بھی ایک عظیم فنکار ہیں کہ ان کی شاعری نے آزادی کے بعد ابھرنے والی ایک نسل کو متاثر کیا ہے۔ اب وہ اس عہد کے نقادوں کیلئے عظیم ہوں یا نہ ہوں۔ آنے والا دور جب اردو ادب کی تاریخ مرتب کرے گا تو وہ تاریخ کیفی صاحب کے ذکر بنا مکمل نہ ہو سکے گی ۔

عبدالقوی دسنوی

کیفی اعظمی — ایک شاعر، ایک مشفق، ایک بھائی

کیفی اعظمی صاحب سے میری ملاقات برادر محترم ڈاکٹر عبدالحمید صاحب (صدر شعبہ اردو مہاراشٹر کالج بمبئی) نے کرائی۔ غالباً یہ ۱۹۴۹ء یا ۱۹۵۰ء کی بات ہے وہ بی اے کے طالب علم تھے اور میں آئی۔ ایس سی میں پڑھتا تھا۔ مجھ میں ادبی ذوق پیدا کرنے میں بھائی صاحب کا بڑا ہاتھ رہا ہے، وہ شروع سے اچھی کتابوں اور رسائل کے مطالعہ کا شوق رکھتے ہیں، چنانچہ نقوش، نگار، فاران، شاعر اور نہ جانے کتنے مختلف رسائل مختلف وقتوں میں خرید کر یا کبھی کتب خانوں یا دوستوں سے حاصل کر کے لایا کرتے تھے۔ میں بھی ان کے بہانے کچھ پڑھ لیا کرتا تھا۔ ایک دن کہنے لگے دیکھو علامہ شبلی نعمانی کا کیفی اعظمی نے کتنا اچھا جواب دیا ہے۔ شبلی نے ایک نظم "امتحان کب تک؟" لکھی تھی جس میں انگریزوں کے ظلم و ستم کی شکایت انھیں سے مخاطب ہو کر کی تھی، اگرچہ یہ نظم نہایت نرم اور غمناک لہجے میں ہے لیکن پڑھنے یا سننے والوں کے دلوں میں ایک عجیب کیفیت چھوڑتی ہے، میں جب بھی اس کو پڑھتا، میرے دل میں ایک عجیب جوش پیدا ہوتا اور انگریزوں کے خلاف نفرت کا جذبہ بیدار ہوتا۔ خاص طور سے اس نظم کے یہ اشعار میرے لئے جادو کا اثر رکھتے تھے اور مجھ میں انگریزوں کے

خلاف اُٹھ کھڑے ہونے کا جذبہ اور ولولہ بیدار کرتے تھے:

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تا کے، یہ حشر انگیزیاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک

یہ مانا گرمیٔ محفل کے ساماں چاہئیں تم کو
دکھائیں ہم تمہیں ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک
یہ مانا قصۂ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے
سنائیں تم کو اپنے درد دل کی داستاں کب تک

سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشانِ رفتگاں ہم ہیں
مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک

اس زمانے میں شبلی کی اس نظم کے علاوہ بعض دوسری نظمیں بھی مجھے پسند تھیں۔ اس لئے اکثر انھیں پڑھا کرتا تھا۔ غلام ہندوستان میں وطن سے محبت انگریزوں سے نفرت اور ان کے خلاف ایک عجیب جوش و ولولہ کی کیفیت سے میں ہمیشہ سرشار رہتا تھا، جب بھائی صاحب نے کیفی اعظمی کی نظم "مژدہ" کے یہ اشعار سنائے:

"حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کبتک
چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کبتک"

زوالِ ملّت اسلامیہ کے نوحہ خوان شبلی
مبارک ہو کہ کروٹ لے رہا ہے آسمان شبلی

مٹائے گا ہمارا کون اب نام و نشاں شبلی
دھواں گر مٹ چکا اڑنے کو ہیں چنگاریاں شبلی

"کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
یہ حشر انگیزیاں تاکے یہ ظلم آرائیاں کبتک"

ہمارے خوں سے دامانِ گلستاں ہو چلا رنگیں
خزاں کے دام میں جکڑے پڑے ہیں سنگدل گلچیں
خوشا تہذیب انسانی کے استادوں کو لے ڈوبیں
وہ حشر انگیزیاں شبلی وہ ظلم آرائیاں شبلی

تو دل مضطرب اور بے چین ہو گیا۔ لیکن اس نظم کے اس بند نے خاص طور سے جوش و ولولہ کی مجھ میں ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی:

"یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہو گا اس کا امتحاں کبتک"

لیا ہے یہ سبق ہم نے خود اپنے خوں شدہ دل سے
ستم کی خو بدل سکتی نہیں فریادِ بسمل سے
تڑپ کر چھین لیں گے تیغ ہم اب دستِ قاتل سے
ہماری گردنوں پر اب نہ ہو گا امتحاں شبلی

اور جب وہ آخری بند پر پہنچے:

"یہ مانا قصۂ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے
سنائیں اپنے دردِ دل کی تم کو داستاں کبتک"

وہ گل شعلے بنے جن پر ستم کردش بدلتا تھا،
وہ رات آخر ہوئی جس میں چراغ ظلم جلتا تھا

ہمارا قصۂ غم سن کے جن کا جی بہلتا تھا
قریب ختم آ پہونچی انھیں کی داستاں شبلی

توآزاد ہندوستان میں سانس لینے والے عبدالقوی دسنوی کے دل میں کیفی اعظمی صاحب کی سبھی باتیں عجیب انداز سے اتر گئیں اور ان کیلئے ایک عقیدت، محبت، خلوص اور احترام کا جذبہ جاگ اٹھا تھا اور وہ سوچنے لگا تھا کہ کیفی اعظمی کا کہنا کس قدر سچ تھا انگریزوں کے ظلم وستم، قہر و بربریت کی کہانی جس کے متعلق سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ اس قدر جلد ختم ہو جائے گی، آخر اختتام کو پہونچ گئی، بھائی صاحب (عبدالمحی رضا صاحب) نے اُدھر نظم ختم کی اور میں اِدھر عجیب سرور و سرمستی، کیف و وارفتگی کے احساس میں ڈوب گیا، دل نے چپکے سے کہا کیفی اعظمی سے کس طرح ملنا چاہیئے، معلوم نہیں کیفی اعظمی کا مزاج کیسا ہے۔ شبلی انگریزوں کی غلامی کے ظلم وستم کا احساس۔ شبلی کا دبی زبان میں جذبۂ بغاوت کا اظہار۔ کیفی اعظمی کا اضطراب اور غلامی سے نجات کا پیام اور آزادی کی بشارت۔ دونوں ہم وطن، اعظم گڑھ کے رہنے والے، وہی اعظم گڑھ جو آج علوم اسلامیہ کے لئے قبلہ و کعبہ کا درجہ رکھتا ہے۔ ایک عاشق رسول شیدائی اسلام، محب وطن، انگریزوں کے ظلم وستم سے پریشان، بیزار، قومی تحریکوں کا ہم نوا۔ آزادیٔ ہند کا مجاہد، دوسرا اس مجاہد کا چاہنے والا، اس کے جذبات کا قدرداں، اس کے خیالات سے متاثر، وطن کا فدائی، شمع آزادی پر پروانہ وار قربان ہونے والا، انھیں خیالات میں ڈوبا رہا اور ملاقات کی تمنا دل میں لئے اپنی دنیا میں کھو گیا، کہ انھیں دنوں غالباً شاہراہ یا سویرا کا کوئی شمارہ شائع ہوا جسے بھائی صاحب بازار سے لے کر آئے تھے اس میں کیفی اعظمی کا کلام چھپا تھا اور ان کا مختصر تعارف بھی، جس میں کیفی اعظمی کو کچھ اس طرح متعارف کرانے کی کوشش کی گئی تھی:

"کیفی اعظمی گھونگریالے بال والے نوجوان شاعر ہیں
جن کی تعلیم مشرقی انداز سے ہوئی ہے اور جو نہایت اچھی جوشیلی

ترقی پسند بمصے بھرپور شاعری کا تحفہ لئے وادی ادب
میں داخل ہوئے ہیں، شوکت کیفی ان کی شریک حیات
ہیں جو حیدرآباد کی کسی معزز خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔"
کیفی اعظمی سے متعلق گو یہ الفاظ نہ ہوں لیکن خیالات کچھ اسی طرح کے تھے
جن کی کچھ دھندلی یادیں اب بھی میرے ذہن کے ایک گوشے میں محفوظ ہیں۔ اس
تحریر نے ایک بار پھر کیفی اعظمی سے ملاقات کی خواہش کو تیز کر دیا لیکن اس
وقت تک ہم دونوں بھائیوں کی دنیا سینٹ زیویرس کالج، گھر اور بمبئی میں ایک دو
عزیزوں تک محدود تھی بہت زیادہ ادھر اُدھر جانا نہیں ہوتا تھا، ملاقات کی
خواہش کی تکمیل کس طرح ہوتی؟ بس دل کی بات دماغ تک یا دماغ سے اٹھ کر
دل میں گم ہو گئی ـــــ لیکن اتفاق کہئے کہ ایک دن کالج پہونچا تو معلوم ہوا
کہ دو نوجوان شاعر "بزم ادب" کی دعوت پر کالج تشریف لا رہے ہیں، ایک
کیفی اعظمی دوسرے مجروح سلطان پوری۔ اس خبر سے بے حد مسرت ہوئی۔
دیرینہ خواہش اور تمنا کے بر آنے کا وقت آگیا تھا،

وقت مقررہ پر اس جگہ پہنچا جہاں جلسہ ہونے والا تھا، تھوڑی دیر بعد
ہمارے مہمان شعراء، کیفی اعظمی اور مجروح سلطان پوری تشریف لائے۔
دونوں کم عمر، دبلے پتلے کرتا پائجامہ میں ملبوس نظر آئے میں دونوں کی شخصیت
سے بالکل مرعوب نہیں ہوا، اس لئے کہ وہ اُس وقت عام نوجوانوں کی طرح نظر
آرہے تھے بلکہ لباس اور مزاج دونوں اعتبار سے سادگی کے مظہر تھے، مسکراتے
ہوئے آئے سادگی سے کرسیوں پر بیٹھ گئے پروفیسر نظام الدین گوریکر نے
تعارف کرایا، غالباً مجروح سلطان پوری صاحب سے کلام سنانے کی درخواست
کی گئی اور وہ دوسرے لمحے سامنے اسٹیج پر کھڑے نظر آئے اور اپنی مشہور غزل
مخصوص لے میں سنانی شروع کی :

آہ جاں سوز کی محرومیٔ تاثیر نہ دیکھ
ہو ہی جائے گی کوئی جینے کی تدبیر نہ دیکھ

واہ واہ کی آوازیں بار بار بلند ہو رہی تھیں، مکرّر کی درخواستیں کی جا رہی تھیں مجروح صاحب اپنا کلام سناتے چلے جا رہے تھے۔ ابھی ہم ان کے اشعار کی سحر آگیں فضا میں مسحور ہی تھے کہ گور بکر صاحب کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ کیفی اعظمی صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کر رہے تھے۔ الجھے ہوئے بالوں میں سلجھے ہوئے نوجوان کو ہم سب نے دو سکنڈ کے لئے اپنے سامنے اسٹیج پر کلام سنانے کیلئے کھڑا دیکھا۔ چمکتی ہوئی آنکھیں جن میں انسانوں سے بے پناہ محبت چھپی ہوئی محسوس کی، کشادہ پیشانی ان کی وسیع القلبی کی طرف اشارہ کرتی ہوئی نظر آ رہی تھی، لب پر مسکراہٹ ان کی شگفتہ طبیعت ثابت کر رہی تھی، چہرہ چمکتا اور دمکتا ہوا، اس کے نقوش اس بات کے شاہد تھے کہ حالات سے کبھی مرعوب نہیں ہونے والا یہ نوجوان شاعر ہمارے سامنے کلام سناتے اس لئے آیا ہے کہ وہ کالج کے نوجوانوں کے دلوں میں بھی اپنا جوش، جذبہ اور عزم و حوصلہ بھر دینے کا خواہش مند ہے۔ کیفی کے ہاتھ بلند ہوئے، آنکھیں سامعین سے ٹکرائیں اور لب وا ہوئے پھر ان کی بلند، پر وقار اور بارعب آواز فضا میں پھیل گئی، لوگ سنبھل بیٹھے اور نہایت خاموشی کے ساتھ اس آواز میں گم ہو گئے:

میں کلکتے میں کیفی آج پہلی بار آیا ہوں
مچلتی آرزو، بے تاب دل، سینے میں لایا ہوں
سلام اس شہر پر جس کی فضا میں گیت بستے ہیں
جہاں نذرلؔ اور ٹیگورؔ کے نغمے برستے ہیں
سلام اس خاک پر گودی سے جس کی آفتاب اٹھا
بغاوت نے کماں کڑکائی شور انقلاب اٹھا

سلام اس دیس کے ان انقلابی نوجوانوں کو
بسا رکھا ہے مدّت سے جنہوں نے جیل خانوں کو
سلام ان شہریوں، ان کامگاروں، ان کسانوں پر
وبا و قحط نے حملہ کیا تھا جن کی جانوں پر

اِدھر کیفی اعظمی پُرجوش آواز اور پُروقار لہجے کے ساتھ، جس پر ترنم بار بار قربان ہو جائے اپنی نظم کو اختتام کی طرف لے جا رہے تھے اُدھر نوجوان جوش اور ولولہ اور حُبِ وطن کے نشہ میں بدمست و سرشار ہوتے دکھائی دے رہے تھے نظم ختم ہوئی تو دوسری پھر تیسری کی فرمائش ہوئی اور کیفی اعظمی مسلسل سناتے گئے پھر نوجوانوں نے اپنے مطلب کی نظمیں بھی سنیں، غالباً آخری نظم پشیمانی تھی۔ کیفی بھائی کی آواز اب بھی کانوں میں گونج رہی ہے:

میں یہ سوچ کر اس کے در سے اٹھا تھا ۔ کہ وہ روک لیگی منالے گی مجھکو
ہواؤں میں لہراتا آتا تھا دامن ۔ کہ دامن پکڑ کر بٹھالے گی مجھکو
قدم ایسے انداز سے اٹھ رہے تھے ۔ کہ آواز دے کر بلالے گی مجھکو
مگر اس نے روکا نہ مجھکو منایا
نہ دامن ہی پکڑا نہ مجھکو بٹھایا
نہ آواز ہی دی نہ مجھکو بلایا
میں آہستہ آہستہ بڑھتا ہی آیا
یہاں تک کہ اس سے جدا ہو گیا میں

نظم ختم کر کے کیفی اعظمی اپنی جگہ پر آبیٹھے اور نوجوانوں پر اک عجیب کیفیت چھوڑ گئے دیر تک خیالات کے تانے بانے میں نوجوانوں کے دل دھڑکتے اور مچلتے رہے۔ اس واقعہ کو تقریباً تیس سال ہو چکے ہیں لیکن اس وقت کی کیفی اعظمی کی تصویر جو دل پر نقش ہوئی تھی نہ مٹی ہے نہ دھندلی پڑی ہے نہ وہ سماں نگاہوں سے اوجھل ہوا ہے جس میں پہلی بار کیفی اعظمی کو اور ان کے کلام کو سنا تھا۔

آپ حیرت کریں گے کیفی اعظمی سے کسی نے مجھے ملایا نہیں، گفتگو کا کہاں سوال پیدا ہوتا لیکن اس کے باوجود ہمارے درمیان اپنائیت کی فضا پیدا ہو گئی تھی، اس یک طرفہ ملاقات نے رشتہ کو اور بھی زیادہ مضبوط کر دیا اور اب محسوس ہونے لگا تھا کہ کیفی اعظمی ہمارے اپنے شاعر ہیں، پھر وقت گزرتا گیا، مشاعروں میں شریک ہوتا رہا، ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں جاتا رہا، کیفی اعظمی سے دور دور کی ملاقاتیں ہوتی رہیں، کلام سن کر خوش ہوتا، تعریف کرتا، دوستوں کی گفتگو کے درمیان ذکر ہوتا سب نوجوان کیفی اعظمی کے کلام کو بہت پسند کرتے، اُن کے پڑھنے کے انداز کی تعریف کرتے بلکہ بعض دوست ان کے انداز کو اختیار کرنے کی کوشش کرتے اور ان کی شخصیت کی جاذبیت، غریبوں، مزدوروں اور عوام سے ان کے گہرے لگاؤ اور ان کے ساتھ ہمدردیوں کے تذکرے اکثر ایک دوسرے کرتے نظر آتے۔ برسوں بعد ۱۹۵۵ء کے اخیر میں میں نے ایک مقالہ "حسرت کی سیاسی زندگی" ۔"چند جھلکیاں" لکھا اور سردار جعفری صاحب کی خدمت میں ان کی رائے حاصل کرنے کیلئے اسے پیش کر دیا، مقالہ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ ایک ہفتہ بعد مجھے بلایا۔ چنانچہ ٹھیک ایک ہفتہ بعد میں ان کے پاس پہنچ گیا۔ سردار جعفری اور کیفی اعظمی دونوں صاحبان پاس پاس رہتے تھے۔ میں نے اپنے مقالہ میں ایک جگہ لکھا تھا:

"۱۹۲۵ء میں جب پہلی کمیونسٹ پارٹی کانفرنس منعقد ہوئی تو حسرت اس کی مجلس استقبالیہ کے صدر منتخب ہوئے"

سردار جعفری صاحب کا کہنا تھا یہ واقعہ ۱۹۲۵ء کا نہیں ہے بلکہ ۱۹۲۰ء کا ہے۔ وہ مجھے لے کر کیفی اعظمی کے کمرے کی طرف گئے اور اسی سلسلے میں ان سے صحیح سنہ کے بارے میں دریافت کیا۔ کیفی اعظمی صاحب بھی ۱۹۲۰ء سے اتفاق رکھتے تھے۔ چنانچہ میں نے اپنے مقالہ میں ان دونوں حضرات کے خیالات حاشیہ پر درج کر دیئے۔

یہ ہماری کیفی اعظمی سے پہلی باضابطہ ملاقات تھی جس میں ایک دوسرے سے گفتگو بھی ہوئی تھی لیکن گفتگو کے دوران یہ ہرگز محسوس نہیں ہوا کہ یہ ہماری پہلی بات چیت ہے بلکہ ایسا لگا کہ ہم مدتوں سے ایک دوسرے سے ملتے جلتے رہے ہیں۔

پھر ۱۹۵۷ء میری زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے۔ مارچ کی کسی تاریخ کو کیفی اعظمی صاحب کا ۱۵ مارچ کا مختصر مکتوب مجھے ملتا ہے۔ جس میں تحریر تھا:

برادرم قومی صاحب! اگر فرصت ہو تو ۱۷ مارچ کو ۳ بجے دن میں غریب خانہ پر آئیے۔ چند اور نوجوان احباب ہوں گے۔ بمبئی سے ایک ادبی ماہنامہ جاری کرنے کا خیال ہے جو نوجوان مصنفین کا ترجمان ہو۔

۱۷ مارچ کو ہم اس کے ابتدائی مسائل پر غور کریں گے، آپ سے اس کام میں مدد لینا چاہتا ہوں۔ امید ہے مجھے مایوسی نہیں ہوگی۔

آپ اپنے ساتھ احباب کو لانا چاہیں لا سکتے ہیں۔ آپ کا

کیفی

کیفی اعظمی صاحب کے اس خط نے دو خوشیاں عطا کیں، ایک تو یہ کہ ہمارے تعلقات واقعی بہت مضبوط تھے اگرچہ بظاہر اس تعلق کو دیکھا نہیں جا سکتا تھا، دوسرے وہ مجھے اس لائق سمجھنے لگے تھے کہ میں ان کے کام میں کسی طرح مدد کر سکتا ہوں۔ کوئی اندازہ نہیں کر سکتا ہے کہ اس خط نے مجھ پر کیا کیفیت طاری کی۔ ترقی پسند شعرا میں مقبول شاعر اور پسندیدہ شخصیت کا خط اور اس انداز سے۔ میں تاریخ اور وقت کا نہایت بے چینی سے انتظار کرتا رہا۔ خدا خدا کر کے وہ تاریخ آئی، وہ وقت آیا میں تیار ہو کر کیفی اعظمی کے دولت کدے پر پہنچا۔ وہ منتظر تھے کچھ اور نوجوان لکھنے والے بھی، فاروق شجاع، حمید سورتی، ساگر سرحدی۔ اختر راہی اور بھیم سین وغیرہ، شاید نوجوان مصنفین کی اس میٹنگ میں سب سے نیا میں تھا، باقی حضرات کیفی اعظمی صاحب سے ملتے رہے تھے۔ دوسرے نوجوان لکھنے والوں سے بھی میں کوئی خاص متعارف نہیں تھا۔ لیکن ہم اجنبی بالکل نہیں

محسوس ہو رہے تھے، گفتگو اسی طرح ہو رہی تھی جیسے کوئی بھی نہیں ہے۔
اس کے بعد ہماری اور کیفی بھائی کی ملاقاتیں برابر ہوتی رہیں لیکن اس قدر ملاقاتوں کے باوجود کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے اپنا کلام ہم لوگوں کو سنایا ہو یا اپنے کلام کا کبھی ذکر کیا ہو۔ وہ سب کی باتیں کرتے لیکن کبھی اپنی بات نہیں چھیڑتے، دوسروں کا کلام سناتے لیکن اپنے کلام کی ہوا نہیں لگنے دیتے۔
ایک دن غریب خانہ پر آئے ہوئے تھے تو ان کے مجموعہ کلام "آخرِ شب" کا ذکر آیا اتفاق سے وہ کتاب میرے پاس تھی۔ میں نے اس پر کیفی بھائی سے کچھ لکھنے کی بہت خواہش ظاہر کی تو اس کے پہلے صفحہ پر انہوں نے یہ لکھ دیا:

تمام گیت فسوں لیکن انقلاب کا گیت
لبِ شگفتہ پہ جیسے کرن اتر آئی

برادرم عبدالقوی دسنوی کیلئے
پیار، خلوص اور بسیار توقعات کے ساتھ
کیفی اعظمی
۲۳ر اگست ۱۹۵۷ء

پھر ایک بار ذکر آیا کیفی بھائی کے پہلے مجموعہ کلام "جھنکار" کا تو انھوں نے بتایا کہ ان کے پاس اس کی ایک بھی کاپی محفوظ نہیں ہے۔ اتفاق سے حمید سوزی اس وقت موجود تھے انہوں نے اپنی جلد مجھے دینے کا وعدہ کیا اور ایک وہ لے آئے کیفی بھائی اس وقت ہمارے ساتھ تھے میں نے کتاب ان کے سامنے رکھدی اس خواہش کے ساتھ کہ وہ کچھ لکھدیں ــــ اور انھوں نے لکھدیا:

عبدالقوی دسنوی کے لیئے
انفعال کے ساتھ
کیفی اعظمی

میں نے کہا یہ کیا لکھدیا، کہنے لگے ٹھیک ہی لکھا ہے، یہ مجموعہ بس ٹھیک ہی ہے،

اس طرح کیفی بھائی سے بار بار ملاقاتیں ہوتی رہیں اور نوجوان مصنفین کی نشستیں ہوتی رہیں۔ گاہے گاہے دو چار کیفی بھائی کے گھر پر بھی جمع ہو جاتے۔ ایک بار میں، فاروق شجاع، سلیمان ظفر کیفی بھائی کے یہاں جمع تھے کہ عصمت چغتائی صاحبہ کے یہاں جانے کا خیال آیا اتفاق سے سردار جعفری صاحب بھی گھر پر تھے وہ بھی ہمارے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ ہم سب ٹیکسی سے عصمت آپا کے یہاں پہونچے۔ ڈر تھا کہ اگر عصمت گھر پر نہ ملیں تو پریشانی ہو جائے گی لیکن وہ گھر پر ہی ملیں۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں پھر کیا تھا محفل جم گئی۔ خوب خوب باتیں ہوئیں ادب سے متعلق، نیم ادب سے متعلق، ماضی سے متعلق، حال سے متعلق۔ عصمت آپا نوجوان مصنفین کی دلچسپیوں سے باخبر تھیں اور خوش تھیں کہ ترقی پسند مصنفین کا سلسلہ آگے بڑھ رہا ہے اس زمانے میں میرا ایک مضمون "ابوالکلام آزاد کے اردو پر احسانات" "ہماری زبان" (۸ جون ۱۹۵۹ء) میں شائع ہوا تھا جسے سردار جعفری صاحب نے بہت پسند کیا تھا۔ وہ مجھے بار بار کہہ رہے تھے کہ بزرگوں کے کام کا جائزہ لیجئے اور ان پر بے لاگ تبصرہ کیجئے، عصمت آپا کے یہاں بھی یہ گفتگو چھڑ گئی۔ سردار جعفری نے کہا عصمت میں ان نوجوانوں سے کہہ رہا ہوں کہ تم ہم لوگوں پر بھی لکھو اور ہماری خامیوں کی بھی نشان دہی کرو، کیفی بھائی نے بھی ہاں میں ملائی، عصمت آپا نے کہا لوگ ناراض ہو جائیں گے پھر کہنے لگیں اگر تم لوگوں نے ساحر پر کچھ لکھا تو وہ مظلوم صورت بنائے سب سے کہتے پھریں گے کہ تم نے ان کے خلاف کیا لکھا اور کیوں لکھا، بات کاٹ کر سردار جعفری کہنے لگے کہ ہاں اگر مجروح سلطان پوری کے خلاف تم لوگوں نے کچھ لکھنے کی کوشش کی تو وہ اپنی گاڑی تمہارے پیچھے لئے پھریں گے اور کوشش کریں گے کہ خلاف لکھنے والے کو گاڑی سے کچل دیں۔ تو ایک قہقہہ بلند ہوا۔ پھر کیا تھا بہت سے ترقی پسند ادبا اور شعراء کا ذکر آیا۔ دلچسپ انداز سے ان کے متعلق گفتگوئیں ہوئیں لطیفے سنائے گئے، بعض اہم واقعات بتائے گئے اور نہ جانے کیا کیا باتیں ہوئیں، کتنے جاندار قہقہے بلند ہوئے، ہم لوگ بہت خوش تھے۔ بھجیے گرم گرم تل کر آرہے

تھے، کھلائے جا رہے تھے، باتیں کی جا رہی تھیں پھر چائے کا دور چلا اور قہقہوں کے درمیان محفل برخاست ہوئی اور ہم لوگ روانہ ہوئے ۔

اس طرح کی نشستیں اکثر ہوا کرتی تھیں، لیکن زیادہ تر مدن پورہ میں، کسی ہوٹل میں کسی مزدور یونین کے دفتر میں، مزدوروں کے درمیان، کامریڈ عبدالجبار اکثر ساتھ رہتے، حمید سورتی، علاء الدین صابر، اور بہت سے نوجوان ہوتے، کبھی علاء الدین صابر کی آواز گونجتی ہے :

ہر شاخ پہ اُلو بیٹھا ہے انجام گلستاں کیا ہوگا ہے

تو ہم لوگ بھی اُٹھتے اور بار بار سنانے کیلئے تقاضے کرتے :

کیفی بھائی گھنٹوں مزدوروں کے درمیان اُٹھتے بیٹھتے ان کے مسائل پر غور کرتے، پروگرام طے کرتے مشکلات حل کرتے ہنستے ہوئے مسکراتے ہوئے۔ ہر فرد ان کی عزت کرتا، ہر شخص ان سے محبت کرتا اور سب لوگ انھیں بھائی سمجھتے، بھائی کہتے اور ہر جگہ ان کے پہنچنے پر مسرت کا اظہار کرتے۔ کیفی بھائی کی وجہ سے ہماری پہنچ بھی ایسی جگہوں میں ہو جاتی جہاں جہاں ہمارے لئے جانا ممکن نہ تھا، ان لوگوں میں میں نے محبت کا جذبہ دیکھا، بے پناہ عقیدت مندی دیکھی، کام کرنے کا حوصلہ دیکھا، معصوم غریبی دیکھی مغموم افلاس دیکھا، کبھی سوچتا کہ یہ کیونکر ہنستے ہیں کبھی مضطرب ہو جاتا کہ کیسے جیتے ہیں ــــــ

ایسا بھی نہیں کہ ہماری دنیا یہی تھی، ہم بمبئی کے عالیشان ہوٹلوں میں بھی جاتے تھے، سر بفلک عمارتوں میں بھی ہماری رسائی ہوتی تھی، لیکن ویسی بلندی کے ساتھ ایسی پستی میں بھی سانس لینے میں لطف آتا تھا اور انھیں دیکھ کر زندگی گزارنے کا حوصلہ بلند ہوتا تھا۔ بار بار سوچتا تھا کہ ہندوستان یہی ہے جہاں کیفی بھائی لے جاتے ہیں، کام کرتے ہیں، دلچسپی لیتے ہیں۔ میرے دل میں کیفی بھائی کا احترام روز بروز بڑھتا رہا اپنے دل میں وہ جوان لوگوں سے محبت رکھتے تھے اور خصوصیت سے جو عام انسانوں سے رغبت

اور بے پناہ تعلق رکھتے تھے ان کی اس خصوصیت نے مجھے اور بھی ان کا اسیر بنالیا تھا۔

اسی دوران میں کیفی بھائی نے طے کیا کہ پروفیسر احتشام حسین صاحب کو بمبئی بلایا جائے اور ان سے مولانا الطاف حسین حالی پر چھ لیکچر کرائے جائیں، ہم لوگ بہت خوش ہوئے، فاروق شجاع اس پروگرام کے کنوینر مقرر ہوئے لیکن بہت ساری ذمہ داریاں کیفی بھائی نے میرے سر رکھ دیں، احتشام صاحب کو بمبئی آنے اور حالی پر چھ لیکچر دینے کی دعوت دی گئی وہ تیار ہو گئے، شاید اس لئے کہ کیفی بھائی نے بھی اپنے طور پر احتشام صاحب کو دعوت نامہ بھیجا تھا۔ جلسہ کے لئے انجمن اسلام ہال انتخاب کیا گیا، غالباً چھبیس دسمبر ۱۹۵۹ء کو وہ بمبئی تشریف لائے۔ کیفی بھائی ساتھ ہم چند نوجوان بوری بندر اسٹیشن پہنچے۔ گاڑی آئی اور احتشام صاحب ایک ڈبے سے اترتے نظر آئے، ہم لوگ ان کے پاس پہنچے، کیفی بھائی نے ہمارا بہت مختصر تعارف کرایا، وہ بہت خوش ہوئے، پھر کیفی بھائی انھیں ایک ہوٹل لے گئے جہاں ان کے لئے قیام کا انتظام تھا، ہم لوگ بھی اُن کے ساتھ تھے، ہوٹل میں کچھ دیر گفتگو ہوئی، لیکن جلسہ کی تیاری کے لئے جلد ہی ہم لوگ انجمن اسلام واپس چلے آئے اور انتظامات کی تکمیل میں لگ گئے، احتشام صاحب کے قیام وطعام کی ذمہ داری کیفی بھائی کے سپرد تھی وہی ان کی دیکھ ریکھ کر رہے تھے اور جلسہ گاہ میں لانے لے جانے کا انتظام کر رہے تھے۔ بمبئی میں چھ دن تک مولانا حالی کی زندگی اور خدمات پر احتشام حسین صاحب نے تقریر کی، سات دن ان کا قیام رہا، پہلی جنوری ۱۹۶۱ء کو رخصت ہوئے، خوب تعریفیں ہوئیں، واہ واہ ہوئی، نوجوانوں کا وقار بنا، اعتماد حاصل ہوا۔ کانفرنس میں بھی اور اس تقریب میں بھی بے تحاشہ خرچ ہوا، روپے کہاں سے آئے کچھ معلوم نہیں کیفی بھائی دو سَو روپے، چار سَو روپے ضرورت کے

مطابق ہم لوگوں کے حوالے کر جاتے ہم اطمینان سے خرچ کرتے، بغیر سوچے ہوئے کہ روپے کہاں سے آرہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کیفی بھائی نے ہمیں یہ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

اہل شہر ہماری تعریفیں کرتے رہے ہم تعریفیں سن کر خوش ہوتے رہے لیکن کبھی یہ بھی نہ کہہ سکے کہ ان سب کامرانیوں اور کامیابیوں کے پیچھے صرف ایک شخص کے ہاتھ ہیں اور وہ کیفی بھائی کے ہیں، وہی تعریف و تحسین کے مستحق ہیں، لیکن وہ تو ستائش کی تمنا اور صلہ کی پروا کئے بغیر ہماری تعمیر میں لگے ہوئے تھے، انھوں نے کبھی مڑ کر نہیں دیکھا کہ اُن کی تعریف کیوں نہیں ہو رہی ہے بلکہ دوسروں کے ساتھ وہ بھی ہماری تعریف میں لگے رہے اور ہماری رہنمائی کرتے رہے۔

فروری ۱۹۶۱ء میں میں بمبئی سے بھوپال آگیا۔ پھر دو تین بار ہی بمبئی جاسکا۔ ایک دو بار ملنے گیا، جانکی کوٹیر میں ملاقات ہوئی، بہت خوش سے مجھے دیر تک بات چیت ہوتی رہی، کبھی بھوپال کی، کبھی بمبئی کی، کبھی دنیائے ادب کی، کبھی میرے بارے میں مختلف سوالات کئے۔ سلیمان ظفر بھی ساتھ تھے وہ بھی بڑی دلچسپی سے گفتگو میں حصہ لیتے رہے۔ پھر بمبئی جانا بہت دنوں تک نہیں ہوا۔

نومبر ۱۹۶۷ء میں خود کیفی بھائی کا بھوپال آنا ہوا، شعبۂ اردو کی درخواست پر سیفیہ کالج بھی تشریف لائے۔ ان کی آمد کی خبر سے کالج کے طلبہ میں ایک عجیب خوشی اور مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ۳۰ر نومبر کو دس بجے پروگرام رکھا گیا۔ پورا ہال وقت مقررہ سے پہلے بھر گیا تھا، کیفی بھائی ہال میں داخل ہوئے تو حاضرین کے چہروں کی چمک دمک سے اندازہ ہوا کہ انھیں کس قدر مسرت ہوئی اور وہ "کیفی اعظمی" سے کس حد تک محبت کرتے ہیں اور ان کی زبان سے ان کا کلام سننے کے لئے کس قدر بے چین ہیں، مجھے خود بھوپال میں کیفی بھائی

کی مقبولیت کا اندازہ اس دن ہوا، سائنس بلاک کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا کیفی بھائی مہمان کی حیثیت سے ایک کرسی پر نہایت سکون سے بیٹھے ہوئے تھے، ہنستا ہوا پر وقار لیکن نرم چہرہ، دمکتا ہوا گندمی رنگ، چمکتی ہوئی وسیع پیشانی، سر پر بڑے بڑے بال، موٹی گردن، کشادہ سینہ، سفید کرتا، پاجامہ، سلیم شاہی میں نہایت بھاری بھرکم معلوم ہو رہے تھے۔ ناظم جلسہ نے پروگرام شروع کیا، میں نے کیفی بھائی کی ادبی کم انسانی شخصیت کا تعارف کرایا، وہ سنتے رہے اور مسکراتے رہے، میں نے بمبئی کا ذکر کیا، نوجوان مصنفین کا ذکر کیا، کیفی بھائی کی نئے لکھنے والوں سے دلچسپی کا ذکر کیا لوگ سنتے رہے اور خوشی میں تالیاں بجاتے رہے میں نے اپنی تعارفی تقریر ختم کی تو کیفی بھائی سے تقریر کی درخواست کی گئی، وہ کھڑے ہوئے اور نہایت دلچسپ تقریر کی، سیفیہ کالج کے تعلق سے میرے بارے میں نہایت خوبصورتی سے تعریف کی کہ میں خود حیران تھا کہ وہ اپنے چھوٹوں کے کام سے کس قدر باخبر رہتے ہیں اور ان کی کامیابیوں پر کس درجہ مسرت کا اظہار کرتے ہیں، ان کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ اس اجنبی شہر میں میری کامیابیوں کو اپنی کامیابی سمجھ کر خوش تھے۔ میں کچھ دیر کے لئے اسی بمبئی کے ماحول میں پہنچ گیا، جہاں کیفی بھائی کی بزرگانہ شفقتیں میسر تھیں۔ تقریر ختم ہوئی تو ہال تالیوں سے گونج رہا تھا، تالیاں تو دوران تقریر میں بار بار بجی تھیں، لیکن تقریر کے اختتام پر جھنکار میں بدل گئیں تھیں، لوگ تالیوں سے، واہ واہ کی آوازسے، چمکتی ہوئی آنکھوں اور دمکتے ہوئے چہروں سے کیفی بھائی کی تقریر کو پسند کرنے کا اظہار کر رہے تھے۔ پھر کیفی بھائی سے کلام سنانے کی فرمائش ہوئی اور وہ اپنے مخصوص انداز سے کھڑے ہوئے۔ غالباً پہلی فرمائش "مکان" کی ہوئی اور انہوں نے لہکتے ہوئے ایک خاص لہجے کے ساتھ کلام سنانا شروع کیا:

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئیگی
سب اٹھو، میں بھی اٹھوں، تم بھی اٹھو تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائیگی

مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہونے لگی، جس کا کوئی نام نہیں بس کیفیت ہی کیفیت تھی اور کیفی بھائی اشعار پڑھتے چلے جا رہے تھے۔

ہاتھ ڈھلتے گئے سانچے میں تو تھکتے کیسے
نقش کے بعد نئے نقش نکھارے ہم نے
کی یہ دیوار بلند، اور بلند، اور بلند
بام و در اور، ذرا اور سنوارے ہم نے

اِدھر کیفی بھائی کے ہاتھ فضا میں بلند ہو رہے تھے اُدھر سامعین کے ہاتھوں میں تناؤ پیدا ہو رہا تھا اور پھر فضا میں کئی ہاتھ لہراتے نظر آرہے تھے اور منہ سے واہ واہ بہت خوب کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ کیفی بھائی نے یہ نظم ختم کی تو سامعین تازہ دم نظر آئے، پھر فرمائش ہوئی "اندیشے" اور "فتح برلن" کی، اور کیفی بھائی اور زیادہ تازگی کے ساتھ اپنا کلام سنانے لگے، وہ اپنے ہی اشعار میں ڈوب گئے ہیں، ساتھ ہی سامعین بھی کھوئے ہوئے ہیں۔ یہ کیفی ہی کا حصّہ ہے کہ "الفاظ اور آواز کے جادو سے پوری فضا اور ماحول کو اپنے بس میں کر لیا ہے"۔ ہم سب سوچتے ہیں کہ ان کی گھن گرج میں ایسا جادو کہاں سے پیدا ہو جاتا ہے جس کے سامنے بہت سی مترنم آوازیں مدھم اور پھیکی پڑ جاتی ہیں، کیفی کی آواز فضا کو چیرتی ہوئی بلند ہوتی ہے اور چاروں سمت گونجنے لگتی ہے۔ وہ "نہرو" پر اپنی مشہور نظم پڑھتے ہیں:

اور اکیلا اکیلا بھٹکتا رہا
ہر نئے اور پرانے زمانے میں وہ

بے زباں تیرگی میں کبھی
اور کبھی چلچلاتی دھوپ میں
چاندنی میں کبھی خواب کی
اسکی تقدیر تھی اک مسلسل تلاش
خود کو ڈھونڈا کیا ہر فسانے میں وہ

نظم رفعت کی طرف جا رہی تھی لوگ رفعتوں میں کھوئے ہوئے تھے اور کیفی بھائی کی آواز جادو جگا رہی تھی، خیالات دلوں کو مسحور کر رہے تھے کہ نظم اختتام کو پہنچی، ادھر کسی طالب علم نے "پشیمانی" کی فرمائش کر دی اور ادھر بہت سارے نوجوانوں کے چہرے دمک اٹھے، آنکھیں چمک اٹھیں، لبوں پہ مسکراہٹوں نے اس فرمائش کو اور زیادہ جاندار بنا دیا اور کیفی بھائی نے ایک دوسرے رنگ کی نظم ایک اور انداز میں جس میں نرمی اور عجیب لطافت تھی سنانی شروع کر دی :

میں یہ سوچ کر اس کے در سے اٹھا تھا
کہ وہ روک لے گی منالے گی مجھکو

. . . .

نہ آواز ہی دی نہ مجھکو بلایا
میں آہستہ آہستہ بڑھتا ہی آیا
یہاں تک کہ اس سے جدا ہو گیا میں

نظم ختم ہوئی تو کیف و انبساط میں ڈوبی ہوئی محفل نے "اندیشے" کیلئے خواہش ظاہر کر دی، کیفی بھائی بھی سنانے پر آئے ہوئے تھے سننے والوں کے ذوق و شوق نے ان کو بار بار سنانے پر آمادہ کر دیا، چنانچہ نظم کی ابتدا ہوئی :

روح بے چین ہے اک دل کی اذیت کیا ہے
دل ہی شعلہ ہے تو یہ سوز محبت کیا ہے
وہ مجھے بھول گئی اس کی شکایت کیا ہے
رنج تو یہ ہے کہ رو رو کے بھلایا ہوگا

پچھلی نظم کے تاثر نے سلسلے کو دراز کیا، وہی رومانوی فضا، ہلکا ہلکا درد، پرلطف چبھن، محبت کی سرشاری، کیف و مستی کی بادشاہی۔ نوجوان جھوم جھوم کر سن رہے تھے۔ اس نظم کے اس بند نے کچھ اور ہی کیفیت پیدا کر دی۔

اس نے گھبرا کے منظر لاکھ بچھائی ہو گی
مٹ کے اک نقش نے سو شکل دکھائی ہو گی
میز سے جب مری تصویر ہٹائی ہو گی
ہر طرف مجھ کو تڑپتا ہوا پایا ہوگا

عام حالات میں یہ عالم بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ پھر جلسہ ختم ہوا اور کیفی بھائی شعبہ اردو میں آئے اور کافی دیر تک شعبہ کے کاموں کو سراہتے رہے۔ شعبہ سے روانگی سے پہلے کیفی بھائی نے بھوپال سے متعلق جو تاثرات تحریر کئے ملاحظہ کیجئے:

ہماری تہذیب اور زبان کے جتنے پرانے مرکز تھے وہ سب کے سب قریب قریب منجملہ آثار قدیمہ ہو چکے ہیں۔ جن کو آج ہم اپنے شاندار ماضی کے ایک قبر کی حیثیت سے دیکھتے ہیں لیکن صرف بھوپال کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ ہمارا مرکز تھا اور ہے یہاں اگر کچھ سورج ڈوبے ہیں تو کچھ طلوع بھی ہوئے ہیں جن سے ہماری تہذیب اور زبان آج بھی کسب نور کر رہی ہے۔"

کیفی اعظمی

اس کے بعد کیفی بھائی ہم سب سے رخصت ہو کر بمبئی کیلئے روانہ ہو گئے۔

فروری ۱۹۷۳ء میں کیفی بھائی کی بیماری کے سلسلے میں بڑی بری خبر سننے میں آئی جس کے لئے میں تیار نہ تھا، گھبراہٹ میں میں نے بمبئی کے کئی حضرات کو آٹھ دس خط لکھ ڈالے اور جواب کا منتظر رہا، کئی روز بعد محترمی سردار جعفری صاحب کا جواب ملا :

۱۹ر فروری ۱۹۷۳ء

برادرم تسلیم

آپ کا مختصر سا خط ملا، کیفی کے دماغ کی ایک نس پھٹ جانے کی وجہ سے ان کے بائیں ہاتھ اور بائیں پیر پر فالج کا اثر ہے۔ اب وہ خطرے سے باہر ہیں، پوری طرح صحتیاب ہونے تک چھ ماہ سے زیادہ وقت لگ جائے گا۔ دعا کیجئے کہ وہ جلد اچھے ہو جائیں۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

آپ کا

سردار جعفری

اس خط نے بڑا سکون بخشا اور یقین ہو گیا کہ اب وہ اچھے ہو جائینگے، پھر اطلاع ملی کہ کیفی بھائی علاج کیلئے ماسکو گئے ہوئے ہیں، پھر واپسی کی اور اچھے ہو جانے کی اطلاع ملی۔ شاید کیفی بھائی کی واپسی کے بعد ایک خط بھی میں نے لکھا، لیکن مجھے جواب نہیں ملا، میں نے یہ سوچ کر کہ ابھی خط و کتابت وغیرہ کا سلسلہ نہیں شروع ہوا ہوگا خاموش ہو گیا۔

۱۷ر مئی ۱۹۸۰ء عزیزم ناظر نعمانی کی شادی کے سلسلہ میں برادرم تاجدار احتشام (مدیر شاعر) کی دعوت پر بمبئی جانا ہوا، تو کیفی بھائی سے ملاقات کا پروگرام بناتا رہا۔ ۱۹ر مئی کو مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ انسٹیٹیوٹ میں ایک ادبی پروگرام تھا، وہیں معلوم ہوا کہ ۲۵ر مئی کو کیفی بھائی کے یہاں ترقی پسند مصنفین کی ادبی نشست ہے جس میں مجھے شریک ہونا ہے میں نے شرکت کا وعدہ بھی کر لیا تھا لیکن کچھ ایسی صورت پیدا ہو گئی کہ شریک نہیں ہو سکا۔ دوسرے دن یعنی ۲۶ر مئی کو

۱۱ بجے برادرم اقبال مسعود آئے وہ ۲۵ مئی کو کیفی بھائی کے یہاں ادبی نشست میں شریک ہوئے تھے، ان کی زبانی معلوم ہوا کہ کیفی بھائی نے میرا بہت انتظار کیا اور میرے نہ پہنچنے پر انھیں سخت شکایت ہے اور آج یعنی ۲۵ مئی کو بلایا ہے۔ میں بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ "چلئے مجھے بھی کل سے یہ فکر لاحق ہے کہ کیفی بھائی سے کس طرح ملاقات ہو"۔ چنانچہ میں اور اقبال مسعود اسی وقت جوہو کے لئے روانہ ہو گئے۔ غالباً ۱۲ یا ۱۲½ بجے جانکی کوٹیر (جوہو) پہنچے۔ کیفی بھائی کے مکان کی شکل بالکل بدلی ہوئی تھی۔ باہر ہی کے کمرے میں کیفی بھائی سے ملاقات ہوئی — مجھے دیکھتے ہی بولے قوی دسنوی آ گئے۔ اٹھ کھڑے ہوئے، گلے سے لگا لیا۔ اس دوران اقبال مسعود کا کئی بار شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے وعدہ پورا کیا اور ملاقات کی صورت پیدا کر دی۔ مجھ پر بھی عجیب جذبات طاری تھے، برس ہا برس کے بعد ملاقات ہوئی تھی جس میں کیفی بھائی ایک بڑے حادثہ سے مقابلہ کر کے کامیابی کے ساتھ زندگی کی راہ پر آگے بڑھ رہے تھے۔ میں بغور کیفی بھائی کا مطالعہ کر رہا تھا اور ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہی انداز، وہی وقار، وہی تیور، وہی خلوص، وہی بزرگانہ شفقت جو تقریباً بیس سال پہلے میں محسوس کرتا تھا۔ انھوں نے بیماری کی کیفیت بتائی، ماسکو کے سفر اور وہاں کے لوگوں کی داستان سنائی، اپنے بچپنے کا تذکرہ کیا، نوجوان مصنفین کا ذکر آیا، بھوپال کے بارے میں پوچھا، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں بیس سال پہلے کا عبدالقوی دسنوی ہوں، نوجوان مصنفین کا حلقہ بنا ہوا ہے کیفی بھائی محفل پہ چھائے ہوئے ہیں۔ پُرلطف باتیں ہو رہی ہیں، ادبی رہنمائی فرما رہے ہیں، پروگرام تیار ہو رہے ہیں۔ بیچ بیچ میں لطیفوں کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا ہے صحت مند قہقہے گونجنے لگتے ہیں، کبھی مسکراہٹیں فضا میں خوشیاں اور مسرتیں بکھیرتی نظر آتی ہیں۔ کیفی بھائی

خوش ہیں، ہم سب خوش ہیں۔ کیفی بھائی شفقتوں کا سمندر ہیں، ہم سب اپنے اپنے چھاگل بڑھائے اس سمندر سے شبنم نہیں بلکہ اپنی اپنی توفیق کے مطابق خوب خوب فیض اٹھا رہے ہیں۔ نئے جوش، نئے حوصلے، نئی امنگ سے سرشار ہو کر، نوجوان لکھنے والوں کے ساتھ آگے کی منزل پر پہنچنے کے عزائم کا دامن تھامے — یہ حمید سورتی، یہ فاروق شجاع۔ یہ اختر راہی، یہ ساگر سرحدی، یہ بھیم سین، یہ سلیمان ظفر یہ ابراھیم رنگلا، یہ بیستم بیلی، یہ افتخار اعظمی، یہ ظفر گورکھپوری، یہ عبدالجبار — خیالات کہاں سے کہاں لئے جا رہے ہیں۔ کہ اقبال مسعود کی آواز آتی ہے وہ کیفی بھائی سے ان کی شاعری کی ابتدا کے بارے میں سوال کر رہے ہیں۔ میں بیس سال پہلے کی ماضی کی دنیا سے لوٹ آتا ہوں، کیفی بھائی سوالات کا جواب دے رہے ہیں۔ میں بھی بیچ بیچ میں سوال کرنے لگتا ہوں۔ اب وہ اپنے ماضی میں کھو گئے ہیں۔ اور ہم دونوں حال میں گم ہیں، میں کیفی بھائی کے کمرے کا جائزہ لے رہا ہوں۔ بہت سی چیزیں رکھی ہیں کچھ ترتیب سے کچھ بے ترتیب۔ کچھ کا حال سے تعلق ہے کچھ کا ماضی سے واسطہ ہے، اب محسوس ہوتا ہے کہ کیفی بھائی حال میں گم ہو کر ماضی سے بے تعلق ہونا نہیں چاہتے۔ ماضی کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں وہ زندگی سے محبت کرتے ہیں، انسان سے محبت کرتے ہیں اور انسان ماضی بھی ہے، حال بھی، مستقبل بھی۔

اس دوران میں ہم لوگ کھانے کی میز پر جاتے ہیں، لذیذ کھانوں سے میز سجی ہوئی ہے، ہم لوگ کھانا شروع کرتے ہیں۔ ساتھ ساتھ گفتگو بھی جاری رکھتے ہیں۔ کبھی کھانے سے متعلق کبھی ماضی کے بارے میں۔ کبھی حال کی روشنی میں — میری نگاہیں شوکت آپا کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ کھانے کی میز پر ہمارے ساتھ ایک خاتون ہیں جن کا نام "ریکھا" ہے، وہ شوکت آپا کا ذکر چھیڑ دیتی ہیں میں ان کے بارے میں پوچھ بیٹھتا ہوں، معلوم

ہوا امریکہ گئی ہوئی ہیں۔ میں نے دل میں کہا ایک ملاقات کا موقع تھا وہ بھی ہاتھ سے گیا۔ کیفی بھائی دورانِ گفتگو میں شوکت آپا کا کئی بار ذکر کرتے ہیں ان کی شوہر پرستی کا۔ ان کے ہوش گوش کا، ان کے صبر و تحمّل کا، تو میرے دل میں ان کا احترام اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔

کھانے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہتا ہے کہ اچانک گھڑی پر نظر پڑتی ہے۔ تین بجنے والا ہے دل پر جبر کر کے کیفی بھائی سے رخصت ہوتے ہیں اس اُمید اور یقین پر کہ پھر ملاقات ہوگی ـــــ لیکن آج یہ نئی ملاقات بھی پرانی ہو گئی ہے اور ماضی کے آغوش میں جا پہنچی ہے لیکن ہم ماضی کو حال سے بے تعلق ہونے نہیں دیں گے بلکہ ماضی کو مستقبل تک پہنچانے کے سلسلے کو جاری رکھنے کی سعی کرتے رہیں گے۔ اس لئے کہ جب ماضی، حال اور مستقبل تینوں مل جاتے ہیں تو زندگی کی تعمیر ہوتی ہے۔

عبد الجبار

کیفی - میرے دوست، میرے رہنما

یہ حقیقت ہے کہ کیفی اردو ادب کے بہت بڑے شاعر ہیں۔ ترقی پسند شاعر ہیں بلکہ کمیونسٹ اور مارکسی شاعر ہیں۔ ان کی شعری تخلیقات کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اور آئندہ بھی لکھا جائے گا۔ میں ان کی شاعرانہ عظمت کے بارے میں کچھ بھی کہنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ وہ اپنا لوہا منوا چکی ہے۔ جو ان کے نظریات سے متفق نہیں ہیں وہ بھی ان کی شعری صلاحیتوں اور اس کی عظمت کو تسلیم کرتے ہیں۔

یہ ضرور ہے کہ میں نے کیفی کو پہلے پہل ایک شاعر ہی کے روپ میں دیکھا، جبکہ وہ اپنی نظم "نئے ہندوستان میں نئی جنت" سنا رہے تھے، اس وقت میں طالب علم تھا، کمیونسٹ پارٹی اور مارکسزم سے قطعاً ناواقف۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ کمیونسٹ پارٹی نظریۂ حق خود ارادیت کے تحت پاکستان کی حمایت کر رہی تھی۔ کیفی کی یہ نظم بھی پاکستان کی حمایت میں تھی۔

اس کے بعد کیفی کو حسینی باغ اور منگل کندوری کے کئی مشاعروں میں سننے کا اتفاق ہوا۔ لیکن یہ صرف دور کا جلوہ تھا۔ وہ جس انداز سے اپنی نظمیں سناتے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دل کی گہرائیوں سے محنت کش عوام کو زندگی اور جد و جہد کا پیغام دے رہے ہیں۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ مارکسی نظریۂ حیات پر ان کا یقین پختہ ہے۔

پھر میں نے کیفی کو انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری کی حیثیت سے دیکھا

جس کی میٹنگیں دبودرہال، گوٹھاری مینشن اور ریڈفلیگ ہال میں بڑی باقاعدگی سے ہوا کرتی تھیں۔ انہیں میٹنگوں میں دوسرے عظیم ترقی پسند ادیبوں، شاعروں، نقادوں کو دیکھنے اور انھیں سننے کا موقع ملا۔ یہیں ترقی پسند مصنفین کی تحریک کا مقصد سمجھ میں آیا۔ یہیں یہ بھی اندازہ ہوا کہ زندگی دوست ادب کی کیوں ضرورت ہے۔ یہیں کیفی کی تنظیمی صلاحیتوں کا بھی اندازہ ہوا۔

لیکن کیفی سے قربت اس وقت ہوئی جبکہ وہ مدنپورہ، ناگپاڑہ اور ڈونگری کے لئے کمیونسٹ پارٹی کے انچارج بن کر آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ تحریک تلنگانہ ختم ہو چکی تھی۔ کمیونسٹ پارٹی انتہا پسند پالیسی کے خول سے باہر آگئی تھی۔ کمیونسٹ اکائیوں کی تنظیم نو ہو رہی تھی۔ اس وقت بھی کمیونسٹ پارٹی دو گروہوں میں بٹی ہوئی تھی۔ مدنپورہ کے کمیونسٹ شروع ہی سے ایک گروپ کے ہمنوا تھے۔ اور وہ کیفی کو مخالف گروپ کا آدمی سمجھتے تھے۔ جس کا کیفی کو بھی احساس تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے پارٹی منظم کرنے کی ذمّہ داری قبول کی۔ اور اپنی صلاحیتوں سے یہ ثابت کر دیا کہ ان میں تنقیدوں کو برداشت کرنے کی طاقت زبردست ہے۔ اور ساتھیوں کو یہ اندازہ ہوا کہ وہ صرف بڑے شاعر ہی نہیں بلکہ بڑے کمیونسٹ بھی ہیں۔ کیونکہ اچھا اور بڑا کمیونسٹ وہی ہے جو کہ اپنے اوپر ہونے والی تنقیدوں کو خنداں پیشانی سے برداشت کرے۔ یہیں کیفی نے یہ بھی ثابت کیا کہ وہ بڑے انسان بھی ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے نقادوں سے خفا یا ناراض ہونے کی بجائے انہیں گلے لگاتے تھے وہ تنقیدوں پر برانگیختہ ہونے کی بجائے بڑی آہستہ روی سے غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے پارٹی ممبروں کے دلوں میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا تھا۔

جلد ہی ساتھیوں کو یہ اندازہ ہو گیا کہ کیفی کا تعلق کسی ایک مخصوص گروپ سے نہیں ہے بلکہ وہ کمیونسٹ اور صرف سچے کمیونسٹ ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی کے اصولوں اور پروگراموں پر عمل کرتے ہیں۔

کیفی کوئی فرشتہ نہیں بلکہ انسان ہیں۔ اس لئے کمزوریوں اور خامیوں سے

مبرا نہیں ہیں۔ لیکن ان میں اچھائیاں اور خوبیاں اتنی زیادہ ہیں کہ کمزوریوں اور خامیوں کو نظر انداز کر دینے کو جی چاہتا ہے۔ کیفی پیار کرنے والے شوہر اور شفیق باپ کے علاوہ بہترین دوست بھی ہیں۔ میری اور ان کی دوستی ار بع صدی میں پھیلی ہوئی ہے گزشتہ ۲۵ برسالوں میں میں نے انھیں قریب سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ زندگی کے بہت سے ہنگاموں میں ساتھ رہا ہے۔ جلسے، جلوس، مشاعرے، مظاہرے، سمینار اور کانفرنسیں ہم نے ساتھ ساتھ منظم کی ہیں کیفی ان سارے پروگراموں میں ہم سب سے زیادہ سرگرم رہے ہیں۔ دراصل انھیں تحریکوں اور جدوجہد سے پیار ہے، بلکہ یہی ان کی زندگی ہے۔

زیادہ قربت کی وجہ سے کیفی کے ماضی میں بھی جھانکنے کا موقع ملا۔ اور معلوم ہوا کہ وہ ۱۹۲۰ء کے قریب ضلع اعظم گڑھ کی تحصیل پھول پور کے ایک چھوٹے گاؤں مجواں کے زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے اور سید اطہر حسین رضوی کے نام سے پکارے جانے لگے۔ ان کا بچپن اسی گاؤں میں گزرا۔ اور نوجوانی لکھنؤ کے رنگین ماحول میں بیتی۔ یہ تو مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے پہلا شعر کب اور کس عمر میں کہا لیکن بقول ان کے وہ میر انیس کے انداز بیان سے کافی متاثر تھے۔ اور انہیں کا رنگ ان کی تخلیقات میں جھلکتا ہے۔ لکھنؤ کے ماحول نے انھیں ایک طرف علم و ادب سے آگاہی بخشی تو دوسری طرف عشق کا چرکا بھی دیا۔ یہ کمند لب بام تک پہنچ کر ٹوٹ گئی اور وہ اپنا دل شکستہ لئے ہوئے کانپور آ گئے یہاں کی مزدور تحریک نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ یہیں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔

مشہور کمیونسٹ اور ادیب رہنما سید سجاد ظہیر کی دوربیں نظروں نے ان کے جوہر کو تاڑ لیا۔ اور انہیں کی ایما پر غالباً ۱۹۴۲ء میں بمبئی آ گئے۔ کمیونسٹ پارٹی کے ہفت روزہ جریدہ "قومی جنگ" سے وابستہ ہوئے اس کے وہ صرف کالم نویس ہی نہیں تھے بلکہ سڑکوں پر گھوم گھوم کر اس اخبار کو فروخت بھی کرتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے مینشن کمار سکینہ کے ساتھ مل کر ہفت روزہ "تحریک" نکالا۔

محمد مہدی کے نظریاتی جریدہ "علم و دانش" سے بھی وابستہ رہے۔ لیکن وہ محنت کشوں کے درمیان رہ کر ان کی تحریکوں میں سرگرم ہونے کے لئے بے چین تھے۔ اسی لئے انہوں نے اپنی سیاسی سرگرمیوں اور جدوجہد کے لئے مدنپورہ ونا گپاڑہ کے علاقوں کا انتخاب کیا۔

آج بھی انھیں مدنپورہ، مومن پورہ اور ناگپاڑہ کے علاقوں سے والہانہ لگاؤ ہے، کیونکہ ان کی زندگی کے ان گنت شب وروز انھیں گلیوں میں گزرے ہیں۔ اس کے سرد وگرم ماحول کے سرگرم حصہ دار رہے ہیں۔ انہیں گلیوں میں انہوں نے جلسے منظم کئے اور تقریریں کی ہیں۔ مشاعرے کئے اور نظمیں سنائی ہیں۔ جلوس نکالے اور بارش میں بھیگے ہیں۔ اور سب سے بڑھکر یہ کہ انہیں گلیوں میں انہوں نے پوسٹر بھی چسپاں کئے ہیں اور کارنر میٹنگیں بھی لی ہیں۔ اسی لئے یہ گلیاں آج بھی انھیں عزیز ہیں۔

سرزمین حیدرآباد جو علم وادب کی شیدائی ہے۔ اسی شہر نے کیفی کو ایک ایسی شریک حیات دی جو کہ ہر حال میں ان کے ساتھ مگن رہی۔ جس نے کیفی کی خامیوں اور کمزوریوں بھی مسکرا کر اپنی زندگی کا جزو بنالیا۔ کیفی جب جب بھکے ہیں تو انہیں کے پیار نے سہارا دیا ہے۔ خصوصًا کیفی کی علالت میں انہوں نے جو خدمت کی ہے وہ ایک وفاشعار بیوی کا انوکھا نمونہ ہے۔ کیفی کے نظریات سے چاہے انہیں انسیت نہ ہو لیکن کیفی کی شاعری سے عقیدت کی حد تک پیار ہے۔ کیونکہ اسی شاعری کی ڈور میں بندھی ہوئی تو وہ ان کی زندگی میں داخل ہوئی ہیں۔

جو لوگ آج کیفی کی خوشحال زندگی دیکھ رہے ہیں۔ ان کے شاندار بنگلہ اور موٹر پر نظریں ہیں۔ انہیں اندازہ نہیں ہو سکتا کہ اسی بمبئی میں انہوں نے اپنی شریک حیات کے ساتھ فاقہ مستی کے دن بھی گذارے ہیں۔ گھر کے راشن اور بچوں کی فیس کے لئے پریشان رہے ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنے نظریات کا سودا نہیں کیا ورنہ اس وقت بھی انہیں شاہانہ زندگی میسر آسکتی تھی۔ اور آج بھی وہ اپنے نظریات پر اٹل ہیں۔ اس میں کسی قسم کا لوچ یا کجروی نہیں آئی ہے۔ اور کیفی کی یہی خوبی ہم سب کو عزیز ہے۔

جیسا کہ میں نے کہا کہ کیفی دوست کے علاوہ میرے رہنما بھی ہیں۔ مجھے عقیدت کی

حد تک ان سے پیار ہے، ان کی دوربیں نظروں نے سیاسی اور سماجی زندگی میں ہمیشہ میری رہنمائی کی ہے۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا جبکہ ہم دونوں کے غور و فکر کی راہیں جدا ہو گئیں یہ ۱۹۶۴ء کا زمانہ تھا جبکہ کمیونسٹ پارٹی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ مارکسی کمیونسٹ پارٹی کا جنم ہوا۔ میں مارکسی کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہوا۔ لیکن کیفی نے کسی بھی کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ رہنا پسند نہیں کیا۔ وہ غیر جانبدار ہو گئے۔ کیونکہ انہیں متحدہ کمیونسٹ پارٹی عزیز تھی۔ کمیونسٹ پارٹی کا انتشار پسند نہیں تھا۔ مدنپورہ، ناگپاڑہ اور ڈونگری کے کمیونسٹ ممبران کی کافی بڑی اکثریت مارکسی کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہو گئی۔ کیفی تنظیمی اعتبار سے کمیونسٹ پارٹی سے دور ہو گئے لیکن مدنپورہ سے ان کا والہانہ لگاؤ بدستور قائم رہا۔ اسی لئے جب جب مدنپورہ کی مارکسی کمیونسٹ پارٹی نے انہیں یاد کیا، انہوں نے لبیک کہا۔ اس کی دعوت پر آئے اور مارکسی کمیونسٹ پارٹی کے جلسوں کو خطاب کیا۔ یہ سب انہوں نے اپنے ساتھیوں کی محبت میں کیا، یہ ان کی اعلیٰ ظرفی کا بیّن ثبوت ہے۔

کمیونسٹ پارٹی کے انتشار کا کیفی کے دل پر گہرا صدمہ ہے۔ جس کی وجہ سے قدرے مایوسی بھی آ گئی ہے۔ ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ کمیونسٹ پارٹیاں متحد ہوں تاکہ وہ پھر سے سرگرم ہو سکیں۔ اب ان کی مایوسی کے بادل چھٹنے لگے ہیں۔ انہیں امید کی روشنی نظر آ رہی ہے۔ اور ان کا یہ یقین پختہ ہوتا جا رہا ہے کہ جلد ہی ایک متحدہ کمیونسٹ پارٹی پورے ملک میں سرگرم ہو گی۔ اور برسوں کا ان کا خواب پورا ہو گا۔

کیفی کی زندگی میں کئی المناک واقعات آئے ہیں۔ وہ بمبئی آنے کے بعد اپنی ماں سے نہیں ملے تھے۔ جب ان کی والدہ پاکستان جا رہی تھیں تو بمبئی آئیں کیونکہ یہیں سے بذریعہ جہاز انہیں کراچی جانا تھا۔ لیکن کیفی ان سے نہیں مل سکے کیونکہ وہ ان دنوں روپوشی کی زندگی گزار رہے تھے۔ جس کا کیفی کے دل پر بے حد اثر ہے اور حد درجہ صدمہ ہے۔ کیفی پر جب فالج کا حملہ ہوا تو ان کی والدہ نے یہ خبر ریڈیو پر سنی۔ وہ اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکیں، صاحبِ فراش ہو گئیں اور یہی غم لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ گزشتہ دنوں جب کیفی پاکستان گئے تو بھائیوں و دوسرے عزیزوں سے ملاقاتیں ہوئیں لیکن پیار کرنے والی ماں نہیں مل سکیں۔ جس کا کیفی کے دل پر

تاحیات صدمہ رہے گا۔ کیفی کو اس کا بھی صدمہ ہے کہ جب ان کا پہلا بچہ بیمار ہوا تو وہ اس کا علاج نہیں کر سکے اور وہ انتقال کر گیا۔ اول تو اس زمانے میں روپوشی کی زندگی گزار رہے تھے اور جیب بھی خالی تھی۔

تیس سال بعد کیفی کو اپنا گاؤں یاد آیا۔ گاؤں کے لوگوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ انہوں نے قلمی آموں کا باغ لگوایا۔ اب وہ سال کے دو چار مہینے اپنے گاؤں میں گزارنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ جبکہ انہوں نے اپنی ساری آبائی زمین کھیت مزدوروں کو دیدی ہے کیونکہ انہیں زمینداری نظام سے نفرت ہے انہوں نے کھیت مزدوروں کا استحصال اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

ترقی پسند ادب کے مخالفین بلکہ کمیونسٹ دشمن نقادیہ کہتے ہیں کہ کیفی کی شاعری صرف نعرہ بازی اور پروپیگنڈہ ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کیفی نے عوام کے سلگتے ہوئے مسائل کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔ محنت کشوں کے مطالبات اور جدوجہد پر نظمیں لکھی ہیں۔ انھیں وقتی نعرے بازی کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ جب تک محنت کشوں کی جدوجہدیں جاری رہیں گی کیفی کی نظمیں انہیں طاقت و توانائی دیتی رہے گی۔ اس کے بعد نئی زندگی کی تعمیر میں مددگار ثابت ہوں گی۔

کیفی کے تعلق سے میری زندگی کی انگنت یادیں وابستہ ہیں۔ ان سب کے ذکر کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ لیکن چند کا ذکر ضروری ہے۔ مثلاً جب لکھنؤ کے سیلاب زدگان کی مدد کے لئے پارٹی نے جلوس نکالا تو موسلا دھار بارش ہو رہی تھی ہم سب کے کہنے کے باوجود کیفی نے ٹرک پر بیٹھنا پسند نہیں کیا بلکہ ٹرک کے آگے آگے نعرے لگاتے ہوئے بھیگتے ہوئے اور کپڑے جمع کرتے ہوئے چلتے رہے۔ یہ جلوس مدنپورہ، ناگپاڑہ اور بھنڈی بازار کی گلیوں سے گزرا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیفی میں کام کرنے کا جذبہ کس قدر تھا۔

کیفی کا سب سے بڑا کارنامہ نوجوان مصنفین کی تنظیم ہے جب ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیاں ختم ہو گئیں تو کیفی نے اپنی ساری توجہ نوجوان ادیبوں پر مرکوز کر دی۔

ان کو منظم کیا۔ پہلے "ینگ رائٹرس" اور پھر "نوجوان مصنفین" کی بنیاد ڈالی۔ اور آخر تک اس تنظیم کی رہنمائی کرتے رہے۔ ان کی یہ دلی تمنا تھی کہ محنت کشوں کے درمیان سے ادیب و شاعر پیدا ہوئے کسی حد تک ان کی یہ خواہش پوری ہوئی لیکن نقاد پیدا نہیں ہوئے جس کا کیفی کو ہمیشہ افسوس رہا وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ نوجوان مطالعہ سے کتراتے ہیں۔ اسی لئے ان کے شعور میں پختگی کا فقدان ہے۔

مجھے وہ دن بھی کل کی طرح یاد ہے جب ہم لوگ صبح صبح ملوں کو بند کرانے نکلے تھے کیونکہ اس دن یونین نے ہڑتال کا اعلان کیا تھا۔ کیفی صبح صبح ململ مل پر گرفتار کر لئے گئے۔ سارا دن اور نصف شب تک آگری پاڑہ پولس اسٹیشن کے "لاک اپ" میں سماج دشمن عناصر کے ساتھ رہے۔ کیفی نے شودر کرس یونین اور زردوزی مزدور یونین کی سرگرمیوں میں بھی آگے بڑھ کر حصہ لیا۔ غرضیکہ محنت کشوں کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی سرگرمیوں میں کیفی ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ اس زمانے میں کیفی مالی اعتبار سے بہت زیادہ پریشان تھے۔ کیونکہ کمیونسٹ پارٹی کے کل وقتی کارکن تھے۔ ظاہر ہے کہ پارٹی اتنا پیسہ بھی نہیں دیتی تھی کہ وہ اپنے گھر میں راشن کا انتظام کر سکتے لیکن اس کے باوجود ان کے پائے استقلال کو کبھی جنبش نہیں ہوئی۔ وہ بڑی تندہی اور سرگرمی کے ساتھ پارٹی کی جدوجہد میں شریک رہے۔ محنت کشوں کو متحد و منظم کرنے کے لئے کوشاں رہے۔ اور آج بھی ان کا یہ جذبہ ختم نہیں ہوا ہے۔ جب بھی ان سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ مدنپورہ کے سب ہی ساتھیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ انھیں یاد کرتے ہیں اور اکثر ان سب سے ملنے کیلئے مدنپورہ بھی آجاتے ہیں۔ مدنپورہ اور ناگپاڑہ کی گلیوں کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ "انہیں گلیوں میں میری زندگی کے انگنت ماہ و سال گزرے ہیں۔ ان سے میری زندگی کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ یہ گلیاں ہمیشہ مجھے یاد رہیں گی۔"

آج کیفی بظاہر عوامی جدوجہدوں اور سرگرمیوں سے علٰحدہ ہیں لیکن ان کے جوش اور جذبہ میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوئی ہے مجھے یقین ہے کہ جب بھی حالات سازگار ہوں گے اور مزدور تحریک آواز دیگی کیفی اسی طاقت سے جدوجہد کے میدان میں کود پڑیں گے۔ اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ وہ وقت بہت جلد آئے گا۔

رفیعہ شبنم عابدی

کیفی اعظمی
کی شاعری میں عورت کا تصوّر

عورت وہ بدنصیب مخلوق ہے جس کو ہمیشہ خوش قسمتی کے خواب دکھا کر لوٹا گیا۔ اور اس کی یہ خوش قسمتی گھر آنگن، چولہا چکی، بناؤ سنگھار، حسن و جمال اور "آرائشِ خمِ کاکل" تک محدود رکھی گئی۔ "اندیشہ ہائے دور دراز" کا حق اسے کسی سماج نے کسی وقت بھی دینا پسند نہ کیا۔ نتیجتاً عورت اپنی ہی زلفوں کے خم سلجھانے میں مصروف رہی جبکہ اس کی زندگی میں ہزاروں پیچیدگیاں آتی چلی گئیں۔ وہ اپنے لبوں کی سرخی پر مچلتی رہی حالانکہ اس کا وجود خزاں رسیدہ برگ و بار کی طرح زرد ہوتا رہا۔ اپنے بہتے ہوئے کاجل کی سیاہی میں ڈوب کر خوابوں کی سرزمین تلاش کرتی رہی جبکہ زندگی اسے حقیقتوں کے گھور اندھیروں میں دھکیلتی چلی گئی۔ اپنے آقائے دائمی مرد کے سامنے اپنی وفا کا بے غرض اظہار اس کا شیوہ ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ محض تسکین کا سامان بن کر رہ گئی۔ اس کی اپنی انفرادیت جو "تخلیق حوّا" کے "حسین سانچے" سے پیدا ہوئی تھی، ختم ہوتی چلی گئی اور اگر باقی رہی بھی تو "متاعِ کوچہ و بازار" کی حد تک۔ اس کی "اچھی صورت" پر جس نے ڈالی، بری نظر ڈالی۔ خصوصاً شاعروں نے اسے اپنے فن کا سستا ذریعہ بنا کر غزل کے نام پر ایک مخصوص صنفِ سخن ایجاد کر لی جس کا مقصد ہی عورت سے بات چیت کرنا تھا۔ اردو شاعروں نے اس خوبصورت وسیلے سے خوب ناجائز فائدہ اٹھایا۔ قد و قامت، زلف و گیسو، لب و رخسار، دہن و کمر اور کنگھی چوٹی سے

لے کر ان تمام رازہائے سربستہ کو منظرِ عام پر لانا ضروری سمجھا جن کا داخلہ شرافت کی دنیا میں کبھی قابلِ قبول نہیں رہا۔ بعضوں نے طرفہ ستم یہ کیا کہ تصوّف کے نام پر ایک ایسی خیالی مخلوق بصورت محبوب پیدا کر لی جو نہ مرد کہلائی جا سکتی تھی نہ عورت۔ سبزۂ خط کے ساتھ ساتھ اس کی زلفیں دراز تھیں۔ قد مانند سرو تھا۔ کمر پتلی تھی۔ ہونٹ سرخ تھے اور وہ تمام ستم گرانہ ادائیں اور عشوے اس میں موجود تھے جو عورت کی فطرتِ خاصّہ خیال کئے جاتے ہیں۔ عورت کی اس سے زیادہ بے حرمتی اور کیا ہو سکتی تھی کہ ریختی کے بہانے اس کے نام پر سستے جذبات کی تجارت کی گئی۔ اور اس میں اچھے اچھے اساتذۂ فن نے حصّہ لیا۔ اور اس قسم کے اشعار کہہ کے خوش ہوتے اور داد پاتے رہے۔

چُبھتی ہے یہ نگوڑی مسلسل کی اوڑھنی
لادے وہی دوا مجھے ململ کی اوڑھنی (انشاء)

کروں میں کہاں تک مدارات روز
تمہیں چاہئے ہے وہی بات روز (رنگین)

ڈھونڈھ لادے مری گوئیاں مجھے بر عید کے دن
تیس دن کی میں نکالوں گی کسر عید کے دن (یکرنگ)

رات کو کس نے یہ اس شوخ سے کیں رنگ رلیاں
صبح بستر پہ جھڑی اس کی میں پائی مہندی (مصحفی)

یہاں تک کہ غالبؔ جیسا باذوق اور نفیس الطبع شخص بھی اس قسم کی سستی باتیں کہنے سے باز نہ آیا کہ

ہے کیا جو کس کے باندھئے، میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

بہر حال غدر کے بعد جب اردو شاعری نے خیالات کا یہ بوسیدہ اور غلیظ لبادہ اتارا اور محمد حسین آزاد اور حالی جیسے مصلحین نے اسے پاک صاف کرنے کی کوشش کی تو اس کا سب سے اچھا ردِ عمل یہ ہوا کہ دھیرے دھیرے عورت کا تصور واضح ہوتا چلا گیا اور پھر جو عورت ہماری شاعری میں آئی وہ کسی حد تک نکھری ہوئی تھی۔ خصوصاً پہلی جنگ عظیم اور آزادی کے آس پاس کی شاعری میں عورت اپنی حقیقی شخصیت کی طرف لوٹتی دکھائی دیتی ہے۔ اور اس قسم کے اشعار مل جاتے ہیں جنہیں گوارا کیا جاسکتا ہے۔

خود حسن و شباب ان کا کیا کم ہے رقیب اپنا
جب دیکھئے تب وہ ہیں آئینہ ہے شانہ ہے (جگر)

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں (داغ)

آنچل ڈھلا رہے مرے مستِ شباب کا
اوڑھا گیا کبھی نہ دوپٹہ سنبھال کے (ریاض)

گھر سے ہر وقت نکل آتے ہو کھولے ہوئے بال
شام دیکھو نہ مری جان سویرا دیکھو (حسرت)

جہاں تک اردو شاعری میں عورت کے تصور کا تعلق ہے اس کا صحیح اور واضح ایچ ترقی پسند تحریک کے بعد ہی نظر آتا ہے اور اس بات سے قطعی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ترقی پسند ادب نے جہاں اردو شاعری کے بہت سے پرانے بت توڑے۔ فرسودہ خیالات کو نئی شکل و صورت دی۔ صاف ستھرے تصورات و رجحانات عطا کئے۔ رونے دھونے اور زندگی کی بے ثباتی کا ماتم کرنے والوں کو انقلاب اور زندگی کی طرف لوٹایا شبِ غم کے اندھیروں میں بھٹکنے والوں کو ایک صبحِ فردا کے خواب دکھائے وہیں عورت کو بھی اس کے حقیقی روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ اور پہلی مرتبہ اردو شاعری میں

عورت، صحیح معنوں میں عورت بن کر آئی۔ اب وہ متاعِ کوچہ و بازار نہیں رہی بلکہ شمعِ محفل اور چراغِ خانہ ہونے کے ساتھ ساتھ مشعلِ راہ بھی بن گئی۔ اس کی مثال بیشتر ترقی پسندوں کے ہاں دیکھی جا سکتی ہے۔ مثلاً جوشؔ کی نظمیں "ہستانِ دکن کی عورتیں"، "سہاگن بیوہ"، "جنگل کی شاہزادی"، "خاتونِ مشرق"، "گنگا کے گھاٹ پر" وغیرہ، مجازؔ کی بے شمار نظمیں جیسے "نمائش میں"، "نذرِ دل"، "مجبوریاں"، "نذرِ خالدہ"، "پردہ اور عصمت" اور "کس سے محبت ہے" وغیرہ ساحرؔ کی اکثر نظمیں مثال کے طور پر "کسی کو اداس دیکھ کر"، "تاج محل"، "جہانگیر کے مزار پر"، "معذوری"، "خوبصورت موڑ"، "پرچھائیاں" وغیرہ اور سردار جعفری کی بیشتر شاعری جس میں ہر معشوقہ انھیں "سلطانہ" نظر آتی ہے۔

کیفیؔ اعظمی بھی چونکہ اسی انجمنِ یاراں سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا ان کے یہاں بھی عورت کا ایک مخصوص تصوّر ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ کیفیؔ کے بچپن پر زیادہ گرفت ان کی والدہ کی رہی یا والد کی۔ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ زندگی میں عورت کی اہمیت کا جو احساس اور عورت کے وجود سے تقدّس کا جو خیال کیفیؔ کے یہاں بار بار ابھرتا دکھائی دیتا ہے وہ اس بات کی علامت ہے کہ کیفیؔ کی زندگی میں جو مختلف موڑ آتے رہے ہوں گے۔ ہر نئے موڑ پر عورت نے ہی انھیں ایک روحانی اور ذہنی سہارا عطا کیا ہوگا۔ چاہے وہ عورت کا کوئی بھی روپ رہا ہو، عورت بہر حال کیفیؔ کی زندگی کا ایک اہم حصّہ رہی ہے۔ اور خاص طور پر اُن کے فن کی جِلا میں عورت کے وجود کی ضو فشانی ضرور شامل رہی ہے۔ کیفیؔ کی زندگی کی طویل رات اور اُس کی تاریکیاں دراصل عورت ہی کے وجود کے سہارے صبح سے ہمکنار ہونے کے لئے بے چین نظر آتی ہیں ورنہ "آخرِ شب" کا انتساب یوں نہ ہوتا ۔

"شش! میں اپنے فن کو تنہا آخرِ شب تک لا چکا ہوں ۔ تم آ جاؤ تو صبح ہو جائے۔"

اس "کشش" کے پردے میں یقیناً کوئی معشوق پوشیدہ ہے۔ اور یہ معشوق مرد نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ اس میں جو شیرینی، شائستگی اور شبنمی کیفیت ہے وہ نسوانیت ہی کی غماز ہے۔ کیفی کے فن کی صبح اسی "کشش" کے پرتو سے منوّر ہوتی ہے اور "آوارہ سجدے" کی منزل آتے آتے یہ "کشش" یعنی عورت کا پیکر بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ "کشش" بیوی بن کر ان کے شبستانِ حیات میں قدم رکھتی ہے تو فنکار شوہر کھُل کر حسن کی بارگاہ میں سجدہ ریزی پر مجبور ہو جاتا ہے اور اپنے فن کو اس کے نام سے منسوب کرتے ہوئے لکھتا ہے ۔

شوکت کے نام

ایسا جھونکا بھی اک آیا تھا کہ دل بجھنے لگا
تو نے اس حال میں بھی مجھ کو سنبھالے رکھا

کچھ اندھیرے جو مرے دم سے ملے تھے تجھکو
آفریں تجھ کو کہ نام ان کا اجالے رکھا

میرے یہ سجدے جو آوارہ بھی، بدنام بھی ہیں
اپنی چوکھٹ پہ سجالے جو ترے کام کے ہوں

مذہبی نقطۂ نظر سے شوہر عورت کا مجازی خدا کہلاتا ہے۔ اور عورت پر اس کی عبودیت فرض ہے۔ عورت کا سجدہ بعد از خدائے حقیقی اُسی کو روا ہو سکتا تھا۔ لیکن کیفی کی عقیدت کا یہ عالم ہے کہ وہ "معبودِ مجازی" بننے کی بجائے "عبدِ حقیقی" بنے جاتے ہیں۔ "مسجود" کہلانے کے بدلے "سجدہ ریزی" کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کے قائل ہیں کہ سجدہ خالق کو کیا جاتا ہے، تخلیق کو نہیں۔ عورت چونکہ خالق ہوتی ہے، اس لئے لائق سجدہ ہے۔ مرد چاہے کتنا ہی عظیم ہو، ہمیشہ "تخلیق" کہلائے گا، خالق نہیں ہو سکتا۔ عورت کی عظمت کا یہی احساس کیفی کی شاعری کی جان ہے۔ اسی لئے وہ ہر عورت میں ایک "حریمِ وقار" دیکھتے ہیں۔ جس کے نفس نفس میں نغمۂ

مسیح کی حلاوتیں گھُلی ہوئی نظر آتی ہیں۔

عورت اُن کے نزدیک سراپا حسن ہوتی ہے۔ ویسے بھی وہ شاعر ہیں لہٰذا اُن کی نگاہیں حُسن سے جلوؤں کو سمیٹنے کی عادی ہیں اور جب یہ کرنیں اُن کی آنکھوں کے پردوں سے ہوتے ہوئے دل میں اترتی ہیں تو تصور میں عورت کا وہ سراپا اتر آتا ہے، جو "مونا لیزا" سے کسی طرح کم نہیں۔ اردو شاعری میں سراپا نگاری کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن کیفی کی نظم "تصور" عورت کے حسن کی ایک ایسی تصویر کھینچتی ہے جو نہ کسی سنگتراش کے بس کی ہے اور نہ کسی مصور کے۔ یہ کام شاعر اور صرف شاعر ہی کر سکتا ہے۔ اور شاید اسی منزل پر آکر شاعری دیگر فنونِ لطیفہ سے افضل تر نظر آنے لگتی ہے۔ کیفی کی آنکھوں سے عورت کے سراپا کا جائزہ لیجئے اور لیونارڈو اور مائیکل اینجلو کے شاہکار بھی مدنظر رکھئے تو اس حقیقت کا احساس ہو جائیگا لکھتے ہیں۔

یہ جسم نازک، یہ نرم باہیں، حسین گردن، سڈول بازو
شگفتہ چہرہ، سلونی رنگت، گھنیرا جوڑا، سیاہ گیسو
نشیلی آنکھیں، رسیلی چتون، دراز پلکیں، مہین ابرو
تمام شوخی، تمام بجلی، تمام مستی، تمام جادو
گلابی لب، مسکراتے عارض، جبیں کشادہ، بلند قامت
نگاہ میں بجلیوں کی جھلمل، اداؤں میں شبنمی لطافت
دھڑکتا سینہ، مہکتی سانسیں، نوا میں رس، انکھڑیوں میں امرت
ہمہ حلاوت، ہمہ ملاحت، ہمہ ترنم، ہمہ نزاکت

کوئی سنگتراش ایسے خوبصورت مورت تراش سکتا ہے یہ صرف کیفی کا کمال ہے کہ وہ اپنے شعروں میں عورت کو "اجنتا" سے اتار لاتے ہیں۔

عورت کیفی کے نزدیک لطافت و شگفتگی کا شاہکار ہے۔ اس کی ذات صرف بہار ہی نہیں بلکہ حاصلِ بہار ہوتی ہے۔ عورت ایک ایسا

گلستاں ہے جو ایک پھول میں قید ہے اور ایک ایسا لالہ زار ہے جو ایک کلی میں سما گیا ہے وہ کلیوں کا غرور ہے۔ پھولوں کا انکسار ہے۔ ایک ایسا موتی ہے جسے جستجو بھی آج تک نہ اٹھا سکی اور ایک ایسا ہار ہے جسے آرزو کے ہاتھ آج تک نہ گوندھ سکے۔ یقیناً وہ ایک ایسی پہیلی بھی ہے جسے عشق آج تک بوجھ نہ سکا۔ اس کی دراز زلفوں میں مالوے کی رات گندھی نظر آتی ہے تو سیہ لٹوں میں بادہ خواروں کی شام خوابیدہ دکھائی دیتی ہے۔ اس کی اداؤں میں خسروانہ بانکپن رچا ہوا ہے اور اس کے قدموں تلے نہ جانے کتنے شہریاروں کے تاج پامال ہوتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عورت کے سراپا کو قلم بند کرنے کی خواہش ان کے فن کا ایک اہم مقصد بن گیا ہے۔ اس لئے کبھی وہ اس کے قدِ بالا کی تعریف کرتے ہیں۔ کبھی رفتار کی، کبھی سیہ زلفوں کی اور لانبے گیسوؤں کی۔ لیکن ہر جگہ ان کا ذوقِ شاعرانہ تشبیہات واستعارات کے وہ پھول کھلاتا چلا جاتا ہے کہ ان کی نظموں میں آکر عورت کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ اسی کو کہتے ہیں حسن اور اس پہ حسنِ ظن۔ (ویسے "حسنِ ظن" بھی کہہ لیں تو بے جا نہیں) محبوب کے سروقد کی تعریف تو اردو غزلوں میں عام ہے لیکن اسے شاعرانہ حسن دے کر یوں کہیں بیان نہیں کیا گیا۔

چشمِ بد دور یہ قدِ بالا
جیسے مشرق سے صبحِ نو کا ابھار
بیل جاتی ہوئی منڈیروں پر
دھوپ چڑھتی ہوئی سرِ دیوار ("نقش ونگار")

عورت کی رفتار کو کبھی "قیامت کے فتنے" سے تعبیر کیا گیا۔ کبھی لغزشِ پا کو ایک ادا گردانا گیا۔ کبھی اٹھلاتی ہوئی چال کو ناگن سے تشبیہہ دی گئی۔ لیکن کیفی نے جو توجیہہ پیش کی ہے وہ کہیں نظر نہیں آتی۔

مرحلے جھیل کے نکھرا ہے مذاقِ تخلیق
سعیٔ پیہم نے دئے ہیں یہ خد و خال تجھے
زندگی چلتی رہی کانٹوں پہ، انگاروں پر
جب ملی اتنی حسیں، اتنی سبک چال تجھے ("نیا حُسن")

یہی نہیں بلکہ انھیں محبوب کا قامتِ بلند بھیرویں کی تان محسوس ہوتا ہے۔ عورت کا بدن کیفی کو ہمیشہ گنگناتا ہوا اور بولتا ہوا سا لگتا ہے۔ اس کے جسم میں خوابیدہ رہنے والے راگ کیفی اپنے احساس کے کانوں سے سنتے ہیں اور انھیں عورت کا وجود ایک ایسا ستار نظر آتا ہے، نگاہ عشق جس کو چھیڑتی ہے اور روح نغمہ و سرود کی اس بارش میں نہا جاتی ہے، کیفی کے نزدیک عورت نغمہ و رقص کی جان ہے۔ اور جب یہ دونوں چیزیں عورت کی ذات میں یکجا ہو جاتی ہیں تو وہ "بنت مریم" نظر آنے لگتی ہے۔ اور کیفی کا عقیدت مند دل پکار اٹھتا ہے۔

آواز تیری جس طرح جگنو چمک جائے کوئی
یا صبح کی آغوش میں غنچہ چٹک جائے کوئی
ساغر چھلک جائے کوئی
اے بنت مریم! گنگنا
اے جان نغمہ گائے جا ("نغمگی")

عورت کی یہ نغمگی ایک ایسا پاکیزہ تصوّر عطا کرتی ہے جس میں دلکشی ہے تقدس ہے پوجا اور عبادت کی سی کیفیت ہے۔ اس کی مترنم آواز میں جھٹ پٹے کے وقت مندروں میں بجنے والی گھنٹیوں کی سی مٹھاس ہے۔ منہ اندھیرے دور کسی مسجد سے آتی ہوئی اذان کی سی روحانی و عرفانی کیفیت گھلی ہوئی ہے۔ یا چوڑیوں کی جھنکار پوشیدہ ہے۔

چوڑیوں کی کھنک جو کیفی کے ایوانِ شاعری میں بار بار گونجتی ہے اس بات کی طرف اشارہ کناں ہے کہ گو کیفی عورت کے حسن کے دلدادہ ہیں لیکن ہر زمین اور ہر جگہ کا حسن اُن کے دل کو فرحت نہیں بخشتا۔ انھیں محض اس حسن سے محبت ہے

جو خالص ہندوستانی ہے، ہندوستان کی سوندھی مٹی سے جنم لینے والی دوشیزائیں جو کبھی کھیتوں میں گیہوں کی بالیاں کاٹتی، دھان کوٹتی یا کھُرپا چلاتی ہوئی نظر آتی ہیں، کبھی پنگھٹوں پر پانی کی گاگر اٹھائے چہلیں کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں اور کبھی گھر کی رسوئی میں برتنوں سے الجھ کر اپنی چوڑیوں کی جھنکار آنگن کی خاموش فضاؤں میں پھیلاتی رہتی ہیں، وہی کیفیؔ کی شاعری میں محبوب بن کر آتی ہیں۔ ایسا سانولا سلونا ہندوستانی حسن اگر انھیں زندگی میں کہیں مل جائے تو برسوں اس کافرادا کی یاد ان کے ذہن میں باقی رہتی ہے اور وہ اس گھڑی کو یاد کرتے رہتے ہیں جب

بسنتی ساری میں چھپا ہوا سادہ جواں بدن
جواں بدن پہ ریشمی بہار لے کے آئی تھی
وہ صندلیں کلائیاں، وہ سبز و سرخ چوڑیاں
سہاگ لے کے آئی تھی سنگھار کے آئی تھی (ملاقات)

یہ سولہ سنگار کی ہوئی سہاگن جس کے گیسوؤں کی ناگن بل کھا کے جوڑے کی شکل میں کنڈل بناتی ہے تو کیفیؔ کے دل کو بھی اپنے اندر لپیٹ لیتی ہے۔ اور وہ بے تاب ہو کر اس کے جوڑے میں لگے پھول کو گرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہ بکھرا بکھرا سا شرمایا اور سہما سہما نسوانی حسن انھیں بہت پیارا لگتا ہے۔ اس چلتی پھرتی جوہی کی کلی کی خوشبو ان کے مشامِ جاں کو معطر کر دیتی ہے اور اس ہنستی مسکراتی بانسری کی لے انھیں مدہوش و سرشار کر دیتی ہے۔ وہ ایسے بے بس و مجبور ہو جاتے ہیں کہ محبت کیے بنا ان سے بنتی نہیں۔ لاکھ چاہنے پر بھی وہ اس نازک ادا سے دامن نہیں بچا پاتے ہیں۔ عورت کی محبت ان پر اس حد تک غالب ہے کہ اس کی بے وفائی، کج ادائی اور تغافل بھی انھیں بدگمان نہیں کرنے پاتا نہ وہ غالبؔ کی طرح بازار سے جا کر دل و جاں اور لے آنے کی دھمکی دیتے ہیں، نہ مومنؔ کی طرح لطف میں کمی پاکر پیار کم کرنے کا خیال دل میں لاتے ہیں۔ اور نہ میرؔ کی طرح نادان جی "اس" کی یاد سے باز آنے کی تلقین کرتے ہیں بلکہ اس فراموش کاری کا جواز ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ اور عجیب عجیب سے وسوسے اور اندیشے ان کے ذہن میں کروٹیں لینے لگتے ہیں۔

وہ مجھے بھول گئی اس کی شکایت کیا ہے
رنج تو یہ ہے کہ رو رو کے بھلایا ہوگا
جھک گئی ہوگی جواں سال امنگوں کی جبیں
مٹ گئی ہوگی ملک، ڈوب گیا ہوگا یقیں
چھا گیا ہوگا دھواں گھوم گئی ہوگی زمیں
اپنے پہلے ہی گھروندے کو جو ڈھایا ہوگا
("اندیشے")

اپنے "پہلے گھروندے" کی خوش فہمی خود عورت کے متعلق کیفی کی نیک رائے کی غماز ہے اور ساتھ ہی ہندوستانی سماج میں عورت کی اس حیثیت کی بھی عکاسی کرتی ہے جو اسے چند اخلاقی بندھنوں میں بندھ جانے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ اس مجبور لڑکی کو بند کمرے میں اپنے خط جلاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اور بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جلتے ہوئے خطوں کے ایک ایک حرف کا عکس انھیں اس کی جبین پر ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔ کبھی وہ اُسے میز کے کونے سے اپنی تصویر ہٹاتے ہوئے پاتے ہیں اور کبھی چھیڑ چھاڑ کرتی ہوئی سکھیوں کے جھرمٹ میں کسی رازدار اور غمگسار سہیلی کے کاندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ عورت کی اس مجبوری پر ان کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ وہ اس سے بدگمان ہونے کی بجائے اُسے احتیاط کی تلقین کرتے ہیں اور خود بھی احتیاط برتنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اتنی احتیاط کہ اُسے آغوش تصور میں بھی آنے کی اجازت نہیں دیتے۔ ؎

عشق بن یہ ادب نہیں آتا

عورت کے تئیں بدگمان ہونے کی بجائے ہمدردی کا یہ احساس کیفی کے ہاں اس وجہ سے بھی ہے کہ وہ عورت کی نفسیات سے اچھی طرح واقف ہیں اور اس کی فطری جذباتی کمزوریوں کو جانتے ہیں۔ انھیں یقین ہے کہ عورت لاکھ بے نیازی دکھائے۔ بے وفائی کا اظہار کرے، پھر بھی اس کے سینے میں ایک نرم اور حساس دل دھڑکتا ہے۔ جو بہت جلد روٹھنا اور روٹھ کے من جانے کا عادی ہے۔ اور نہ صرف

جننا بلکہ منانا بھی عورت کی فطرت میں داخل ہے۔ وہ مرد کی ناراضگی اور بے توجہی زیادہ دیر
تک برداشت نہیں کر پاتی ہے۔ اور بہت جلد سپر ڈال دیتی ہے۔ عورت کی اسی نفسیات
کا فائدہ اٹھا کر وہ بھی کبھی کبھی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے اس کے در سے اٹھتے ہیں اور اس
امید کے ساتھ کہ وہ انھیں روک لے گی۔ منالے گی۔ اور دامن پکڑ کر بٹھالے گی۔ کچھ نہیں تو کم
از کم آواز ہی دے کر واپس لوٹنے پر مجبور کرے گی۔ لیکن جب عورت اپنی ضد پر اڑ
جاتی ہے تو انھیں افسوس ضرور ہوتا ہے۔ پھر بھی وہ اپنے آپ ہی کو قصور وار سمجھتے ہیں
اور اپنی ہی گستاخیوں کو اس کا سبب گردانتے ہیں۔ اور اپنی دست درازی کو اس کا ذمہ دار
ٹھہراتے ہوئے سوچتے ہیں۔

لطف نظارگی مٹا ہی دیا
میں نے دست طلب بڑھا ہی دیا (" تبسم ")

حسن کو جب وہ خود اپنے ہاتھوں پامال ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تو پھر وہ
یہ کیسے برداشت کر سکتے ہیں کہ سر بازار عورت کی تذلیل ہو اور اگر ایسا کوئی کریہہ
منظر ان کی نگاہوں سے گزرتا ہے تو وہ جھنجھلا جاتے ہیں اور چیخ کر کہتے ہیں ۔۔

تو جہاں تھی اسی جنت میں نکھرتا ترا روپ
اس جہنم کو بسانے کی ضرورت کیا تھی؟ (" اجنبی ")

وہ نہیں چاہتے کہ ایسی مجبور عورت ان کے لئے "باب کرم" وا کرے۔ وہ تو کچھ دیر ٹھہر
کر، آواز دے کے چلے جانے والوں میں سے ہیں۔ اور یہ دعا دیتے ہوئے کہ۔

کاش ایسا نہ ہو گھیرے رہے دنیا تم کو
اور اس طرح کہ جس طرح کوئی پاس رہے (" نذرانہ ")

کیفی کی نظر میں عورت کا صحیح مقام اس کا گھر ہے بازار نہیں۔ وہ گھر
کی رونق ہے۔ چار دیواری کی عزت ہے۔ اور گھر کا ماحول اسی کے وجود سے روشن
ہے۔ جب وہ شوہر کی گردن میں اپنی صندلی باہوں کا ہار ڈالتی ہے تو گھر میں بہار
آجاتی ہے۔ اور تب کوئی مرد "پیار کا جشن" منانے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن اس کا یہ

مطلب نہیں کہ قدامت پرست مردوں کی طرح کیفی بھی عورت کو گھر کی چار دیواری میں قید کرنا چاہتے ہیں وہ آزادی نسواں کے زبردست حامی ہیں۔ انھیں اس تاریخ سے نفرت ہے جس نے عورت کے پیروں میں صدیوں تک غلامی کی زنجیریں پہنائے رکھیں۔ جس نے اسے مرد کے پہلو کو گرمانے کا ذریعہ سمجھا۔ اور مرد کے ظلم و ستم کو بلا چوں چراں برداشت کرنے کا عادی بنایا۔ اور اس کی اپنی شخصیت اور انفرادیت کو دبائے رکھا۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ عورت راہ حیات میں مرد کے شانہ بشانہ گامزن رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ چلتی رہے۔ وہ عورت کے اندر سوئی ہوئی صلاحیتوں کو جگاتے ہوئے اسے پیغام دیتے ہیں کہ

زندگی جہد میں ہے صبر کے قابو میں نہیں
نبض ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں
اڑنے کھلنے میں ہے نکہت خمِ گیسو میں نہیں
جنت اک اور ہے جو مرد کے پہلو میں نہیں
اس کی آزاد روش پر بھی مچلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے (عورت)

یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب عورت جہالت کے قعرِ مذلّت سے نکل کر تعلیم کے اجالے میں آئے۔ تعلیم یافتہ عورت کیفی کے نزدیک ایک آئیڈیل عورت ہے۔ انسانیت کے ماتھے کا وقار ہے۔ تہذیب کا شاہکار ہے۔ فطرت کا جمالِ رنگیں ہے۔ اس کے لبِ شاداب پر چھلکی ہوئی گلنار ہنسی انھیں ان فرسودہ اصولوں کے خلاف بغاوت کا ایک اعلان نظر آتی ہے جنھوں نے ایک مدّت تک اس کی شخصیت کو مجروح کر کے رکھ دیا تھا۔ عورت کی اس بیداری کو دیکھ کر وہ خوش ہوتے ہیں اور بے ساختہ عقیدت مندانہ سلام کرتے ہیں۔

حوصلے جاگ اٹھے، سوزِ یقیں جاگ اٹھا
نگہِ ناز کے بے نام اشاروں کو سلام

تو جہاں رہتی ہے اس ارضِ حسیں پہ سجدہ
جن میں تو ملتی ہے ان راہ گزاروں کو سلام (”نیا حسن“)

یہ تعلیم یافتہ حوصلہ مند عورت جب سروجنی نائیڈو بن کر ملک کی تقدیر ہو جاتی ہے تو وہ ایک سعادت مند بیٹے کی طرح اس بہادر ماں کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

ذرا زمین کو محور پہ گھوم لینے دے
سماج تجھ سے ترا سوز و ساز مانگے گی
جمال سیکھے گا خود اعتمادیاں تجھ سے
حیاتِ نو ترے دل کا گداز مانگے گی (”سروجنی نائیڈو“)

یہی عورت جب بیٹی کا روپ دھار کر عظمتِ فن کا نشان ہو جاتی ہے تو ایک شفیق و ہمدرد باپ بن کر کیفیؔ اس کی سالگرہ پر یوں دعا دیتے ہیں۔

اب اور کیا ترا بیمار باپ دے گا تجھے
بس اک دعا کہ خدا تجھ کو کامیاب کرے
وہ ٹانک دے ترے آنچل میں چاند اور تارے
تو اپنے واسطے جس کو بھی انتخاب کرے

یہ خراجِ عقیدت صرف سروجنی نائیڈو کی خدمت میں نہیں اور یہ دعا صرف شانہ اعظمی کے لئے نہیں بلکہ دنیا کی ساری ماؤں اور ساری بیٹیوں کے لئے ہیں عورت کے تئیں کیفیؔ کا یہ عقیدت مندانہ اور مشفقانہ اظہار اس وقت بھی نظر آتا ہے جب تلنگانہ میں آزادی کے لئے بغاوت کا علم بلند ہوتا ہے۔ اور کیفیؔ یہ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں کہ عورتیں بھی اس جنگ میں مردوں کے ساتھ ہیں۔

ضعیف مائیں، جوان بہنیں، جھکے ہوئے سر اٹھا رہی ہیں
سلگتی نظروں کی آنچ میں، بھیگی بھیگی پلکیں سکھا رہی ہیں
لہو بھرے چولیوں، پھٹے آنچلوں سے پرچم بنا رہی ہیں

ترانۂ جنگ گا رہی ہیں ("تمنگانہ")

یہ مائیں، بہنیں اور بیٹیاں وحشت و بربریت کے ہاتھوں چھوٹے اور فرسودہ عقائد کی خاطر ہوس کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھتی ہیں اور وطن کی آزادی دراصل شر پسندوں کی آزادی کا روپ دھار لیتی ہے ہر طرف بہتے ہوئے انسانی خون کے دریا میں ڈوبتے ہوئے ان کے انسانیت نواز اور امن پسند دل سے یہ درد بھری آواز آتی ہے ۔

اے بہار! ان کو کچھ تسلی دے — بہنیں روتی ہیں بھائیوں کیلئے
غم میں بچوں کے جاں گنواتی ہیں — مائیں سو سو پچھاڑیں کھاتی ہیں
تیری روحانیت کا کیا کہنا — تو نے بچوں کا خون چوس لیا
گیت گا کر مہا تما جی کے — پیٹ ماؤں کے چاک کر ڈالے
دل میں بھونکے کٹار کر بھالا — منہ کیا ملک و قوم کا کالا
انکھڑیوں کا سرور چھین لیا — عصمتوں کا غرور چھین لیا

("مثنوی خانہ جنگی")

عورت کی بیوگی کا روپ بھی انھیں متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ جب وہ مرحوم شوہر کی آخری نشانی کو سینے سے چمٹائے پھرنے والی مجبور اور غریب بیوہ کی عصمت کو ظاہر پرست پارساؤں کی پاکبازی کی نذر ہوتا دیکھتے ہیں تو اس پر لعنت بھیجے بغیر نہیں رہتے۔ عورت کی ارزانی کا انھیں بے حد دکھ ہوتا ہے اور ان زمینوں سے انھیں نفرت ہونے لگتی ہے جہاں عورت کی عصمت محفوظ نہیں ہے وہ اگر "برلن کی فتح" پر خوشیوں بھرا ترانہ بھی گانا چاہتے ہیں تو اس خیال سے کہ اب عورتوں کی عصمت محفوظ ہو گئی ہے ۔

کہہ دو اب اٹھ کر جلائیں دیویاں گھی کے چراغ
مٹ گئے جو توڑتے پھرتے تھے عصمت کے ایاغ ("فتح برلن")

فساد و جنگ کی یہ گرم بازاری انھیں ایک ایسی "بھر دیبی" نظر آتی ہے جو اپنے بے رحم ہاتھوں سے انسانی زخموں کی بند کھڑکیاں کھولتی رہتی ہے۔ اور ایک ایسی گربھ دیتی ہے

جس کی کوکھ سے تفرقہ پسندی اور نفرت کا فتنہ جنم لیتا ہے۔ ایسے تمام فتنوں کا واحد حل کیفی کی نگاہ میں آزادیٔ نسواں ہے۔ پابندیاں عورت کی شخصیت کو گھٹن کا شکار بنا دیتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جذبات پر بٹھائے جانے والے پہرے قدموں کی لغزش پر آمادہ کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ ایسے تمام لوگوں کے سخت معترض ہیں۔ "نرسوں کی محافظ" (میٹرن) سے وہ اسی لئے شاکی ہیں کہ وہ اُن معصوم اٹھتی جوانیوں پر جن کے چہرے عصمتِ مریم کی ضو سے فروزاں ہیں، زبردستی پابندیاں عائد کرتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ آزادی عورت کو اپنی ذات سے آگہی اور خود اعتمادی سکھاتی ہے۔ اور وہ نیک و بد میں گناہ و بیگناہی میں تمیز کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ پابندیاں اس کی شخصیت کو ماند کر دیتی ہیں۔ لہٰذا نوجوان لڑکیوں کو کسی حد تک آزادی ضرور دینی چاہئے۔

یہ تتلیاں جنھیں مٹھی میں بھینچ رکھا ہے
جو اُڑنے پائیں تو الجھیں کبھی نہ خاروں سے
تری طرح کہیں یہ بھی نہ بجھ کے رہ جائیں
تپش نچوڑ نہ ان ناچتے شراروں سے
("نرسوں کی محافظ")

مختصر یہ کہ کیفی دنیا کے کرب و اضطراب سے گھبرا کر عورت کے دامن میں پناہ لینا چاہتے ہیں۔ حادثات کی تپتی ہوئی دھوپ سے بچ کر اس کی محبت کی گھنی چھاؤں میں بسیرا کرنا ان کا مقصد ہے۔ اور اس کے حسن و جمال کی شعاعوں سے اپنے فن کو جلا دینا ان کی خواہش ہے۔ اسی لئے وہ عورت سے یہ التجا کرتے ہیں کہ۔

تو خورشید ہے بادلوں میں نہ چھپ
تو مہتاب ہے جگمگانا نہ چھوڑ
تو شوخی ہے، شوخیٔ رعایت نہ کر
تو بجلی ہے بجلی، جلانا نہ چھوڑ
("حوصلہ")

نجابت ادیب

کیفی اعظمی کے ابتدائی تخلیقی آئیڈیل

از آدمؑ تا ایں دم ظالم و مظلوم، قاتل و مقتول، جابر و رحم دل، حاکم و محکوم، استحصال کنندگان و محبت و اخوت کے دل دادہ، سرکش و کمزور، احتجاجی و صلح پسند اور ایسی متضاد و متعدد صفات کے افراد صفحۂ قرطاس پر ابھرتے اور بکھرتے رہے ہیں سماج کے حساس عناصر نے جب ان کا مشاہدہ و مطالعہ کیا تو کچھ نے اپنا آئیڈیل ظلم کے بجائے مظلومیت جبر کے بجائے رحم و شکر و قناعت پسندانہ رویہ اختیار کر کے عاقبت کی زندگی کے حوالے کر دیا مگر کچھ ایسے افراد بھی ہمیشہ مگر تعداد میں کم پیدا ہوتے رہے جنھوں نے ظلم کے خلاف بغاوت اور احتجاج کے راستہ کو اختیار کیا۔ کیفی کی شاعری مظلومیت کے خلاف جذبۂ احتجاج ہے۔

کیفی کا گھریلو ماحول شعری، ادبی و مذہبی گفتگو کے ساتھ ساتھ اعلا اخلاقی قدروں کی تعلیم و عمل کی درس گاہ کی حیثیت سے ان کی زندگی کا اہم جزو ہے۔ والد ریاست بلہرا کے ضلع دار تھے اور ذوقِ

شعری بدرجۂ اتم رکھتے تھے۔ والدہ مذہبی اقدار کی بہر طور پاس داری و احترام کرتی تھیں۔ سبھی بڑے بھائی شاعر تھے۔ گھر میں میر انیس کے مرثیے اور اس دور کے دیگر شعرا کے مرثیے، سلام، نوحہ و قصیدہ ہر فرد کی وِرد زبان تھے۔ مجالس و محافل ذکر اہل بیت رسولؐ منعقد ہوا کرتی تھیں جن میں اہل بیت اطہارؑ کے کردار و عمل اور فضائل و مصائب کا تذکرہ رہتا تھا۔ جہاں فضائل کو سُن کر خوش ہونا اور مصائب کو سُن کر رونا رلانا شعار تھا۔ مجالس کی وجہ سے غم پسندی اور ظلم کے خلاف شعورِ احتجاج لاشعوری طور سے مزاج کا جز ہوتے گئے۔ اس کے علاوہ اوائل عمری میں بہنوں کا انتقال اور زمین دارانہ جبر و استبداد نے کیفی کو ایسے آئیڈیل کردار تلاش کرنے پر مجبور کیا جن میں مظلومیت اپنی انتہا پر ہونے کے باوجود عزمِ احتجاج مل سکے اور سماج میں موجزن ظلم و جبر و استبداد اور استحصال کی طوفانی لہروں کا مقابلہ کرتے ہوئے کشتیٔ انسانیت کو پار لگانے کا حوصلہ و جذبہ مل سکے۔

ڈاکٹر محمد حسن رقم طراز ہیں:

> "مرثیوں کی روایات میں پیدا ہونے والے شاعر نے آنکھوں سے ماتم کے آنسو پونچھے ہیں اور اپنی شاعری کو قنوطیت کے اندھیروں سے محفوظ رکھا ہے اور اندھیروں کو دور کرنے کے لیے تابناک تصورِ تاریخ اپنایا ہے اسی تصور ہی سے اعتماد حاصل کیا ہے۔" (ماہنامہ سہیل)

کیفی کی شعر گوئی کی ارتقائی منزلوں میں حضرت امام علیؑ، حضرت امام حسینؑ اور حضرت امام زین العابدینؑ آئیڈیل کی حیثیت سے ورثہ میں ملتے ہیں جن کے فکر و عمل سے کیفی نے روایتی طور سے رونے رُلانے کی طرزِ فکر سے ہٹ کر ان کرداروں سے زندگی کو سنوارنے، سجانے، بنانے، ظلم کے خلاف احتجاج کرنے، حق کے راستوں کو تلاش کرنے اور ظلم و جبر و تشدد کو بے نقاب کرنے کا سلیقہ سیکھا ہے۔ اسی لیے قنوطیت کا پہلو ان کی شاعری کا حصہ نہ بن سکا۔ حالانکہ کیفی نے زندگی کے تپتے سلگتے ریگ زاروں میں ایسے حقیقت کے تھپیڑے کھائے ہیں کہ ان کا قنوطی ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ مگر مذکورہ بالا آئیڈیل کرداروں ہی سے ان کو اعتماد حاصل ہوا جس کا اظہار یہ مندرجہ ذیل اشعار ہیں۔

کیفی کی اوائل عمری کی تخلیق غزل کا یہ شعر ہی ان کے عزم و حوصلہ کو صاف صاف ظاہر کرتا ہے:

اک تم کہ تم کو فکرِ نشیب و فراز ہے   اک ہم کہ چل پڑے تو بہرحال چل پڑے

مذہب و سماج کی تمام تر سخت گیریوں اور پابندیوں کے خلاف غزل کی زبان میں یہ پہلا احتجاج اور دعوت فکر و عمل بھی ہے یہی جذبہ کیفی کے یہاں بتدریج بڑھتا رہتا ہے۔

کیفی کی نظم "مزدوروں کا پیشوا" (غیر مطبوعہ) ان کے آئیڈیل کا اظہار یہ ہے جہاں ان کو مزدور و محنت کش کے وقار کو بلندی، جاں باز سپاہی کو سرخ روئی، علم و درس انسانیت، خطرے میں پڑ کر بھی تحفظ انسانیت کا درس، جبر و ظلم کے خلاف آواز احتجاج، بندہ اور سلطان میں یکسانیت، شاہانہ غربت اور ایسے ہی لاتعداد اوصاف نظر آتے ہیں۔ کیفی نے ان اوصاف کو بیان کرتے ہوئے پیشوائے قوم و ٹھیکیداران ملت کو دعوت فکر و عمل دی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نگاہ شوق تھم کیوں جرأت پرواز کرتی ہے
یہی مزدور ہے جس پر خدائی ناز کرتی ہے

اسی کا بیلچہ تھالوں میں امرت گھول دیتا تھا
جبین ارض کی پُر رعب گرہیں کھول دیتا تھا

اسی کی تیغ کا دم خم ہے فرمان پیمبر میں
اٹھی یہ ہی احد میں بدر میں خندق میں خیبر میں

اسی کی نبض میں شعلہ حمیت کا بھڑکتا ہے
اسی کی مٹھیوں میں حریت کا دل دھڑکتا ہے

دیا انسانیت کا درس خوں آشام بندوں کو
سدھایا پھاند کر خطرہ میں دختر کش درندوں کو

جہالت کی لحد پر مشعل علم و ہنر رکھ دی
شب تاریک کے دامن میں بنیاد سحر رکھ دی

پرو دیا ایک ہی رشتہ میں بندہ اور سلطاں کو
کوئی ترتیب دے جس طرح سے خواب پریشاں کو

مٹا کر رسم کہنہ نظم نو کی ابتداء کی ہے
یہ پہلا انقلابی ہے یہ پہلا اشتراکی ہے

نبیؐ کے کفش جب خود طایک کر یہ باخدا اٹھا
غرور نسل پر رہ گیا زمانہ جگمگا اٹھا

نظر اٹھ کر جو اس شاہا نہ غربت سے ملاتی ہے
کلیجہ تھام کر سرمایہ داری بیٹھ جاتی ہے

کہاں ہیں وہ جو خود کو پیشوائے قوم کہتے ہیں
ہوس کے حرص کے الجھے ہوئے جھرمٹ میں رہتے ہیں

کہاں ہیں جن کی تقریروں میں ہے اسلام کی قیمت
غنودہ بندگی ، مدقوق سجدہ ، ادھ مکتی طاعت

پرکھ لیں، دیکھ لیں درس تمدن جن کو ازبر ہے
یہ مزدوروں کا لیڈر ہے یہ جاں بازوں کا لیڈر ہے

تڑپ کر تلملا کر مفلس و مقہور اٹھے ہیں
اٹھایا ہے تری تعلیم نے مزدور اٹھے ہیں

سلگ اٹھے گا جب دامن نظام مہربانی کا
صلہ کیفی تجھی سے لے گا اس آتش بیانی کا

حضرت امام حسینؑ کے عزم و حوصلے سے متاثر ہو کر نظم "حسینؑ کا عزم" (غیر مطبوعہ) اور "حسینؑ کی آخری نماز" (غیر مطبوعہ) تخلیق شعری کی منزلوں سے ہمکنار ہوئیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جادۂ تسلیم پر انسانیت کے نام پر
خونیوں سے بے حیاؤں سے سیاہ کاروں سے جنگ

بہر تکمیل محبت بہر استحکام حق
سرکشوں سے معرکہ بد عہد غداروں سے جنگ

موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اظہار حق
چھاؤں میں تیغوں کی بے دینوں سے زرداروں سے جنگ

اک مکمل درسِ جرأت ہے حسین ابنِ علی
کٹ گیا سر بیعتِ فاسق نہ کی آخر نہ کی

آفریں اے افتخارِ فاتحِ بدر و حنین
آفریں صد آفریں اے بیکس و تنہا حسینؑ

حریت کو آج پھر ہے ابنِ حیدرؑ کی تلاش
وقت کو ہے پھر کروڑوں میں بہترؑ کی تلاش

دیکھنا کیفیؔ نشانِ حریت لہرائے گا
جب جہاں کو عزمِ شاہِ کربلا مل جائے گا

وہ نمازی و مجاہد جس نے ہنگامِ سپہر
روک لی تھی سجدۂ خالق کی خاطر تیغِ تیز

نورِ چشمِ مصطفےٰؐ لختِ دلِ شیرِ اللہ
جنگِ آزادی کا ہیرو حریت کا بادشاہ

سر پہ تیغِ خوں چکاں سجدہ میں خم فرقِ نیاز
ہم ہیں کیفیؔ کیا نہ بھولے گا خدا بھی یہ نماز

حضرت امام زین العابدینؑ سے متاثر ہوئے ہیں تو امام کی مظلومی، رعب و جلال، ظلم پر مظلومیت کے اثرات اور فتحِ مقصدِ حق کا اعلان، تاریخی، نفسیاتی، روحانی، فکری و عملی کاوشوں کو نظم کیا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

تیغ کو جنبش نہ تھی اور ہِل رہی تھی کائنات
تھی زمانہ سے جدا پیکارِ زین العابدین

کیفی نے ان آئیڈیل کرداروں سے تعلیم فکر و عمل لی ہے۔ رونے رلانے کے قنوطی انداز سے احتراز کیا ہے۔ اتنے محترم اور باوقار صاحب عمل آئیڈیل کردار ہونے کے باوجود جب رہبران ملت اور مذہبی اجارہ داروں کی بے عملی دیکھی تو کیفی پریشان ہو اٹھے۔ نظم "مولوی کا رجز" (غیر مطبوعہ) اور "معنی خلوت" (مطبوعہ) ان کے اسی کرب کی نقیب ہے۔ نظم "مولوی کا رجز" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

میں مجتہد العصر ہوں میں حاکم دیں ہوں
گھستا ہے جبیں خاک پہ کعبہ میرے آگے

تسبیح جپا کرتے ہیں مذہب میری خاطر
ایمان کیا کرتا ہے سجدہ میرے آگے

جو قوم اجل سے بھی لڑا سکتی ہے آنکھیں
اس قوم کا ہلتا ہے کلیجہ میرے آگے

بندے تری کوشش پہ ہنسی آتی ہے مجھ کو
جب زور خدا کا نہیں چلتا میرے آگے

یہ کفر کی ہے نقل کوئی کفر نہیں ہے
کیفی یوں ہی ارشاد ہوا تھا مرے آگے

کیفی اپنے آئیڈیل کی صفات علماء دین و قومی و ملی رہبران کی شکل میں دیکھنے کے خواہش مند تھے مگر جب ان کے قول و فعل میں تضاد پایا تو انسانیت کی بقا کے سبق مارکس، لینن، نہرو، گاندھی وغیرہ جہاں جہاں بھی ان کو ملے، انھوں نے حاصل کیے۔ اور اپنی شاعری کو انسانیت کی بقا اور استحصال کے خلاف احتجاج کا ذریعہ بنایا مگر متذکرہ بالا بنیادی آئیڈیل کرداروں سے وہ کبھی الگ نہ ہو سکے۔ ان اہم و باوقار عظیم آئیڈیل کرداروں کی تعلیمات ہمیشہ ان کے ذہن و شعور کو جلا بخشتی رہی ہیں جس کی مثالیں ان کی رومانی، سماجی، اشتراکی، وطنی، سیاسی اور فطرت کی عکاس شاعری میں بیشتر ملتی ہیں۔

سید سجاد ظہیر

پیش لفظ

جدید اُردو شاعری کے باغ میں ایک نیا پھول کھلا ہے، ایک سُرخ پھول۔ کیفی اعظمی سے میری واقفیت ایک سال سے بھی کم کی ہے، ان سے ملاقات کو چھ مہینے بھی ابھی نہیں ہوئے۔ انھوں نے اپنی دو تین نظمیں "قومی جنگ" کو بھیجیں، لیکن اپنا پتہ نہ لکھا۔ نظمیں اچھی تھیں اس لئے شائع کر دی گئیں۔ پہلے تو میں سمجھا کہ یہ شخص شاید کسی سرکاری دفتر میں ملازم ہے۔ اس کا لاپتہ ہونا بہ مجبوری ہے اور یہی شاید اس کی شرمندگی اور مُنھ چھپانے کی وجہ بھی ہے۔ بہر حال ہماری کھوج جاری رہی۔ بڑی مشکل سے علی سردار جعفری کی رہنمائی میں لکھنؤ کے کچھ رفیقوں نے کیفی کو ڈھونڈھ نکالا۔ ملنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک طالب علم قسم کے نوجوان ہیں جن کی تعلیم کا باقاعدہ سلسلہ عربی مدرسوں میں عربی فارسی کے امتحانوں کی سندیں حاصل کر لینے کے بعد تھوڑی ہی مدّت پہلے ختم ہو چکا ہے، انگریزی زبان سے ناواقف ہیں اسے پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں، بے روزگار ہیں، اپنا کوئی گھر نہیں، اسی سبب سے "لاپتہ" تھے۔ اس کے بعد ہم نے ان سے کہا کہ اپنی تمام انقلابی نظمیں ہمارے پاس بھیج دیں۔ یہ کوئی پندرہ بیس ہوں گی۔ ہم "قومی جنگ" کے ادارے والے انھیں پڑھ کر حیران رہ گئے۔

جنگ کے اس دور میں جب سے کہ سوویت یونین پر ہٹلری حملہ ہوا ہے، اور ہندوستان کی سرحدوں پر جاپانی قزاق آن بیٹھے ہیں، ہمارے بہت سے نوجوان ادیبوں پر روحانی اور ذہنی تعطّل سا طاری ہے، جنگ کے سلسلے میں پیدا ہونے والے دل خراش حالات اور ملک میں سیاسی جمود کا اثر تو ان کے دماغوں پر بھی پڑا ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ انقلاب کی وہ راہ جس پر

وہ چار پانچ سال پہلے اتنی تیزی سے گامزن تھے، یکایک کہاں کھو گئی! "پرانے ترقی پسند ادیبوں" میں چند کو چھوڑ کر زیادہ تر ایسے ہیں جو خاموش ہیں۔ اور اس دور کے اکثر نوجوان ادیبوں میں سے اس گم گشتگی کے عالم میں بعض نے جام و سبو میں۔ بعض نے جنسی بے اعتدالی میں، بعض نے یاس پرستی اور بعض نے ابہامیت یا خالصاً مہمل گوئی کے دامن میں پناہ لی ہے۔ الغرض یہ کہ وہ گھوم پھر کر ابتذال و ضلالت کی اُسی پرانی منزل پر پہنچ رہے ہیں، جس کے برخلاف ترقی پسند مصنفین کی تحریک نے بغاوت کا سرخ پرچم بلند کر کے اُردو ادب میں ایک نئی زندگی اور ایک انوکھی شان پیدا کر دی تھی۔ ابھی تو "پرانے" رجعت پرست ان فحش نگاروں و مہمل گویوں کو "ترقی پسند" کا نام دے کر ساری ترقی پسند تحریک کو بدنام کر رہے ہیں، بہت جلد ہم یہ سماں بھی دیکھیں گے کہ ترقی پسندوں پر اعتراض کرنے والے ان جدید رجعت پرستوں کے کلام کو اُسی طرح مزا لے لے کر پڑھیں گے جس طرح کوک شاستر یا چرکین یا جان صاحب کا کلام بلاغت نظام ہمارے اخلاق تاب رؤسا کے یہاں اب بھی شوق سے پڑھا جاتا ہے۔

کیفی کی شاعری قدیم و جدید دونوں قسم کی ادبی غلاظتوں سے پاک ہے۔ اس میں سچی ترقی پسندی کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس کا خیال و نصب العین صاف و متعین، اُس کا طرزِ بیان سیدھا اور براہِ راست، اُس کی تشبیہیں و استعارے نئے اور دلکش ہیں۔ وہ اشتراکیت کا پُرجوش حامی ہے، سوویت روس کا گہرا دوست ہے اور اب ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کا رُکن بھی ہے۔ اس کے خیال و مقصدِ حیات، اس کی زندگی اور عمل میں تضاد نہیں۔ اگر وہ انقلاب اور مزدور راج کے گُن گاتا ہے تو اُسے اس کا حق ہے۔ اس لئے کہ اس نے اپنی زندگی محنت کشوں کی خدمت اور ان کی جد و جہد میں شرکت کے لئے وقف کر دی ہے۔ جدید دور کے ترقی پسند شاعر اسی قسم کے ہوں گے، وہ غالباً پہلے کے مقابلہ میں تعداد کے لحاظ سے کم ہوں گے لیکن ان کی گفتار و کردار میں ہم آہنگی کی وجہ سے ان کے کلام میں خلوص اور سچائی کا عنصر پہلے سے زیادہ ہوگا۔ وہ نئی صبح کا نقشہ کیفی کی طرح کچھ یوں دیکھیں گے:

یہ سادہ سادہ گردوں، یہ تبسم آفریں مونج
پیا پے کامیابی سے ہوا ستائش گن جیسے

اُبلتی سرخیوں کی زد پہ جلتے ہیں سیاہی کے
پڑی ہو آگ میں بکھری غلامی کی رسن جیسے
شفق کی چادریں رنگیں فضا میں تھرتھراتی ہیں
اُڑائے لال جھنڈا اشتراکی انجمن جیسے

اور فیکٹریوں کی اونچی اونچی چمنیوں سے نکلتے ہوئے دھوئیں کو دیکھ کر انھیں خیال آئے گا:

دامنِ تار پر جا بجا نقش گیر　　خونِ مزدور کی آڑی ترچھی لکیر
یہ دھواں، آہ کیفی یہ اندھا دھواں　　ایک مدت سے ہے جو یونہی پرفشاں
سطح سے نفع خوری کی اُبھرے اگر　　توڑے چاند تارے ابھی جھوم کر

ارتقاء جلوہ نو دکھانے لگے
بن کے جنت زمیں جگمگانے لگے

یہ فیکٹریاں اور کارخانے اگر سرمایہ داروں کی ملکیت سے نکل کر اشتراکی ملکیت بن جائیں تو زمین جنت بنائی جا سکتی ہے، لیکن سرمایہ داری کی تباہ کاریوں کا اس وقت کوئی حساب نہیں۔ سُنیے:

ملکیت نے پرِ شہبازِ ہنر توڑ لئے　　نخلِ فطرت کے حسیں برگ و ثمر توڑ لئے
حرص میں دامنِ گیتی کے گہر توڑ لئے　　اور بچے تو گل و شمس و قمر توڑ لئے

اُفقِ دہر پہ ظلمت کے سوا کچھ بھی نہیں

فاشزم اسی قسم کی سرمایہ داری کی ایک صورت ہے۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ دنیا کے پہلے اشتراکی نظامِ حیات، یعنی سوویت یونین کو تباہ کر دے۔ لیکن اُسے منھ کی کھانی پڑی۔ اشتراکی نظام نے پچیس سال میں ایسے انسان پیدا کر دیئے جو شکست کھا ہی نہیں سکتے۔ نازیوں کو اعتراف کرنا پڑا کہ:

غیر ممکن ہے کبھی دام میں آنا ان کا　　ان کی راتوں کے بھی ماتھے پہ ہے پرتو دن کا
ان کے سینوں میں دھڑکتا ہے دلِ استالن کا　　ان میں سب خنجر ہیں یہ ٹھوکریں کھائیں کیونکر

دوران کا رہنما استالن جیسا شخص ہے۔ ایک معمولی مزدور، جو آج ساری آزادی پسند دنیا کا رہنما بن گیا ہے۔ کیفی نے اس کی بڑی سچی اور دلکش تصویر کھینچی ہے:

تیرے سر پر ہے انقلاب کا تاج　　دوشِ تعمیر پر ہے ہات ترا

جنگ اور ایسے خونیوں سے جنگ — اک شکن بھی مگر جبیں پہ نہیں
اپنی دھن، اپنی راہ، اپنا کام — زنگ اوہام کا یقیں پہ نہیں!

کیفی اپنے ہم وطنوں کو بھی جہد و عمل کا پُر جوش پیام دیتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس انقلابی دَور میں اس کی قوم بھی متحد و منظم ہو کر آزادی کی عالم گیر جنگ میں شریک ہو۔ وہ اس مذبذب اور فرسودہ تخیل سے کوسوں دور ہے جس کا مقصد اپنی شریک زندگی کو "تم میرے ساتھ کہاں جاؤ گی؟" کہہ کر ٹال دیتا ہے۔ جنسِ لطیف کی اس سے بڑھ کر ذلّت اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس کے برخلاف کیفی کا اصرار ہے کہ: اُٹھ مری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے!

زندگی جہد میں ہے صبر کے قابو میں نہیں
نبضِ ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں
اُڑنے کھلنے میں ہے نکہت خمِ گیسو میں نہیں!

یہ ہے کیفی کے تخیل اور ان کی انقلابی و اشتراکی نظموں کا رنگ۔ ان کے علاوہ اس مجموعہ میں اور بھی نظمیں ہیں، جو بالکل غیر سیاسی ہیں۔ غرضکہ یہ ان کی شاعری کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔ کیفی ابھی نوجوان ہیں، ان کی عمر اس وقت ۲۶ سال سے کم ہے۔ اور "جھنکار" کی تمام نظمیں، غالباً گذشتہ تین سال کے اندر اندر کہی گئی ہیں۔ کسی شاعر کی شاعرانہ زندگی کا آغاز مشکل سے اس سے بہتر ہو سکتا ہے۔ سب سے زیادہ اُمید افزا بات یہ ہے کہ ان کے کلام میں معنویت اور فن دونوں کے اعتبار سے تدریجی ترقی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ابھی اُن کے کلام میں وہ گہرائیاں پیدا نہیں ہوئیں، جو صرف علمی عبور، نیز مشاہدے اور کثیر تجربوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ زورِ کلام اور فصاحتِ بیان، مشاہدے، خیال، علم اور ادراک کی تہی مائگی پوری نہیں کر سکتے۔ انسانی جذبات کو متحرک کرنا شاعری کا کام ہے لیکن اگر اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ شعر دلوں کو مسرور اور حیاتِ انسانی کو تابندہ و منور کرے، روح کو بالیدگی بخشے، نفس کو طمانیت اور آئینۂ عقل کو صیقل، تو پھر اس کی منزل بہت دشوار ہے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ بہترین شاعری "جزویست از پیغمبری" ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ کیفی اس اعلیٰ و ارفع منصب کو حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس وقت ان کی بہترین تعریف یہی ہے کہ اُن کا رُخ صحیح طرف ہے اور ان کے قدم برابر آگے بڑھ رہے ہیں۔

(جھنکار سے)

محمد علی صدیقی

نئی روایت

کیفیؔ اعظمی کی شاعری ایک ایسے وقت میں مقبول ہوئی جب شاعری کا منصب اس قدر وسیع ہو چکا تھا کہ اس کی حدود دراقتاً "چہار دانگِ عالم کو محیط تھیں اور بلبلِ شیراز اور لالۂ سمرقند و بخارا کی قیاسی دنیا کی جگہ نئے عہد کے حقیقی جغرافیہ نے ہر باشعور شاعر و ادیب کے قلب و ذہن پر دستک دینی شروع کر دی تھی۔

آج اس شاعری کے بارے میں خواہ کچھ ہی کہا جائے لیکن اس حقیقت میں کیا کلام کہ شاعری صرف باطن کے اندر سفر کرنے کا نام نہیں اور اگر ایسا ہے تو یہ بہت ہی مجہول سی تعریف ہے۔ اب خیر سے وہ زمانہ آگیا ہے کہ اس موقف پر شدت سے قائم رہنے والے حضرات بھی باطن کی اس طرح تعریف کرنے لگے ہیں کہ اسے خارج ہی کی ایک شکل سمجھا جا سکے۔ شاید جب ہم کسی "مظہر" کی تعریف کرتے ہیں تو اپنی دانست میں تعریف کرنے کے لمحے تک ساری معروضیت نچوڑ لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ "نامعلوم" کے خانے میں کچھ پڑا نہ رہ جائے۔ تو جب تک تعریف کی غایت اعتبار ہے، اس وقت تک اعتبار کی ایک منزل سے دوسری منزل تک سفر کے لئے نئے واقعات، نئے مشاہدات اور نئے تجربات نئی تعریفوں کو جنم دیتے رہیں گے۔

شاعری کیا ہے؟ اس کا ایک جواب اُس دُنیا بیزار جوگی نے دیا تھا جس کے لئے اپنی حالت ہی واحد قابلِ اعتبار حالت تھی، ایک جواب دنیا کے آلام و مصائب سے نبرد آزما "جنگجو" نے دیا تھا جو اس کی حالت ذہنی اور اقتضائے حقیقت کا ترجمان تھا۔ الغرض جتنے اذہان، جتنی

حالتیں، جتنے نقطہائے نظر، اتنی ہی تعریفیں۔ سو ہم تعریفوں کے ایک گھنے جنگل میں سانس لے رہے ہیں اس لئے غالباً ایک ایسی تعریف ادب یا شعر ہی کو اعتبار حاصل ہو سکتا ہے جو ادب کے ساتھ عمرانی وسائنسی علوم کے رشتوں پر گہری نظر رکھ سکے۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ ہماری زندگی ہمہ جہت دباؤ میں سانس لینے پر مجبور ہو اور ہم صرف ایک جہت کے علاوہ باقی تمام جہات کو خاطر میں نہ لائیں۔ ہر ایسی تعریف جو معروضیت سے کٹی ہوتی ہے، زندگی سے بھی بُریدہ ہے اور جب صورتِ حال یہ ہو تو اس کا شمار ادبی تعریف سے زیادہ ایک ایسے ذہن کی عکاسی شمار ہونا چاہیئے جو ادب کے مقابلے میں زندگی کی تضحیک پر حائل ہوتا ہے۔

کیفی اعظمی کا پہلا مجموعہ "جھنکار" ۱۹۴۳ء میں اور دوسرا "آخر شب" مئی ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا تھا۔ یعنی جس مجموعے کا پہلا پاکستانی ایڈیشن آپ کے ہاتھوں میں ہے وہ تقسیم سے قبل متحدہ برصغیر میں شائع ہوا تھا کیفی اعظمی کی شاعری کی تفہیم کے لئے "آخر شب" سب سے زیادہ ضروری ہے۔ وہ یوں کہ اس مجموعے کے ذریعے کیفی اعظمی نے پوری کامیابی کے ساتھ اپنے امکانات تلاش کر لئے تھے اور بعد کے کیفی اعظمی "آخر شب" کی مضبوط بنیادوں پر کھڑے ہوئے ملتے ہیں اس مجموعے کے ذریعے شاعر کا تصوّرِ حیات اپنی تمام تر تنہوں کے ساتھ ہمارے ذہنوں پر دستک دیتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ شاعر ایک نئے طرزِ احساس کا شاعر ہے۔ وہ اپنے اردگرد کے مسائل سے اُلجھا ہوا ہے۔ اس صدی کے چوتھے عشرے کی ہلچل کو دُور دیسوں کے معاملات کو شب فتنہ گردان کر غنودہ نہیں ہو جاتا۔ ہر انسانی مسئلہ کو اپنا مسئلہ سمجھتا ہے۔ ایک نئی بین الاقوامیت کے احساس سے موجزن جو بہت ولولہ اور طاقت کے ساتھ اُردو شاعری میں در آیا ہے۔ کیفی اعظمی اس ہمہ جہت اجتماعی احساس کی شاعری کے اہم نام ہیں، وہ جملہ معاشی مسائل کا حل اپنی فکر کی سرافرازی میں تلاش کرتے ہیں اور اس مجموعے میں ایک دردمند ذہن کے احساسِ اجتماعیت کا ایک رنگ لیکن ہمہ اقسام کی خوشبوؤں سے معطر چمن کھلا ہوا ہے جس کی ہر روش سے انضمام، انبساط اور جدوجہد کی لہریں اُبھر رہی ہیں۔

کیفی اعظمی ترقی پسند تحریک کے اہم نام ہیں۔ اگر فیض احمد فیض کی رومانیت عالمی ادب کی سربرآوردہ خوشبوؤں سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی روایت میں زندہ ہے۔ اگر مخدوم

روایت اور بغاوت کا حسین امتزاج ہیں۔ اگر سردار کی تعقل پسندی کے ڈانڈے مشرقی و مغربی افکار کے سوتوں سے جا ملتے ہیں اور نغمگی اور بلند آہنگی کی ایک مثال ہیں، اگر قاسمی کے یہاں انقلابی شاعری کا نصب العین جدت پسندی سے متصادم نہیں ہے تو کیفی اعظمی کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کے یہاں رومان، کشمکش حیات اور انقلاب ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے کارزارِ حیات کی منزلوں کو سر کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ اُن کی شاعری ایک احتجاج ہے، مسلسل احتجاج، عام انسانوں کے ساتھ یکجا ہونے کی زبردست خواہش کے ساتھ شیر و شکر ہو کر طاقتور تر احتجاج۔ یہ احتجاج فتح مندی کی نوید دیتا ہے اور عین محبت و وصل کے ہنگام بھی انقلاب کی دعوت سے دست کش نہیں ہو پاتا۔ کیفی کے یہاں ایک عجیب سرمستی ہے، اپنی فکر کے ساتھ پوری دنیا پر چھا جانے کی ایک ایسی معصوم خواہش جو شاعری کی شکل میں بظاہر معصوم معلوم ہوتی ہے لیکن یہ معصومیت ایک گہری سچائی کی امین ہے اور تحلیل و تجزیہ کے ساتھ سائنسی نقطۂ نگاہ کی پروردہ ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ ایک باقاعدہ نقطۂ نگاہ ہے۔

بعض اوقات کیفی اعظمی پر خطابت کا الزام لگایا جاتا ہے۔ یہ الزام درست ہے۔ اسی خطابت کے بل بوتے پر انھوں نے لاکھوں محنت کشوں کے ذہنوں میں ادب اور زندگی کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ کرنے والی دیوار کو پاش پاش کیا ہے۔ جب شعر و ادب زندگی کی پیداوار ہوں تو ہر وہ شہ پارہ جو انسانوں کو "ہونے" کا سبب بنائے اور انھیں اپنی امنگوں اور آرزوؤں سے رقم ہونے والی تاریخ کا خالق بنائے، عین ادب ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ ادب کے نام پر معذرت خواہی۔ بہت سے ہم عصر شعرا کے یہاں ادب زندگی کی تزئین اور تہذیب کا کام سر انجام دینے کی بجائے زندگی کی تحقیر اور تکذیب کی وظیفہ خواری بن گیا ہے جسے دنیا بیزاری کی عظیم "حزنیہ روایت" کا نام دیا گیا ہے جیسے ماضی جد و جہد اور کشمکش سے خالی رہا ہے اور زمانۂ حال اس کشمکش کا نتیجہ نہیں ہے۔ کیفی اس خیال کی نفی کرتے ہیں۔

"آخرِ شب" سے کیفی اعظمی کی شاعری کا ایک نمائندہ رُخ سامنے آتا ہے۔ یہ مجموعہ تقسیم سے قبل شائع ہوا تھا اور ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اس مجموعے کے ذریعے ہم زندگی اور تاریخ کی بہت سی بصیرتیں حاصل کرتے ہیں۔ نظروں کے سامنے ایک فلم چلنے لگتی ہے۔ طاقتور ذہن

اس ظلم کی از سرِ نو تشکیل کر سکتے ہیں۔ ماضی قریب جگمگا اُٹھتا ہے تو حال بھی واضح تر ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک دَور ختم ہو رہا ہے۔ اور نئے دور کی پیدائش امکان سے باہر نظر آ رہی ہے۔ (تیس سال بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال شاعرانہ احتیاط یا صحیح تجزیے سے عاری فکر کا غماز نہیں تھا) سارا مجموعہ ایک سراپا احتجاج ہے۔ محبت و وصل کے لمحات محض جزیروں کی مانند سطح پر تیرتے ہوئے ملتے ہیں۔ ایک ایک معاشرے میں جہاں ناانصافی کے طویل دور نے جہل، توہم پرستی، بھوک اور بیماری کے عفریتوں کو جنم دیا ہو۔ حجاب امتیاز علی کے افسانوں کے ماحول کو ادب گردانا فراریت کے ذیل میں آتا ہے۔ سچا ادب، سچے علم کی طرح، زندگی کی حقیقی معنویت اُجاگر کرتا ہے جس کے بغیر عرفانِ ذات ناممکن ہے۔ ہمارے یہاں احتجاجی روایت کی بڑی اہمیت ہے۔ شہر آشوب ہو یا ہجو نگاری، ہمارے شعراء نے اپنے عہد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے سے پرہیز نہیں کیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ مصلحتوں نے 'غزل' کے حق میں ووٹ دیا۔ جن قوموں میں سیاسی شعور کی کمی نہیں ہوئی، اُن کا ادب، موسیقی، مصوری، غرضیکہ فنونِ لطیفہ کے ہر شعبے پر سیاسی اقتدار کی چھاپ لگی ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں دنیا بیزاری کی روایت نے دُنیا فہمی پر ناک بھوئیں چڑھایا اور یہ عمل اب تک جاری ہے۔ لیکن کیفی اعظمی کی نسل نے جس نوع کی شاعری شروع کی تھی۔ اب وہ ایک روایت بن چکی ہے۔ ایک مضبوط اور توانا روایت "آخرِ شب" جدید اردو شاعری کا ایک اہم موڑ ہے اور احتجاجی شاعری کی روایت کی رہبر کتاب ہے۔ نئی نسل کے لئے اس کتاب کا مطالعہ سود مند ہونے کے ساتھ ساتھ ضروری بھی ہے۔

("آوارہ سجدے" سے)

آخرِ شب

فیض احمد فیض

پیش لفظ

اس مختصر مجموعے میں کیفیؔ اعظمی نے گزشتہ پچیس برس کا منتخب کلام شامل کیا ہے یعنی ایک طرح سے یہ ان کا سلور جوبلی ایڈیشن ہے۔ پڑھنے والوں کو شاید سب سے بڑی تو اس مجموعے کے اختصار سے شکایت ہوگی اور یہ تجسس بھی کہ کون سی چیزیں اس میں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں اور کیوں؟۔ اس کا جواب تو کیفیؔ ہی کے پاس ہوگا لیکن اس انتخاب سے ان کے دل کے معاملہ ضرور کھل جانا چاہیئے اس لئے کہ ان کے فکر و جذبہ، اور اسلوب اشہاد کے سبھی پہلو اس اشاعت میں موجود ہیں۔

پچیس برس یعنی ربع صدی کا عرصہ کافی طویل عرصہ ہے جس میں بچے جوان اور جوان بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ ان منظومات کا ایک خاصہ تو یہی ہے کہ ان میں وقت کی پرچھائیں کا سراغ لگانا مشکل ہے۔ لہجے کی کھنک، الفاظ کا بانکپن، رعنائی خیال اور وفورِ جذب و شوق جس پہلو سے دیکھئے آج کے کیفیؔ وہی کیفیؔ ہیں جنھیں ہم اور آپ پچیس برس سے جانتے ہیں، اپنے شاعرانہ مقام کے اعتبار سے اب وہ جوان اور نوجوان شعرا کی صف سے نکل کر بزرگانِ سخن کے دائرے میں شامل ہو چکے ہیں لیکن بزرگی کے ساتھ مضمحل ہو گئے قویٰ غالب کا جو تصور وابستہ ہے اس کا کوئی شائبہ کیفیؔ کے کلام میں نہیں ملتا، صرف اتنا ہے کہ اب اس میں آرائش خم کا کل کا بیان کم ہے اور اندیشہ ہائے دُور دراز سے رغبت زیادہ۔

بنیادی طور سے کیفیؔ کی شاعری کا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ ہے لیکن غنائیہ شاعری کے

سطحی تکلفات اور مصنوعی زیبائشوں سے کیفی نے بہت کم سروکار رکھا ہے۔ غمِ جاناں کا ذکر ہو کہ غمِ دوراں کا۔ بوسۂ لب کی بات ہو کہ بوسۂ زنجیر کی، کیفی بات ہمیشہ کھری کرتے ہیں۔ جیسی سفاک اور بے رحم زندگی ہمارے گرد و پیش موجود ہے اسی کی بے کم و کاست منظر کشی کیفی کا مسلکِ شعر ہے۔ نہ تلخیٔ مضمون سے گھبراتے ہیں، نہ تلخیٔ کلام سے گریز کرتے ہیں، نہ زہر کو قند بنا کر پیش کرنے کے قائل ہیں، نہ قند کی حقیقت سے انکاری اور اس کے باوجود کیفی کی شاعری زہر اور قند کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ ایک متوازن، ٹھہرے ہوئے دردمند، فکر انگیز اور حسّاس نظریۂ حیات و فن کا بلیغ اظہار ہے، جس میں کوئی جھول اور کوئی تضاد مشکل ہی سے دکھائی دے گا۔

طولِ کلام کے نہ کیفی قائل ہیں نہ میں ہوں۔ تعارف کے وہ محتاج نہیں اور تنقید کے لئے دفتر درکار ہے۔ یہ چند حروف تو محض اظہارِ خلوص کے لئے لکھ رہا ہوں اس لئے کہ میری نظر میں کیفی ایک عزیز دوست ہونے کے علاوہ ہمارے دَور کے نمائندہ اور باکمال شاعرانہ مفسروں میں سے ہیں۔

("آخرِ شب" سے)

سردار جعفری

پیش لفظ

اقبالؔ کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" کا شمار اقبالؔ کی بہترین تخلیقات میں نہیں کیا جاسکتا جیسے شمع و شاعر، خضرِ راہ، طلوعِ اسلام، ساقی نامہ، مسجدِ قرطبہ، لینن خدا کے حضور میں اور فرمانِ خدا فرشتوں کے نام۔ اسی طرح کیفیؔ کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ کا دوسرا اجلاس" کا بھی شمار کیفیؔ کی شاہکار نظموں کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ دونوں نظمیں اپنی عصری معنویت اور تاریخی بلاغت کے اعتبار سے بے حد اہم ہیں۔ اقبالؔ کی انقلابی فکر کی تکفیر کرنے والے بعض نقادوں نے ابلیس کی مجلس شوریٰ کو خاص طور سے اہمیت دی ہے۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ یہ نظم کالجوں اور مدرسوں کے حلقے میں محدود رہی اور اقبالؔ کے عام قاری کی توجہ کو کبھی حاصل نہ کر سکی۔

اقبالؔ نے انقلابِ روس کے بعد اشتراکیت میں بے انتہا کشش محسوس کی اور اُردو شاعری کو ایک نئی اور خوبصورت انقلابی جہت سے آشنا کیا۔ یہ کشش وقتی نہیں تھی۔ ۱۹۱۷ء کے بعد سے ۱۹۳۸ء تک اس کا اظہار ان کی شاعری میں مسلسل ہوتا رہا۔ لیکن بعض اوقات ایسی کیفیات کا اظہار بھی ہوا جن سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اقبالؔ اشتراکیت کے بعض پہلو قبول کرنے سے جھجک رہے ہیں۔ یہ وہ کیفیت ہے جس کو شیکسپیئر نے ہیملٹ کے کردار میں مجسّم کر دیا ہے۔ یعنی صحیح اقدام کی بے پناہ خواہش بھی اور پھر اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے سے گریز بھی۔ اس کیفیت کو شیکسپیئر نے چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔

TO BE OR NOT TO BE THAT IS THE QUESTION

ایک دوسرے انداز سے اس نفسیاتی کیفیت کو غالبؔ نے یوں بیان کیا ہے۔

ایمان مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

اور ایک مصرعے میں جو بات اقبال نے نیٹشے اور کارل مارکس کے لئے کہی ہے اس کا اطلاق خود اقبال پر بھی ہوتا ہے ؎

قلب او مؤمن دماغش کافر است

یہاں کافر منکر کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

شہزادہ ہیملٹ کی اس نفسیاتی کیفیت میں سیاسی سطح پر پنڈت جواہر لال نہرو اور شاعرانہ اور مفکرانہ سطح پر اقبال شریک ہیں۔ یہ تذبذب ہی ابلیس کی مجلس شوریٰ کی تخلیق کا باعث ہے ورنہ جس شاعر نے صاف صاف الفاظ میں یہ لکھا ہو ؎

خواجہ از خون رگ مزدور سازد لعل ناب
از جفائے دہ خدایان کشت دہقانان خراب
انقلاب اے انقلاب

وہ ابلیس کی مجلس شوریٰ کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا تھا۔

اقبال کی زندگی میں ان کی آخری کتاب "ضرب کلیم" شائع ہوئی (۱۹۳۶ء) اس کے دو سال بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کتاب میں دو صفحات پر آمنے سامنے تین نظمیں ہیں جو بال جبریل کی "لینن خدا کے حضور میں" فرشتوں کا گیت اور فرمان خدا کی طرح ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ پہلی نظم کا عنوان "اشتراکیت" ہے اور اس میں یہ مصرع ہے کہ ؎

بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار

اور اس میں شاعر نے اسلام کے ان اسرار کو بیان کیا ہے جنھیں انسان کی ہوس نے صدیوں سے چھپا کر رکھا تھا۔ اور وہ ہی آیتِ قرآنی قُلِ الْعَفْوَ کے مفاہم اور وہ بہت بلیغ ہیں یعنی جو کچھ انسان کے ذاتی اخراجات سے فاضل ہو وہ خدا کی راہ میں خرچ کر دیا جائے۔ اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں بعض علماء نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر ایک شخص کے پاس پانی ہے اور دوسرے کے پاس نہیں ہے تو پہلا شخص سیراب ہونے کے بعد باقی پانی پیاسے آدمی کو دے دے اور اگر وہ انکار

کرے تو پیاسے آدمی کو یہ حق ہے کہ وہ زبردستی پانی چھین لے۔ اس طرح اقبال نے روس یا اشتراکیت کی معاشی جمہوریت کو اسلام کی تعلیم کے مطابق قرار دیا ہے۔ دوسری نظم "کارل مارکس کی آواز" ہے جس میں مارکس یورپ کے معاشی نظام کو "عقل عیار کی نمائش" قرار دیتا ہے۔ اور تیسری نظم قطعہ کی شکل میں ہے اور اس کا عنوان انقلاب ہے اور آخری دو مصرعے ہیں ؂

دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا
قریب آگئی شاید جہانِ پیر کی موت

یہ وہی بات ہے جو فرمانِ خدا کے عنوان سے بال جبریل کی نظم میں کہی گئی ہے ؂

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگادو کاخ امرا کے درو دیوار ہلا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلادو

اس کے بعد جب ہم ابلیس کی مجلس شوریٰ پر نظر ڈالتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ اقبال نے خود اپنے پیام کی تردید کی ہے۔ اقبال کی پوری شاعری میں ابلیس کا کردار ایک انقلابی کردار ہے۔ وہ فطرت کے جدلیاتی نظام میں اثبات کے مقابلے پر نفی کی طاقت ہے اور ان کے باہمی ردعمل سے ارتقا اور انقلاب کی منزلیں طے ہوتی ہیں۔ چنانچہ ابلیس اقبال کے فلسفے میں "خواجۂ اہل فراق" ہے (جس کی لذت طلب وصل میں مرگ آرزو) وہ "خونِ رگ کائنات" ہے۔ وہ اپنے آپ کو "داور بے محشرم ماہر بے دوزخم" کہتا ہے اور جبریل کے سامنے فخریہ انداز سے کہتا ہے کہ ؂

گر کبھی خلوت میسّر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگین کر گیا کس کا لہو
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو

یہ مولوی کے "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" والا ابلیس نہیں ہے بلکہ وہ ابلیس ہے جو "پیام مشرق" میں اس شان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آدم کو تخلیق خدا نے کیا ہے۔ لیکن وہ جوان ابلیس کی گود میں ہوا ہے اور اس طرح "ابلۂ جنت" "دانائے راز" بنا ہے اور نیک و بد میں تمیز کر کے اپنی انسانی صفات

کو خدائی صفات میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے یہ ایک فلسفیانہ توجیہ ہے۔ لیکن "ابلیس کی مجلس شوریٰ" کے دوسرے اجلاس کا ابلیس ایک رجعت پرست کردار ہے جو سامراج شاہی شہنشاہیت اور فاشزم کا خالق ہے اور اپنی آنکھوں سے اپنی شکست کا نظارہ کر رہا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ شکست اشتراکیت کے ہاتھوں ہوگی یا اسلام کے ہاتھوں یا دونوں کے انقلابی اشتراک سے۔ اقبالؔ کی نظم کے بعد کیفی کی نظم اس صورتِ حال کی نشاندہی کرتی ہے۔

اقبالؔ کی نظم میں چار نظام ہیں۔ ایک شہنشاہیت دوسرے فاشزم، تیسرے اشتراکیت، چوتھے اسلام، ان میں سے پہلے دو نظام ابلیس کی تخلیق ہیں۔ اور انقلاب کی زد پر ہیں اور متزلزل نظر آرہے ہیں۔ اشتراکی نظام اور اسلام کا ابلیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان دونوں میں یہ اہم مماثلت ہے کہ یہ دونوں ابلیسی نظاموں کے خاتمے کا باعث ہیں۔ یہاں اگر اقبالؔ کی زبان اور لہجے کا تجزیہ کیا جائے تو یہ دلچسپ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ابلیس کے تیسرے اور چوتھے مشیر کی تنقید سے مارکس اور اشتراکیت کی عظمت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ مثلاً تیسرا مشیر یہ کہتا ہے کہ مغرب کے جمہوری نظام کے اندر روحِ سلطانی کارفرما ہے۔ لیکن وہ اس کو زندہ نہیں رکھ سکے گی کیونکہ ایک یہودی (مارکس) شرارت پر آمادہ ہے ؎

وہ کلیم بے تجلی وہ مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہِ پردہ سوز
مشرق و مغرب کی قوموں کے لئے روزِ حساب
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

اس کے جواب میں ابلیس اپنی نئی تخلیق فاشزم کا ذکر کرتا ہے۔ جو رومۃ الکبریٰ کے ایوانوں سے ابھر رہی ہے اور اشتراکیت کو ختم کر دے گی اس پر پانچواں مشیر پھر مارکس اور اشتراکیت کی ناقابلِ شکست طاقت کا ذکر کرتا ہے ؎

گرچہ ہیں تیرے مرید افرنگ کے ساحر تمام
اب مجھے ان کی فراست پر نہیں ہے اعتبار
وہ یہودی فتنہ گر وہ روح مزدک کا بروز
ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تار تار
زاغ دشتی ہو رہا ہے ہم سر شاہین و چرخ
کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاج روزگار
چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعت افلاک پر
جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشت غبار
فتنہ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج
کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار
میرے آقا وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

ان اشعار کے بارے میں اسلوب احمد انصاری، جو اشتراکیت کے شیدائی نہیں ہیں یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ "ان سب الفاظ اور تراکیب کا مجموعی تاثر نئی انقلابی تحریک کے دوررس، تہلکہ خیز اور لامحدود امکانات اور نتائج کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ کوئی بھونچال ہے جس نے زمین اور آسمان کو ہلا کر رکھ دیا ہے یا توانائی کا لاوا ہے جو اندر سے ایک دم پھوٹ پڑا ہے۔"
(اقبال کی تیرہ نظمیں صفحہ ۱۹۵)

اور یہ واقعہ ہے کہ اس نظم میں اقبال کا سارا زور بیان اور حسن بیان اس مقام پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ابلیس جس کمزور دلیل کا سہارا لیتا ہے اس میں بڑے سے بڑے شاعر کے پاس بھی زورِ بیان اور حسنِ بیان کا کوئی امکان باقی نہیں رہ جاتا۔ ابلیس کی دلیل صرف اتنی ہے

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد

لیکن اس دعوے اور دلیل کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ انھیں "پریشان روزگار" اور "آشفتہ مغز آشفتہ ہو" لوگوں نے سرمایہ داری اور ملوکیت کی بساط کو الٹ کر رکھ دیا ہے جس کی وجہ سے ابلیس

کی مجلس شوریٰ منعقد کرنے کا جواز پیدا ہوتا ہے اگر" اشتراکی کوچہ گرد" اس بساط کو نہ اُلٹتے تو اس نظم کی تخلیق ہی نہ ہوئی۔ اس کے بعد یہ کہنا کہ ؎

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمّت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

ایک ایسا بیان ہے جس کی تردید وہ خود آگے آنے والے اشعار میں کر دیتا ہے ؎

جانتا ہوں میں یہ اُمّت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مؤمن کا دیں

اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ جس بندۂ مؤمن کا دین سرمایہ داری ہے، وہ سرمایہ داری اور ملوکیت کے لئے اشتراکیت سے زیادہ بڑا خطرہ کیسے بن سکتا ہے۔ شاعر نے" ہے وہی سرمایہ داری" کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جس سرمایہ داری کی ملوکیت کو اشتراکیت ختم کر چکی ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ شاعر کا انقلابی ضمیر بول رہا ہے یا اس کا بیدار سیاسی شعور۔ اس کے بعد ابلیس اس اُمّت کی وہ ساری کمزوریاں بیان کرتا ہے جو اقبالؔ کے نزدیک مسلمانوں کے زوال کے باعث ہیں اس کے پیرانِ حرم کی آستیں میں ید بیضا نہیں ہے اور پیرانِ حرم کی ترکیب اقبالؔ کے اس شعر کی یاد دلا دیتی ہے ؎

یہی پیرِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذرؓ و دلق اویسؓ و چادرِ زہراؓ

اب ابلیس کی ساری آس اور اُمید اس اُمّت کی بیداری پر ہے اور اس بیدار امت کی جن خوبیوں کی اقبالؔ نے بیان کیا ہے وہ اقبالؔ کے اسلام کی تشکیلِ نو کے خلاف ہیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ گاندھی کی تعلیمات ہیں جو غیر انقلابی رہی ہیں جن میں سرمایہ دار دولت کا متولّی بن جاتا ہے اور" کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار" کے کوئی معنی نہیں رہ جاتے جب یہ شعر آتا ہے کہ ؎

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

تو بے ساختہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلم حکمرانوں اور مسلم سلطنتوں کی چودہ سو برس کی تاریخ میں اس پر کبھی عمل نہیں کیا گیا اور زمین بادشاہوں اور جاگیرداروں کی ملکیت رہی اور زمین جوتنے والا کسان جانوروں سے بدتر زندگی گزارتا رہا۔ اور آج جب اشتراکی کوچہ گردوں نے زمین جاگیرداروں سے لے کر کسانوں کو واپس کر دی اور الارض واللہ صحیح معنوں پر عمل کیا تو ابلیس یہ کہتا ہے کہ عمل کرنے والوں سے زیادہ خطرہ سرمایہ داری نظام اور ملوکیت کو ان بے عملوں سے ہے جو حاملِ قرآن نہیں ہیں لیکن بیدار ہو سکتے ہیں۔ یہ اقبالؔ کی نظم کا سب سے کمزور حصہ ہے۔

لیکن اقبالؔ کی نظم ابلیس کی مجلس شوریٰ اس اعتبار سے بہت زیادہ اہم نظم ہے کہ اقبالؔ کی تاریخی بصیرت نے ۱۹۳۶ء کے آس پاس یہ محسوس کر لیا تھا کہ ایشیا میں سرمایہ داری ملوکیت اور اشتراکیت کی جنگ میں اسلام کا شریک ہونا ضروری ہے اور آخری بات یہ ہو گی کہ اسلام اور اشتراکیت ایک دوسرے کے مقابل آئیں گے۔ لیکن خود اقبالؔ کی تعلیمات اور افکار میں یہ چیز موجود ہے کہ اشتراکیت کے معاشی نظام کا جواز اسلام کی تعلیمات میں موجود ہے۔

دراصل کیفی کی نظم اقبالؔ کی نظم کا جواب نہیں ہے بلکہ ان امکانات کا اظہار ہے جو اس تاریخی دور کے بطن میں پوشیدہ ہیں۔ آج عالمِ اسلام اور اشتراکیت کے درمیان ایک نئی مفاہمت کی ضرورت ہے جو تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ سرمایہ داری ملوکیت کا خاتمہ صرف اشتراکیت کرے گی اور اسلام کی جمہوری اور انسانی روایات اس کا ساتھ دیں گی۔

اقبالؔ کی یہ بشارت پوری ہو گی ؎

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

("ابلیس کی دوسری مجلس شوریٰ" سے)

گیان چند

خانہ جنگی ایک سیاسی مثنوی

دورِ جدید میں اگر مثنوی بحیثیت ایک صنف اپنی انفرادیت کھو بیٹھی ہے مگر پھر بھی بعض شعرا نے کسی قدر طویل مثنوی کہیں ۔ انھیں میں کیفی اعظمی کی مثنوی "خانہ جنگی" ہے جو ان کے مجموعۂ کلام "آخرِ شب" (طبع اوّل مئی ۱۹۴۷ء) میں شامل ہے۔ اس مثنوی کے آخر میں ستمبر ۱۹۴۶ء کی تاریخ درج ہے۔ مثنوی میں ۲۱۵ شعر ہیں۔ چونکہ دو شعروں کی تین بار تکرار ہوئی ہے اس لئے اس میں دراصل ۲۱۱ شعر ہیں۔ مثنوی میں ابنائے وطن کو فرقہ دارانہ فسادات سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے۔ جب قوم پرست قوتیں بدیسی حکومت کے خلاف کارزار میں غرق تھیں مسلم لیگ انگریزوں کے خلاف نہیں بلکہ قوم پرست قوتوں کے خلاف میدان میں کود پڑی ۔ اس کی ابتدا کلکتے میں راست اقدام سے ہوئی جو بڑے پیمانے پر ریاستی حکومت کے کرائے ہوئے فرقہ دارانہ فساد کے سوا کچھ نہ تھا۔ تب سے کر ۱۹۴۸ء کے اوائل تک ملک ایسے وحشیانہ فسادات کا شکار رہا جو تاریخ میں بے نظیر ہیں۔ کلکتے کا فساد مسلم لیگ نے کرایا تھا ۔ اس کے جواب میں ہندوؤں نے بہار اور گڑھ مکتیشور میں مسلمانوں کو ہلاک کیا اور اس کا جواب الجواب مشرقی بنگال میں نواکھالی میں دیا گیا۔ دونوں فرقے برابر ملوث تھے ۔ غیر جانبدار حساس شاعر کو ایسے میں نومیدی کے سوا کیا ہاتھ آئے گا ۔ مثنوی کی شروعات غالب کے قنوطی شاہکار سے ہوتی ہے ۔

کوئی امید بر نہیں آتی ؛ کوئی صورت نظر نہیں آتی

اور اس کے بعد ہی اشعار میں اسیر کیا ہے فسادات کے دوران محلوں کے ہراساں سنسان ماحول کو

سوکھتی ہے پڑ وسیوں سے جان | دوستوں پر ہے قاتلوں کا گمان
لوگ گھر سے نکلتے ڈرتے ہیں | راستے سائیں سائیں کرتے ہیں
شہر ویراں ہیں بند ہیں بازار | اینڈتا ہے فضا میں گرم غبار
ناکے ناکے پہ ہے پولیس کا راج | ہو چکی ہے گلی گلی تاراج
جیپ ہر موڑ سے گزرتی ہے | ہر طرف فوج گشت کرتی ہے

اور اس کے بعد شاعر کلکتہ، نواکھالی، بہار، بمبئی اور دلی کو پکار کر پوچھتا ہے یوں کہ دیتا ہے، ان کے شیطان کو ان کی نظروں کے سامنے ڈال دیتا ہے۔ نواکھالی کے لئے کتنا درست کہتا ہے۔

فطرتِ شرع میں فساد نہیں | رہزنی داخلِ جہاد نہیں
کہہ کے تکبیر با ندھ کر نیت | ماؤں بہنوں کی لوٹ لی عزت
راست اقدام خوں میں ڈوب گیا | آج اسلام خوں میں ڈوب گیا

اور بہار سے کہتا ہے

گیت گا کر مہاتما جی کے | پیٹ ماؤں کے چاک کر ڈالے

میں نہیں کہہ سکتا کہ بہار کے مفسد، مہاتما گاندھی کے گیت گاتے تھے۔ فسادات کے نعرے مذہبی لگا ؤ ظاہر کرتے تھے۔ اللہ اکبر، ہر ہر مہادیو، ست سری اکال وغیرہ کی بانگوں کو پیٹ چاک کرنے اور بھالے گاڑنے پر اکسانے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ بہار کے فسادی مہاتما گاندھی کے پسندیدہ گیت (ایشور اللہ تیرے نام، ویشنو جنتو) تو نہ گاتے ہوں گے انھیں مہاتما سے اس طرح دور کی نسبت ہو سکتی ہے کہ اس وقت میں عام طور پر ہندو، فسادیوں سمیت، مہاتما گاندھی اور کانگریس کے حلیف تھے۔ وہ کانگریس آج کی موقع پرستوں کی کانگریس نہیں تھی۔

اور پھر شاعر فتنہ پرور لیڈروں کو پکار کر کہتا ہے کہ آؤ لاشیں شمار کرو۔ یہ لاشیں ہندو مسلمان کی نہیں بلکہ

لاش علم و ادب کی، حکمت کی | لاش کلچر کی، آدمیت کی
لاش سوراج کی، خلافت کی | لاش ہر جہد، ہر بغاوت کی
لو محمد علی کی لاش ہے یہ | لو تلک سے بلی کی لاش ہے یہ

لو بھگت سنگھ سے جوان کی لاش | لو یہ ہے مویلا کسان کی لاش
لاش ہے یہ علاحدیت کی | لاش ہے یہ اکھنڈ بھارت کی

یہ صحیح ہے کہ فساد کی لاشیں مندرجہ بالا سب کی تھیں لیکن علاحدیت کی نہ تھی ۱۹۴۶ء میں شاعر یہ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن آئندہ سال ثابت ہو گیا کہ فسادات نے علاحدیت کو خون پلا کر پروان چڑھایا۔
یہ جو انتقام کا چکر تھا کلکتہ، بہار، نواکھالی وغیرہ اس پر شاعر ہندو مسلمان کو شرمندہ کرتا ہے۔

خون کے ایک ایک قطرے کا | تم نے اپنوں سے لے لیا بدلا
لیکن اس سے ملا سکے نہ نگاہ | کر دیا جس نے زندگی کو تباہ

مراد یہ ہے کہ ہندو مسلمان نے اپنے فریق کے خون کے ایک ایک قطرے کا فریق مخالف سے بدلے لیا لیکن انگریزوں سے آنکھیں نہ ملا سکے۔ مجھے اس سے پورا اتفاق نہیں ہندوستانیوں نے انگریزوں سے بار بار آنکھیں ملائیں۔ ۴۲ء اور اس کے بعد کے ایام شاہد ہیں۔
شاعر نے فسادات کے ذریعے ملک کے عزیز ورثے کی تباہی کا خوب نقشہ کھینچا ہے۔ ایسے جانکاہ موضوع میں اس نے شعریت اور تغزل کو گھول دیا ہے۔

روئے کشمیر سے اڑا لی آب | لوٹ لی شان و شوکتِ پنجاب
ہو گئی مالوے کی نیند حرام | رات دے کے اودھ سے لی شام
زلف بنگال بڑھ کے بکھرا دی | صبح کاشی پہ دھوپ دوڑا دی

واضح ہو کہ شب مالوہ، شام اودھ، زلف بنگال اور صبح بنارس مشہور ہیں جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس وقت تک کشمیر، مالوہ، اودھ، اور بنارس میں فسادات نہیں ہوئے تھے۔ ہاں جن خوبیوں کے لئے یہ مشہور تھے وہ ضرور مدھم پڑ چکی تھیں۔ اس تاراجی کو تغزل کی زبان میں سنئے۔

انکھڑیوں کا سرور چھین لیا | عصمتوں کا غرور چھین لیا
عارضوں کے گلاب توڑ لئے | ماہتاب آفتاب توڑ لئے
ڈال دیں گتھیاں ترنم میں | کرب حل کر دیا تبسم میں

آخری شعر کے دونوں مصرعے قابلِ توجہ ہیں۔ اسی میں آگے چل کر ایک طنزیہ شعر ہے۔

ماجد، نواب، ثمر، منافع خور — لا کے گھر میں بسادیے سو چور

ثمر کی خوب خبر لی ہے۔ اور پھر شاعر بدلے ہوئے زمانے کی طرف اشارہ کرتا ہے

ملک ملک ہو گئے آزاد — ہو رہا ہے نیا جہاں آباد

زہر اترتا ہے تلخ کامی کا — مٹ رہا ہے نشان غلامی کا

تشنہ کاموں کے پاس جام آیا

دورِ آزادیٔ عوام آیا

اور یہاں ہے ابھی وہی رفتار — باہمی جنگ، باہمی پیکار

منزلِ فتح کے قریب آکر — اپنے دستے پہ پھٹ پڑا لشکر

سوچنا پڑتا ہے کہ شاعر کن ملکوں کے آزاد ہونے کا ذکر کر رہا ہے۔ ایشیا اور افریقہ کی نوآبادیوں کی آزادی کا سلسلہ تو ہندوستان کی آزادی کے بعد ہی شروع ہوا تھا۔ شاید وہ ان ممالک کی طرف اشارہ کر رہا ہے جنھیں دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمنی اور جاپان نے محکوم بنالیا تھا۔ وہ سب آزادی جنگ کی عارضی کروٹ تھی ان کا آزاد ہونا آزادیٔ عوام نہیں۔ کیا شاعر کی منظم چین میں کمیونسٹوں کی فیروزی پر تو نہیں

شاعر یومِ رشید کا ذکر کرتا ہے۔

یاد ہو گا کسے وہ یومِ رشید — ص ۱۳۳

یادِ یومِ رشید کی سوگند — ص ۱۴۰

ہم یومِ رشید کی تلمیح سے واقف نہیں۔ میرے رفیقِ کار ڈاکٹر سید مجاور حسین رضوی کا قیاس ہے کہ آزاد ہند فوج میں کوئی کیپٹن رشید تھے۔ ان پر برٹش حکومت مقدمہ چلا رہی تھی۔ انھیں کے سلسلے میں کوئی یوم منایا گیا ہو گا۔ اس دن ہندو مسلمان مل کر آزادی کا جہاد کر رہے تھے۔

وہ ترنگے کا کھل کے لہرانا — وہ ہلالی علم کا بل کھانا

لال جھنڈا وہ دل بڑھائے ہوئے — وہ جواں تیوریاں چڑھائے ہوئے

گولیاں خوں میں بھر رہی تھیں ذقند — گیس نظروں پہ ڈالتی تھی کمند

پھر بھی بڑھتا ہی جا رہا تھا جلوس

ساری دیواریں ڈھا رہا تھا جلوس

کانگریس، مسلم لیگ اور کمیونسٹ پارٹی کے جھنڈوں کا اکٹھا ہونا معجزے سے کم نہیں۔ میرے علم کی حد تک مسلم لیگ نے کبھی برٹش حکومت سے ٹکر نہیں لی۔ اس کے قائدین کو کبھی قید و بند کا منہ دیکھنا نہیں پڑا۔ جہاں تک کمیونسٹ پارٹی کا تعلق ہے دوران جنگ وہ برٹش حکومت کی حلیف تھی۔ سبھاش چندر بوس اور آزاد ہند فوج کو جاپانی حکومت کی تائید تھی اس لئے کمیونسٹوں نے آزاد ہند فوج کے کسی سابق افسر کی رہائی کے لئے مطالبہ کیا ہو تو یہ بھی حیران کن ہے۔ بہر حال یہ متحدہ جلوس ؎

دے کے دشمن کو فتح کا پیغام منتشر ہو گیا جلوس تمام

پھر شاعر بنگال کے کسی مسلمان کا ذکر کرتا ہے جس نے کسی شہید کی قبر پر مٹھی بھر مٹی لے کر دعا کی تھی کہ اے سردار، کاش تیری شہادت ہندو مسلم کو متحد کر دے۔ میں اس تلمیح سے بھی واقف نہیں یوم رشید اور اس صلح کل قوم پرست کے بارے میں فٹ نوٹ میں صراحت کر دی جاتی تو بہتر تھا۔

انگریز حکومت کے پاؤں اکھاڑنے میں ہندوستان چھوڑو تحریک، آزاد ہند فوج کی لڑائی اور بمبئی میں بحریہ کے سپاہیوں کی بغاوت یہ تین عوامل شدت سے اثر انداز ہوئے۔ شاعر نے ملاحوں کی بغاوت کا بیان کیا ہے اور پھر اپنی مارکسیت کا ادا کرنے کے لئے مزدوروں کی ہڑتال کا ذکر لے آئے۔

کامگاروں کا دیدنی تھا جلال غیظ میں ہو گئے تھے چہرے لال

رک گئی تھی گرج مشینوں کی کارخانوں میں دھول اڑتی تھی

اور پھر اہلِ مشن کے آنے پر رہنماؤں نے بڑھ کر ان کے گلوں میں ہار ڈالے اور خانہ جنگی کا تحفہ لیا۔ مجھے یہ اعتراض ہے کہ کیبنٹ مشن نے خانہ جنگی نہیں دی۔ ہم تو خود ہی لڑ رہے تھے۔ اپنی کوتاہی انگریزوں کے سر کیوں منڈھی جائے۔ وائسرائے لارڈ ویول پر اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اس نے مسلم لیگ کو عبوری حکومت میں لے کر ملک کی تقسیم کی بنا مستحکم کر دی لیکن

یہ پھوٹ ہماری اپنی تھی۔ ہم تو آزادی کے بعد بھی فرقہ وارانہ بنا پر لڑا کیے ۔

مثنوی کا ۱۴۲ اشعار کا بڑا جزو یہاں ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد ۲۰ شعروں کا جزو "عوام" کے عنوان سے ہے مجھے یہ دونوں اجزا کسی قدر دو لخت معلوم ہوتے ہیں۔ پہلا بڑا جزو بدیسی حکومت کے خلاف ہے تو دوسرا جزو کارخانہ داروں اور سرمایہ داروں کے خلاف۔ ایک وقت میں ایک دشمن سے، ایک ہی محاذ پر لڑا جا سکتا ہے۔ ۴۵ء میں جنگِ عظیم کے خاتمے سے جون ۴۷ء تک ہندوستانیوں کا ایک ہی دشمن تھا اور اسی کے خلاف جنگ آزادی لڑی جا رہی تھی اگر اس وقت مِل مالکوں یا زمین داروں کے خلاف احتجاج کیا گیا تو وہ جنگِ آزادی سے علٰحدہ کوئی اور لڑائی تھی شاعر کہتا ہے ۔

حکمراں حکمراں کے رکھوالے ــــــ یہ ملوں والے یہ زمیں والے
گمرہی، اجہل، وہم کے رہبر ــــــ دورِ محکومیت کے نورِ نظر

کسانوں اور مزدوروں نے انگڑائی لی۔ کشمیر، ٹراونکور، پٹیالہ اور تلنگانہ میں احتجاج ہوئے۔ بنگال کی طرف دیکھ کر نوجوان ابل پڑے اور سب نے پھوٹ کی آگ کو بجھا کر انگریزوں سے لڑنے کا عہد کیا۔

جب سلگنے لگا لوا کھالی ــــــ اور آگ آس پاس پھیل گئی
سرخ پرچم لیے کسان اٹھے ــــــ بوڑھے نو عمر نوجوان اٹھے

مجھے کسی سیاسی گروہ سے تعلق نہیں لیکن یہاں شاعر نے جس طرح سرخ پرچم کو جنگِ آزادی کی آخری پشت پناہ قرار دیا ہے وہ تاریخی حقیقت نہیں۔ کمیونسٹ پارٹی جنگ کے دوران برٹش حکومت کے ساتھ تھی اور ہندوستان چھوڑو کی بغاوت عظیم کی مخالف۔ جنگ ختم ہونے کے بعد وہ کس منھ سے انگریز حکومت کو نکالنے میں نمایاں رول ادا کر سکتے تھے۔ وہ ہڑتالیں تو کرا سکتے تھے لیکن ہڑتالوں سے بدیسی حکومت نہیں نکل سکتی ۔

شعلہ افشاں ہے صبحِ بیداری ــــــ آخری جنگ کی ہے تیاری
جنگ ان سے جو خون پیتے ہیں ــــــ لوٹ کر دوسروں کو جیتے ہیں
جنگ سکوں کی حکمرانی سے ــــــ جنگ بر لاسے، اصفہانی سے

لے وہ مجروح ذہنِ جاں جنگال	تملا کر سنبھالتا ہے کدال
لے وہ ٹھٹھرا ہوا لہو میں بہار	اپنے ہنسیوں کی دیکھتا ہے دھار

متحد ہو گئے کسان مگر	آنکھ جھپکی، بدل گیا منظر
بھیڑ سی لگ گئی ہے کھیتوں پر	لاٹھیاں جمع ہیں منڈیروں پر
نوجوان پینترے بدلتے ہیں	اِس طرف اُس طرف اچھلتے ہیں
ہیں زمیندار دم بخود سارے	آگے بڑھتے نہیں ہیں ہرکارے
ختم ہوتا ہے دورِ خونخواری	ٹلتی ہے لعنتِ زمیں داری
جو کھپائے گا کھیتوں میں جان	اس کے گھر پر لگے گا اب کھلیان
بیج جو بوئے گا، اگائے گا	دھان آنگن میں وہ سکھائے گا
اب نہ بکھریں گے دل جوانوں کے	اب جھکیں گے نہ سر کسانوں کے

اب یہ طوفان بڑھتا جائے گا

اب یہ سیلاب چڑھتا جائے گا

نظم کا موضوع بدل گیا ہے اور دو لڑائیوں کو خلط ملط کر دیا گیا ہے۔ اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ مزدوروں اور کسانوں کا استحصال ہوتا ہے۔ یہ بھی مسلم کہ کمیونسٹ پارٹی کسانوں مزدوروں کی سب سے بڑی بہی خواہ ہے لیکن مندرجہ بالا اشعار میں جس تحریک کا بیان کیا گیا ہے وہ اہلِ ہند کی بنیادی اور مرکزی لڑائی نہیں جو بدیسی حکومت کے خلاف تھی۔ ہندوستانیوں کے ایک طبقے کا دوسرے طبقے کے خلاف نبرد آزما ہونا ایک دوسری خانہ جنگی ہوتی۔ آزادی سے قبل کے چند برسوں کی جنگ صرف کانگریس اور اس کے مویدوں نے لڑی۔ پاکستان بنوانے کی تحریک مسلم لیگ اور اس کے حامیوں نے چلائی اور اسے ترقی پسندوں کی تائید حاصل تھی۔ لیکن برلا اور زمین داروں کے خلاف جنگ آخری جنگ نہیں تھی۔ اگر آخری جنگ سے مراد یہ ہے کہ اس کے بعد کوئی اور جنگ لڑنے کی ضرورت نہ ہوگی تو کیا بدیسی حکومت کے خلاف جنگ کو خیرباد کہہ دیا گیا یا اس کو ثانوی اہمیت دی۔ برلا کی ہمدردی انگریزوں سے نہیں کانگریس اور مہاتما گاندھی

سے تھی۔ اس وقت ہندوستان کی سب سے بڑی دشمن برطانوی شہنشاہیت تھی دیسی سرمایہ داری نہیں۔ اگر دیسی مل مالکوں اور زمین داروں کے خلاف جنگ کو سب کچھ سمجھ لیا گیا تو شہنشاہیت کو سانس لینے کی مہلت مل جاتی۔ صحیح طریقہ یہی تھا کہ پہلے سب متحد ہو کر مشترکہ دشمن یعنی بیرونی حکومت کو ملک بدر کرتے پھر طبقاتی جنگ لڑتے۔ معاشی آزادی سیاسی آزادی کے بعد ہی آسکتی ہے۔

جسے شاعر نے آخری جنگ قرار دیا ہے وہ تو اب بھی جاری ہے۔ کھیتوں میں جان کھپانے والے کی حالت اب پہلے سے قدرے بہتر ہے لیکن اب بھی کسانوں کے سر جھک جاتے ہیں۔

مارچ ۱۹۸۰ء میں کیفی اعظمی حیدرآباد کی مرکزی یونیورسٹی میں آئے۔ ایک نظم سنانے سے قبل انہوں نے کہا کہ یہ میرے نظریے کے خلاف مایوس کن ہے'۔ امید اور یاس کسی حکم کے ذریعے طاری نہیں کی جا سکتیں۔ یہ حالات پر منحصر ہیں۔ ترقی پسند نظریے کا حکم تھا کہ خواہی نخواہی ہر ادبی تخلیق کو رجائیت پر ختم کرو اور یہ عقیدہ ظاہر کرو کہ آنے والا کل آج سے بہتر ہوگا۔ ستمبر ۱۹۴۶ء حالات کسی طرح امید افزا نہیں تھے۔ شاعر یہ تو پیشین گوئی کر نہ سکا کہ بدیسی حکومت کا چل چلاؤ ہے، اس نے مزدوروں اور کسانوں کی تحریک میں امید کی کرن ڈھونڈھ نکالی۔ کہیں وہ اس فرمائشی رجائیت سے خود کو دھوکا تو نہیں دے رہا۔

خلیل الرحمن اعظمی لکھتے ہیں[1]

"اس سلسلے کی سب سے زیادہ کامیاب مثنوی خانہ جنگی ہے جو حالی کے شکوۂ ہند کے طرز پر لکھی گئی ہے۔

میری رائے میں شکوۂ ہند اور خانہ جنگی میں کوئی مناسبت نہیں شکوۂ ہند کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے۔

الوداع اے کشورِ ہندوستاں جنت نشاں ٭ رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیسی میہماں

اس نظم کے بارے میں ۱۹۵۲ء میں سید ہاشمی فرید آبادی نے لکھا[2]

---

[1] اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ۱۹۷۲ء۔ ص ۱۷۱۔ [2] ہاشمی فرید آبادی، شکوۂ ہند۔ مشمولہ رسالہ اردو حالی نمبر، اپریل ۵۲ء۔ کراچی۔ ص ۱۴۷

"۲۔ یہ تصور کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں مولانا کی ہر نظم خصوصاً مسدس حالی میں مضمر و کارفرما ہے لیکن اس قدر صریح اور واشگاف پیرائے میں کہیں بیان نہیں ہوا جیسا کہ شکوۂ ہند میں۔

۳۔ نظم کا تیسرا امتیاز یہ ہے کہ بعد کے واقعات اور پاکستان کی تاسیس بالخصوص وسیع پیمانے پر مسلمانوں کی ہندوستان سے نقل مکانی نے اسے دور بینی اور پیش گوئی کی ایک دلچسپ مثال بنا دیا۔"

شکوۂ ہند اور مثنوی خانہ جنگی میں دور تک کوئی تعلق نہیں۔ شکوۂ ہند ملّی نظم ہے، خانہ جنگی ہندو مسلم اتحاد کی نقیب اور بدیسی حکومت کے خلاف احتجاج کے جذبے سے سرشار ہے۔ اس نظم کو مناسبت ہے تو حالی کی مثنوی حبِ وطن سے خانہ جنگی کے مصرعے دیکھیے۔

بھائی بھائی کا خوں بہاتا ہے — ص ۱۳۷

بھائیوں کو لڑا بھی دیتے ہیں — ص ۱۳۹

بَیر تا چند بھائی بھائی کا — ص ۱۴۰

حالی کی مثنوی حبِ وطن میں بھی بھائی بھائی کے بارے میں بیسیوں مصرعے ہیں لیکن خانہ جنگی کے مصرعوں کی نشست نواب مرزا شوقؔ کی مثنویوں کی چستی کی یاد دلاتی ہے۔

ہو گئے دیکھ گھر کے گھر خالی — ص ۱۲۸

زہرِ عشق میں ہے

عشق سے کون ہے بشر خالی — کر دیے اس نے گھر کے گھر خالی

چونکہ یہ مثنوی ایک روایت بستہ مثنوی میں کی گئی ہے اس لیے نامناسب نہ ہوگا کہ اس کے فنی پہلو پر روایتی انداز سے ایک نظر ڈالی جائے۔

مثنوی کی ہیئت کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں تھکا دینے والا تسلسل ہوتا ہے۔ بندوں کی تقسیم نہ ہونے کی وجہ سے ایک یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اقبال نے اس کا توڑ یہ نکالا کہ اپنی اردو مثنویوں، مثلاً ساقی نامہ میں، موضوع کے اعتبار سے بندوں کی تقسیم کی یعنی ایک بیت کو ترکیب بند کے انداز پر ٹیپ بنا کر رکھا گیا اور اس کے آگے دوسرا جزو شروع کیا گیا۔ کیفی نے بھی موضوع کے لحاظ سے اسی طرح مثنوی کو بندوں میں توڑ لیے اب خالص فن پر آئیے

ع ہندو مسلم وطن کو بھول گئے

ع ہندو مسلم کو متحد کر دے

ع پہلو حکام کے بھی گرمائے

ہندو اور پہلو فارسی لفظ ہیں ان کی واؤ کو گرانا کسی قدر گراں گزرتا ہے۔

کمسنائی زمین پٹیالہ حملہ آور ہوا تلنگانہ

ہو سکے گا نہ ارتقا گھائل مر سکے گی نہ روحِ مستقبل

پٹیالہ اور تلنگانہ کا قافیہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ گھائل کا کتابی تلفظ کچھ بھی ہو موجودہ بول میں اسے ل ماقبل مفتوح بولا جاتا ہے جب کہ اس شعر میں ماقبل مکسور ہے۔

خوں اہنسائی پر، جلالی پر : خوں ترنگے پر، خوں ہلالی پر

اہنسائی اور جلالی کیا ہوتے ہیں؟ - یہ دونوں الفاظ وزن و قافیہ کا پیٹ بھرنے کے لئے لائے گئے ہیں یعنی مصرع بھرتی کا ہے۔

مندروں کی زمین دہلا دیں قبر کے ساتھ مسجدیں ڈھا دیں

مورتوں کے گلوں سے ہار لئے مقبروں کے کلس اتار لئے

مورت کے معنی ہیں تصویر - مورتی کے معنی مجسمہ - یہاں مندروں کی مورتی مراد ہے اس لئے "مورتیوں" کا مقام تھا لیکن بحر کے جبر سے مورتوں، لکھ دیا ہے۔

خوں شدہ انکھڑیوں میں لرزاں آگ ص ۱۳۳

تھیں ضعیفوں کی انکھڑیاں گلنار ص ۱۳۷

آنکھ اور انکھڑی کے معنوں میں جذباتی فرق ہے۔ یہ نہیں کہ کہیں بھی آنکھ کی جگہ انکھڑی لکھ دیا جائے۔ انکھڑی کسی حسینہ کی آنکھ کو کہتے ہیں مجاہد یا بوڑھے کی آنکھ کو نہیں۔ جو نسبت مکھڑے اور مکھ میں ہے وہی انکھڑی اور آنکھ میں ہے آنکھوں کا لفظ آسانی سے مصرع میں نہیں سما رہا تھا اس لئے انکھڑی لکھ دیا۔

ان مشاہدات سے قطعِ نظر نظم صوری پہلو کے لحاظ سے بھی چست ہے اور معنوی پہلو سے تو قابلِ داد ہے ہی۔ کیسے کیسے حسین مصرعے ہیں۔

۶ تیوریوں میں چمکتے ہیں خنجر ص ۱۲۷

۶ اینڈتا ہے فضا میں گرم غبار ص ۱۲۷

ڈال دیں گتھیاں ترنم میں کرب حل کر دیا تبسم میں

۱۹۴۷ء کے سیاسی پیش منظر کو اس نظم میں بڑی حقیقت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے لیکن آخری حصّے میں اپنے عقیدے کے جبر کے تحت جو سرمایہ دار اور زمین دار کو بڑکایا ہے اس سے نظم کی وحدتِ تاثر مجروح ہوتی ہے۔

علی احمد فاطمی

اُردو کی پہلی سیاسی مثنوی۔ خانہ جنگی

ہیئت کے اعتبار سے دیگر اصنافِ سخن کی طرح مثنوی بھی فارسی سے مستعار ہے لیکن موضوع کے اعتبار سے اردو کی مثنویاں فارسی مثنویوں سے خاصی مختلف رہی ہیں۔ فارسی کی مثنویاں زیادہ تر رزمیہ۔ عشقیہ۔ حکیمانہ یا صوفیانہ رنگ میں لکھی گئیں۔ فردوسی کا شاہنامہ ایک طرح سے رزم نامہ ہے لیکن ساتھ ہی حکومتِ وقت کا طور طریقہ، طرزِ جنگ وغیرہ پر اچھی روشنی پڑتی ہے اور کہیں کہیں عشقیہ مضامین بھی اور بقول پروفیسر سید محمد عقیل۔ "شاہنامہ میں سیاست۔ مذہب۔ حکومت۔ فطرت نگاری رزمیہ فنون کا ایک مبسوط ذکر ملتا ہے" عنصری اور نظامی گنجوی نے ارمان مثنویاں لکھیں۔ سکندر نامہ ان سے الگ ہے جو سکندر اعظم کی زندگی اور اس کی فتوحات کو پیش کرتی ہے۔ تاتاریوں اور منگولوں کے زبردست حملوں نے جو ایران کی حالت بنائی اور بے ثباتی کا جو منظر پیش کیا اس نے مولانا روم کی مثنوی کا روپ لے لیا جو سراسر صوفیانہ مسائل سے لبریز ہے۔ یہ مثنوی، مثنوی کم انسانی ارتقا اور ارمانی مسائل کا منظر نامہ زیادہ ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ رومی کے بعد کرمانی اور سعدی نے بھی مثنویاں لکھیں اس میں بھی تصوف اور اخلاق زیادہ ہے۔

دور مغلیہ میں ایران کے شاعر ہندوستان بھی آئے۔ امیر خسرو فارسی شاعری کی داغ بیل ڈال چکے تھے۔ دیگر فارسی شعراء نے بھی طبع آزمائی لیکن سارا زور قصیدہ اور غزل پر رہا مثنوی الگ تھلگ رہی اور جہاں تہاں زد میں آئی بھی تو اس پر غزل کا اثر حادی رہا اس تفصیل میں جائے بغیر کہ اُردو میں مثنویوں کا آغاز کس ماحول اور کس اثر کے تحت ہوا، جو ابتدائی نمونے میں ملتے ہیں اور ان میں جو غالب عنصر ہمیں نظر آتا ہے وہ عشق ہے اور جزوی طور پر اس کے ساتھ ہندوستان کا وہ جغرافیائی اور ثقافتی ماحول ہے جو زبان کی نشو و نما کے ساتھ شعر و ادب میں بھی فطری طور پر رچ بس رہا تھا اور یہ سلسلہ آگے بڑھتا گیا، پوری اُردو شاعری میں بالعموم اور اُردو مثنوی میں بالخصوص پورے ادب و آداب۔ مزاج و مذاق کے ساتھ سماتا گیا۔ بابا فرید شکر گنج کی مثنویوں سے لے کر قطب مشتری۔ کدم راؤ پدم راو۔ پھول بن میں تو اس کے نمونے اور اشارے ملتے ہی ہیں۔ امیر خسرو تو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب و ثقافت کا مکمل پیکر بن کر اُبھرتے ہیں۔ حاتم، آبرو کے بعد میر اور سودا ایسے شاعر ہیں جنھوں نے قابل ذکر مثنویاں لکھیں۔ سودا کی مثنویاں ان کے قصیدوں کی طرح صرف ان کی قادر الکلامی کا ثبوت پیش کرتی ہیں لیکن میر کی مثنویاں جو عشق کے ارد گرد لکھی گئیں لیکن ان کی زمانہ شناسی اور عصری حسیت ان کی مثنویوں میں بھی اُجاگر ہے۔ ان کی مثنویوں میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں ؎

پڑی آفت خطر تھا سکھوں کا ۔۔۔ کیونکہ وہ ملک گھر تھا سکھوں کا

لون لگ لگ کے جھڑتی ہے ماٹی ۔۔۔ آہ کیا عمر بے مزہ ہے کاٹی

سچ بات یہ ہے کہ سودا۔ میر۔ مصحفی۔ افسوس جیسے استادِ سخن کی طبع آزمائی کے باوجود اردو میں مثنوی کی وہ حیثیت نہ بن سکی جس کا وہ حق رکھتی ہے۔ اردو میں پہلی بار اُسے اصل شہرت میر حسن مثنوی سحر البیان اور اس کے بعد دیا شنکر نسیم کی گلزار نسیم سے ملی۔ اردو کی یہ معرکۃ الآرا مثنویاں ایسی ہیں جن پر سبھی ناقدین ادب ایک سُر اور آواز سے رطب اللسان ہیں خود میر حسن کو بھی اس کی عظمت کا احساس تھا تبھی تو ان کا یہ شعر زبان زد ہو گیا ؎

نہیں مثنوی ہے یہ اک پھلجھڑی ۔۔۔ مسلسل ہے موتی کی گویا لڑی

نئی طرز ہے اور نئی ہے زباں　　نہیں مثنوی ہے یہ سحرالبیان

اس میں شک نہیں کہ یہ مثنوی زبان و بیان کے اعتبار سے ایک نئی اور چونکا دینے والی مثنوی ہے اور اس میں جس طرح زبان، محاورے، اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں اور جس طرح سب کچھ نگینے کی طرح جڑا گیا ہے وہ سب کچھ بے مثال ہے لیکن قصہ پن موضوع یا پیغام کے اعتبار سے یہ محض پھلجھڑی ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں، کم و بیش یہی صورت گلزار نسیم کی ہے۔ لکھنؤ کی زبان صنعت گری و کاری گری کو جس طرح پیش کیا گیا ہے اس کی مثال تو غزلوں میں بھی مشکل سے نظر آتی ہے لیکن موضوع کے اعتبار سے یہ بھی محض خیالی اور تفریحی بلکہ تعیش اور فحش عناصر کو چھوتی ہے۔ میر حسن اور نسیم کی عظمتیں اپنی جگہ پر لیکن جو موضوعات انھوں نے منتخب کئے اور جو ڈھانچہ انھوں نے تیار کیا وہ نہ صرف کمزور، کھوکھلا بلکہ حقائق کی دنیا سے بیزار، فرار کی کی راہ دکھلاتا ہے ایسا وہ کیوں کر گئے یا انھیں دونوں اس قسم کی داستانیں کیوں لکھی گئیں یہ سب ایسے سوالات ہیں جن پر بحث کی جا سکتی ہے لیکن مثنویوں کے حوالے سے یہ سوال بار بار اُٹھ سکتا ہے کہ فارسی سے برآمد یہ صنف ہندوستان آکر اپنی دیرینہ روایت سے کٹ کر محض عشق و محبت اور انسانی حیات و نفسیات سے بالکل دور محض خیالی اور ماورائے انسانی کہانی کا تصوّر اس دور کے کس خیال اور رجحان کو پیش کرتا ہے۔

عام طور پر ہوتا ہے کہ کسی تخلیق کی غیر معمولی مقبولیت دوسروں کے لئے راستہ مسدود کر دیتی ہے۔ ان دونوں مثنویوں نے بھی تقریباً ایسا ہی کیا لیکن کچھ عرصے کے بعد نواب مرزا شوق نے زہر عشق لکھ کر اردو مثنوی کو ایک نیا راستہ دیا وہ راستہ جس پر دیو پری نے اپنے قدم رکھ کر مثنوی کو جنگلوں اور ریگستانوں میں پہنچا دیا تھا ایک بار پھر انسانوں کی بستی میں آگیا بقول سردار جعفری "مرزا شوق نے ان روایتی بلندیوں سے اتنے نیچے اُتر سکے کہ پری کی جگہ سوداگر کی بیٹی اور شہزادے کی جگہ لکھنؤ کے نواب صاحب نے لے لی"

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جہاں زندگی اور ادب کے تمام شعبوں میں نمایاں تبدیلی کا احساس اور اظہار ہوا اردو مثنوی کے موضوعات میں بھی نمایاں تبدیلی آئی۔ زندگی بدلی رویے بدلے، تصورات بدلے، حقیقت پسندی مادہ پرستی میں اضافے ہوئے۔ سماجی

اور سیاسی شعور میں نمایاں تبدیلی آگئی ۔ زندگی بدلی تو غزل اور نظم بھی بدلی ان خوشگوار اور ناخوشگوار تبدیلیوں نے جہاں فن کاروں کا ایک گروپ کلاسیکی صنف سخن سے بیزار ہوا تو کچھ روایت پسندوں نے مثنوی کو تخلیقی اظہار کا سب سے موثر ذریعہ تسلیم کیا، چنانچہ دور جدید کے جتنے بھی سربرآوردہ شاعر ہیں سبھی نے نظموں اور غزلوں کے ساتھ ساتھ مثنویاں بھی کہیں اور ایک نئے انداز اور مزاج کے ساتھ کہ جس نے اردو مثنوی کا معیار اور مذاق ہی بدل دیا ۔ آزاد، شبلی، حالی، اسمٰعیل میرٹھی، اقبال وغیرہ نے مثنویاں کہیں ۔ حالی کی مثنوی حب وطن جذبۂ وطن سے سرشار ہے یہ مثنوی اس وقت لکھی گئی جب ملک میں آزادی کی لہر تیز ہو چکی تھی ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی بنیاد پڑ چکی تھی اگر یہ سب نہ ہوتا، تو حالی اس مثنوی کے اخیر میں یہ نہ کہتے ؎

ملک روندے گئے ہیں پیروں سے   چین کس کو ملا ہے غیروں سے

حالی کی دوسری مثنوی برکھارت ہے جس میں نیچر کا خوبصورت ذکر ہے ۔ شبلی کی صبح امید جو حالی کے مقدمے اور مسدس کے درمیان کی چیز سمجھی جاتی ہے اس میں وہ بہ یک وقت اسلاف کے کارناموں کا ذکر کرتے ہیں تو ساتھ ہی شعراء کے قدیم طرز فکر پر اصلاح بھی کرتے ہیں ۔ اقبال نے ساقی نامہ لکھ کر اردو مثنوی کو ایک فکر ۔ جہت اور جدت عطا کی بقول پروفیسر محمد عقیل ـــ "ساقی نامہ ذوق ۔ جدت ۔ رجائیت اور خودی کے مختلف کارناموں کا مجموعہ ہے ۔" اس مثنوی کا مطالعہ جہاں فکر و خیال کی نئی منزلیں طے کرتا ہے وہیں جوش و عمل کی دعوت بھی دیتا ہے ؎

بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر   طلسم زمان و مکاں توڑ کر

اقبال کی اس مثنوی نے زندگی اور موت ۔ حیات و کائنات کے فلسفے کو جس طرح پیش کیا وہ نہ صرف اردو مثنوی بلکہ پوری اردو شاعری کے لئے بالکل ایک نئی چیز تھی ۔ اس لئے فوراً ہی بعد ترقی پسند شاعروں کا دور آتا ہے ۔ حقیقت پسندی، عوامی دردمندی ۔ انقلاب و احتجاج کا ایک نیا دور ۔ جہاں غلامی سر پہ ہے آزادی دو قدم پر ہے زندگی چوراہے پر آکر کھڑی ہے ۔ موضوعات کی بھیڑ ہے تو شاعروں کی بھی بھیڑ ہے ۔ سنجیدگی ہے تو نعرہ بازی

بھی ہے۔ بے لگامی ہے تو نظریاتی وابستگی بھی ہے ۔ کہا جاتا ہے شاعری میں اتنی وسعت اتنی گہرائی کبھی نہیں آئی جتنی ترقی پسندوں کے دور میں لیکن ان سب کی بھیڑ میں مثنویاں صرف دو ہیں کیفی اعظمی کی خانہ جنگی اور سردار جعفری کی جمہور۔ یہ دونوں مثنویاں سیاسی مثنویاں ہیں۔ پہلی بار ایسا ہوا کہ مثنوی اور عصری سیاست ایک دوسرے کے قریب آئے ورنہ عام طور پر مثنوی کے بارے میں یہی تصور کیا جاتا تھا کہ یہ صنف حقائق کی دنیا سے دور محض تصور و تخیل کی دنیا میں کھیلنے والی رنگ برنگی شے ہے۔ جس کا سیاست اور حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ میر سے لے کر اقبال تک کی مثنویوں کا یہ مختصر سا جائزہ محض اسی خیال کو پیش کرنے کی کوشش ہے کہ اردو میں مثنوی عشقیہ خیالات سے شروع ہوتی ہے آگے بڑھ کر وہ اخلاقی، سماجی اور جغرافیائی عناصر اس میں شامل ضرور ہوتے ہیں لیکن اردو مثنویوں کا تعلق سیاستِ عصر سے نہ پیدا ہو سکا۔ کیفی اعظمی کی خانہ جنگی اس سلسلے کا پہلا قدم ہے ویسے اردو مثنویوں میں بالواسطہ یا بلاواسطہ جنگ اور فسادات کے اثرات داخل اور ظاہر ہوتے رہے ہیں۔ میر کی مثنویوں میں یہ اثرات واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ احمد شاہ ابدالی اور دُرّانی کے حملوں کی گونج میر کے یہاں سنائی دیتی ہے۔ حالی کے یہاں بھی جو جھمک سنائی دیتی ہے لیکن کیفی اعظمی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے براہِ راست سیاسی اور سماجی حالات اور فرقہ وارانہ فسادات کو موضوع بنا کر باقاعدہ مثنوی کہی اور باقاعدہ اسے واقعاتی اور تاثراتی رنگ دے کر اُسے باقاعدہ ایک کامیاب مثنوی بنانے کی کوشش کی۔ جس وقت یہ مثنوی لکھی گئی اُسی وقت کے حالات بقول پروفیسر عقیل — یہ مثنوی اُس وقت لکھی گئی، جب ہندوستان سے انگریزوں کا چل چلاؤ تھا اور ہندوستان کی تقسیم کے منصوبے باندھے جا رہے تھے۔ کرپس مشن جا چکا تھا۔ ہندوستان کی فضا "لے کے رہیں گے پاکستان بٹ رہے گا ہندوستان" "جا رہے جناّ (جناح)، دے دے جان نہیں ملے گا پاکستان" کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ کلکتہ، نواکھالی۔ بہار۔ لاہور، بمبئی میں فرقہ وارانہ فساد کے باعث آگ لگی ہوئی تھی۔ سامراجی، ہندوستان کو غلام بنائے رکھنے کا آخری داؤں کھیل رہے تھے گو بظاہر اپنے جانے کا اعلان کر چکے تھے"۔ یہ تو اس وقت کے عام حالات تھے لیکن اگست ۱۹۴۶ء میں کلکتے میں جو زبردست

ہندو مسلم فساد ہوا جس کی زد میں نواکھالی آیا بہار میں بھی اس کی لپٹیں پہنچیں اور کچھ چنگاریاں بمبئی تک بھی پہنچیں خانہ جنگی کے اس خاص حادثے سے متاثر ہو کر یہ مثنوی لکھی گئی جو براہ راست ان واقعات اور حادثات کو چھوتی ہے مثنوی غالب کے اس شعر سے شروع ہوتی ہے ؎

کوئی امید بر نہیں آتی   کوئی صورت نظر نہیں آتی

جب سے آکر گئے ہیں اہلِ مشن   زندگی کا بگڑ گیا ہے چلن

ویسے تو ہندوستان کے حالات پہلے سے بھی اچھے نہ تھے لیکن کیفی اعظمی کی ملک دوستی اور عوام دوستی اس بدتری کا جائزہ کریپس مشن کے بعد سے شروع کرتی ہے وہ اس بدحالی کا ذمہ دار انگریزوں کو ٹھہراتے ہیں ان کی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں وہ کلکتہ کی زمین کو مخاطب کرتے ہیں اس کے آنچلوں میں لگی آگ اور لٹے ہوئے سہاگ کا ذکر کرتے ہیں ابتدائی بند کے اخیر میں وہ اپنی فطری ترقی پسندی کے تقاضے کے تحت کہتے ہیں ؎

ہو گئے بند کتنے کاروبار   کتنے مزدور بیٹھے ہیں بے کار

مٹ گئی آس بدنصیبوں کی   روٹیاں چھن گئیں غریبوں کی

اسی طرح وہ نواکھالی کو مخاطب کرتے ہیں اور وہاں بگڑی ہوئی صورت لٹی پٹی ماں بہنوں کا ذکر اور نقشہ پیش کرتے ہیں اور صرف انگریزوں کو ہی نہیں اپنی اس قوم پر بھی طنز کرتے ہیں جو اس تشدد میں شریک رہی ہے۔ نواکھالی کے بعد بمبئی اور دلی کا ذکر آتا ہے چاروں طرف بہتے ہوئے خون کا ذکر آتا ہے اور اس بہتے ہوئے خون میں قرآن۔ وید۔ ترنگا۔ اہنسا۔ سب بہہ جاتے ہیں لاشوں کا ڈھیر لگ جاتا ہے غرضکہ ؎

چار سو خون چار سو لاشیں   کو بہ کو خون رو برو لاشیں

اس صورتِ حال میں وہ ایسے تمام فتنہ پرور عناصر کو للکارتے ہیں اور زبردست طنز کرتے ہیں مثنوی کا یہ حصہ بے حد جاندار ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

لو یہ ہے شیخ و برہمن کی لاش   نسل کی، قوم کی، وطن کی لاش

لاش علم و ادب کی حکمت کی   لاش کلچر کی آدمیت کی

لاش سوراج کی خلافت کی   لاش ہر جہد ہر بغاوت کی

لاش ہے یہ علاحدیت کی — لاش ہے یہ اکھنڈ بھارت کی
آفریں ہندوؤ مسلمانوں — لیگ کے کانگرس کے پروانو
خون کے ایک ایک قطرے کا — تم نے اپنوں سے لے لیا بدلہ
لیکن اس سے ملا نہ سکے نگاہ — کر دیا جس نے زندگی کو تباہ

ظاہر ہے ایک بار پھر یہ اشارہ انگریزوں کی طرف کیا گیا ہے جنھوں نے ملک کو اجاڑنے کی بھرپور کوشش کی۔ مثنوی کے اس حصے میں اسی اُجڑے ہوئے بھارت کی تصویر ہے جسے انگریزوں نے بگاڑی اور اس حد تک بگاڑی کہ

زیست کا بند بند کھول دیا — پھوٹ کا زہر خوں میں گھول دیا

اب کیفی اعظمی عالمی سطح کی آزادی اور تبدیلی کا ایک مختصر سا منظر پیش کرتے ہوئے ہندو اور مسلمان دونوں کی ان کی گزشتہ عظمتوں کی یاد دلاتے ہوئے وہ واقعات بطور خاص یاد دلاتے ہیں جب ہندو مسلم اور کانگریس لیگ کمیونسٹ سب ایک مقصد، ایک مشن کے لئے متحد و متفق ہو کر ملک کی آزادی کے لئے انگریزوں کے خلاف اپنی جان کی بازی لگائے ہوئے تھے چونکہ یہ حصہ جوش و ولولے اور پاز یافت اور باز آفرینی کا قصہ ہے اس لئے قدرے طویل ہے جا بجا اس میں بھی بڑے خوبصورت اشارے اور کہانیاں پروئی گئی ہیں جن سے اشعار بے حد معنی خیز اور پُر اثر ہو گئے ہیں مثلاً

قابلِ دید تھا جہاد کا جوش — ہندو مسلم رواں تھے دوش بدوش
ایک ساتھ اُٹھ رہے تھے سب کے قدم — ایک ساتھ اُڑ رہے تھے سب پرچم
ایک ہی جہت ایک ہی رفتار — ایک نعرہ ایک ہی للکار
ایک ہی سعی ایک ہی حاصل — ایک ہی مقصد ایک ہی منزل
ارضِ بنگال یاد تو ہو گا — تجھ کو منظر وہ ایک مرقد کا
جسے ہندو بھی تنے مسلماں بھی — دھرم بھی سرخ رو تھا قرآں بھی
یاد آتا ہے آج رہ رہ کر — ساحلِ بمبئی ترا منظر
بحر و بر کی چمک رہی تھی کمر — اُمڈ آتا تھا شہر ساحل پر

تھیں زمیں برہم آسماں برہم　　طفل برہم تھے نوجواں برہم
تھی ضعیفوں کی انکھڑیاں گلنار　　چتونوں میں مچل رہے تھے شرار
ختم کر دو بہیمیت کا راج　　فرقِ جلاد سے گرا دو تاج

لیکن یہ سب بے کار ہو گیا۔ انگریزوں نے طرح طرح کی چالیں چلیں، کرپس کمیشن بھی ایک چال ہی تھا چنانچہ کیفی کہتے ہیں ؎

مائل لطف تھے جو اہلِ مشن　　عاجزانہ بڑھا دیئے دامن
ہو کے مسرور دے کے دل سے دعا　　خانہ جنگی کا لے لیا تحفہ

مثنوی کا پہلا حصہ یہیں ختم ہو جاتا ہے لیکن جیسا کہ سنجیدہ ترقی پسند شعراء کا مزاج رہا ہے کہ وہ مایوسی اور یاسیت کے بادل میں امید و نشاط، عزم و حوصلہ کا سورج طلوع کرتے ہیں یہ ان کے فکر اور وابستگی کا حصہ ہوا کرتا ہے، چنانچہ کیفی نے بھی نظم کے دوسرے حصے میں عوام کو مخاطب کیا ہے اور کہا ہے کہ اتنی پھوٹ اور نفرت کے باوجود ؎

اے وطن اس قدر اُداس نہ ہو　　اس قدر غرقِ رنج و یاس نہ ہو
خانہ جنگی ہے آخری حربہ　　زر پرستوں کا حکمرانوں کا
لیکن اے غمزدہ غریب وطن　　کہیں رُکتا ہے انقلاب آگھن
قلب جمہور ہو چکا بیدار　　عزم مزدور ہو چکا بیدار
لی کسانوں نے تن کے انگڑائی　　نوجوانوں نے کی صف آرائی
خانہ جنگی کے اس اندھیرے میں　　جل رہی ہیں ہزار قندیلیں
پھوٹ کی آگ ہم بجھا دیں گے　　قتل و غارت گری مٹا دیں گے
کارخانوں سے آرہے ہیں جلوس　　منتشر صف جما رہے ہیں جلوس
ہو رہے ہیں نئی طرح سے بہم　　جن کی فطرت ہے کوششِ پیہم
لوٹ سے جرم سے گناہ سے جنگ　　تاج سے جنگ بادشاہ سے جنگ
ڈال دیں پاے وقت میں زنجیر　　رات دیکھے نہ صبح کی تنویر
بیج جو بوئے گا اُگائے گا　　دھان آنگن میں وہ سکھائے گا

اب یہ طوفان بڑھتا جائے گا　　اب یہ سیلاب چڑھتا جائے گا

کیفیؔ اعظمی نے خانہ جنگی کے مختلف پہلو بیان کیے ہیں اسی طرح اس سے نبٹنے کی ترکیبیں بھی بیان کی ہیں، عوام کو اطمینان اور ڈھارس دلایا ہے کہ ایسے حالات میں مایوس اور کمزور نہیں ہونا چاہئے بلکہ ان کا سامنا کرنا چاہیئے اور اسے شکست دینا چاہیئے۔ اتحاد و اتفاق سے کام لینا چاہئے۔ انھوں نے لڑنے والوں کو EXPOSE کیا ہے مرنے والوں کی دلآویز تصویر کھینچی ہے۔ نادانی اور عقلمندی اور بزدلی اور شجاعت کے درمیان خطِ امتیاز کھینچا ہے اور تاریخی اشارے بھی کئے ہیں۔ ایک طرح سے یہ مثنوی ماضی بعید، ماضی قریب کے اشاروں سے لبریز اپنے عہد کا مکمل رزم نامہ بن کر سامنے آتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس نظم میں کیفیؔ اعظمی کہیں کہیں کچھ زیادہ ہی آدرش وادی اور کمیونسٹ پارٹی کے آرگن بنتے نظر آتے ہیں لیکن پھر بھی عام انسانوں کے تئیں ان کا خلوص اور ملک اور سماج کے لئے ان کا بے لوث پیار، بہتے ہوئے انسانی خون پر ان کا درد ان کی اس مثنوی میں پورے طور پر رچ بس گیا ہے اس پر اس مثنوی کی سادہ اور فن کارانہ زبان نے اس موضوع کو اور بھی پُر اثر اور دلفریب بنا دیا ہے۔ یہ مثنوی روایتی عشق یا قصہ پن سے بہت دور ہے تصوّر و تخیّل سے، بالکل الگ ایک عہد کے بعض تلخ حقائق کا ایک سچّا رزمیہ ہے جو پہلی بار ہندوستان کی آزادی اور جنگ آزادی کے تعلق سے مثنوی کے پیمانے میں پیش کیا گیا ہے۔

سیاسی افکار و خیالات سے لبریز کیفیؔ اعظمی کی یہ مثنوی ایک کامیاب تجربہ ہے اور اُردو مثنوی کا ایک خوبصورت توسیعی وار تقائی قدم ہے جسے جتنا بھی سراہا جائے کم ہے۔ جنگ آزادی نفرت اور بیزاری سے متعلق ہندوستانی ادب میں خوب خوب لکھا گیا ہے اردو میں زیادہ تر اس کے اثرات فکشن میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ انقلاب و احتجاج کی گونج نظموں میں بھی رچی بسی ہے لیکن بندھے ٹکے اور ڈھلے ڈھلائے انداز کی اردو مثنویوں میں روایت اور مزاج کا خیال اور احترام کرتے ہوئے سیاسی مناظر کو اُبھارنا اور اُسے اپنے عہد کا منظر نامہ بنا دینا بہرحال ایک مشکل کام تھا جسے کیفیؔ اعظمی

نے پوری صداقت اور صلاحیت کے ساتھ پیش کیا۔ ظاہر ہے کہ اس کے پیچھے دو باتوں کی واقفیت بے حد ضروری ہے۔ ایک تو صنف کی کلاسکیت پر گرفت اس کی گرامر اور ہیئت پر گہری نظر دوسرے موضوع کے ساتھ وابستگی اور انصاف ــــ کیفیؔ اعظمی دونوں سطح پر کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کی عربی و فارسی دانی اور ان کا سوشل کمٹ منٹ پورے ادب و آداب اور آب و تاب کے ساتھ اس مثنوی میں جلوہ گر ہوا ہے۔ خانہ جنگی، سحرالبیان اور گلزار نسیم کی طرح طویل مثنوی نہیں لیکن یہ اپنی چھوٹی سی ہیئت اور مختصر سے قالب میں طویل انسانی داستان رکھتی ہے، ایک پیغام رکھتی ہے اور ساتھ ہی مثنوی کے بدلتے ہوئے رجحانات، مزاج کو سلیقے سے پیش کرتی ہے، پرانی صنف میں نئے مسائل یا پرانی بوتل میں نئی شراب پیش کرتی ہے اور اس بات کا دعویٰ بھی کرتی ہے کہ اگر شاعر کے پاس کہنے کو اچھی بات ہو اور اچھی طرح سے کہنے کا سلیقہ ہو تو پامال صنف یا پامال موضوع کو بھی نئی زندگی اور توانائی دی جاسکتی ہے۔ کیفیؔ اعظمی کی خانہ جنگی اس کی بہترین مثال ہے۔

مضمون کے اخیر میں دو ایک باتیں اور اُٹھانا چاہتا ہوں۔ پہلی بات اس کے پہلی سیاسی مثنوی ہونے کی ہے۔ سردار جعفری لکھتے ہیں "اردو میں سیاسی مثنوی کا رواج نہیں ہے جمہور اس قسم کی پہلی چیز ہے۔" خانہ جنگی ستمبر ۴۷ء میں شائع ہوئی، جیسا کہ ان کے مجموعے آخرِ شب میں درج ہے۔ جمہور کے پیش لفظ میں تو دسمبر ۴۶ء کی تاریخ لکھی ہوئی ہے لیکن ابتدا میں طبع اوّل کے طور پر مارچ ۴۶ء رقم ہے۔ پروفیسر عقیل رضوی نے اپنی کتاب "اردو مثنوی کا ارتقا" میں خانہ جنگی کو اوّلیت دی ہے۔ پروفیسر گیان چند جو تحقیق کے ماہر ہیں پہلے دوسرے نمبر کی فکر نہیں کرتے وہ ان دونوں مثنویوں کی ہی زیادہ فکر نہیں کرتے شاید ان کے خیال میں یہ نظمیں مثنوی کے روایتی تصور پر نہیں اُترتیں۔ راقم الحروف نے کیفیؔ اعظمی سے ایک ملاقات میں دریافت کیا انھوں نے واضح طور پر کہا " پہلے خانہ جنگی کی تخلیق ہوئی اس کے بعد جمہور کی اشاعت میں جمہور پہلے منظر عام پر آئی صرف چند ماہ قبل ــ اردو میں پہلی بار سیاسی مثنوی میں نے کہی۔"

اور ایک ذمّہ دار معتبر شاعر کے اس بیان کو ہی میں نے اس مضمون کا عنوان بنا دیا۔

دوسری بات، جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ترقی پسندوں کے پاس اتنے مسائل تھے۔ اتنا کچھ کہنے کو تھا کہ جس کی وجہ سے وہ غزل جیسی محدود و مشروط صنف سے بیزار ہوئے اور نظم کی طرف متوجہ ہوئے اور خوب خوب نظمیں کہیں، سارے بند توڑ دیئے یہیں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اتنا کچھ کہنے کو تھا تو نظم کے ساتھ ساتھ زیادہ ہی کھل کر آسان اور پھیلے ہوئے انداز میں کہنے والی صنف مثنویوں کا ترقی پسند شاعروں نے کیوں استعمال نہیں کیا۔ سردار جعفری لکھتے ہیں ؎

"حیرت ہے کہ اس مفید صنف سے ترقی پسند شعراء نے اب تک کوئی کام نہیں لیا۔ شاید انھوں نے مثنوی کو پرانی چیز سمجھ کر ترک کر دیا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس صنف میں بہت امکانات ہیں۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ ہم اس سے بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ جب میں ہندوستان اور دنیا کے موجودہ حالات قومی اور بین الاقوامی جد و جہد اور کشمکش اور ان سے پیدا ہونے والے انسانی جذبات اور احساسات کی وسعت اور پھیلاؤ کو دیکھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ مثنوی کے سوا اور کوئی صنفِ شعر انھیں اپنے دامن میں نہیں سمیٹ سکتی۔ فردوسی کے "شاہنامہ" سے اقبال کے "ساقی نامہ" تک فارسی اور اردو مثنوی کا ورثہ ہمارا بہت بڑا سرمایہ، بہت بڑی دولت ہے۔ پھر یہ کفرانِ نعمت کیوں۔؟"

(نئی دنیا کو سلام ص ۱۸۴)

لیکن یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا خود سردار جعفری کے پاس بھی جواب نہیں۔ بہ قول گیان چند ؎

"سردار نے خود اپنے مشورے پر عمل نہیں کیا۔ انھوں نے مذکورہ بالا موضوعات کو نظم کیا تو مثنوی ان کی دستگیری نہ کر سکی۔ مثنوی جمہور کے علاوہ ان کی طویل نظمیں نئی نئی ہیئتوں میں ظاہر ہوئیں۔"

(اُردو مثنوی شمالی ہند میں جلد دوم ص ۲۹۷)

نئی ہیئتوں کا ذکر قابلِ توجہ ہے جس دور میں یہ سیاسی مثنویاں لکھی گئیں وہ صرف موضوع کی سطح پر ہی نہیں بلکہ ہیئت کی سطح پر بھی انقلاب آفریں دور تھا۔ نظموں کو مزید آزاد اور بلینک ورس کرنے کا دور تھا۔ کچھ نیا پیش کرتے اور بدلتے رہنے کا دور تھا۔ شاعری کا مزاج بدل رہا تھا۔ ایسے میں کسی قدیم روایتی اور کلاسیکی صنف کو اپنانا اور عدیم الفرصتی کے دور میں لمبی لمبی مثنویاں کہنا ممکن ہی نہ تھا حالانکہ سچ بات یہ ہے بقول گیان چند ؎

"مثنوی کی صلاحیتیں لامحدود تھیں لیکن یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس سے اس قدر فائدہ نہیں اٹھایا گیا جس قدر ممکن تھا۔ مثنوی نگار عام طور پر دیو پری کے چکر میں پھنسے رہے جس کی وجہ سے مثنوی نثری داستانوں کا عکس بن کر رہ گئی۔ اردو مثنوی میں کوئی قابلِ قدر رزمیہ یا کوئی شاندار تمثیل پیش نہیں کی گئی۔ محدودے چند چیزیں جو ہیں وہ تیسرے درجے کی ہیں — ظاہر ہے کہ میر حسن کو ایلیڈ، شاہنامہ یا راماین کے مقابلے میں تو نہیں رکھ سکتے۔ مثنوی میں اس کی صلاحیت تھی لیکن مثنوی نگاروں میں نہیں، وہ معمولی فکر کے شاعر تھے۔"

(اُردو مثنوی شمالی ہند میں ص ۹۵-۲۹۴)

دنیا کے تقریباً تمام بڑے ادب میں رزمیے لکھے گئے لیکن بڑے رزمیے تو عالمی ادب میں بھی گنے چنے ہیں۔ عظیم ادب صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ اعتراف کہ اُردو میں بڑا رزمیہ آج تک نہیں لکھا گیا لیکن یہ بھی اعتراف کہ اگر لکھا جا سکتا ہے تو اس کے لئے مثنوی کی ہیئت ہی سب سے کار آمد صنف ثابت ہوگی تبھی تو سردار جعفری اور کیفی اعظمی کو فوری طور پر سہی تاریخی مائل۔ جد و جہد آزادی اور ملک و قوم کی بقا اور ارتقا کے لئے جو چھوٹے چھوٹے رزمیے لکھنے پڑے اسی کے لئے اُنھیں مثنوی کے فارم کا سہارا لینا پڑا اور جب تک کہ مزید کوئی بڑا عہد نامہ یا رزم نامہ نہیں لکھا جاتا اُس وقت تک خانہ جنگی اور جمہور جیسی مثنویوں کی قدر و منزلت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسے کم مائیگی

کہئے یا کم نصیبی کہ ترقی پسند شعرا نے جہاں ادب کو بے پناہ سماجی اور سیاسی شعور عطا کیا۔ وسعت و عظمت عطا کی۔ ادب کو زمین اور دھرتی سے جوڑا۔ اُسی زمین سے جڑی رہنے والی صنف مثنوی سے وہ بے نیاز اور بیزار رہے اور بڑا نقصان کیا۔ فی الحال تو ہمارے پاس یہی دو سرمائے ہیں جنھیں ہم آنکھوں سے لگائیں۔ یا دل سے۔

سبودھ لال

کیفی کی فلمی شاعری

کیفی اعظمی کے فلمی گانوں کی تنقید میں سب سے پہلے یہ کہنا شاید مناسب ہی ہوگا کہ ان کے گانے فلموں کے لیے تو ضرور لکھے گئے ہیں یا استعمال کیے گئے ہیں لیکن فلمی نہیں ہیں۔ بمبئی کی فلمی دُنیا جہاں اچھے اچھے کلاکار پیسے کی چکاچوندھ میں کھو جاتے ہیں وہاں تھوڑے سے ہی ایسے نام یاد آتے ہیں ان لوگوں کے جنھوں نے اپنے فن سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ گیت کاروں میں یہ نام ڈھونڈے نہیں ملتے؛ ظاہر ہے کیفی کا نام اس اعتبار سے ایک ممتاز نام ہے۔

بمبئی کی طرف بڑے بڑے ادیب کھنچ کر چلے آئے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ پریم چند اور جوش ملیح آبادی جیسے لوگ بھی ناکامیاب ہو کر لوٹ گئے۔ یہ اپنے آپ میں ایک معجزہ ہے کہ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۶۵ء کے بیس سال کے عرصے میں اُردو کے کئی ترقی پسند شاعر بمبئی میں جا کر بس گئے اور فلمی اعتبار سے کامیاب شاعر بنے۔ مجروح، ساحر، جاں نثار اختر اور کیفی نے اچانک بمبئی کے کمرشیل (Commercial)

سینما میں ایسی شاعری گھول دی کہ گیت اور سنگیت کا رُخ ہی بدل گیا۔ ایک طرف جہاں اردو زبان نے اپنے وجود کے لیے نئی لڑائی شروع کی وہیں بمبئی کی فلموں کی بدولت اردو شاعری کے نئے عاشق بھی پیدا ہو گئے۔ ساحر کی شاعرانہ تخلیقات، مجروحؔ کے نازک شعر، جاں نثار اختر کا شعور چاہے عام فہم نہ بن پائے ہوں لیکن عام آدمی تک پہنچ ضرور گئے۔ کسی نوجوان عاشق کا اپنی روٹھی ہوئی محبوبہ کو نہایت شاعرانہ خط لکھنا قطعی مشکل نہیں رہا۔ کبھی ساحر کی نظمیں 'تم چلی جاؤ گی پرچھائیاں رہ جائیں گی' اور 'چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں' کام آئیں تو کبھی کیفی کے پُرزور نغموں 'وقت نے کیا کیا حسیں ستم' اور 'ہو کے مجبور مجھے اس نے بھلایا ہو گا' کا سہارا مل گیا۔ اگر کیفی کی زبان میں ہی کہا جائے تو مناسب ہو گا۔

تم جو مل گئے ہو تو یہ لگتا ہے
کہ جہاں مل گیا ۔۔۔۔۔

کیفی کی فلمی یا غیر فلمی شاعری کسی درجہ بندی کی محتاج نہیں۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ ان کی فلمی شاعری میں باغیانہ ادا، شیلندر کی نغمگی، مجروحؔ کا تغزل، گلزار کی تجربہ پسندی سبھی شامل ہیں اور ساتھ ساتھ ان کا اپنا خصوصی رنگ ہے تو شاید کچھ لفظوں میں اُن کے فلمی شاعری کے فن کو باندھنے کی ایک نیم کامیاب کوشش ہی کہی جا سکتی ہے۔ اپنی کتاب 'میری آواز سنو' کی ابتدا میں کیفی نے کہا ہے کہ شاید اُن کے فلمی نغموں کو شائع کرنے والے دوست یہ دیکھنا چاہتے ہوں کہ سنگیت اور گانے والوں کی آوازوں سے الگ کر کے ان گیتوں میں کچھ بچتا بھی ہے یا نہیں؟

یہ سچ ہے کہ فلموں کا شاعر اکثر اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ رائٹر اور ڈائریکٹر جو منظر نگاری کریں اس کے مطابق گیت لکھے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ یہی شاعر کی انفرادیت کو سب سے بڑی چنوتی بھی ہے۔ اس زمانے میں جب لوگ فلمی گانوں کے بینک قائم کر رہے ہیں کیا کوئی شاعر ایسی فلمی شاعری میں بھی یقین رکھتا ہے کہ گانوں کے ذریعے کردار یا منظر کے وہ پہلو ابھر آئیں جنھیں رائٹر یا ڈائریکٹر اپنے اپنے فن سے ابھارنے میں خود کو ناکامیاب پاتے ہوں؟ اگر ایسا نہیں ہوتا تو فلموں میں گیتوں کا جواز ہی کیا ہے؟ صرف سنگیت یا زیادہ تر انگریزی فلموں کی طرح آرکسٹرا ہی کافی ہے۔

فلمی شاعری کی سب سے بڑی کسوٹی یہ ہے کہ کیا کوئی گانا منظر نگاری، شاعرانہ شعور اور سنگیت میں ڈھل جانے کی ایسی صفت رکھتا ہے کہ ہر پہلو روشن ہو جائے؟ مثلاً مخدوم محی الدین کی نظم 'ایک چمیلی

کے منڈوے تلے' ایک فلم میں استعمال کی گئی اور ٹاٹ پر مخمل کا پیوند بن کر رہ گئی۔ اس کے برعکس خاندانی منصوبہ بندی جیسے 'سرکاری' سمجھے جانے والے پروپگنڈے کے لیے شدت سے محسوس کرنا اور ایسا گیت لکھنا جس سے منظر دوبالا ہو جائے۔ ایک 'کامیاب' شاعر کا ہی فن ہے۔ فلم 'ایک کے بعد ایک' میں کیفی کا گیت ہے:

نہ تیل اور نہ پانی ، نہ قابو ہوا پر
دیئے کیوں جلائے چلا جا رہا ہے؟
اُجالوں کو تیرے سیاہی نے گھیرا
نگل جائے گا روشنی کو اندھیرا
چراغوں کی لو پر دھواں چھا رہا ہے
دیئے کیوں جلائے چلا جا رہا ہے؟

کیفی کے ایسے ہی گیت، اُن کے اُس سوال کا جواب ہیں جو انھوں نے 'میری آواز سنو' کے پیش لفظ میں پوچھا ہے یا اس سوال کا جواب، جو ہم پوچھنا چاہتے ہیں۔ کیا فلموں میں گانوں کا جواز یہی ہے کہ ہیرو اور ہیروئن کو پیڑوں کے ارد گرد ناچنے کا موقع مل جائے؟

کیفی نے فلموں کے لیے سیکڑوں گیت لکھے ہیں۔ لہٰذا اس کے لیے ہمیں ان کے چنیدہ گیتوں کا سہارا ہی لینا ہوگا۔ حالانکہ ان کے گیتوں میں سے تھوڑے سے گیت چُن لینا اپنے آپ میں پریشانی کا باعث ہے۔ بہر کیف میں اس جوکھم بھری ذمے داری سے بچ نہیں سکتا۔ وطن پرستی بلا شک خوب صورت جذبہ ہے لیکن اسی جذبے کو اکثر شاعر یوں بیان کرتے ہیں کہ ان کے کلام کو منظوم تقاریر کہنا زیادہ مناسب محسوس ہوتا ہے۔ فلموں میں کبھی پردیپ اور فلموں کے باہر عالم فتح پوری یا شمسی مینائی کی شاعری کا تاثر اتنی دیر تک ہی قائم رہتا ہے جتنی دیر انھیں سُنا جائے۔ ان دو وطن پرست شاعروں کی نظمیں جوش بن کر سامعین کے ساتھ زیادہ دیر تک نہیں ٹکتیں۔ اور فلموں میں اس جذبے پر جیسے گیت عام طور پر لکھے جاتے رہے ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا کیا جائے۔ کیفی کو اکثر ایسی فلموں کے گیت لکھنے کو کہا گیا جہاں دیش بھگتی کا جذبہ کہانی کا اہم حصہ ہو۔ مثلاً حقیقت، ہندوستان کی قسم، نونہال۔ ان اور دیگر فلموں میں کیفی نے جو دیش بھگتی کے گیت لکھے ہیں وہ کُل شاعری میں اس قسم کے بہترین گیتوں میں شامل ہیں۔

کر چلے ہم فدا جان و تن ساتھیو!
اب تمہارے حوالے وطن ساتھیو!

فلم 'حقیقت' کا یہ گیت پچھلے تیس سال سے مقبول ہے اور ظاہر ہے جذبات کے کھرے پن کی وجہ سے تب تک مقبول رہے گا جب تک وطن پرست زندہ رہیں گے۔ لیکن کوئی بھی گیت صرف اپنے بنیادی جذبے کی بنا پر ہی امر گیت نہیں بن سکتا۔ ایسے کسی بھی گیت میں جب تک احساس کی شدت شاعرانہ شعور اور بیان کی تازگی نہ ہو تب تک اس کی کامیابی مشکوک ہی رہتی ہے۔ 'حقیقت' کے اسی گیت کا ایک بند ہے:

زندہ رہنے کے موسم بہت ہیں مگر
جان دینے کی رُت روز آتی نہیں
حُسن اور عشق دونوں کو رسوا کرے
وہ جوانی جو خوں میں نہاتی نہیں

آج دھرتی بنی ہے دُلہن ساتھیو!
اب تمہارے حوالے وطن ساتھیو!

سرفروشی کی تمنا ('جان دینے کی رُت روز آتی نہیں') شاعری کی روایات کا ایک مخصوص استعمال ('حُسن اور عشق دونوں کو رُسوا کرے') اپنی دھرتی کے لیے پیار کا اظہار ('آج دھرتی بنی ہے دُلہن ساتھیو') یہ سبھی اجزا ایک لطیف انداز میں ساتھ ساتھ پرو دیئے گئے ہیں۔ نتیجتاً اس نظم کے آخری بند کا پیغام کھوکھلا نہیں لگتا:

کھینچ دو اپنے خوں سے زمیں پر لکیر
اس طرف آنے پائے نہ راون کوئی
توڑ دو ہاتھ، اگر ہاتھ اُٹھنے لگیں
چھونے پائے نہ سیتا کا دامن کوئی

رام تُم ہی، تم ہی لکشمن ساتھیو!
اب تمہارے حوالے وطن ساتھیو!

وطن کے لیے محبت کا جذبہ لیے اور کئی گیتوں پر کیفی کی نہ مٹنے والی چھاپ ہے۔ مثلاً :

ہندوستان کی قسم ، ہندوستان کی قسم
نہ جھکے سر وطن کا ، ہر جواں کی قسم
پھر امتحاں نہ ہوگا ، یوں امتحان دیں گے
کھائیں گے زخم ہنس کر ، خوش ہو کے جان دیں گے
مٹ جائیں گے زباں پہ ، جب ہم زبان دیں گے
ہے اس میں شان اپنی ، اس شان کی قسم
ہندوستان کی قسم ......

اور :

آندھی آئے کہ طوفاں کوئی غم نہیں
ہے یہی آخری امتحاں ساتھیو !
اک طرف موت ہے ، اک طرف زندگی
بیچ سے لے چلو کارواں ساتھیو !
پھوٹ کا ، دشمنی کا اندھیرا ابھی ہے
ہر قدم پر غریبی کا ڈیرا ابھی ہے
صرف راتیں ہماری نہیں ہیں سیاہ
دھندلا دھندلا سا اپنا سویرا ابھی ہے
جیسے شعلہ بھڑکتا ہے ، بھڑکو کبھی
ہوتا جاتا ہے گہرا دھواں ساتھیو !

شاعر کا پیغام وطن کی سرحدوں سے نہیں رکتا۔ اس کا فلسفہ ساری دنیا کے دُکھ درد کا فلسفہ ہے۔ کیفی کی شاعری میں " Condition of man " اور انسانی رشتوں میں دراڑوں کا تذکرہ ایک خاص کسک لیے ہوئے ابھرتا ہے۔ ٹوٹے ہوئے ناطے ، زخموں سے چھلنی حساس سینے ، بیابان میں اکیلے پن کا احساس ، تمام سیاہیوں کے باوجود دور امید کی کرن جس سے پائندہ قدروں پر

پھر یقین لایا جا سکے۔ کیفی کا فلسفہ ان سب منزلوں سے روشناس ہے۔ جن فلموں میں کیفی کے اس فلسفے کو گیتوں میں ڈھل جانے کا موقع ملا ہے اس کے گیتوں میں ایک انوکھا سوز اور تڑپ ہے۔ 'کاغذ کے پھول' کا گیت 'وقت نے کیا' کیفی کا سب سے زیادہ مقبول گیت ہی نہیں اُن کے فلسفے کا ایک شفاف آئینہ بھی ہے۔

وقت نے کیا، کیا حسیں ستم
تم رہے نہ تم، ہم رہے نہ ہم
جائیں گے کہاں، سوجھتا نہیں
چل پڑے مگر، راستہ نہیں
کیا تلاش ہے، کچھ پتا نہیں
بُن رہے ہیں دِل خواب دم بدم

اسی فلم کا یہ گیت بھی کیفی کے فلسفے کی ترجمانی کرتا ہے:

دیکھی زمانے کی یاری بچھڑے سبھی باری باری
اُڑ اُڑ جا پیاسے بھنورے
رَس نہ ملے گا خاروں میں
بیٹھ نہ اُن گلزاروں میں
نادان تمنا ریتی میں
اُمید کی کشتی کھیتی ہے
اِک ہاتھ سے دیتی ہے دنیا
سَو ہاتھوں سے لے لیتی ہے
یہ کھیل ہے کب سے جاری بچھڑے سبھی باری باری

بلاشک فلموں میں گیت رائٹر اور ڈائریکٹر کی کہانی اور منظر نگاری پر منحصر ہوتے ہیں لیکن ہر کردار کے نازک ترین جذبات کی تصویر نگاری کی ذمہ داری اکثر گیت کار کو ہی نباہنی پڑتی ہے اپنی صلاحیت کے مطابق۔ گویا فلموں میں جہاں 'دل کہتا ہے ایلو، ایلو' جیسے گانے ہوتے ہیں وہیں کیفی

جیسے شاعر دل چھونے والے نرم اور نازک شعروں سے بھی کام لیتے ہیں مثلاً :

ملو نہ تم تو ہم گھبرائیں ملو تو آنکھ چرائیں

ہمیں کیا ہوگیا ہے

ہمیں کیا ہوگیا ہے

اور 'ارتھ' کی بہترین غزل :

تم اتنا کیوں مسکرا رہے ہو کیا غم ہے جس کو چھپا رہے ہو

آنکھوں میں نمی ، ہنسی لبوں پہ کیا حال ہے کیا دکھا رہے ہو

کیفیؔ " Innerland Scape " کے پینٹر ہیں اور یقیناً اپنے شعروں اور گیتوں سے فلموں کو وہ ' Dimension ' دیتے ہیں جو کیمرا یا اداکاری نہیں دے سکتے۔

آج سوچا تو آنسو بھر آئے

مدتیں ہوگئیں مسکرائے

ہر قدم پر اُدھر مُڑ کے دیکھا

اُن کی محفل سے ہم اٹھ تو آئے

دل کی نازک رگیں ٹوٹتی ہیں

یاد اتنا بھی کوئی نہ آئے

(فلم 'ہنستے زخم')

ایک ذرا ہاتھ بڑھائیں تو پکڑ لیں دامن

اس کے سینے میں سما جائے خود اپنی دھڑکن

اتنی قربت ہے تو پھر فاصلہ اتنا کیوں ہے

کوئی یہ کیسے بتائے کہ وہ تنہا کیوں ہے

(فلم 'ارتھ')

پتھر کا شہر بمبئی اور اُس میں پلنے والی پیسے کی دنیا۔ اس حد تک بمبئی کے فلمی لوگوں پر غالب ہوجاتی ہے کہ حساس سینے بھی مشینی انداز سے دھڑکنے لگتے ہیں۔ اس مکالمے میں مجھے اُن کلاکاروں کا ذکر

نہیں کرنا ہے جن کے احساس نے بمبئی سے سمجھوتہ کرلیا۔ یہاں کیفی کا ذکر ہی مقصود ہے۔ پچھلے پینتیس سالوں میں بھی 'بمبیاپن' کیفی کے فلمی گیتوں کو چھو تک نہیں گیا۔ چاہے وہ ایشار میں لکھی گئی کوئی غزل ہو یا حال میں لکھی گئی کوئی نظم۔ کیفی نے تغزل میں بھیگا ہوا اپنا مخصوص رنگ قائم رکھا:

اِس جرم پر کر ہم نے چاہا تھا مُسکرانا
مرنے نہ دے محبت جینے نہ دے زمانا
یہ سوچ کر بُجھادی خود شمع آرزو کی
شاید ہو روشنی میں مشکل نظر ملانا

(فلم 'شمع')

شکل پھرتی ہے نگاہوں میں وہی پیاری سی
میری نس نس میں مچلنے لگی چنگاری سی
چھو گئی جسم مرا کس کے دامن کی ہوا
کہیں یہ وہ تو نہیں، کہیں یہ وہ تو نہیں

(فلم 'ہیر رانجھا')

جھکی جھکی سی نظر بے قرار ہے کہ نہیں
دبا دبا سا سہی، دل میں پیار ہے کہ نہیں
وہ پل کہ جس میں محبت جوان ہوتی ہے
اُس ایک پل کا تجھے انتظار ہے کہ نہیں

(فلم 'ارتھ')

کیفی کی کُل شاعری میں بوسیدہ پیکروں اور استعارات کی کبھی کوئی جگہ نہیں رہی۔ روایتی شاعری کے اصناف سے انھیں گریز نہیں رہا لیکن وہ اُن کی شاعری پر بوجھل بھی نہیں ہوئے۔ لہٰذا جہاں غزل اور تغزل کیفی کی شاعری میں محفوظ ہیں وہیں نئے اصنافِ سخن اور نئے استعارات وکنایات کا شگفتہ امتزاج بھی نمایاں ہے۔

کچھ دل نے کہا ، کچھ بھی نہیں
کچھ دل نے سنا ، کچھ بھی نہیں
ایسے بھی باتیں ہوتی ہیں

لیتا ہے دل انگڑائیاں ، اس دل کو سمجھائے کوئی
ارمان نہ آنکھیں کھول دے ، رسوا نہ ہو جائے کوئی
پلکوں کی ٹھنڈی سیج پر ، سپنوں کی پریاں سوتی ہیں

جھوٹی چمک ، جھوٹا نکھار ، جیون تو سونا ہی رہا
سمجھے سب آئی ہے بہار ، کلیوں سے کوئی پوچھتا
ہنستی ہیں یا روتی ہیں ، ایسے بھی باتیں ہوتی ہیں

جس طرح شاعری کی روایتیں کیفی کے کلام پر حاوی نہیں ہوئیں اسی طرح کیفی کا سیاسی اور سماجی عقیدہ بھی ان کی شاعری پر بوجھ نہیں بنا۔ کیفی پرانے کمیونسٹ ہیں اور اس بات پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ سماجی ظلم کے خلاف انھوں نے ہمیشہ آواز اٹھائی ہے۔ فلموں میں بھی جب جب موقع ملا کیفی نے اپنے Redical فلسفے کو بیان کیا ہے، بہ قول علی سردار جعفری:

شکایتیں بھی بہت ہیں ، حکایتیں بھی بہت
مزہ تو جب ہے کہ یاروں کے روبرو کہیے

کیفی نے سماج کے روبرو شکایتیں اور حکایتیں تو رکھی ہی ہیں لیکن انداز کچھ ایسا اپنایا ہے کہ دل پہ اثر رکھنے والی بات بھی تلخ نہیں لگتی۔ مثلاً:

ہاتھوں میں کچھ نوٹ لو ، پھر چاہے جتنے ووٹ لو
کھوٹے سے کھوٹا کام کرو ، باپو کو نیلام کرو

باپو باپو کرتے رہو ، زہر دلوں میں بھرتے رہو
پرانت پرانت کو تنگ کرے ، بھاشا سے بھاشا جنگ کرے
سب کو چاہیے اپنی زمیں ، ہندوستانی کوئی نہیں

اور :

ہم کو انساں میں ہے خدا کی تلاش
تم تجوری میں اُس کو ڈھونڈتے ہو
یہ تمہارے گھڑی گھڑی سجدے
یہ تمہاری گھڑی گھڑی پوجا
ایک رشوت ہے، بندگی کیا ہے
کون سوچے کہ زندگی کیا ہے۔

کیفی نے اگر فلموں میں گیت نہ لکھے ہوتے تو بھی اُن کی شخصیت مقبول ہی رہتی لیکن یقیناً فلمی دنیا اُس رس۔ اس حُسن کو ترستی جو کیفی کی ہی دین ہے۔ اگر کیفی نے فلموں کے علاوہ شاعری نہ کی ہوتی تب بھی اُن کو ادب عزت کی نظر سے دیکھتا اور زمانہ اُن کی آواز دھیان سے سُنتا۔

محمد نعمان

کیفی اعظمی کے ساتھ ایک صبح

صبح جب حسبِ معمول نیند سے بیدار ہوا تو لگا کہ جیسے یہ بھی عام سی ایک صبح ہے۔ لئے دیئے بستر سے اٹھو، اخبار پڑھو، دوسروں کے حادثے سنو، اور خوش ہو جاؤ کہ اس حادثوں بھری دنیا میں ہم کو کچھ نہیں ہوا۔ انھیں خیالات میں گم اداسی کے ساتھ میں گھڑی کی طرف دیکھتا ہوں، چھ بج کر آٹھ منٹ ہوئے ہیں، دن دوشنبہ اور تاریخ دو۲! اور یہ لفظ دو جیسے کچھ یاد سا آتا ہے، کوئی خاص بات، میں ٹیبل پر پڑے کاغذات الٹتا ہوں، میری نظر ان کاغذات میں پڑے اس کارڈ پر جم جاتی ہے جو جناب کیفی اعظمی کے اعزاز میں منعقد ہونے والے پروگرام "کیفی اعظمی کے ساتھ ایک صبح" کے سلسلے میں ہے۔ کارڈ کو دیکھ کر آج کی صبح کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ صبح عام دنوں کی طرح "صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے" سے مختلف ہے۔

اس خیال کے آتے ہی میں بستر چھوڑ دیتا ہوں اور آج کے اس پروگرام کے سلسلے میں مختلف کاموں میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ اپنے ذمہ تمام کاموں کو انجام دیتا ہوا پونے دس بجے سلفیہ کالج پہنچتا ہوں۔ وہاں استاد محترم پروفیسر عبدالقوی دسنوی انتظامی امور میں

مصروف نظر آتے ہیں، مجھ سے مخاطب ہو کر ایک بار پھر از سرِ نو پروگرام کی تفصیلات طے کرتے ہیں۔ اسی اثنا میں بی۔ اے سالِ آخر کے طلبا جناب کیفی اعظمی کی کالج میں آمد کی اطلاع دیتے ہیں۔ فوراً ہی دہلوی صاحب ہیں، اور شعبۂ اردو میں منتظر اہلِ ذوق حضرات سیڑھیوں تک پہنچ کر ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ وہ لکڑی کے سہارے رفتہ رفتہ آگے قدم بڑھاتے ہوئے شعبۂ اردو میں تشریف لاتے ہیں۔ ان کے ہمراہ جناب فضل تابش، جناب اقبال مجید اور پروفیسر شفیقہ فرحت بھی شعبۂ اردو میں داخل ہوتی ہیں۔ انھیں کے ساتھ پروفیسر مرتضیٰ علی شاد، پروفیسر عبد المجید خاں، پروفیسر عقیل احمد ندوی، پروفیسر اختر علی خاں، پروفیسر سیّد حامد جعفری اور کالج کے دیگر اساتذہ کے علاوہ مقامی شعرائے کرام میں حضرات وکیل بھوپالی، شاہد بھوپالی، بختیار ضیا، ظفر صہبائی، شجاع فرخی، افتخار آزر، وفا صدیقی، اور وقار فاطمی بھی تشریف لا چکے ہیں۔

بی۔ اے۔ بی۔ ایس سی۔ ایم۔ اے۔ ایم۔ ایس سی۔ اور دیگر درجات کے طلبا و طالبات سجاد ہال میں پہلے ہی سے اپنی اپنی نشستوں پر قبضہ جما چکے ہیں۔ کیفی صاحب کے ہمراہ سارا قافلہ شعبۂ اردو سے سجاد ہال کے لئے روانہ ہوتا ہے۔ سجاد ہال کیفی صاحب کے مدّاحوں اور عقیدت مندوں سے بھرا ہوا ہے جو طلبا و طالبات کیفی صاحب کی آمد کے لئے سراپا انتظار بنے بیٹھے ہیں، انھیں دیکھ کر ان کے چہرے مسرت و شادمانی سے کھل اٹھتے ہیں وہ سب کھڑے ہو کر اپنے مہمان کا استقبال کرتے ہیں۔ پھر اپنی اپنی نشستیں سنبھال لیتے ہیں۔

پروگرام کی نظامت کے فرائض پروفیسر مرتضیٰ علی شاد انجام دے رہے ہیں۔ وہ پروگرام کا آغاز کرتے ہوئے، دھیمے لیکن کسی قدر جذباتی لہجے میں کہتے ہیں کہ:

"کل رات یہاں جو مشاعرہ منعقد ہوا، وہ سیفیہ کالج کے سالانہ فنکشن کا ایک حصّہ تھا اور آج جو پروگرام یہاں ہو رہا ہے یہ شعبۂ اردو کے مختلف پروگراموں کا ایک حصّہ ہے۔ جب بھی یہاں کوئی مقتدر شخصیت آتی ہے تو ہم، اس سے گذارش کرتے ہیں کہ سیفیہ کالج بھی تشریف لائیں۔ شعبۂ

اُردو کی جانب سے وقتاً فوقتاً ایسے پروگرام منعقد ہوتے رہتے ہیں۔"
اس تمہید کے بعد پروفیسر شاؔد معزز مہمان کا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں:

"حضرات!
ہماری خوش نصیبی ہے کہ کیفیؔ اعظمی صاحب ہمارے درمیان موجود ہیں
ان کا کیا تعارف پیش کروں کہ وہ خود آپ اپنا تعارف ہیں۔ ان کا تعارف
کرانا محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً ایسا ہی ہے جیسے آفتاب کو چراغ دکھانا،
لیکن ترقی پسند تحریک نے جن معتبر آوازوں کو جنم دیا اور جو آج بھی اسی
آب و تاب اور توانائی کے ساتھ گونج رہی ہیں ان میں کیفیؔ اعظمی صاحب
کی آواز زیادہ طاقت ور ہے۔"

اس مختصر مگر جامع تعارف کے بعد، شاؔد صاحب آج کے پروگرام کی صدارت کے لئے سکریٹری مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی جناب فضل تابشؔ کے نام کا اعلان کرتے ہیں فضل صاحب اس وقت اپنے نام کے لئے غالباً ذہنی طور پر تیار نہ تھے، لیکن حاضرین جلسہ اور کیفیؔ صاحب کے پیہم اصرار پر صدارت کی ذمہ داری قبول کر لیتے ہیں۔

سجا دہال تالیوں کی آواز سے گونج اٹھتا ہے۔ مائک پر شاؔد صاحب کی آواز ابھرتی ہے وہ آج کے پروگرام کی تفصیل بتاتے ہوئے کہہ رہے ہیں:

"حضرات! آج کے اس پروگرام میں، پہلے کیفیؔ صاحب پر تین مضامین
پڑھے جائیں گے اور پھر کیفیؔ صاحب کو سنا جائے گا۔"

شاؔد صاحب آج کے پہلے مضمون نگار جناب نسیم شہنوی سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنا مضمون "کیفیؔ اعظمی آوارہ سجدے کی روشنی میں" پڑھ کر سنائیں۔

نسیم شہنوی شعبۂ اُردو سیفیہ کالج سے ایم۔ اے اور پی۔ ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے کئی مضامین ملک کے موقر ادبی رسائل میں شائع ہو کر خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ وہ مائک پر تشریف لاتے ہیں، اپنے مضمون کا عنوان پڑھتے ہیں اور اعظم گڑھ کے علمی، ادبی و تہذیبی پس منظر اور اس سے وابستہ نامور علمی ادبی شخصیتوں کا تعارف پیش

کرتے ہوئے نہایت روانی کے ساتھ اپنا مضمون شروع کر دیتے ہیں۔ ماحول پُر سکون ہے سامعین مضمون سننے میں منہمک ہیں، البتہ سجاد ہال میں شائقینِ ادب کی آمد کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ آنے والوں میں جناب جہانقدر چغتائی (ہم زلف جاں نثار اختر مرحوم) جناب اُویس انصاری، جناب سیّد زاہد علی، جناب شہریار مدنی، جناب مظہر علی خاں وغیرہ کے علاوہ طلباء و طالبات بھی شامل ہیں۔

پروفیسر ایم، ایم سنگھ، پروفیسر ڈی، پی سنگھ، پروفیسر ایس، این پانڈے، پروفیسر مسرور علی خاں، پروفیسر عزیز انصاری وغیرہ بھی آکر اگلی نشستوں پر بیٹھ گئے ہیں۔ میں سجاد ہال پر طائرانہ نظر ڈالتا ہوں۔ سارا ہال کیفی صاحب کے عقیدت مندوں سے بھرا ہوا ہے یہاں تک کہ جگہ نہ ہونے کے سبب کچھ لوگ دروازے کے باہر گیلری میں کھڑے ہو کر پروگرام کا لطف اٹھا رہے ہیں۔

میری نظر بانی سیفیہ ملّا سجاد حسین مرحوم کی اس قد آور تصویر پر آکر ٹھہر جاتی ہے جو سامنے والی دیوار کے عین درمیان میں خوبصورت فریم میں آویزاں ہے۔ تصویر سے ان کے باوقار چہرے سے وہی خلوص اور شفقت مترشح ہے جو ان کے اصل چہرے سے منعکس ہوتی تھی۔ میرا سر عقیدت سے خم ہو جاتا ہے میں سوچتا ہوں کہ یہ اسی مردِ درویش کی تصویر ہے جس نے اپنی محنت و مشقت کی کمائی کو ذاتی عیش و عشرت پر صرف نہ کرکے، اپنے ہم وطنوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے اور ان کے روشن مستقبل کی تعمیر کے لئے دانش گاہِ سیفیہ کی بنیاد رکھی! جس کی ذات ہماری قدیم اور قابلِ فخر تہذیب و ثقافت کی آئینہ دار تھی، اور جو انسانیت کی ان اعلیٰ اقدار کا رمز شناس اور علمبردار تھا کہ جس کے تصور کے بغیر انسانیت کا تصور دھندلا جاتا ہے اور لفظ تعلیم کا مفہوم بے معنیٰ ہو کر رہ جاتا ہے۔

سیفیہ کالج کا وجود اور عروج اسی مردِ مؤمن کے خوابوں کی تعبیر ہے۔

نسیم شہنوی کی آواز مجھے پھر ہال کی دنیا میں لے آتی ہے۔ وہ کیفی صاحب کی شاعری پس منظر، ابتدار، درمیان اور عروج پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے مجموعۂ کلام ''جھنکار'' اور ''آخرِ شب'' پر تبصرہ کرتے ہیں پھر ترقی پسند ادبی تحریک سے ان کی وابستگی پر اظہارِ خیال

کرتے ہوئے اپنے اصل موضوع یعنی "آوارہ سجدے" پر آجاتے ہیں۔ وہ اس مجموعۂ کلام میں شامل نظموں کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی حقیقت بیانی، تلخ نوائی انقلابی آواز، اصلاحی طرز اور مشاہدے کی باریک بینی کے ساتھ ان کے پُر امید لہجے کو سراہتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ:

"ان کی فطری رومانیت پسندی کی وجہ سے ان کی شاعری خطیبانہ انداز اختیار نہیں کر پاتی اور نہ ہی اس میں وہ کرختگی ملتی ہے جو دیگر ترقی پسند شعراء کی نظموں میں عام ہے ان کے یہاں تعمیر و اصلاح کا جذبہ کارفرما ہے پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ کیفی اعظمی کی نظمیہ شاعری پر دوسرے شاعر کا گمان نہیں ہو سکتا! وہ اپنی پہچان آپ رکھتی ہے۔"

ان تاثرات کے ساتھ نسیم شہنوی کا مضمون اختتام پذیر ہوتا ہے وہ تالیوں کی گونج میں واپس جا رہے ہیں۔ شاد صاحب، دوسرے مضمون نگار اقبال مسعود کے نام کا اعلان کرتے ہوئے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنا تاثراتی مضمون "یادِ یارِ مہرباں" پیش کریں۔

"یادِ یارِ مہرباں" دراصل ایک رپورتاژ ہے جس میں بمبئی میں کیفی صاحب کے دولت کدے پر ان سے ملاقات کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔

اقبال مسعود مائک پر آتے ہیں اور گویا ہوتے ہیں:

"حضرات! یہ ایک رپورتاژ ہے، کافی طویل، لیکن اس میں سے ایک حصہ پڑھ رہا ہوں کہ یوں بھی رپورتاژ مکمل نہیں ہوتا۔"

اس تمہید کے بعد اقبال صاحب اپنا رپورتاژ شروع کر دیتے ہیں، ماحول پُرسکون ہے، تمام سامعین ہمہ تن گوش ہیں۔ اقبال صاحب کیفی صاحب کی تاریخ پیدائش، ابتدائی تعلیم، خاندانی حالات، گھریلو ماحول، مشاغل، ذہنی رجحانات و نظریات، شاعری اور ماضی و حال سے متعلق معلومات افزا، دلچسپ اور حیرت انگیز واقعات کو اس طرح بیان کر رہے ہیں گویا انھوں نے گزرے ہوئے لمحات کو زبان دے دی ہے وہ کیفی صاحب کی شاعری کا پس منظر بیان کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں:

"کیفی صاحب نے جس زمانے میں اپنے شعری افکار کی شمع فروزاں کی وہ

دور ہندوستان میں ایک اہم دور تھا، آزادی کی جنگ ایک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ ادھر مغرب میں ایک نیا سورج روس کے افق پر طلوع ہو رہا تھا اور سورج کی روشنی سے دبے کچلے عوام سر اٹھا رہے تھے کہ ان کے پاس لٹنے کو اب کچھ نہ تھا اور جیتنے کو ساری کائنات پڑی تھی۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی حساس درد مند شاعر کا ان واقعات سے متاثر ہونا عین فطری تھا۔ یہی واقعات کیفی صاحب کی شاعری کا محور بن گئے۔"

کیفی صاحب کی شاعری کے پس منظر کے بعد، اقبال مسعود ان موضوعات و مقاصد پر اظہارِ خیال کر رہے ہیں جو کیفی صاحب نے ایک سوال کے جواب میں انھیں بتائے ہیں:

"انسان ہمیشہ اپنے ماحول اور ماحول کے ساتھ اپنے آپ کو بدلتے رہنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور میری شاعری کا موضوع بھی یہی عظیم جد و جہد ہے جو انفرادی بھی ہوتی ہے، اجتماعی بھی، تکنیکی بھی! اس کے اثرات دل میں بھی ہوتے ہیں اور بیرونِ دل بھی، اور شاعری کا اہم مقصد اپنی شخصیت کی تکمیل بھی ہے اور قارئین کے ذہن کی تشکیل بھی۔"

کیفی صاحب کی شخصیت و شاعری سے متعلق بہت سی اہم باتوں کو افسانوی انداز میں پیش کرنے کے بعد اقبال مسعود ان تاثرات پر اپنا رپورتاژ ختم کر دیتے ہیں:

"کیفی صاحب نے نظمیں بھی لکھیں، غزلیں بھی، فلمی گیت بھی اور مزدوروں کے جلسوں میں تقریریں بھی کیں، وہ جہاں رہے ہیں نمایاں ہو کر رہے ہیں ہے

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا"

اقبال مسعود تالیوں کی گونج میں واپس جا رہے ہیں۔ مائک پر شاد صاحب کی آواز اُبھرتی ہے وہ تیسرے اور آخری مضمون نگار پروفیسر عبدالقوی صاحب دسنوی سے درخواست کر رہے ہیں۔

دسنوی صاحب کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ ان کی کاوش فکر و نظر نے تحقیق و تنقید کے کئی نئے گوشے منور کئے ہیں۔ شعبۂ اُردو کے قیام سے لے کر آج تک اس کی تمام ادبی سرگرمیاں دراصل دسنوی صاحب کے ہی تراوشِ خونِ جگر کی رہینِ منت ہیں۔ بقول سلام مچھلی شہری مرحوم ؎

ازسرِنو سیفیہ کالج میں اُردو کی بہار
میری نظروں میں تو شاید دسنوی کے دم سے ہے

دسنوی صاحب مائک پر تشریف لا چکے ہیں۔ سامعین پورے طور پر دسنوی صاحب کی آواز پر متوجہ ہو جاتے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں:

"حضرات! میرا یہ مضمون تنقیدی نہیں بلکہ تاثراتی ہے۔ کیفی بھائی سے جو رشتہ میرا بمبئی میں رہا ہے اور انھوں نے میری جو ادبی رہنمائی کی ہے اور جو محبتیں دی ہیں اسے میں نے اس مضمون میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔"

اس تمہید کے بعد دسنوی صاحب اپنا مضمون شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ایک طویل تاثراتی مضمون ہے جس کے ایک ایک لفظ سے کیفی صاحب کے تئیں، دسنوی صاحب کے خلوص، عقیدت اور احترام کا جذبہ مترشح ہو رہا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ خلوص و محبت خود کیفی صاحب کے خلوص کا آئینہ دار بھی ہے، جسے میں نے نہ صرف کانوں سے سنا ہے بلکہ دل سے محسوس بھی کیا ہے۔ اس ضمن میں مجھے گذشتہ روز کی وہ بات یاد آ رہی ہے جو کلا پریشد کے مہمان خانے میں (جہاں کیفی صاحب قیام پذیر تھے) جناب فخرالدین صاحب (سکریٹری سیفیہ ایجوکیشن سوسائٹی) اور کیفی صاحب کے درمیان ہوئی تھی۔

فخرالدین صاحب نے کیفی بھائی کی آمد پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ مجھے آپ کی علالت کی وجہ سے امید نہ تھی کہ آپ تشریف لا سکیں گے۔ جواباً مسکراتے ہوئے کیفی صاحب نے کہا تھا:

"جی ہاں صاحب! قوی میاں کی بات ٹالنا ذرا میرے لئے مشکل ہے

قوی صاحب میری کمزوریوں میں سے ہیں، بھوپال آنے کو کئی دنوں
سے جی چاہ رہا تھا۔ جب مجروح کی لڑکی کی شادی میں اختر سعید خاں
سے ملاقات ہوئی تو جی چاہا کہ ان سے کہوں کہ بھائی بھوپال بلانے کی
کوئی تدبیر سوچو لیکن وہاں ان سے یہ کہہ نہیں پایا اور اس شادی سے
گھر لوٹا تو قوی میاں کا لیٹر ملا اور میں نے بھوپال آنے کا ارادہ کرلیا۔"

دسنوی صاحب کی آواز مجھے اپنی جانب متوجہ کرلیتی ہے وہ اپنے مضمون میں آج سے ۱۲ سال قبل اپنے کالج کے اُردو طلباء کی ادبی بزم کے زیر اہتمام دو نوجوان شاعر کیفی اعظمی اور مجروح سلطان پوری کے اعزاز میں منعقدہ پروگرام کی رودادسناتے ہوئے کیفی صاحب کی نظم "پشیمانی" (جو انھوں نے وہاں کے جلسہ میں پڑھی تھی) کچھ ایسے پُرجوش اور جذباتی انداز میں پڑھتے ہیں کہ سامعین بالخصوص کیفی صاحب پر بھی جذباتی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ ماحول پر سحر آگیں سکوت طاری ہے۔ دسنوی صاحب پوری روانی اور جوش کے ساتھ اپنا مضمون پڑھنے میں منہمک ہیں کبھی بمبئی کے نوجوان مصنفین کی ادبی سرگرمیوں کا ذکر ہے تو کبھی کیفی صاحب کی شخصیت وشاعری سے متعلق اہم و دلچسپ واقعات بیان کئے جارہے ہیں تو کبھی کیفی صاحب سے برادرانہ مراسم کا تذکرہ کرتے ہوئے ان سے مختلف ملاقاتوں کی تفصیلات پیش کی جارہی ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ:

"نومبر ۱۹۶۷ء میں پہلی بار کیفی بھائی سیفیہ کالج میں تشریف لائے تھے
اس کے بعد پھر دوبارہ نہ آئے۔ یہاں سے بلانے کی بار بار کوششیں
کی گئیں لیکن کامیابی نصیب نہ ہوئی۔"

اس کے بعد دسنوی صاحب مئی ۸۰ء میں بمبئی میں کیفی صاحب سے ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے نہایت جذباتی لہجہ میں کہہ رہے ہیں کہ:

"آج یہ نئی ملاقات بھی پرانی ہوگئی ہے اور ماضی کی آغوش میں جا
پہنچی ہے لیکن ہم ماضی کو حال سے بے تعلق نہ ہونے دیں گے بلکہ ماضی کو

مستقبل تک پہنچانے کے سلسلے کو جاری رکھنے کی کوشش کرتے رہیں گے
اس لیۓ کہ ماضی حال اور مستقبل جب تینوں مل جاتے ہیں تو زندگی مکمل
ہوتی ہے ۔"

ان پُر خلوص تاثرات ، جذبات اور یادوں پر مشتمل دسنوی صاحب کا یہ طویل مضمون ختم ہوتا ہے ۔ میں سوچ رہا ہوں کہ دسنوی صاحب نے کس حسن خوبی اور ذمہ داری کے ساتھ سابقہ ۲۰ برسوں پر مشتمل سنہری یادوں کو ان چند صفحات میں محفوظ کرلیا ہے ۔ ان میں سے کتنی یادیں کتنی باتیں ہمارے لیۓ مشعلِ راہ بھی ہیں اور گراں قدر سرمایہ بھی!

سامعین کا خیال ہے کہ اب کیفی اعظمی صاحب سے ان کا کلام خود ان کی زبانی سنانے کی درخواست کی جائے گی ۔ لوگ شاد صاحب کی آواز سننے کو بے چین ہیں ۔ وہ مائک پر آتے ہیں لیکن بجائے کیفی صاحب کے جناب اختر سعید خاں سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ اس پروگرام اور کیفی اعظمی صاحب کی شخصیت و شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار فرماکر ہمیں مستفید فرمائیں ۔

اختر صاحب غالباً اس طرح اچانک بلائے جانے پر تیار نہ تھے لیکن شاد صاحب کے پیہم اصرار پر مائک پر تشریف لاتے ہیں اور اپنے مخصوص انداز میں یوں گویا ہوتے ہیں:

"صاحب! بڑی ذمہ داری کی بات ہے ۔ شخصیت کے بارے میں یہاں اتنی باتیں ہو چکیں اور فن پر بات کرنا بغیر کسی تیاری کے اور بغیر کیفی صاحب کا پورا کلام سامنے رکھے ہوئے اور بغیر حوالوں کے!

بہر حال اتنی بات طے ہے کہ کیفی صاحب کے چاہنے والوں میں سے میں بھی ایک ہوں اور میری چاہت کا معیار کوئی معمولی نہیں جس کو میں چاہتا ہوں اس کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ وہ کھرے معیار کا انسان ہے ۔"

اختر صاحب نہایت اعتماد و خلوص کے ساتھ اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ :

"کیفی اعظمی صاحب کا ایک بہت بڑا کنٹری بیوشن ترقی پسند ادب کی نہ صرف تحریک بلکہ جو ادب خود انھوں نے تخلیق کیا ہے، وہ ہے!"
وہ دسنوی صاحب کے مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ:
"کیفی صاحب کی سرگرمیوں کے بارے میں آپ نے دسنوی صاحب کا تفصیلی مضمون ابھی ابھی سنا۔ انھوں نے کس طرح ادب، سیاست اور ان کی زندگی کو ایک مرکز پر لا کھڑا کیا اور کس طرح ان کے ادب کو سیاست اور سیاست کو ادب کے ایک پلڑے میں رکھ کر دسنوی صاحب نے ان کی شخصیت کے متوازن پہلوؤں کو ابھارنے کی کوشش کی۔"
اس کے بعد اختر صاحب کیفی صاحب کی خدمات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"یہ مقصدی ادب جس کی ترویج و اشاعت میں کیفی صاحب نے اپنی ساری زندگی کو صرف کر دیا ہے، یہ دراصل ان کا سب سے بڑا کنٹری بیوشن ہے جس کے لئے آنے والی نسلیں ہمیشہ کیفی صاحب کی شکرگذار رہیں گی .... جس شاعر نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ اپنی ذہنی کوششوں کے ذریعے اس جگہ تک پہنچا دیا ہو کہ ہم زندگی کو حسین انسان کی اعلیٰ اقدار کی حمایت اور اس نظامِ حیات کو جس میں انسان انسان پر ظلم کر رہا ہے۔ تبدیل کر دینا چاہتے ہیں۔ اس شاعر یا فن کار کی کتنی قدر دانی کی جانی چاہیئے یہ آپ یا میرے لئے کوئی متنازعہ سوال نہیں! کیفی صاحب اپنے اس کنٹری بیوشن کی وجہ سے ان قافلہ سالاروں میں شمار کئے جاتے ہیں جو ہماری ترقی پسند تحریک کے چند ایک نمائندہ لوگ ہیں۔"

اپنی اس پُرمغز تقریر کے آخری حصّہ میں اختر بھائی بطورِ خاص طلباء و طالبات کو مخاطب کر کے انھیں مشورہ دیتے ہیں کہ:

"ہمیں اُن کے تخلیقی کارناموں کو سامنے رکھ کر خود اپنی زندگی کی تہذیب کرنی چاہیئے، کیوں کہ ادب سے اگر آپ اپنی زندگی کی تہذیب نہ کر پائے تو آپ کی زندگی میں بہت سے خلا رہ جائیں گے کیوں کہ انسانی زندگی کو بنانے اور سنوارنے میں ادب کا اہم حصہ ہے اور کیفی صاحب کی شاعری اسی سلسلہ کی کڑی ہے اور یہ جو روشنی انھوں نے پھیلائی ہے، وہ امانت کے طور پر آنے والی نسلوں کو دے دی ہے، جو اسے لے کر آگے بڑھ رہے ہیں، ہم میں سے بہت سے ایسے ہیں کہ جنھوں نے وہ مشعل اپنے ہاتھوں میں سنبھال لی ہے اور مجھے امید ہے کہ ان بہت سارے تاریک گوشوں کو منور کر دیا جائے گا جو ابھی تک اندھیرے میں ہیں۔"

ان خیالات و تاثرات پر اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے اختر صاحب کہہ رہے ہیں کہ:

"ہمارے بعض لکھنے والوں نے کیفی صاحب کی شاعری کے بارے میں بہت سے دعوے کئے ہیں اور میں نے بھی اپنی تقریر میں رجائیت کا پہلو اختیار کیا ہے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ دعویٰ بغیر دلیل کے بے سود ہے لہٰذا وہ ان دعوؤں کی دلیل کے طور پر کیفی صاحب کو دعوت دے رہے ہیں کہ وہ مائک پر تشریف لائیں اور ہم سب لوگوں کی باتوں کی تائید فرمائیں۔"

حاضرینِ جلسہ! جو کہ کیفی صاحب کو سننے کے لئے بے چین ہیں، اس اعلان پر تالیاں بجا کر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہیں لیکن تالیوں کا یہ شور شاد صاحب کی اس آواز پر مدھم ہو جاتا ہے کہ صاحبِ صدر کی خواہش ہے کہ وہ کیفی صاحب سے قبل کچھ کہنا چاہتے ہیں حالانکہ یہ روایت شکنی ہے لیکن کیوں کہ ان کا احترام لازم ہے اس لئے میں ان سے گذارش کرتا ہوں کہ وہ یہاں تشریف لائیں۔

صدر جلسہ فضل تابش مائک پر تشریف لاتے ہیں اور نہایت سادگی کے ساتھ اپنی اس قبل از وقت تقریر پر معذرت کا اظہار کرتے ہوئے اعلان کرتے ہیں کہ:

"نہایت خوشی کی بات ہے کہ اب کیفی صاحب ہمارے شہر میں تین چار مرتبہ تشریف لائیں گے، دو مرتبہ ڈرامے لے کر اور ایک مرتبہ جاں نثار اختر کے فنکشن کے سلسلے میں یہاں آئیں گے۔"

فضل صاحب اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے مزید کہہ رہے ہیں کہ:

"مجھے کیفی صاحب سے کبھی تفصیلی ملاقات کا موقع نہیں ملا۔ کل سوا گھنٹہ میں نے ان کے ساتھ گزارا تو محسوس کیا کہ وہ زندگی سے کتنا زبردست پیار کرتے ہیں اور جینے کی ان میں جتنی زبردست خواہش ہے وہ مجھے عام طور پر لوگوں میں نہیں ملتی چنانچہ کل وہ ادب پر بات کرتے ہوئے ایک دم نرسری پر آ گئے تھے کہ مجھے گارڈننگ کا بہت شوق ہے اس لئے میں یہاں کے پھول دیکھنا چاہتا ہوں۔"

فضل صاحب دورانِ تقریر کیفی صاحب کے تئیں اپنی عقیدت مندی ظاہر کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ میں بھی کیفی صاحب کا عاشق رہا ہوں جس طرح کہ یہاں موجود ۹۰ فی صد لوگ ان کے عاشق ہیں۔

ان خیالات کے ساتھ شکریہ ادا کرتے ہوئے فضل صاحب اپنی تقریر ختم کرتے ہیں، کیفی صاحب کو سننے کے لئے دیر سے منتظر سامعین کے چہروں سے بے چینی، امید اور اشتیاق کے ملے جلے جذبات نمایاں ہو رہے ہیں۔ لوگ پُر اُمید نگاہوں سے شاد صاحب کی جانب دیکھ رہے ہیں، شاد صاحب لوگوں کی نگاہوں کی زبان پڑھ چکے ہیں وہ بلا کسی تاخیر کے مائک پر آ کر جلسہ کے مہمانِ خصوصی جناب کیفی اعظمی صاحب سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ ہمیں آج کے ادبی مسائل پر اظہارِ خیال فرماتے ہوئے اپنے کلام سے مستفید ہونے کا موقع عنایت فرمائیں! تالیوں کی گونج میں اس اعلان کا استقبال کرتے ہوئے سبھی لوگ پہلو بدل بدل کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے ہیں۔ کیفی صاحب سب

کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ سجاد ہال مدّاحانِ کیفیؔ سے بھرا ہوا ہے لیکن اس وقت پورے ہال پر خاموشی چھا گئی ہے، سوائے چڑیوں کی چوں چوں کی آواز کے اور کچھ سنائی نہیں دے رہا ہے۔ مائک کیفیؔ صاحب کے سامنے رکھ دیا گیا ہے۔ کیفیؔ صاحب کا تمتماتا چہرہ بڑے بڑے بالوں کے درمیان سُرخ ہوتا نظر آ رہا ہے وہ سکون و استقلال کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔

ان کی بھاری بھرکم لیکن پُر وقار آواز فضا میں گونجتی ہے اور ماحول کے پُراسرار سکوت کو توڑ دیتی ہے۔ لوگ گوش بر آواز ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں:

"حضرات! اب سے پہلے بھی ایک بار سیفیہ کالج آنے کا اتفاق ہوا تھا اور اس بار بھی جوں ہی میں نے بھوپال میں قدم رکھا، مجھے دسنوی صاحب نے یہ خبر سنائی کہ صبح سیفیہ کالج کے ادبی جلسہ میں شرکت کرنا ہے تو میں فوراً تیار ہو گیا کہ یوں بھی نوجوان طالب علم میری کمزوری رہے ہیں۔ مجھے آج تک یاد نہیں کہ میں نے کبھی ان کے کسی جلسہ میں جانے سے انکار کیا ہو۔"

کیفیؔ صاحب آج کے جلسہ کے متعلق دلچسپ انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ:

"حضرات! آج کا جو جلسہ ہوا ہے اس کے بعد میں نے سوچ لیا ہے کہ اب سیفیہ کالج کبھی نہیں آؤں گا، اس لئے کہ شاید یہ ایک طرح کی سازش تھی نفس امارہ کو موٹا کرنے کی جس سے میں اب تک بہت بچتا رہا ہوں۔"

کیفیؔ صاحب، جس دلچسپ اور پُرلطف انداز میں ان جملوں کو ادا کر رہے ہیں، انھیں سن کر سارا ہال قہقہہ زار بن گیا ہے اور وہ انھیں قہقہوں کے درمیان اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ:

"مجھ پر فالج کا حملہ ہوا اس کے باوجود میں اپنے ہوش و حواس سنبھالے

رہا اور بچا رہا۔ زبان بھی باقی رہ گئی اور یادداشت بھی! ڈاکٹروں نے تعجب کیا۔ لیکن یہ حملہ میرے لئے اس سے زیادہ شدید تھا جو آج یہاں مجھ پر ہوا لیکن شکر ہے کہ میں اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے ہوں ....

میں اس کو محبت تو سمجھا اور ظاہر ہے کہ وہ میرے لئے محبت ہی ہے! بہت خوشی ہوئی، لیکن نفس امارہ کو میں قابو میں ہی رکھوں گا۔ سراہنا بہت اچھا ہوتا ہے اور خاص طور پر دوست جب سراہیں تو بے انتہا خوشی ہوتی ہے۔ شاید آج میری زندگی میں کچھ برسوں کا اضافہ ہو گیا ہو!

ایسی تعریف جتنی میرے ساتھی عبدالقوی دسنوی نے کی ہے یا اقبال نے میں اپنے کو اس کا مستحق نہیں سمجھتا لیکن ان کی محبت کے جواب میں صرف محبت ہی دے سکتا ہوں "

میں دیکھ رہا ہوں کہ کیفی صاحب خاصے جذباتی ہو رہے ہیں وہ سلسلہ کو مزید جاری رکھنے کے باوجود، کامیاب نہیں ہو پا رہے ہیں، لہٰذا وہ موضوعِ گفتگو تبدیل کرتے ہوئے نہایت پُر لطف انداز میں یوں گویا ہوتے ہیں کہ:

"اس وقت مصلحت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اتنی تعریفوں کے بعد اگر مجھ سے شعر نہیں سُنا جاتا تو میری آبرو رہ جاتی، اب میں بڑی کشمکش میں ہوں کہ کہیں یہ لوگ جھوٹے نہ ٹھہریں "

اس دلچسپ تقریر کے بعد کیفی صاحب، اس تمہید کے ساتھ کلام سنانے کا اعلان کرتے ہیں کہ:

"یہ ایک مختصر سی نظم ہے، جب انسان نے پہلے پہل چاند پر جانے کی کوشش شروع کی تھی اس وقت میں نے پاکستان جانے کی کوشش شروع کی لیکن جب وہ چاند پر پہنچ گیا، مجھے اس کے بعد ویزا ملا۔

یہ بات مذاق میں کہہ رہا ہوں لیکن یہ میری زندگی کی اتنی بڑی ٹریجڈی ہے کہ جس کی تلافی ہو ہی نہیں سکتی "

میں محسوس کر رہا ہوں کہ کیفی صاحب کے لہجہ میں بجائے شوخی کے سنجیدگی اور اُداسی پیدا ہوگئی ہے وہ کہہ رہے ہیں کہ:

"میں ہندوستان میں اپنے خاندان میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ باقی اب آپ ہی لوگ ہیں۔ اب میری عمر سے اندازہ لگائیے کہ میری ماں کی چند برس پہلے کیا عمر رہی ہوگی۔ جب مجھ پر فالج کا یہ حملہ ہوا تو بی۔بی۔سی سے اناؤنس کر دیا گیا کہ میں مر گیا۔ یہ خبر میری ماں نے پہلی بار سنی اور ان کا انتقال ہوگیا اور میں اسی طرح جیتا ہوا بیٹھا ہوں۔ میں جب کراچی پہنچا تو وہ نہیں تھیں۔ میں نے انھیں تاثرات کو کراچی سے واپس آتے ہوئے ٹرین میں ایک مختصر نظم میں قلمبند کیا ہے جو آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں ؎

عجب کیا دامنِ یوسف کی قسمت ان کو مل جائے
کراچی میں جو کچھ تارِ گریباں چھوڑ آیا ہوں
کوئی دستِ حنائی یوں ہی لہرایا تھا چلمن میں
میں ٹکڑے کر کے اپنا جیب و داماں چھوڑ آیا ہوں
نہ جانے چھو لیں کس کے رَس بھرے گلنار ہونٹوں کو
وہ بوسے جو فضاؤں میں پرافشاں چھوڑ آیا ہوں

نظم کے ایک ایک شعر پر مہمان شاعر کو بھرپور داد مل رہی ہے۔ کیفی صاحب، اسی داد و تحسین کے شور میں نظم ختم کر کے فوراً ہی دوسری نظم "چوری" شروع کر دیتے ہیں۔ داد و تحسین کا سیلاب تھم جاتا ہے اور حاضرینِ جلسہ نئی نظم سننے کی خاطر خاموشی کے ساتھ کیفی صاحب کی جانب متوجہ ہو جاتے ہیں۔

کیفی صاحب پوری سنجیدگی کے ساتھ نظم کا پہلا مصرعہ

رات جب میرے ہاتھوں کے نزدیک تھا ماہتاب

پڑھتے ہیں، پھر جب خود ہی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ صرف شاعری ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے تو ماحول کی ساری سنجیدگی ایک بار پھر بلند آواز قہقہوں

میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کیفی صاحب اسی ماحول میں اپنی نظم مکمل کر دیتے ہیں۔

بعدازاں اپنی مشہور نظم "زندگی" سنانے سے پہلے اس کا پس منظر بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ایک نظم ہے اسے لوگوں نے پڑھا اور سنا ہوگا، لیکن چوں کہ یہ ایک علمی ادبی ادارہ ہے اور یہاں جو حضرات بیٹھے ہیں ان کا علم و ادب سے بہت گہرا تعلق ہے۔ ان کے لئے یہی میرے پاس ایک تحفہ ہے جو ان کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔ اس نظم کی چھوٹی سی تاریخ ہے کہ جب میرا برین ہیمریج ہوا تھا اور میں اسپتال میں تھا تو اس وقت کسی کو مجھ سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ ڈاکٹر جو میرا معالج تھا، جب میری آنکھیں بند تھیں تو اس کی آواز شاید اس لئے سن پایا کہ وہ نہایت غلط اُردو بول رہا تھا جس کی وجہ سے میرے کانوں کو تکلیف پہنچ رہی تھی، وہ میری بیوی سے کہہ رہا تھا کہ بائی کوئی ہوپ نہیں بچے گا نہیں بس اب بھگوان سے پرارتھنا کرو، اور کچھ نہیں! میں نے صرف یہ آوازیں سنیں، ڈاکٹر صاحب کا چہرہ نہیں دیکھا اور ظاہر ہے کہ ان آوازوں کی وجہ سے ان کا چہرہ دیکھنے کی خواہش بھی نہیں ہوئی۔ لہٰذا میں نے اسی طرح آنکھیں بند کئے ہوئے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب گھبرائیے نہیں میرے اندر اتنا برین ہے کہ برین ہیمریج کے بعد بھی کچھ بچ ہی جائے گا۔

کیفی صاحب اس سنجیدہ حقیقت کو اس پرلطف انداز میں بیان کر رہے ہیں کہ باوجود سنجیدہ رہنے کی کوشش کے لوگ ہنسی ضبط نہیں کر پا رہے ہیں۔ کیفی صاحب اسی ماحول میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ:

اسی وقت میری ایک بہت ہی عزیز خاتون دوست کو کسی طرح مجھ تک آنے کی اجازت ملی، وہ آئیں تو میں نے ان سے کہا کہ میں کچھ بولتا ہوں آپ لکھ لیجئے! اور اس طرح اس نظم کی تخلیق ہوئی ہے۔

اس تمہید کے بعد کیفی صاحب نہایت پُرتاثیر لہجے میں نظم سنانا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کی آواز کے ساتھ ساتھ سامعین کی واہ واہ کی آوازیں بھی سارے ماحول پر ایک عجیب کیفیت طاری کئے ہوئے ہیں، ہر شخص جھوم رہا ہے، بے اختیار داد دے

رہا ہے۔ نظم ختم ہوتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کیفی صاحب کے ساتھ سامعین بھی کچھ تھک سے گئے ہیں، لیکن جیسے ابھی پوری تسکین نہیں ہو سکی ہے اور کچھ اور سننے کی خواہش ان میں ابھی جوان ہے! اسی اثناء میں پچھلی نشست سے کسی طالب علم کی آواز ابھرتی ہے "نذرانہ" سنائیے لیکن کیفی بھائی اس فرمائش کو قبول نہیں کرتے، غالباً اس لئے کہ وہ جس بلند سطح سے اس وقت نظمیں سنا رہے ہیں ان میں یہ نظم مکمل طور پر میل نہیں کھاتی، لہٰذا وہ ایک دوسری نظم "بہروپنی" سنانے کا اعلان کر دیتے ہیں۔ اور اس کا پس منظر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ نظم فرقہ پرستی پر ہے لیکن اس نظم میں ہندو مسلم بھائی بھائی والی بات نہیں ہے اس کو میں نے صرف ایک طالب علم کی حیثیت سے سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ فرقہ پرستی کس طرح جنم لیتی ہے اور اس کا روپ رنگ کیا ہوتا ہے؟۔

ان خیالات کے بعد وہ نہایت جوش و خروش کے ساتھ نظم "بہروپنی" شروع کر دیتے ہیں جسے سن کر میرا خیال اقبال مسعود کے ان خیالات کی طرف منعطف ہو جاتا ہے جس کا اظہار انھوں نے ابھی ابھی اپنے رپورتاژ میں کیا تھا کہ:

> "شاعر کا کلام خود اس کی زبان میں سننا اور لطف اندوز ہونا کتنا دلچسپ تجربہ ہے۔ ویسے بھی مشرقی روایات کا ایک حصہ ہے کہ شاعر کا کلام بزبان شاعر سنا جائے کہ اس طرح کلام کی روح تک پہنچنا آسان ہوتا ہے اور پھر قاری کا شاعر سے براہ راست تعلق بھی قائم ہو جاتا ہے"

کیفی صاحب اشعار کے پورے اُتار چڑھاؤ، اس کے رموز، خوابناکی، بھیانک پن اور احتجاج کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ نظم کا مکمل ابلاغ ممکن ہو جاتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ الفاظ کی موسیقی بھی شاعری کا ایک جُز ہے اور جب ہم آرام سے لیٹ کر شعر پڑھتے ہیں تو اس کی موسیقی دل و دماغ تک نہیں پہنچ پاتی صرف کورے یک رُخے الفاظ ہاتھ آتے ہیں اور صرف بے جان الفاظ کا نام شاعری نہیں، الفاظ تو بیج ہیں ان کو محنت سے اناج کے خوشوں میں بدلنا پڑتا ہے۔"

نظم ختم ہوتے ہی میرے خیالات کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ لیکن سامعین کی جانب سے یکے بعد دیگرے فرمائشوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کیفی صاحب ایک ایک کی فرمائش پوری کر رہے ہیں، کلام سنا رہے ہیں، سارا ہال نعرہ ہائے داد و تحسین سے گونج رہا ہے۔ یکایک شعر سناتے سناتے کیفی صاحب رُک جاتے ہیں، لیکن فرمائشیں نہیں رکتیں۔!

کیفی صاحب کے چہرے سے تکان کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ آپ لوگ آخر پڑھتے کس وقت ہیں، اچھا یہ آخری سنیئے، اس کے بعد نہیں سناؤں گا یہ کہہ کر وہ اپنی نظم شروع کر دیتے ہیں۔ میں ہال کا جائزہ لے رہا ہوں۔ میری نظریں سامنے کونے پر رکھے کیفی صاحب کے خوبصورت پنسل اسکیچ پر رُک جاتی ہے جو شہر کے مشہور آرٹسٹ دلارے میاں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ تصویر کی خوبصورتی اور فنکار کی فنکاری کا اندازہ کیفی صاحب کے مندرجہ ذیل جملوں سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے تصویر پر اپنے دستخط کے ساتھ تحریر کیے ہیں:

"دلارے میاں جیسی اچھی آپ نے میری تصویر بنائی ہے، اسے دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ کاش مجھے بھی آپ کے ہاتھوں ہی بنایا گیا ہوتا۔"

شاد صاحب کی آواز میرے سلسلۂ خیالات کو توڑ دیتی ہے، وہ پروگرام کے اختتام کا اعلان کر رہے ہیں۔ سامعین اپنی اپنی نشستیں چھوڑ کر سجاد ہال سے باہر آ رہے ہیں۔ کیفی صاحب بھی اپنے مداحوں، کالج کے طالب علموں سے ملتے ہوئے آٹوگراف دیتے ہوئے ان سے باتیں کرتے ہوئے رفتہ رفتہ شعبۂ اُردو کی جانب تشریف لا رہے ہیں۔ نیچے کالج کے وسیع صحن میں موٹر کار انھیں لینے آ چکی ہے۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب، پروفیسر شاد صاحب اور کالج کے دیگر اساتذہ، طالب علم رہنما اور معززین شہر انھیں کار میں بٹھاتے ہیں ان کا چہرہ خوشی سے سُرخ ہو رہا ہے۔ وہ سب کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ گاڑی دھیرے دھیرے مُڑتی ہے، پھر کچھ رفتار کے ساتھ مشرق میں واقع کالج کے صدر دروازے سے نکلتی ہوئی نظروں سے اوجھل

ہو جاتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ جیسے یہ راستہ جس پر سے ابھی گزر کر کیفی صاحب گئے ہیں۔
وقت کے بہتے دریا کا ہی ایک حصہ ہے جس پر ہماری یادوں کا سنہرا دیا جھلملاتا ہوا بہہ
رہا ہے، وقت کا یہ حصہ جو اب ماضی بن چکا ہے لیکن ہمارے ذہن کے دریچوں میں اسی
طرح جگمگا رہا ہے، جو ہماری یادوں میں نہ صرف زندہ رہے گا بلکہ ہمیں روشنی ہمت
ور حوصلہ عطا کرتا رہے گا!۔

شاہینہ تبسم

دربابِ کلامِ کیفی

کیفی اعظمی کی شاعری کی شروعات ایک ایسے عہد میں ہوئی جب اردو شاعری میں اقبال اور جوش کے اثرات کے دوش بہ دوش رومانیت، نیم رومانیت اور داخلی رومانیت کا دور دورہ تھا اور رومانوی شاعری اختر شیرانی اور عظمت اللہ خاں جیسے شعرا کی معیت میں اپنا تاریخی کارنامہ سرانجام دینے کے بعد ایک نئے عہد میں قدم رکھنے کی تیاری کر رہی تھی۔ ساری فضا قوس قزح کے حسین و خواب ناک رنگوں سے دل کش اور پرکشش نظر آتی تھی۔ اور آج کے بہت سے ترقی پسند شاعر اس زمانے میں رومانی شاعر کی حیثیت سے ابھر رہے تھے۔ جن میں اسرار الحق مجاز، معین احسن جذبی، جاں نثار اختر، فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، علی جواد زیدی، وقار انبالوی، احمد ندیم قاسمی، پرویز شاہدی، شہاب ملیح آبادی، مسعود اختر جمال اور شمیم کرہانی وغیرہ کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

کیفی کے ابتدائی کلام کا مطالعہ کیا جائے تو ایک طرف جہاں ان کی شاعری پر اقبال، جوش، اختر شیرانی اور عظمت اللہ خاں کے اثرات کہیں واضح اور کہیں غیر واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں تو دوسری طرف ان کا اپنا انفرادی رومانی اسلوب بھی صاف نظر آتا ہے۔

سلونے ہونٹوں کی لرزشوں میں تھی پرفشاں روحِ میکدے کی
نظر کی سرشاریوں میں تخیلِ ساحری تھر تھرا رہی تھی
اسی کے جلوے اسی کا پرتو اسی کے نغمے اسی کا جادو
اسی کی دنیا بسی ہوئی تھی جدھر نظریں اٹھا رہی تھی

دلوں کی حالت بھی دیدنی تھی رخوں کی رنگت بھی دیدنی تھی
کبھی کوئی لہر آ رہی تھی کبھی کوئی لہر جا رہی تھی

——— آوارہ نغمہ

زمیں محور پہ گھومی جا رہی ہے | فلک مرکز پہ جھوما جا رہا ہے
ستارے دے رہے ہیں تال باہم | ہر اک ذرہ تھرک کر گا رہا ہے
نجانے کیوں ہر اک میٹھی نوا پر | دلِ مہجور بیٹھا جا رہا ہے
اسی کی شکل پھرتی ہے نظر میں | کوئی بچھڑا ہوا یاد آ رہا ہے

——— بانسری کا لہرہ

زلفوں میں تابِ سنبلِ پیماں لیے ہوئے
عارض پہ شوخ رنگِ گلستاں لیے ہوئے
آنکھوں میں بولتے ہوئے ارماں لیے ہوئے
ہونٹوں میں آبِ لعلِ بدخشاں لیے ہوئے
فطرت نے تول تول کے چشمِ قبول میں
سارا چمن نچوڑ دیا ایک پھول میں

——— دوشیزہ مالن

کیفی کی ان نظموں میں وہی حسن ہے، حسن پرستی ہے اور وہی کیف و مستی ہے جو اس دور کے رومانی شاعروں کا طرۂ امتیاز تھا۔ عورت اور اس کے لطیف پیکر کو قلب و روح میں رچا بسا کر اپنی فکر اور فن کا حصہ بنا کر پوری کی پوری کائنات کو اسی کے تصور سے بھر دینا اور خود کو اس کائناتِ حسن وعشق کے پجاری کے روپ میں محسوس کرنا اس کے وجود کے تئیں پُر تقدس اور پاکیزہ خدمات کا ایسا معصومانہ اظہار ہے جس میں بوالہوسی یا محرومی نام کو بھی نہیں ملتی کیفی اعظمی کی اسی سلسلے کی دوسری نظموں میں اخفائے محبت، پہلا سلام، سویرے سویرے، تم، ملاقات، تصادم، ماتول، شباب، ننگی، شام وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

کیفی کی رومانی نظموں میں بنیادی حیثیت عورت کے لمس کی بجائے اس کی محبت اور شرکت

کی حامل ہے۔ ان نظموں میں کیفی ایک ایسے نوجوان جذباتی شاعر کے روپ میں ابھرے ہیں جو جذبات عشق میں سرشار ہونے کے باوجود مغلوب نہیں کیے جاسکتے کیونکہ وہ احتیاط اور ضبط سے کام لینا جانتے ہیں وہ عشق کا قوی جذبہ رکھنے کے باوجود بہر حال سماج اور معاشرے کا ایک ذمہ دار فرد ہے۔ اور اس حیثیت سے اپنے ذاتی دکھ درد اور محبت کو پوری دنیا اور پوری انسانیت کے دکھ درد پر ترجیح دینے کا خود غرضانہ رویہ اختیار کرنے کو کسی قیمت تیار نہیں۔ پیار کا جشن، کھرے کا کیست، معذرت، احتیاط اور عورت وغیرہ نظموں میں کیفی کی شاعری کا یہی پہلو ابھر کر سامنے آیا ہے جسے اکثر ناقدین نے رومان سے انقلاب کی طرف اٹھنے والے قدم یا فکر کے ایک اہم موڑ سے تعبیر کیا ہے۔ اس موڑ سے گزرنے کے بعد کیفی نے وقتی اور ہنگامی موضوعات پر بے تکان نظمیں لکھی ہیں۔ ان نظموں کو جہاں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی وہیں چند ناقدین ادب نے ان پر سخت تنقیدیں بھی کی ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی اپنی کتاب "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک" میں کیفی اعظمی کی اس دور کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "انھوں نے شبلی اور ظفر علی خاں کی نظموں کا طرز اختیار کر لیا۔ کیونکہ اس طرز میں نظم لکھنے میں نسبتاً آسانی ہوتی ہے اور وقت مقررہ پر موضوع کو نظم کیا جاسکتا ہے۔ اس طریق کار نے کیفی کے یہاں وقتی شاعری کو بہت جگہ دی۔ "گاندھی جناح کی ملاقات پر، سوویت یونین اور ہندوستان' سوئے برلن جاری ہے سرخ، موج، فتح برلن، میں کلکتے میں کیفی آج پہلی بار آیا ہوں، سلام اے روس تیرے شعلے عجب شگوفے کھلا رہے ہیں، لال جھنڈے پھینک دو اے دیش بھگتو کیا کہا، قومی حکمراں، ریاست ٹراونکور کے مجاہدوں کا ترانہ، الیکشن کے دنوں میں مولانا آزاد اور خضر حیات کی ملاقات،" وغیرہ نظمیں کیفی کا کارنامہ سمجھی جانے لگیں۔ ان نظموں میں دیرپا عناصر نہیں ہیں۔ لیکن ان کی زبان معیاری ہے اور کہیں کہیں خوب صورت بند یا مصرعے بھی آجاتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ بنیادی طور پر شاعر کے ذہن میں تخلیقی عناصر دبے ہوئے ہیں۔ بعد میں کیفی نے اور آسانی کے

لیے بعض شاعروں کی مقبولِ عام نظموں کے ڈھانچوں کو سامنے رکھ کر نظمیں لکھنی شروع کردیں۔" [1]

یہ اعتراض اپنی جگہ درست لیکن اگر شاعر کو کوئی وقتی یا ہنگامی مسئلہ اظہار کے لیے اکساریا ہو تو محض اس ڈر سے کہ ناقد اس پر صحافت کا لیبل چپکا دیں گے یا کم رتبہ شے قرار دیں گے اس کا اظہار نہ کرنا میرے نزدیک ایک قسم کی بد دیانتی کے مترادف ہوگا ہر اچھے اور بُرے شاعر نے وقتی اور ہنگامی موضوعات پر بھی کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے۔ میر و غالب کو چھوڑیے اقبال اور جوش کے شعری سرمائے میں ہمیں ہنگامی شاعری کے کئی نمونے مل جائیں گے۔ کیفی اعظمی کی شاعری کا بھی یہ محض ایک پہلو ہے جسے طے کرلینے کے بعد ان کی شاعری کا رشتہ اپنے عہد کے ساتھ اور مضبوط ہوگیا ہے۔ ان کے طنز میں پہلے سے کہیں زیادہ گہرائی آگئی ہے۔

دراصل ان وقتی اور ہنگامی نظموں کی تخلیق کے دوران کیفی اعظمی نے اپنے اِرد گرد کی زندگی اور اُس کے مسائل کا مختلف زاویوں سے نہ صرف مشاہدہ کیا بلکہ ان کے بارے میں نہایت سنجیدگی اور شدّت سے سوچا بھی ہے اور اسی عمل نے ان کے مخصوص رومانوی ذہن کو متاثر کرکے انھیں محبت کی جذباتی اور طلسمی دنیا سے باہر قدم نکالنے میں بے حد اہم کردار ادا کیا ہے۔ کیفی اپنے تخلیقی سفر کے اسی وقتی اور ہنگامی مراحل سے گزرنے کے بعد ہی اردو ادب کو مثنوی "خانہ جنگی" اور "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" (دوسرا اجلاس) جیسی بلند پایہ تخلیقات دے پائے ہیں جن میں عصری زندگی کی بہترین ترجمانی ملتی ہے۔ یہ ترجمانی اس انفرادیت پسند فن کار سے بجا طور پر مختلف شے ہے جو اس بھری پُری دنیا، سماج اور معاشرے سے خود کو الگ تھلگ کرکے اپنی تنہائی کا رونا رونے ہی کو سب سے بڑا فنی کارنامہ متصوّر کرتا ہے۔ بقول سردار جعفری:

> "شاعر یا ادیب کے جذبات کو برانگیختہ کرنے والے محرکات گرد و پیش کی اسی دنیا میں پائے جاتے ہیں جہاں تمام انسان زندگی بسر کرتے ہیں اور یہ محرکات خود اس سماجی اور اقتصادی نظام کی پیداوار ہوتے ہیں جو انسانی زندگی کی

---

[1] ترقی پسند ادبی تحریک: ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی۔ ص ۱۷۰۔

شیرازہ بندی کرتا ہے۔ اس لیے اعلا شاعری یا ادب کسی ایک فرد کا نہیں بلکہ پوری جماعت کا ترجمان ہوتا ہے۔" ؎

مثنوی "خانہ جنگی" اور "ابلیس کی مجلس شوریٰ" کیفی اعظمی کی سیاسی اور سماجی سوجھ بوجھ، ان کی فنی بصیرت اور شاعرانہ کمال کی مظہر ہیں۔ بالخصوص مؤخر الذکر نظم اقبال کی اسی عنوان کی معرکۃ الآرا نظم کی توسیع کی خوب صورت مثال کہی جا سکتی ہے۔

"زندگی" ایک ایسی اچھوتی نظم ہے جسے میرے خیال سے ان کا کوئی بھی باشعور ناقد نظر انداز نہیں کر سکتا۔ یہ نظم صرف ایک بار سرسری طور پر پڑھنے یا سننے یا سن کر سر دھنے کی چیز نہیں (جیسا کہ عموماً اس کے ساتھ ہو رہا ہے) نظم کا بغور مطالعہ کیا جائے تو "زندگی" پہلے ہی مصرعے کے ساتھ قاری کو اپنی نس نس میں اترتی محسوس ہوتی ہے کیونکہ یہ نظم شعور و لاشعور، احساسات و محسوسات، خواب، نیم خوابی اور بیداری وغیرہ وغیرہ کے درمیان سوچ کے لیے عجیب و غریب زاویوں سے گزرتی ہے جسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کیفی اعظمی جیسے شاعر سے جو مغربی ادب کی خوشہ چینی کا عادی اور قائل نہیں۔ اتنی جدید ترین تکنیک میں اتنا حسین و دل کش، فکر انگیز اور متاثر کن تخلیق کا اظہار کیسے ممکن ہوا؟ یہاں ان کی دو اور نظمیں "ایک بوسہ" اور "جوہر" کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا۔ اول الذکر میں ایک مخصوص کیفیت کو خیالی حرکی تصویروں میں اور پھر ان حرکی تصویروں کو الفاظ کے ذریعے شعری پیکروں میں ڈھالنے کا اچھوتا تجربہ ملتا ہے تو مؤخر الذکر میں جوہر خود کو شعلہ، بجلی، طوفان اور آندھی کی شکلوں میں محسوس کرتے ہوئے شاعر کے مخصوص فلسفۂ حیات کا ترجمان بن جاتا ہے۔

کیفی اعظمی کی دیگر نظموں میں "دھماکہ، میرا ماضی میرے کاندھے پر، سوار، آوارہ سجدے، گم شدہ شہر، ابن مریم، بہروپنی، ایک لمحہ اور سانپ" وغیرہ خصوصیات کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ تمام نظمیں میرے نزدیک فکر و فن کے لحاظ سے کیفی اعظمی کی نمائندہ نظموں کا درجہ رکھتی ہیں۔ ترقی پسند اور جدیدیت کے مروّجہ لیبلوں سے پرے اگر ایمانداری سے دیکھا جائے تو کیفی اعظمی ان نظموں کے ساتھ ان گنے چنے شاعروں کے دوش بہ دوش کھڑے نظر آتے ہیں جو ہم عصر اردو شاعری کا

؎ ترقی پسند مصنفین کی تحریک: سردار جعفری "نیا ادب" اپریل ۱۹۳۹ء۔

مایۂ افتخار ہیں۔ یہی نہیں ساتویں دہائی کے بعد کیفی اعظمی کی غزلوں کا اسلوب بھی ان کی نظموں سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

وہ تیغ مل گئی جس سے ہوا تھا قتل مرا
کسی کے ہاتھ کا اُس پر نشاں نہیں ملتا
کھڑا ہوں کب سے میں چہروں کے ایک جنگل میں
تمہارے چہرے کا کچھ بھی یہاں نہیں ملتا

دیواریں تو ہر طرف کھڑی ہیں   کیا ہو گئے مہربان سائے
جنگل کی ہوائیں آ رہی ہیں   کاغذ کا یہ شہر اڑ نہ جائے

لگ گیا اک مشین میں میں بھی   شہر میں لے کے آ گیا کوئی
میں کھڑا تھا کہ پیٹھ پر میری   اشتہار اک لگا گیا کوئی

کیفی اعظمی بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ انھوں نے بہت کم غزلیں لکھی ہیں۔ لیکن ان غزلوں میں موجود ایسے اشعار اس بات کا ثبوت ہیں کہ اردو شاعری کے بڑھتے ہوئے کارواں میں وہ تازہ دم مسافروں کے ساتھ ہیں۔ اپنے ہم عصر ترقی پسند شعرا کی طرح تھک کر بیٹھ نہیں گئے کسی منزل پر رُک کے نہیں۔ اسی لیے آج کی اردو شاعری کے منظر نامے میں ان کا چہرہ بہت واضح اور صاف نظر آتا ہے۔

مروجہ ادبی سیاست، جوڑ توڑ، گروہ بندی، مصلحت اور تشہیری فریب کاریوں سے دامن بچا کر اپنی ذاتی صلاحیتوں پر مکمل اعتماد کے ساتھ تخلیق فن کے کام میں ریاضت و عبادت کی طرح منہمک ایک ہمہ جہت فن کار کی حیات و فن کا بے لاگ تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ

تخلیق کار صادق

- جس کی نظمیں اور غزلیں ایک بے حد منفرد طرز اسلوب کا نمونہ اور فکر و فن کا حسین امتزاج ہیں۔
- جس کے افسانے عصری زندگی کے اچھوتے تجربات سے عبارت ہیں۔
- جس کے مضامین اردو فکشن کی تحقیق و تنقید میں اضافہ قرار دیے جا سکتے ہیں۔
- جس کے موقلم کی جنبشوں سے جنم لینے والے بصری پیکر فن مصوری کی جاندار روایت کا حصہ ہیں۔

تخلیق کار صادق

●

انتخاب اور تجزیہ

شاہد ماہلی

Meyār

K-20C, SHEIKH SARAI, PHASE II, NEW DELHI-110017.

No. 6

1992